بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
مارچ 2021
www.pklibrary.com

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ——— /840 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ——— 18,000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا - 20,500 روپے

سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں

subscriptions@khawateendigest.com

مستقل سلسلے

مارچ 2021

جلد 35 شمارہ 07

قیمت 70 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

مارچ کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

مارچ کا مہینہ جب موسم سرما کی رخصتی کے ساتھ بہار دستک دیتی ہے۔ لیکن اس بار موسم بہار کا آغاز بھی نہیں ہوا کہ گرمی چلی آئی۔ سچ پوچھیے تو موسم سرما بھی چند دن کا ہی مہمان تھا۔

کبھی کراچی کا موسم معتدل ہوتا تھا۔ نہ ٹھٹھرا دینے والی سردی نہ جھلسانے والی گرمی۔ شام میں سمندری ہوائیں چلتیں، راتیں پرسکون ہوتیں اور صبحیں اجلی اور روشن۔ لیکن اب تو لگتا ہے کہ جیسے سارے موسم ہم سے روٹھ گئے ہیں۔ مصروف زندگی کی جاگ دوڑ اور مشینی شور کی آلودگی میں ہمیں احساس ہی نہیں رہا کہ ہم اپنا کیسا قیمتی سرمایہ کھو بیٹھے ہیں۔

اب آمد بہار پر نہ ہریالی نظر آتی ہے نہ پرندوں کے رسیلے گیت کانوں میں رس گھولتے ہیں نہ چڑیوں کی چہچہاہٹ زندگی کا احساس دلاتی ہے نہ کوئل کی ہوک دلوں میں درد جگاتی ہے۔

ہم نے کار فطرت میں مداخلت کی تو فطرت نے بھی موسموں کی یہ خوبصورتی ہم سے چھین لی۔

آج کراچی بدترین ماحولیاتی آلودگی کا شکار ہے۔ اس کا ایک بڑا سبب کونوکارپس کے درخت ہیں جو سابق میئر کراچی نے لگائے۔ مقامی درخت جو یہاں کی سرزمین سے مطابقت رکھتے تھے، انہیں بے دریغ کاٹ دیا گیا اور اس کی جگہ کونوکارپس کے درخت لگا دیے گئے۔ یہ درخت سارا پانی جذب کر لیتا ہے اور اس پر پرندے بھی نہیں بیٹھتے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ کراچی میں گرمی کی شدت بڑھنے کی ایک وجہ درختوں کی کٹائی اور ایسے درخت نہ لگائے جانا ہے جو کراچی کے ماحول سے مطابقت رکھتے تھے۔

درختوں کی قربت، آکسیجن کی زیادہ مقدار اور پرندوں کی آوازیں ہمارے ذہن پر خوشگوار اثرات مرتب کرتی ہیں۔ ذہن پرسکون رہتا ہے۔ اداسی اور مایوسی دور ہوتی ہے۔

اگر آپ کو سہولت میسر ہے تو اپنے گھر کے آنگن میں کیاریاں بنائیں۔ پھولوں کے گملے رکھیں اور ممکن ہو تو درخت بھی ضرور لگائیں۔ اس سے ہماری بقا وابستہ ہے۔

اس شمارے میں،

- بمبئی کی بانو۔ امت العزیز شہزاد کا مکمل ناول،
- عسر یسرا۔ حسنہ حسین کا مکمل ناول،
- طلوع و غروب۔ نعیمہ ناز کا ناولٹ،
- افشین نعیم، نور نظر، ساجدہ لطیف، شمیم رانی، حنا بشریٰ اور فریحہ اشتیاق کے افسانے،
- رخسانہ نگار عدنان اور تنزیلہ ریاض کے ناول،
- لیجنڈری فنکارہ بدر خلیل سے ملاقات،
- مصباح نوشین اور سعدیہ کامل کا بند حسن،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں، خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

حمد باری تعالیٰ

تیری مدحت اور میں، معذور و سرتاپا قصور
میں کہاں سے لاؤں اتنا حوصلہ، اتنا شعور

صرف تیرے آسرے پر لب کشا ہوتا ہوں میں
اس سعادت کی مجھے توفیق دے ربِ غفور

غنچہ و گل آئینہ تیرے جمالِ قدس کا
ماہ و انجم سے عیاں تیری تجلی تیرا نور

ہے رواں تیرے اشارے پر نظامِ کائنات
گردشِ افلاک بھی سجدہ کناں تیرے حضور

ذرہ ذرہ خاک کا تیری عظمت کا نقیب
بوٹا بوٹا گلستاں کا تیری قدرت کا ظہور

سرخرو ہیں تیری رحمت سے ترے سجدہ گزار
سرنگوں ہے تیرے آگے کفر و باطل کا غرور

مل چکا اقبال کو سب کچھ تری سرکار سے
بخش دے اس کی خطائیں بھی مرے ربِ غفور

اقبال عظیم

زباں پر محمدؐ کا نام میرے اللہ
درودوں کا لطف کلام میرے اللہ

روضۂ پاک خیر الانعام میرے اللہ
کس قدر ہے ادب کا مقام میرے اللہ

قرینہ سکھایا ہے جینے کا ہم کو
شریعت بھی کیا ہے نظام میرے اللہ

آسمان و زمین، چاند، سورج، تارے
سبھی بھیجتے ہیں سلام میرے اللہ

دل ہے مسرور یادِ محمدؐ میں ایسے!
جیسے تسنیم و کوثر کا جام میرے اللہ

سامنے مصطفیٰؐ کے حقیقت کیا ان کی
پھول ہوں یا کہ ماہِ تمام میرے اللہ

دعائیں قبول ہو گئیں تیری تسنیم
مدینے سے آیا پیام میرے اللہ

سراج المنیر تسنیم

خواب اور ان کی تعبیر

لغوی معنی: تعبیر کے لغوی معنی، اظہار، بیان اور ترجمانی کے ہیں جبکہ خواب سے مراد وہ مناظر یا وہ چیزیں ہیں جو کوئی شخص نیند میں دیکھتا ہے، لہٰذا تعبیر الرؤیا کا مطلب ہوگا، حالت نیند میں دیکھے جانے والے مناظر کی تعبیر اور ان کی ترجمانی کرنا۔

خوابوں کی اقسام

خواب مومن کے لیے اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں۔ اگر اچھا خواب نظر آئے تو مومن کو دلی مسرت اور روحانی سرور حاصل ہوتا ہے اور اگر برا خواب نظر آئے تو مومن اپنے رب کی طرف رجوع کر کے احتیاطی تدابیر اختیار کرتا اور اپنے رب کی پناہ حاصل کر لیتا ہے۔ اس طرح خواب مومن کے لیے ہر حال میں خیر و برکت کا باعث بنتے ہیں۔ خوابوں کی اقسام درج ذیل ہیں۔

1۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومن کے لیے خوش خبری پر مشتمل خواب۔

2۔ مومن کو پریشان کرنے کے لیے شیطانی اور ڈراؤنے خواب۔

3۔ دن بھر کی مصروفیات، منصوبوں اور خیالات کا خواب میں نظر آنا۔

خواب سچے بھی ہوتے ہیں اور انسان کو پریشان کرنے کے لیے محض شیطانی وسوسے بھی۔ حافظ ابن حجر رحمتہ اللہ نے خواب دیکھنے والوں کو درج ذیل اقسام میں تقسیم کیا ہے۔

انبیائے کرام علیہ السلام: ان کے خواب سچے اور حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں۔

نیک لوگوں کے خواب: ان کے اکثر و بیشتر خواب سچے ہوتے ہیں جبکہ کبھی کبھار اس کے برعکس صورت حال بھی ہو سکتی ہے۔

فاسق فاجر اور کفار کے خواب: ان کے اکثر خواب جھوٹے اور شیطانی وسوسے ہوتے ہیں، البتہ کبھی کبھار ان کے خواب بھی سچ ہو سکتے ہیں۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے دو قیدی ساتھیوں کے خواب یا فرعون کا خواب وغیرہ۔

خواب کی تعبیر کے آداب: نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ہر شعبے میں امت کی رہنمائی فرمائی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خواب آتے تھے جن کی تعبیر خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے۔ اچھا یا برا خواب دیکھنے پر کیا آداب اختیار کرنے چاہئیں؟ اس کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کی بھرپور رہنمائی فرمائی ہے۔ چنانچہ امت کو حکم دیا ہے کہ خواب کی تعبیر بیان کرتے وقت اسے اچھی اور بہتر صورت پر محمول کریں کیونکہ تعبیر کر دینے کے بعد خواب ویسے ہی واقع ہو جاتا ہے۔

خواب کی تعبیر کے سلسلے میں آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ ”تعبیر ہمیشہ اپنے خیر خواہ اور عالم شخص سے دریافت کرو۔“ اس میں یہ حکمت پوشیدہ ہے کہ عالم شخص اور خیر خواہ آدمی ہمیشہ اچھی تعبیر

کریں گے جبکہ حاسد یا جاہل شخص بری تعبیر دے کر نقصان کا باعث بنیں گے۔ جس شخص کو خواب آئے اسے درج ذیل آداب نبوی ﷺ اپنانے چاہئیں۔

1۔ اچھا خواب نظر آئے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے، اپنے پسندیدہ، محبوب اور خیر خواہ لوگوں کو سنائے اور خوشی کا اظہار کرے۔

2۔ اگر ڈراؤنا یا برا خواب دیکھے تو اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرے، یعنی اعوذ باللہ من شیطان الرجیم پڑھے۔ نیند سے بیدار ہونے پر بائیں طرف تین بار تھتکار دے۔ کسی بھی شخص سے اس کا اظہار نہ کرے۔

3۔ جس کروٹ لیٹا ہوا ہے تبدیل کر کے دوسری کروٹ پر لیٹ جائے۔ نفل نماز ادا کرے۔

4 آیۃ الکرسی پڑھے۔

درج بالا آداب اختیار کرنے سے ان شاء اللہ آدمی برے خواب کے اثرات سے محفوظ ہو جائے گا۔

خوابوں کی تعبیر سے متعلق آداب و احکام مسلمان کا خود یا کسی اور کا اس کے لیے اچھا خواب دیکھنا

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"نیک آدمی کا اچھا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل:

1۔ نبی کا خواب ہمیشہ سچا ہوتا ہے کیونکہ اس پر شیطان کا اثر نہیں ہوتا۔ البتہ بعض اوقات وہ خواب ایسا ہوتا ہے جس کی تعبیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ نیک آدمی کو بھی غلط خواب بھی آتے ہیں کیونکہ وہ معصوم نہیں ہوتا۔ تاہم جتنا زیادہ نیک ہو، اتنا زیادہ اس کے خواب کے سچا ہونے کی امید ہوتی ہے۔

2۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں۔ ان کے بعد کوئی آدمی نبی نہیں ہو سکتا، اس لیے خواب کو نبوت کا چھیالیسواں حصہ کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ خواب دیکھنے والا اشرف نبوت میں شریک ہو جاتا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ نبوت کے چھیالیس یا ستر حصے ہیں اور ان میں سے ایک حصہ اچھے خواب بھی ہیں۔ اگرچہ نبوت اب باقی نہیں رہی مگر اس کا یہ حصہ قیامت تک باقی ہے۔

3۔ اس کی ایک توجیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دور نبوت تیئس سال کا ہے اور ان میں پہلے چھ ماہ تک آپ کو محض خواب آیا کرتے تھے جو اس قدر سچے اور حقیقت پر مبنی ہوتے تھے، جیسے رات کے اندھیرے کے بعد صبح صادق کا طلوع ہونا۔ چونکہ یہ چھ ماہ تیئس سال کا چھیالیسواں حصہ ہے، اس نسبت سے مومن کے خواب کے متعلق یہ کہا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔

مومن کا خواب

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مومن کا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ ممکن ہے اس حدیث سے ادنیٰ درجے کے مومن کا خواب مراد ہو اور پہلی حدیث میں اعلیٰ درجے کے مومن کا خواب۔ ادنیٰ درجے کے خواب میں اس کے اپنے خیالات کا دخل زیادہ ہوتا ہے، اس لیے اس کے بعینہ پورا ہونے کا امکان نسبتاً کم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

سچے خواب

حضرت ام کرز کعبیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"نبوت ختم ہو گئی اور خوش خبری دینے والی چیزیں رہ گئیں، یعنی سچے خواب باقی ہیں۔" (مسند

احمد)

فوائد و مسائل:

1۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں۔ اس لیے نبوت سے براہ راست مستفید ہونا اب ممکن نہیں۔

2۔ سچے خوابوں کو مبشرات کہا گیا ہے کیونکہ ان کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ مومن کو کسی ملنے والی نعمت کی خبر دیتا ہے یا کسی آنے والی مصیبت سے متنبہ کر دیتا ہے تاکہ انسان اس سے بچنے کی دعا اور تدبیر کرلے۔

3۔ اکثر خواب ایسے ہوتے ہیں جن کی تعبیر کی ضرورت ہوتی ہے، البتہ بعض خواب جیسے نظر آتے ہیں بعد میں ویسا ہی واقعہ پیش آجاتا ہے، جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کو صحابہ کے ساتھ عمرہ کرتے دیکھا تو اگلے سال اسی طرح عمرہ کیا گیا۔

اچھا خواب

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اچھا خواب نبوت کا سترواں حصہ ہے۔" (مسلم)

خوش خبری

حضرت عبادہ صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے متعلق دریافت کیا۔

"ان کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی خوش خبری ہے اور آخرت میں بھی۔" (سورۃ یونس 64)

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اس سے مراد اچھا خواب ہے جو مسلمان دیکھتا یا اس کے لیے دیکھا جاتا ہے۔" (ترمذی)

فوائد و مسائل

1۔ اچھا خواب اپنے بارے میں بھی ہو سکتا ہے اور کسی دوسرے مسلمان کے بارے میں بھی۔ دونوں صورتوں میں یہ خوش خبری ہے۔ مثلاً: ایک آدمی دیکھتا ہے کہ وہ کعبہ کا طواف کر رہا ہے، یہ اس کا اپنے بارے میں خواب ہے۔ یا دیکھتا ہے کہ اس کا والد طواف کر رہا ہے۔ تو یہ اس کے والد کے بارے میں خوش خبری ہے۔

2۔ آخرت میں مومن کو جنت میں داخلے کی خوش خبری ملے گی۔ یہ روح قبض ہوتے وقت بھی ملتی ہے اور قبر کے سوالات کے بعد بھی ملتی ہے۔

3۔ دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ ملنا بھی خوش خبری ہوگی۔ اعمال کا وزن ہوتے وقت نیکیوں کے پلڑے کا بھاری ہو جانا بھی خوش خبری ہے۔

نیک خواب

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے (آخری) مرض کے ایام میں (ایک دن) پردہ ہٹایا جبکہ لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیچھے صفیں باندھے ہوئے (نماز پڑھ رہے) تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لوگو! نبوت کی خوش خبری دینے والی چیزوں میں سے صرف نیک خواب باقی ہیں جسے کوئی مسلمان دیکھتا ہے یا اس کے لیے دیکھا جاتا ہے۔" (مسلم)

خواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے مجھے خواب میں دیکھا، اس نے (گویا) مجھے بیداری میں دیکھا کیونکہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کر سکتا۔" (ترمذی)

حضرت ابو جحیفہ وہب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے مجھے خواب میں دیکھا، گویا اس نے مجھے بیداری میں دیکھا۔ شیطان یہ طاقت نہیں رکھتا کہ میری صورت اختیار کرے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل:

1۔ بعض خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ یہ خواب سچے ہوتے ہیں۔ خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بھی اسی قسم میں شامل ہے۔

2۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اس حلیے کے مطابق ہو تو خواب سچا ہے۔ تعبیر کی ضرورت نہیں۔ اگر خواب میں حلیہ مبارک مختلف نظر آئے تو اس کی تعبیر کی جائے گی اور یہ دیکھنے والے کے دین و خلق میں نقص اور کوتاہی کا اظہار ہے (فتح الباری ۱۳/۳۸۴)

3۔ بعض لوگ جھوٹ موٹ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا دعویٰ کر دیتے ہیں، حالانکہ انہیں ایسا کوئی خواب نہیں آیا ہوتا۔ یہ بہت بڑا گناہ اور نہایت سنگین جرم ہے۔

تین قسمیں

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"خواب تین قسم کے ہوتے ہیں: (ایک) اللہ کی طرف سے خوش خبری (دوسرے) دل کے خیالات اور (تیسرے) شیطان کی طرف سے خوف زدہ کرنے کے لیے (برے اور ڈراؤنے خواب) جب کسی کو ایسا خوب آئے جو اسے اچھا لگے تو اگر وہ چاہے تو اسے (کسی کے سامنے) بیان کر دے۔ اور اگر کوئی ناپسندیدہ چیز نظر آئے تو کسی کو خواب نہ سنائے اور اٹھ کر نماز پڑھے۔" (بخاری)

خواب کی قسمیں

حضرت عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"خواب تین قسم کے ہوتے ہیں: بعض خواب ڈراؤنے ہوتے ہیں، (وہ) شیطان کی طرف سے انسان کو پریشان کرنے کے لیے (ہوتے ہیں) بعض ایسے ہوتے ہیں کہ انسان بیداری کی حالت میں جو کچھ سوچتا رہتا ہے، وہی کچھ خواب میں اسے نظر آجاتا ہے۔ اور بعض (خواب) وہ ہیں جو نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہیں۔" حضرت مسلم بن مشکم رحمتہ اللہ نے کہا:

"کیا آپ نے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (براہ راست) سنی ہے؟"

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"ہاں میں نے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنی ہے۔ ہاں، میں نے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنی ہے۔" (طبرانی)

فوائد و مسائل:

1۔ اللہ کی طرف سے فرشتے کے ذریعے سے دکھائے جانے والے خواب سچے ہوتے ہیں، خواہ واضح ہوں یا ان کی تعبیر کی ضرورت ہو۔

2۔ شیطان جس طرح بیداری میں انسان کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے، اسی طرح نیند کی حالت میں پریشان کن خیالات کو خوابوں کی صورت میں پیش کرتا ہے۔

3۔ انسان دن میں جو کام کرتا ہے یا کرنا چاہتا ہے لیکن کسی وجہ سے کر نہیں سکتا، نیند میں اس قسم کے خیالات خوابوں کی صورت میں سامنے آجاتے ہیں۔ ان کی تعبیر کی ضرورت نہیں ہوتی۔

4۔ جدید علم نفسیات صرف تیسری قسم کے خوابوں کے بارے میں بحث کرتا ہے۔ یہ لوگ فرشتوں اور شیطانوں پر ایمان نہ رکھنے کی وجہ سے

پہلی اور دوسری قسم پر یقین نہیں رکھتے لیکن وہ ایک حقیقت ہیں جن کی مثالیں اکثر سامنے آتی رہتی ہیں۔

5۔ انبیائے کرام علیہ السلام کے خواب وحی میں شامل ہیں، لہٰذا یقینی امور پر مشتمل ہوتے ہیں۔

برا خواب

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب کسی کو ایسا خوب نظر آئے جو اسے برا لگے تو اسے چاہیے کہ بائیں طرف تین بار تھوک دے اور تین بار شیطان سے اللہ کی پناہ مانگے، اور جس پہلو پر لیٹا ہوا ہو، اسے بدل دے (دوسرے پہلو پر لیٹ کر سو جائے۔'') (مسلم)

اللہ کی طرف

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اچھا خواب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور برا خواب شیطان کی طرف سے، لہٰذا اگر کسی کو (خواب میں) ایسی چیز نظر آئے جو اسے ناگوار ہو تو اسے چاہیے کہ تین بار بائیں طرف تھوک دے اور شیطان مردود سے تین بار اللہ کی پناہ مانگے، اور جس پہلو پر لیٹا ہوا ہو اسے بدل دے۔'' (بخاری)

فوائد و مسائل:

1۔ برا خواب شیطان کے شر سے ہوتا ہے، اس لیے اس سے حاصل ہونے والی پریشانی کا علاج اعوذ باللہ پڑھنا ہے۔

2۔ بائیں طرف تھتکارنے میں یہی حکمت ہے کہ بائیں طرف شیطان سے مناسبت رکھتی ہے، وہ اس طرف سے آ کر دل میں وسوسے ڈالتا۔

3۔ کروٹ بدلنا جسمانی حالت میں ظاہری تبدیلی ہے جس میں اللہ سے اس کی رحمت کی امیدوار درخواست کا اظہار ہے کہ اللہ پریشانی کی حالت تبدیل فرما کر اطمینان عطا فرما دے۔

شیطان شرارت کرے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا:

''میں نے (خواب میں) دیکھا کہ میرا سر اڑا دیا گیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ لڑھکتا جا رہا ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''شیطان (بعض اوقات) کسی انسان کی طرف متوجہ ہو کر اسے (خواب میں) خوف زدہ کرتا ہے، پھر وہ (شخص) صبح لوگوں کو بتانے لگتا ہے (یہ مناسب نہیں۔'') (مسند احمد)

فوائد و مسائل:

1۔ پریشان کن خواب کسی کو سنانا مناسب نہیں۔

2۔ انسان کو چاہیے کہ اللہ پر توکل کرتے ہوئے ایسے خواب کو اہمیت نہ دے بلکہ گزشتہ باب کی احادیث کے مطابق عمل کرے۔ اللہ کی رحمت سے اسے کوئی نقصان نہیں ہو گا۔ واللہ اعلم۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ ایک آدمی آیا اور اس نے کہا:

''اے اللہ کے رسول! آج رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میرا گلا کاٹ دیا گیا اور میرا سر (جسم سے الگ ہو کر) گر گیا ہے۔ میں نے اس (لڑھکتے ہوئے سر) کا تعاقب کر کے اسے پکڑ لیا اور دوبارہ (جسم پر) لگا لیا۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''جب کسی کے ساتھ شیطان خواب میں شرارت کرے تو وہ (یہ خواب) لوگوں کو ہرگز نہ بتائے۔'' (مسلم)

☆

کچھ باتیں، کچھ یادیں

رضیہ جمیل

کسی نے فون پر مجھ سے پوچھا۔ ”کیا آپ کو معلوم ہے، خالدہ جیلانی کا انتقال ہو گیا؟“

میں ریسیور کان سے لگائے گم صم سی بیٹھی رہی۔ پھر بدقت تمام میں نے جواب دیا۔ ”نہیں، مجھے ابھی آپ ہی سے معلوم ہوا ہے۔“

چند اور جملے میں نے ان کے انتقال اور سوئم کے بارے میں سنے اور پھر میں نے کہا ”اچھا! میں ابھی ان کے گھر فون کر کے تفصیلات معلوم کرتی ہوں۔“

میرے پاس خالدہ کے جو نمبر تھے، ان میں سے ایک نمبر کوئی ریسیو نہیں کرتا تھا۔ اور دوسرا نمبر انگیج مل رہا تھا۔ خالدہ کو میں نے تقریباً ڈیڑھ مہینے پہلے بھی فون کیا تھا۔ لیکن دو، تین دفعہ فون کرنے کے باوجود میرا ان سے رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ بعد میں جب عاصمہ سے میرا رابطہ ہوا تو انہوں نے بتایا کہ وہ نمبر تو کافی عرصے سے بند پڑا ہے۔ عاصمہ سے کچھ دیر میری بات ہوئی۔ بڑے صبر اور حوصلے سے اس نے مجھ سے باتیں کیں۔ عاصمہ کی امی کے انتقال کے بعد سے خالدہ، عاصمہ کی نہ صرف ماں بلکہ اس کی ہمدرد و غمگسار، دکھوں اور خوشیوں کی شریک تھیں۔ کہنے کو خالدہ عاصمہ کی خالہ تھیں لیکن ایک خالدہ کی ذات میں وہ عاصمہ کی ماں بھی تھیں، اس کی بہن بھی تھیں، اس کی سہیلی بھی تھیں۔ اس ایک رشتے میں عاصمہ نے بہت سارے رشتے پائے تھے۔ وہ ان کو خالدہ آپا کہتی تھی۔ عاصمہ کے بچوں اور ان کے شوہر نے بھی خالدہ کو بہت عزت، بہت مان دیا۔

جاند نگر گروپ آف پبلیکیشنز کے ادارے سے خالدہ کا تعلق بہت دیرینہ تھا۔ جس طرح امل اپنی ذمے داریوں کو خلوص، محبت اور دل سے نبھا رہی ہیں۔ اسی طرح خالدہ نے بھی اپنی ذمے داریوں کو دل سے نبھایا۔

خالدہ کی شخصیت میں ایک وقار تھا، ایک سادگی تھی۔ دراز قامت خالدہ کو ایک نظر دیکھنے کے بعد نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بے اختیار ان سے بات کرنے کو دل چاہتا تھا اور بات کر کے اندازہ ہوتا تھا کہ اس ڈیل ڈول کی شخصیت کے اندر تو ایک بڑی معصوم سی لڑکی چھپی بیٹھی ہے۔

یہ بات میں خالدہ سے اپنی ابتدائی ملاقات کے حوالے سے کہہ رہی ہوں اس بات کو برسوں گزر گئے۔ پھر جیسے جیسے ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ آگے بڑھتا گیا، یہ احساس بھی بڑھتا گیا کہ خالدہ جیسی شخصیت کے لوگ ہی دلوں میں خود بخود جگہ بناتے چلے جاتے ہیں۔ ہنسی میں ایسی کھلکھلاہٹ کہ بے اختیار دل کو ان پر پیار آ جائے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خالدہ کے لیے دل میں عزت اور محبت بڑھتی ہی چلی گئی۔ پیار ایسا جیسے دو بہنوں میں ہوتا ہے۔ میری بیٹی کی شادی کی تیاری کا موقع آیا تو جتنے کام میں سہولت سے کر سکتی تھی، کرتی رہی جہاں کوئی ایسا مسئلہ آیا کہ مجھے اپنی نااہلیت کا احساس ہوا فوراً خالدہ کو فون کیا۔

”خالدہ! الیکٹرونک مارکیٹ جانا ہے۔ مجھے تو اس طرح کی چیزیں خریدنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔“

پہلے تو ایک کھلکھلاتی ہوئی ہنسی سنائی دیتی پھر پوچھا جاتا۔ ”کب چلیں گی؟ آپ مجھے بتا دیجیے گا میں آ جاؤں گی۔“ جب ہم نئے گھر میں شفٹ ہوئے تو کوکنگ رینج خریدنا تھا۔ خالدہ حسب عادت میرے ساتھ چلنے کو تیار تھیں۔ ایک تو ان کی شخصیت کا وقار ہی لوگوں کو ان کے سامنے مؤدب کر دیتا تھا پھر جب وہ بہت طور طریقے سے بھاؤ تاؤ کرتیں تو معاملہ بخیر و خوبی طے ہو جاتا۔ ڈیوٹی فری شاپ جانا ہوتا خالدہ میرے ساتھ جانے کو تیار ہوتیں۔ غرض یہ کہ کوئی بھی ایسا کام جو میں سمجھتی تھی کہ میں بہتر طریقے سے یہ کام نہیں کر سکوں گی۔ خالدہ بڑی خوش دلی اور محبت سے میرے ساتھ جانے کو تیار ہوتی تھیں۔ ان کی محبت اور خیال رکھنے کا جذبہ صرف میرے لیے ہی مخصوص نہیں تھا وہ سب کے ساتھ ہی ایسی تھیں۔ چاہے وہ کسی کے لیے مس خالدہ ہوں یا خالدہ باجی ہوں یا خالدہ آپا ہوں۔ انہوں نے اپنے دل کی نرمی، محبت اور خلوص لوگوں میں بانٹ کر دوسروں کی محبتیں،

پیار اور خلوص کمایا ہے۔ میرے سامنے تو جب بھی کسی نے ان کا ذکر کیا، عزت، محبت اور خلوص کے ساتھ کیا۔ کیونکہ وہ خود سرتاپا خلوص اور سرتاپا محبت تھیں۔"

ان کے گھر سے نکلنے کا ٹائم عموماً ڈیڑھ، دو بجے کا ہوتا تھا۔ اکثر وہ میرے گھر سے ہوتی ہوئی جاتی تھیں۔ کبھی کھانا لگا ہوتا تھا تو میں انہیں روک لیتی تھی۔

"خالدہ! کھانا کھا کر جایئے گا۔"

انہیں میرے ہاتھ کی بنی ہوئی سبزیاں بہت پسند تھیں۔ کھانا کھاتے ہوئے کہتی تھیں۔ "آپ اس سبزی کی ریسپی مجھے بتایئے گا۔"

ان کی خوراک اتنی کم تھی کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔

میں ان سے پوچھتی تھی۔

"خالدہ! کیا آپ آفس جا کر کھانا کھائیں گی؟"

"نہیں، میں نے کھالیا۔"

میں ہنس کر کہتی۔ "خالدہ! اپنے اس ڈیل ڈول کی کچھ تو لاج رکھ لیجیے۔" جواباً کھلکھلاتی ہوئی مخصوص ہنسی سنائی دیتی۔

پچھلے کچھ برسوں سے ہماری ملاقات نہیں ہوسکی تھی۔ فون پر ہماری بات ہو جاتی تھی۔ میری

Knee Replacement Surjery

(گھٹنوں کا آپریشن) 3 نومبر 2018ء میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد تقریباً سات مہینے تک میں بہت ہی اشد ضروری کاموں سے گھر سے نکلتی تھی۔ فون پر خالدہ سے بات ہوتی تھی تو وہ کہتیں۔

"میں آپ کی طرف آنے کے لیے سوچ ہی رہی تھی۔"

لیکن یقیناً کوئی نہ کوئی مصروفیت ایسی ہو جاتی تھی کہ وہ اپنی سوچ پر عمل نہیں کر سکتی تھیں۔

اپنی کون کون سی چیزوں کو دیکھ کر مجھے ان کا خیال آتا رہا ہے، میں کیا کیا بیان کروں۔ میری بیٹی کی شادی ہوئی تو انہوں نے مجھ سے کہا۔

"اگر آپ چاہیں تو میرے جیولر کی شاپ پر چل کر ایک نظر دیکھ لیں۔"

میں نے ایک انگوٹھی پسند کی، جب بھی میں سے پہنتی ہوں، ان کی یاد آتی ہے۔ ان کے گھر ایک بندہ آتا تھا، اس کے پاس کڑھائی والے سوٹ جارجٹ، شیفون کے شیڈو ورک کے دوپٹے اور کشمیری کڑھائی والی شالیں ہوتی تھیں۔ ایک دفعہ انہوں نے فون کیا۔ اس بندے کا نام تو مجھے نہیں یاد۔

"آپ نے مجھ سے کہا تھا نا! تو میں نے کچھ دوپٹے اور شالیں رکھ لی ہیں۔ میں غلام حسین (ڈرائیور) کے ہاتھ بھجوا دوں گی جو آپ کو پسند آئیں رکھ لیجیے گا۔"

میں نے تین شالیں رکھ لیں۔ ایک شال کسی موقع پر کسی کو گفٹ کر دی تھی۔ باقی دو سردیوں کے موسم میں وارڈ روب میں لٹکی ہوتی ہیں۔ اس بار کی سردیوں میں بھی ہینگرز میں لٹکی ہوئی شالیں مجھے ان کی یاد دلاتی رہیں اور میں سوچتی رہی۔

"طبیعت تھوڑی بہتر ہو، گھر والے گھر سے نکلنے کی اجازت دیں تو خالدہ سے ملنے جاؤں گی۔" لیکن جب قسمت میں ہی ان سے ملنا نہیں لکھا تھا تو میرے سوچنے سے کیا ہو سکتا تھا۔

یہ تو سب ہی کو معلوم ہے کہ خالدہ کا تعلق شعبہ اشتہارات سے تھا۔ کتنی محنت اور کتنے خلوص سے انہوں نے اپنی ذمے داری کو نبھایا۔ ان کی شخصیت کے وقار، ان کی خوش اخلاقی نے ان کے کام کو آسان بنانے میں ان کی مدد یقیناً کی ہوگی لیکن ان کی محنت اور لگن وہ نے اس شعبے کے لیے کتنی کامیابی سے ایک معیار قائم کیا اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

جو لوگ ہمارے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں، چلتے پھرتے اور ہنستے بولتے ہیں۔ ایک دن چپ چاپ ہمارے درمیان سے چلے جاتے ہیں پھر؟ پھر اس کے بعد کیا باقی رہ جاتا ہے؟ یادیں اور باتیں۔

خالدہ بھی ہمارے لیے یہی چھوڑ گئی ہیں۔ اور ایک کام اور چھوڑ گئی ہیں، ان کے لیے مغفرت کی دعائیں کرنا۔ ہم سب ہی لوگوں کے ذہن میں ایک طویل فہرست ہوتی ہے جن کے لیے ہم صبح شام مغفرت کی دعائیں کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خالدہ کو اپنے پاس بلا کر ہماری فہرست میں ایک اور نام کا اضافہ کر دیا۔ ہماری آپ کی سب کی خالدہ جیلانی۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور دنیا سے جانے کے بعد کے تمام راستے ان کے لیے آسان کر دے۔ آمین ثم آمین۔

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

ز۔ ڈ

1988 سے شعاع کی خاموش قاری ہوں جب "تجھ سے ناتا جوڑا ہے" کا سلسلہ شروع ہوا تو دل چاہا کہ ہم بھی اپنی 22 سالہ شادی شدہ زندگی کے ساتھ اس میں شامل ہوں سو کاغذ قلم اٹھایا اور لکھنا شروع کیا تو گزرے سالوں کی کھٹی میٹھی یادیں بن بادل برسات کی طرح برسنے لگیں۔ اب ہم پریشاں کہ کیا لکھیں کہاں سے شروع کریں تو چلیں شروع کرتے ہیں۔

1۔ شادی کب ہوئی؟

16 اکتوبر 1994 کو تھوڑا ڈرتے، گھبراتے خوب صورت ارمان اور رنگین خواب لیے والدین کی نصیحتوں سہیلیوں کے مشوروں کو پلو سے باندھے، سسرال والوں کا دل جیتنے اور ساتھی کا ساتھ نبھانے کے ارادے لیے ہم پیا کے آنگن میں اترے۔

2۔ شادی سے پہلے مشاغل اور دلچسپیاں؟

شادی سے پہلے کون سا کام تھا جو نہیں کیا ہم دس بہن بھائی اور سنبھالنے والی ایک امی سو بہت چھوٹی عمر سے امی کا ہاتھ بٹانا، چھوٹے بہن بھائیوں کو سنبھالنا پڑا۔ بہن بھائیوں کے فیڈر بناتے، انہیں بہلاتے اور منہ دھلاتے کب بچپن بیتا پتا ہی نہیں چلا۔ ہوش تب آیا جب امی نے کہا آج کے بعد دوپٹے کے بنا گلیوں میں پھریں تو ٹانگیں توڑ دوں گی میٹرک تک پہنچتے ہم گھر کے ہر کام میں ماہر ہو چکے تھے۔ گھر کے کام کے بعد کتابیں پڑھنا، ٹی وی دیکھنا اور خیالی پلاؤ پکانا بس یہی مشاغل تھے۔ انٹر کے بعد نوکری ملی تو کچھ سہیلیاں بھی نہیں رہیں جن کے گھر کبھی کبھار جاتے تھے۔

3۔ اس رشتے میں آپ کی مرضی تھی یا بزرگوں کے فیصلے پر سر جھکایا؟

رشتہ کرنے سے پہلے ابو نے مجھ سے پوچھا تھا اور میں نے ان کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا کہ یقین تھا والدین کبھی بھی اپنی اولاد کے لیے برا فیصلہ نہیں کرتے۔ شادی سے پہلے میں نے انہیں دیکھا بھی نہیں تھا۔

4۔ ذہن میں جیون ساتھی کے حوالے سے کوئی تصور تھا وہ کیا خوبیاں تھیں جو اپنے جیون ساتھی میں دیکھنا چاہتی تھیں۔

میرے والد ہمیشہ سے میرا آئیڈیل رہے ہیں اس لیے منگنی کے بعد ان کا جو تصور ذہن میں بنا وہ کچھ ایسا ہی تھا کہ ابو کی طرح اتنا دھیما بولتا ہوگا کہ کان لگا کر سننا پڑے گا۔ آنکھوں میں نرم سا تاثر ہوگا۔ غصہ کرنا اور ڈانٹنا تو جانتا ہی نہ ہوگا کہ ابو کو ہم نے کبھی غصے میں نہ دیکھا تھا۔ ہمدرد، خیال رکھنے والا، باکردار اور ہر ایک کے کام آنے والا ہوگا۔ یہ تمام خوبیاں ان میں کچھ کمی بیشی کے ساتھ موجود ہیں خدمت خلق کے معاملے میں تو یہ "سارے جہاں کا درد میرے جگر میں ہے" کی عملی تفسیر ہیں۔

اتفاق سے ان میں اور ابو میں اور بھی کچھ باتیں مشترک ہیں جیسے دونوں ہی اپنے اپنے خاندان کے پہلے فرد ہیں جنہوں نے اسکول کی شکل دیکھی، اپنے بل پر اپنی تعلیم مکمل کی اور نوکری حاصل کی۔ اپنی شادی کا خرچ خود اٹھایا دونوں ہی اپنے رشتے داروں اور بھائی بہنوں کو سپورٹ کرتے رہے ہیں۔

شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں خیالات تھے؟

میں ٹھہری خیالی دنیا میں رہنے والی ناک کی سیدھ میں چلنے والی سادہ لوح بندی جس کا واسطہ صرف بھائی بہنوں اور امی سے پڑا تھا اور شادی بھی سب سے پہلے میری ہوئی تھی اس لیے بہو کی چالاکیوں اور ساس کی سیاست سے ناآشنا کورا کاغذ

تھی سو۔

"لے کر چلے تھے ہم جنہیں جنت کے خواب
تھے۔"

کے مصداق سسرال والوں کے لیے بڑے نیک خیالات تھے کہ ساس ماں اور نندیں بہنیں ہوں گی یہ تو سسرال جا کر جانا کہ ساس ماں نہیں ہوتی، نہ نند بہن ہوتی ہے، نہ بہو بیٹی۔ ان رشتوں کو اگر خوبی سے نبھانا ہے تو انہیں ان کی جگہ پر رکھ کر ان کے تقاضوں کے مطابق چلنا پڑتا ہے مطلب قربانی، درگزر اور صبر کے بنا یہ رشتے نہیں چل سکتے۔

5۔ منگنی کتنا عرصہ رہی شادی سے پہلے فون پر بات ہوئی یا ملاقات؟

منگنی دو سال رہی ان دو سالوں میں یہ صرف عید پر عیدی دینے ہمارے گھر آئے اور سارا وقت ابو کے ساتھ بہن بھائیوں کے جھرمٹ میں بیٹھے رہے اس لیے بات ہونے کا سوال ہی نہیں تھا ایک بار غلطی سے فون اٹھا لیا تھا۔ تعارف سنتے ہی شرافت سے بہن کو پکڑا دیا تھا کہ گھبراہٹ کے مارے پسینے چھوٹنے لگے تھے سوچا اب شادی کے بعد ہی دیکھیں گے اور بولیں گے۔

6۔ شادی کے لیے تعلیم کی قربانی دینا پڑی یا کوئی اور؟

تعلیم کی قربانی نہیں دینا پڑی میں نے اپنا ماسٹرز اور بی ایڈ شادی کے بعد مکمل کیا۔ البتہ شادی کے بعد سسرال میں اپنی جگہ بنانے اور معاشی طور پر مستحکم ہونے کے لیے اپنا دل مارنے کی قربانی کئی دفعہ دینی پڑی اور بہت سارے سمجھوتے بھی کرنے پڑے۔

7۔ شادی کے بعد شوہر نے آپ کو دیکھ کر کیا کہا؟

گزرے بائیس سالوں میں ایک دوسرے سے اتنا کچھ کہا سنا ہے کہ اب یہ یاد کرنا بھی مشکل ہے کہ کیا کہا تھا۔ ان سے پوچھا تو یہی جواب آیا کہ......

کس زمانے کی بات کرتے ہو
دل جلانے کی بات کرتے ہو

البتہ پہلے ہی دن اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کے دل کے دروازے کی چابی ان کے گھر والوں کے پاس ہے۔ ان کے گھر والے خوش تو یہ خوش بیوی کیا چاہتی ہے جانے ان کی بلا، ہوگا وہی جو اماں چاہیں گی۔ معصوم اتنے کہ شادی کے بعد جب بھی کہیں گھومنے گئے گھر والوں کا پورا جلوس ساتھ ہوتا میں بھی ایسی بدھو تھی کہ خیال ہی نہیں آیا کہ شادی کے بعد دولہا دلہن اکیلے بھی جاتے ہیں۔

اپنے گھر والوں سے ان کی محبت اب بھی قائم ہے اور ہمارا نمبر ان کے بعد ہی آتا ہے کہ:

عنوانِ محبت پر ہم بس اتنا ہی لکھ پائے
بہت کمزور رشتے تھے بہت مضبوط لوگوں سے

8۔ شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟

تبدیلیاں زندگی کا حسن ہیں۔ اور شادی کے بعد تو لازمی تبدیلیاں آتی ہیں۔ سو شادی کے بعد ہماری زندگی میں بھی تبدیلیاں آئی اور ہمارے اندر بھی تبدیلی آئی۔ ہماری تنخواہ جو شادی سے پہلے ہمارے ہاتھ میں آتی تھی میاں جی کے ہاتھ میں چلی گئی "یہ کلہاڑی ہم نے اپنے پیروں پر خود ماری تھی" تنخواہ کب آئی کب خرچ ہوئی ہمیں بائیس سال میں بھی پتا نہ چلا۔ ہاں یہ اطمینان ضرور تھا کہ صاحب نے صحیح جگہ پر ہی خرچ کی ہوگی۔

شادی سے پہلے لوکل بسوں میں بھی سفر نہیں کیا تھا کہ ابو کے پاس سرکاری گاڑی تھی شادی کے بعد معلوم ہوا کہ کراچی کی شیشے ٹوٹی دھواں چھوڑتی، کھڑکھڑاتی لوکل بس کے ڈنڈے سے لٹک کر سفر کرتے ہیں۔ بڑے گھر کی عادت تھی سو پہلے پہل صاحب کا چھوٹا سا سرکاری فلیٹ مرغی کا ڈربہ لگا مگر آہستہ آہستہ ہم نے اس ڈربے کے مطابق پاؤں پھیلانا سیکھ لیا۔

دانتوں سے پکڑ کر پیسہ خرچ کیسے کرتے ہیں یہ سسرال آ کر جانا پھر وقت کے ساتھ اللہ کی مہربانی اور

ہم میاں بیوی کی محنت سے سب ٹھیک ہوتا گیا۔ اب اللہ تعالیٰ نے اپنا بڑا گھر، گاڑی، کھلا پیسہ سب لوٹا دیا ہے۔

سب سے بڑی تبدیلی میرے اپنے اندر آئی کہ میرے اندر کی احساس کمتری کی ماری، خوابوں کی دنیا میں رہنے والی بدھو سی لڑکی کہیں غائب ہوگئی اور اس کی جگہ ایک سمجھ دار اور مضبوط اعصاب کی مالکن لڑکی نے لے لی۔ میرے مضبوط اعصاب اور صبر نے مجھے سسرال میں اپنی جگہ بنانے میں بہت مدد دی کیونکہ پل میں تولہ پل میں ماشہ کا مزاج رکھنے والی ساس "جیسے ہر وقت یہ شک ہوتا رہتا ہو کہ بہو مجھ سے بیٹا چھین لے گی" کے ساتھ بائیس سال گزارنا مضبوط اعصاب اور صبر کے بنا ممکن نہیں تھا۔

ویسے بائیس سال ساتھ گزارنے کے بعد بھی میری ساس کو یہ یقین نہیں آیا کہ ان کی کرسی کو مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہے کیونکہ اچھی طرح جانتی ہوں کہ جادوگر کی جان طوطے میں ہے کی طرح ہمارے صاحب کی جان اپنی ماں میں ہے پھر بھلا میں ماں بیٹے کے بیچ آنے کی گستاخی کیسے کر سکتی ہوں اور آنا بھی نہیں چاہیے کہ بیٹے بہرحال ماؤں کا مان ہوتے ہیں۔ اس لیے بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ

ان کی نظریں نہ جان پائیں اچھائیاں ہماری

محسن

ہم جو بیچ میں خراب ہوتے تو کتنے فساد ہوتے

9۔ شادی کے کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟

شادی کے تیسرے دن صاحب اور ساس وغیرہ مجھے امی کے گھر چھوڑ کر خود گاؤں ہمارا بغیر دلہن کا ولیمہ نمٹانے چلے گئے۔ میں نرالی دلہن تھی جو اپنے ہی ولیمے میں شریک نہیں تھی۔ چوتھے دن واپس کراچی آئے اور پانچویں دن کہاں کی دلہن کیسی کھیر پکوائی خود ہی کچن میں پہنچ گئے اور کام کرنا شروع کر دیا۔

نہ کسی نے روکا نہ ٹوکا کہ چاؤ چونچلے کرنے سے ہمارے سر چڑھ جانے کا خدشہ تھا۔

10۔ کیا میکے کے اور سسرال کے کھانے پکانے کے ذائقے اور انداز مختلف محسوس ہوئے۔

کھانے پکانے کے انداز میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ یا پھر شاید میں نے ہی فرق پر زیادہ غور نہیں کیا کہ سمجھنے اور محسوس کرنے کے لیے اور بہت سی باتیں موجود تھیں۔ جن میں سرفہرست ہماری ساس کا مزاج تھا جس کا پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ کب کون سی بات مزاج پر گراں گزر جائے بعض دفعہ تو میرے حساب سے میری کی گئی اچھی بات بھی انہیں بری لگ جاتی۔ اب میرے فرشتوں کو بھی پتا نہ ہوتا کہ کس بات پر مزاج برہم ہے، منائیں تو منائیں کیسے۔ صاحب کی "سارے جہاں کا درد میرے جگر میں ہے" کی عادت اور ہر ہفتے گاؤں دوڑ لگانے کی روش سے سمجھوتا کرنا بھی کافی مشکل اور صبر آزما کام تھا۔

11۔ میکے اور سسرال کے ماحول میں کیا فرق محسوس کیا؟

سب بہن بھائی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے میکے میں پڑھا لکھا ماحول تھا۔ بات کرنے کی آزادی تھی ایک دوسرے کے احساسات وجذبات کا خیال رکھتے۔ دوسروں پر اپنی مرضی نہیں تھوپی جاتی جبکہ سسرال میں ایسا نہیں تھا ہم میاں بیوی پڑھے لکھے باقی سب ان پڑھ۔ بات تول کر بولنا پڑتا تھا کہ یہاں ہر کوئی اپنی مرضی کا مطلب نکالنے میں دیر نہیں لگاتا تھا۔

دوسروں کے جذبات واحساسات کس چڑیا کا نام ہیں۔ ہماری ساس نہیں جانتیں بہو کو کوئی بات بری لگے گی اس کی انہیں پروا نہیں ہاں بہو سے کوئی بات ایسی نہ ہو جو ان کو بری لگے۔ شروع میں ساس کی تنگ مزاجی کو سہنا مشکل لگا کیونکہ صاحب اپنی ماں کے بابت نہ کچھ سنتے تھے نہ ان کو کچھ بولتے تھے یعنی رہنا ہے تو اسی طرح رہو۔ نہیں تو راستہ کھلا ہے جوش میں آ کر ہم بھی روٹھ کر میکے چلے گئے ابو کو بتایا تو انہوں نے کہا۔

"دیکھو بیٹا! تمہاری ساس کی تم سے نہیں بنتی اس بات کی بنا پر میں تمہیں نہیں رکھوں گا کیونکہ تمہاری

ساس کو تم سے منانے کی ضرورت نہیں ہے یہ تمہارا کام ہے کہ تم ساس سے کیسے بنا کر رہو۔ وہ تمہارے شوہر کی ماں ہیں اور انہیں اسی کے ساتھ رہنا ہے۔ ماں اور بیٹے کے درمیان تمہیں اپنی جگہ خود بنانی ہے۔ آئندہ اپنی ساس کی شکایت لے کر میرے پاس مت آنا اور بھائی سے کہا بہن کو اس کے گھر چھوڑ آؤ۔" لو جی کل ہی تمک گئی۔

"جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔"

اس وقت تو بہت غصہ بھی آیا خوب رونا بھی آیا کچھ عرصے تک امی ابو سے ناراض بھی رہی مگر دل میں پکا ارادہ کرلیا کہ اب چاہے کچھ بھی ہو جائے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا۔ اس گھر میں اسی ساس کے ساتھ رہ کر دکھانا ہے سو ہم اپنی ساری کشتیاں جلا کر کود پڑے اس میدان میں اور آخر ماں اور بیٹے کے بیچ اپنی جگہ بنا ہی لی۔ اب سوچتی ہوں تو ابو کا فیصلہ صحیح لگتا۔ اگر ابو اس وقت ایسا نہ کرتے تو شاید میں بھی اپنے حالات سے لڑنے کا حوصلہ نہ کرپاتی۔

12۔ سسرال میں کن باتوں پر تنقید ہوئی اور کن باتوں پر تعریف ہوئی؟

ہر انسان کے حصے میں تعریف اور تنقید دونوں آتی ہیں کہ ہر ایک کو خوش کرنا ممکن نہیں۔ اپنی ساس کے منہ سے تعریف سننے کے لیے تو میں یہی کہہ سکتی ہوں کہ

"حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے"

میری بڑی خواہش ہے کہ ساسو اماں بھی میری تعریف کریں مگر ہائے رے قسمت کہ انہیں مجھ میں صرف خامیاں ہی خامیاں نظر آتی ہیں۔ البتہ شوہر اور نندوں وغیرہ کی طرف سے بھی کبھار کوئی تعریفی جملہ سننے کو مل ہی جاتا ہے۔ ایک بات جو میرے لیے اعزاز ہے وہ میرے میاں کا مجھ پر بھروسا ہے کہ "چاہے کوئی بھی بات ہو میری بیوی مجھ سے جھوٹ نہیں بولے گی۔"

13۔ سسرال والوں نے وہ مقام دیا جو آپ کا حق تھا سسرال میں گھریلو اور خاندانی معاملات میں آپ کی رائے کو کتنی اہمیت دی جاتی ہے؟

مقام کوئی کسی کو نہیں دیتا اپنی جگہ خود بنانی پڑتی ہے۔ میرے سسرال میں بھی روایتی سسرال کی طرح فرائض حاضر اور حقوق ندارد والا معاملہ تھا۔ خاصی قربانیوں اور جدوجہد کے بعد اب تھوڑا بہت مقام مل ہی گیا ہے۔ باقی میری ساس حق اور مقام کے معنی ہی نہیں جانتیں سو ان کی طرف سے میں نے صبر کرلیا ہے۔

میری رائے کو میری ساس ناک پر بیٹھی مکھی کی طرح اڑا دیتی ہیں کہ کل کی آئی لڑکی کو خاندانی معاملات میں بولنے کا کوئی حق نہیں۔ اب تو میں بھی اتنی عادی ہوگئی ہوں ان کے ہر رویے کی کہ سب مکھی کی طرح نگل لیتی ہوں۔ کبھی کبھار صاحب کے سامنے اگل بھی دیتی ہوں۔ باقی سسرال والے پہلے تو نہیں لیکن اب رائے لے ہی لیتے ہیں۔ شوہر بچوں کے معاملات میں میری رائے کو اہمیت دیتے ہیں۔

14۔ سسرالوں سے وابستہ توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟

میرے ابو کہتے ہیں کہ جب ہم اپنا ہر عمل صرف اللہ کے لیے کرتے ہیں اور لوگوں سے کوئی توقع رکھے بغیر خلوص کے ساتھ اپنا کام کرتے جاتے ہیں اور اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں تو بہت سکون میں رہتے ہیں سو اسی بات پر عمل کرتے ہوئے کسی سے کوئی توقع نہیں رکھی بس خاموشی سے اپنے کام کیے جاتے ہیں کہ

امیدیں توڑ کر کتنا سکون ملتا ہے
توقعات کے غم میں عذاب کتنے ہیں

میں نے ساری توقعات اپنے اللہ سے وابستہ کیں اور اس غفور و رحیم نے مجھے کبھی مایوس نہیں کیا بلکہ توقع سے زیادہ دیا میرا بیٹا" جس کی زندگی سے ڈاکٹرز مایوس ہو چکے تھے" صحت مند حالت میں مجھے بخش دیا۔ ڈاکٹرز کہتے تھے کہ یہ بچہ ذہنی طور پر معذور رہے گا اور آج جب میرا بیٹا اسکول میں اے ون گریڈ

لاتا ہے تو بے اختیار اپنے اللہ پر پیار آتا ہے۔ اچھا باکردار شوہر، صحت مند، ذہین بچے دیے ہیں اپنے گھر اور اپنے پیارے حبیب کے روضے کا دیدار کروایا ہے۔ جس کے لیے اس کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔

15۔ بچوں کی پیدائش عورت کے لیے امتحان ہوتی ہے۔ خاص کر پہلا بچہ؟

شادی کے تین مہینے بعد مجھے ماں بننے کی نوید ملی، سب کار عمل بس نارمل سا تھا۔ کوئی جوش و خروش نہیں تھا کہ میری ساس پہلے ہی آدھا درجن پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں کھلا چکی تھیں۔ ایسی ساس دنیا میں کم یاب ہوتی ہیں جو اس حالت میں بہو کو پھلکی کا پیالہ بنا کر دیتی ہیں۔ سو ہم گھر کے کام اسی طرح کرتے رہے جیسے پہلے کرتے تھے۔ آخری مہینہ امی کے گھر گزارا تب لگا کہ ہاں ابھی میں بھی کوئی نیا کام کرنے جارہی ہوں۔ بچی کی پیدائش کے بعد واپس آئی تو وہی جھمیلے میرے منتظر رہتے۔ ساس نے اتنا تعاون کیا کہ نوکری کے پانچ گھنٹے جو ہم گھر سے باہر رہتے تھے۔ بچی کو سنبھال لیتی تھیں پہلے ہی گھر میں داخل ہوئے کہاں کی پوتی، کیسی دادی اپنی اولاد خود سنبھالو۔ دوسری بیٹی اور بیٹے کی دفعہ ڈاکٹر نے بیڈ ریسٹ بتایا جو ہم نے کرسی پر بیٹھ کر جھاڑو لگاتے کھانا پکاتے اور برتن دھوتے کیا۔ نوکری سے البتہ چھٹی کر لی تھی۔

بیٹے کی پیدائش کے کچھ گھنٹے بعد میری حالت بہت خراب ہوئی تھی اور دوبارہ آپریشن تھیٹر لے جایا گیا۔ تب پہلی دفعہ ان کو اپنے لیے جس طرح پریشان ہوتے دیکھا اس اندازہ ہوا کہ ہمارے لیے بھی صاحب کے دل میں کچھ جگہ ہے۔

16۔ آپ جوائنٹ فیملی سے اتفاق کرتی ہیں یا علیحدہ رہنا پسند ہے؟

ہمارا تو اب وہ حال ہے کہ......

اتنے مانوس صیاد سے ہو گئے ہیں
اب رہائی ملی بھی تو مرجائیں گے

اتنے سال ہو گئے ہیں۔ جوائنٹ فیملی میں رہتے ہوئے کہ اب گھر الگ ہونے کا سوچوں بھی تو گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ ایک ورکنگ وومن کے لیے جوائنٹ فیملی ہی اچھی رہتی ہے اگر تھوڑا خلوص صبر و برداشت اور درگزر سے کام لیا جائے تو آپ تھوڑی سی قربانی دے کر بہت سے مسائل سے بچ جاتے ہیں۔ نانی دادی کے ساتھ رہتے آپ کے بچے محبت اور شیئرنگ سے آشنا رہتے ہیں اور آپ بھی اطمینان سے اپنے کام پر توجہ دیتے ہیں کہ پیچھے آپ کے بچے تنہا نہیں ہیں۔ ویسے بھی اصل سے سود زیادہ پیارا ہوتا ہے آپ کے ساس سسر آپ کے ساتھ جیسے بھی رہے ہوں اپنے پوتے پوتیوں کے لیے ان کے پاس محبت کا سمندر ہوتا ہے۔ تو ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم اپنے بزرگوں کو ان کے بڑھاپے کی اس محبت سے محروم کریں یا اپنے بچوں کو پیار کے اس انوکھے رنگ سے دور کریں۔

آپ نے ماحول کو بہتر بنانے کے لیے کیا کوششیں کیں؟

میں نے اپنے گھر کے ماحول اور اپنی زندگی کو بنانے کے لیے وہ سب کیا جو میں کرسکتی تھی۔ معاشی طور پر مددگار ہونے کے لیے شوہر کا ہر طرح سے ساتھ دیا۔ گھر کے ماحول کو خوش گوار اور پرسکون رکھنے کے لیے اپنی ساس کی تنک مزاجی، بلاوجہ تنقید اور کڑوے رویے کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا۔ بچوں کے دل میں بھی دادی یا دوسرے سسرالی رشتے داروں کے لیے نفرت نہیں ڈالی۔

اللہ سے دعا کرتی ہوں ساس کے دل کو میری طرف سے نرم کر دے۔ کئی بار اپنے دل کو مار کر اور اپنی انا کو پس پشت ڈال کر سسرال والوں کی خوشی کا خیال کیا کہ......

منافقتوں کا نصاب پڑھ کر محبتوں پر کتاب لکھنا
بہت کٹھن ہے خزاں کے ماتھے پر داستان گلاب لکھنا

☆

بندھن

مصباح نوشین ہمراہ سعید کامل

شازیہ خورشید

بندھن میں اس بار ہماری مہمان معروف رائٹر اور ڈرامہ نگار مصباح نوشین ہیں ان کا سیریل "مہر پوش" حال ہی میں اختتام پذیر ہوا ہے جو بے حد پسند کیا گیا ہے۔

لکھنا، گھر داری کرنا...... سسرال کو ٹائم دینا اور سب سے بڑھ کر بچوں کی تربیت کرنا یہ سب ذمہ داریاں مصباح کس طرح پوری کرتی ہیں معلوم کرتے ہیں۔

"کیسے مزاج ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"اپنا اور پھر اپنے میاں صاحب کا فیملی بیک گراؤنڈ بتا دیں پھر "بندھن" شروع کرتے ہیں۔"

"جی...... میرا نام مصباح نوشین ہے۔ 27 اگست کو پیدا ہوئی۔ ہم چار بہن بھائی ہیں یعنی دو بہنیں اور دو بھائی اور میرا نمبر آخری ہے۔ اس لیے گھر بھر کی لاڈلی ہوں میرا تعلق ٹوبہ ٹیک سنگھ سے ہے اور میرے ابو بینکر ہیں۔ سعید کامل صاحب۔ تین بھائی اور دو بہنیں ہیں اور ان کا نمبر تیسرا ہے ان کے بعد دو بہنیں ہیں۔ میاں جی کی تعلیم بی اے ہے مگر جاب نہیں کرتے۔ زمین داری کو پسند کرتے ہیں اور اسی کا ان کو شوق ہے۔ اور الحمدللہ بہت اچھی آمدنی ہو جاتی ہے۔ یہ بھی بلوچ ہیں اور امی ابو کے دور کے کزن ہیں۔"

"ہوں، اچھا۔ سعید صاحب نے پہلی بار کہاں دیکھا تھا آپ کو۔ کیا بات پسند آئی تھی اور شادی کو کتنا عرصہ ہوا؟"

"انہوں نے پہلی بار مجھے کسی کے گھر میں دیکھا تھا۔ اس وقت میں نویں جماعت کی طالبہ تھی...... میرے بھائی سے بھی ان کی دوستی تھی...... اس لیے اس رشتے کے لیے میرے بھائی بہت بڑے سپورٹر تھے...... اور انہیں میری کیا بات پسند آئی تھی تو سچ بات تو یہ ہے کہ "یہ میں نہیں کہہ رہی میرے میاں صاحب کہتے ہیں کہ مجھے تمہاری خوب صورتی نے متاثر کیا تھا...... میں انہیں اچھی لگی تھی...... مجھے یاد ہے کہ یہ مجھ سے اکثر ایک بات کرتے ہیں کہ (یہ اس زمانے میں بہت ہینڈسم تھے۔ اب بھی ہیں مگر پہلے جیسے نہیں) میں جب تمہارے ماموں کے گھر آیا تو تم نے مجھ پر توجہ نہیں دی اور میں نے تم سے کوئی بات پوچھی تو تم نے اس کا بہت سرسری جواب دیا۔ تب انہوں نے کسی سے کہا کہ "یہ کیا لڑکی ہے اس کا ایٹی ٹیوڈ کیسا ہے کہ یہ مجھے اگنور کر رہی ہے۔ اس نے مجھے صحیح جواب نہیں دیا اور نظر اٹھا کر مجھے دیکھا تک نہیں ہے۔"

یہ بات مجھے بڑی عجیب سی لگی۔ حالانکہ مجھے یہ واقعہ بالکل بھی یاد نہیں ہے جبکہ انہیں یہ واقعہ اپنی تمام جزئیات کے ساتھ یاد ہے اور آج تک اس واقعے کو دہراتے رہتے ہیں۔

اس واقعے کے بعد ان کی بہن کی شادی ہوئی میں پہلی بار ان کے گھر گئی تھی۔ تب بھی انہوں نے مجھے دیکھا تھا۔ پھر انٹر کے بعد میری ان سے شادی ہوگئی۔ میرے بھائی جن کی ان کے ساتھ بڑی دوستی تھی وہ ہی ان کے بڑے سپورٹر تھے اور بہت تعریف کرتے تھے کہ سعید بہت اچھے ہیں...... تو بس یہ دوستی بھی کام آئی...... تو جناب میری شادی کو ماشاء اللہ 28 دسمبر 2020 میں گیارہ سال ہوگئے ہیں اور میرے دو بچے ہیں اسوہ کامل اور حذیفہ کامل۔"

"اپنے سسرال کے بارے میں بتائیں...... کیسے ہیں؟"

"میرے سسرال میں یہ سب بنیادی طور پر زمین دار ہیں۔ الحمد للہ بڑے زمیندار جس طرح ہوتے ہیں۔ اسی طرح کے یہ سب ہیں...... گاؤں کا جس طرح بڑا گھر ہوتا ہے اور جہاں پنچائیت لگتی ہے اور پنچائیت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ وہ سب کو ماننا پڑتا ہے تو میرے بڑے جیٹھ شوکت عباس اور اسد عباس ان کے پاس پنچائیت آتی ہے اور یہ فیصلے کرتے ہیں...... ان کا سیاست سے بھی تعلق ہے چونکہ گاؤں میں بڑا گھر ان ہی کا ہے تو سارے مسائل ان ہی کے گوش گزار کیے جاتے ہیں۔ اور میرے دوسرے نمبر کے جیٹھ اسد عباس ان کے انڈر پندرہ گاؤں ہیں۔ جہاں کے لوگوں کے یہ مسائل حل کرتے ہیں۔ تو اس لحاظ سے آپ کہہ سکتی ہیں کہ ہم فیوڈل اور پولیٹیکل فیملی کا ممبر ہیں۔"

"خوب صورت لڑکیوں کے امیدوار بھی بہت ہوتے ہیں تو تمہارے ساتھ کوئی مسائل تو نہیں ہوئے؟"

"میرے ماموں جن کا نام الطاف حسین ہے (لندن والے نہیں) ان کا بھی پولیٹیکل بیک گراؤنڈ ہے ان کا بھی کافی آنا جانا تھا سعید کے گھر، کافی دوستی بھی تھی۔ تو جب سعید نے مجھے دیکھا تو سب سے پہلے انہوں نے اپنی پسندیدگی کا اظہار اپنے گھر والوں سے کیا اور چونکہ ہمارا کوئی قریبی رشتہ نہیں تھا تو ان کے گھر والوں کی خواہش تھی کہ سعید کا رشتہ اپنی قریبی فیملی میں کریں۔ مگر سعید بضد تھے کہ شادی کرنی ہے تو اسی لڑکی سے۔ ان کے گھر میں کچھ لوگ اس رشتے پر راضی بھی نہیں تھے مگر انہوں نے سب کو منایا۔ ان کے گھر میں ان کے کچھ بہن بھائیوں کا خیال تھا کہ سعید کو اپنی پسند سے ہی شادی کرنی چاہیے۔ جب سب ان کی ضد کے آگے ہار گئے تو انہوں نے رشتے کے لیے سب سے پہلے میرے ماموں سے بات کی اور میرے ماموں سعید کو اتنا زیادہ پسند کرتے تھے کہ کہتے تھے کہ تمہیں ایک رشتہ نہیں دینا بلکہ اپنے خاندان کی دو لڑکیاں دینی ہیں وہ اتنا زیادہ پسند کرتے تھے سعید کو (مصباح بچت ہو گئی ورنہ......)

خیر ماموں نے امی سے پہلے اس رشتے کا ذکر کیا۔ انہوں نے بھائی سے بات کی تو بھائی نے بھی سعید کی بہت تعریف کی کہ بہت شریف ہے کوئی بری عادت نہیں ہے۔ نہ سگریٹ نہ پان اور نہ ہی فیوڈل لوگوں کی طرح کوئی اور بری عادت ہے۔ تو بس کچھ مت سوچیں اور بسم اللہ کریں۔ تو اس طرح سے رشتہ ہوا۔ اور آناً فاناً ہوا۔ دو دن پہلے رشتہ مانگا دو دن کے بعد رضامندی ہوئی اور ان کے گھر والے آ کر رسم بھی کر گئے۔ میرے ساس سسر حیات نہیں ہیں لیکن میری دو نندیں، دو جیٹھ، ان کی بیگمات اور بچے ان سب سے بہت محبت ملی۔ ظاہر ہے کہ میرے لیے نیا ماحول تھا تو سب نے مجھے بہت زیادہ سپورٹ کیا اور ابھی تک میری بہت چاہت کرتے ہیں۔"

"منگنی کتنا عرصہ رہی اور بیاہ کر شہر بدر ہوئیں یا علاقہ بدر یا ملک بدر؟"

"منگنی ایک سال رہی۔ شادی کی تاریخ دو بار فکس ہوئی۔ مگر اس ڈیٹ پر شادی نہ ہو سکی کوئی ایشو ہو گیا تھا۔ میری امی کی فرمائش کہہ لیں یا ڈیمانڈ کہ ہماری بیٹی کا الگ گھر ہونا چاہیے، تو ظاہر ہے کہ گھر بننے میں تھوڑا ٹائم لگا۔ میرے سسرال میں کسی نے ہماری اس ڈیمانڈ پر اعتراض نہیں کیا بلکہ بڑے کھلے دل سے اس بات پر رضامندی ظاہر کی۔ ویسے بیاہ کر تو میں اپنے سسرال ہی گئی تھی۔ میرے جیٹھ کا گھر کافی بڑا تھا تو ان کے گھر گئی تھی...... اور سب سے اچھی بات یہ تھی کہ میں نے چھ ماہ تک کسی کام کو ہاتھ نہیں لگایا اور ہماری بڑی بھابھی نیلوفر نے ہی چھ ماہ اپنے ساتھ رکھا اور ان ہی کے ساتھ ہمارا کھانا پینا تھا پھر چھ ماہ کے بعد میں نے اپنا کچن سیٹ کیا تھا۔"

"شادی دھوم دھام سے ہوئی تھی؟ رسمیں ہوئیں؟ تمام احوال تفصیل سے بتاؤ؟"

"میری شادی بہت دھوم دھام سے پلان کی گئی تھی جب میری ڈیٹ فکس ہوئی تو آٹھ دس دن بعد میرے جوان ماموں جن کی عمر تینتیس، چونتیس سال تھی اچانک انتقال کر گئے۔ یہ ہماری فیملی کے بہت بڑا نقصان تھا۔ ایسے میں دھوم دھام سے شادی کا تو خیر سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا البتہ خاندان کے بزرگوں نے کہا کہ جب ڈیٹ فکس ہے تو بہتر ہے کہ سادگی سے نکاح کر دیا جائے اور رخصتی بھی کر دیں کیونکہ جانے والے کب لوٹ کر آتے ہیں۔ یہ تو فرض ہے اور فرض کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں ہونی چاہیے تو سارے پلان ایک طرف رہ گئے اور میری جو خواہش تھی کہ میری شادی دھوم دھام سے ہو وہ بھی پوری نہ ہو سکی۔ بہت سادگی کے ساتھ میرا نکاح ہوا۔ سعید کے گھر والوں نے تو سعید کی مہندی کی رسم بھی کی تھی اور میرے سسرال والوں نے بھی میری مہندی کی رسم بہت ہی سادگی کے ساتھ کی۔ دوسرے دن رخصتی ہوئی 28 دسمبر کا دن تھا اور سردی بہت زیادہ

تھی۔ ویسے بھی مجھے سردی بہت لگتی ہے۔

''رخصت ہو کر جب سسرال گئی تو بہت ہی پرتپاک استقبال ہوا۔ ہمارے یہاں ایک رسم ہوتی ہے کہ جب دلہن آتی ہے تو اس کے پیروں کے نیچے یا تو پیسے رکھے جاتے ہیں یا کاٹن کی پونیاں (روئی کے گالے) بھی رکھے جاتے ہیں۔ تو وہ بھی رکھی گئی تھیں اور دہلیز پر جو تیل ڈالا جاتا ہے وہ بھی ڈالا گیا تھا۔ جب آ کر بیٹھی تو میٹھا کھلایا گیا۔ دودھ لائی کی رسم ہوئی اور گود میں ''بچہ'' بٹھانے کی بھی رسم ہوئی۔ مجھے رسمیں بہت پسند ہیں اور میں بہت انجوائے کرتی ہوں۔ سسرال میں ساری رسمیں ہوئیں۔ کمرا بھی بہت اچھا سجا ہوا تھا۔ جب یہ کمرے میں آئے تو انہوں نے مجھے دیکھتے ہی ماشاء اللہ کہا۔ بہت بہت تعریف کی۔ تعریف کرنے کے معاملے میں کافی فراخ دل ہیں اور آج کے دن تک تعریف کرتے ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ہماری محبت میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ ہم میں دوستی بہت زیادہ ہے۔ شیئرنگ بہت زیادہ ہے کیئر بہت زیادہ ہے۔ میں ان کے مزاج کے خلاف کوئی بات یا کوئی کام نہیں کرتی اور نہ ہی وہ میرے مزاج کے خلاف کوئی بات کرتے ہیں۔''

''پھر تو کبھی جھگڑا ہوا ہی نہیں ہوگا، کمپرومائز کیا کبھی؟''

''ایسا نہیں ہے۔ جھگڑے ہر گھر میں ہوتے ہیں اور ہمارا بھی جھگڑا ہوتا ہے۔ اور میری امی نے ایک بات مجھے سمجھائی تھی۔ وہ لڑکیاں جن کی ابھی شادی نہیں ہوئی ان کو بھی میں اپنی امی کے حوالے سے ایک بات سمجھانا چاہتی ہوں کہ اگر آپ کا میاں غصے میں ہے تو آپ خاموش ہو جائیں۔ سامنے سے ہٹ جائیں اور ان کو ٹھنڈا ہونے کا موقع دیں۔ تو میں ایسا ہی کرتی ہوں سب کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔

ویسے میں آپ کو بتاؤں کہ سعید کو غصہ سال چھ مہینے میں ایک بار ہی آتا اور شدید قسم کا آتا ہے۔ جبکہ

میرا غصہ تیز ہے دن میں دس بار تو آتا ہی ہوگا مگر پھر جھاگ کی طرح غصہ بیٹھ بھی جاتا ہے۔ جہاں تک کمپرومائز کی بات ہے تو دو لوگ جب شادی کرتے ہیں تو اپنی زندگی ''زیرو'' سے شروع کرتے ہیں۔ تو پھر آپ کی [illegible] بھی آتے ہیں۔ اور کمپرومائز بھی آپ کو کرنے پڑتے ہیں۔ جو کہتے ہیں کہ ہم نے کبھی کمپرومائز نہیں کیا تو وہ غلط کہتے ہیں۔ جھوٹ بولتے ہیں۔ شادی کے پانچ سال اسٹرگل کے ہوتے ہیں اس کے بعد آپ کی زندگی سیٹ ہو جاتی ہے۔

''شادی پر کھانا کم تو نہیں ہوا تھا؟ اور جہیز کی کوئی ڈیمانڈ تو نہیں کی تھی؟''

''جیسا کہ میں نے بتایا کہ شادی بہت سادگی سے ہوئی تھی اور ہم نے بارات کو کھانا نہیں دیا تھا۔ میرے سسرال والے بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ آپ رخصتی کر دیں آپ کا یہی بہت بڑا احسان ہوگا۔ ان کی طرف کھانا بنا تھا۔ اور بالکل بھی کم نہیں ہوا تھا۔ میرے سسرال والے کافی خوش خوراک لوگ ہیں تو کھانا وافر مقدار میں پکا تھا۔ رہی بات جہیز کی۔ تو ان کی طرف سے کوئی ڈیمانڈ نہیں تھی اور نہ ہی ہماری طرف سے سوائے علیحدہ گھر کے، کہ وہ ضرورت بھی

تھی تو میرے امی ابو نے مجھے علیحدہ گھر کی وجہ سے مجھے ضرورت کی ہر چیز دی تھی اور مجھے نئے گھر جا کر کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی اور میری امی نے ہر چیز ڈبل بلکہ ٹرپل دی تھی۔ جیسے دستر خوان مجھے پانچ سال خریدنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ اس کے علاوہ بے تحاشا دیگر ضروریات کا سامان۔

"سعید اچھے شوہر ہیں۔ اچھے باپ یا اچھے بھائی بیٹے؟"

"بہت اچھے شوہر ہیں، اس سے کہیں بڑھ کر اچھے باپ ہیں۔ مجھ سے زیادہ بچوں کا خیال رکھتے ہیں۔ مجھ سے تو شاید کبھی کوتاہی ہو بھی جاتی ہو گی مگر ان سے نہیں ہوتی۔ ہر رشتہ بہت اچھی طرح نبھاتے ہیں۔"

"کھانا گھر کا اور آپ کے ہاتھ کا پسند ہے یا باہر کا؟ اور آپ کی مصروفیات سے گھبراتے ہیں؟"

"کھانا انہیں ہر صورت میں میرے ہاتھ کا پکا ہوا چاہیے۔ کھانا بڑے اہتمام کے ساتھ کھاتے ہیں۔ رائتہ بھی ضرور ہو اور سلاد بھی چاہیے، چٹنی بھی چاہیے۔ پورے لوازمات کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کھانا دل لگا کر پکایا کرو۔ ہم ہمیشہ کھانا ساتھ مل کر کھاتے ہیں دستر خوان بچھا کر۔ ہم نے کبھی ایک دوسرے کے بغیر کھانا نہیں کھایا۔ ناشتہ بھی نہیں کیا کبھی ایک دوسرے کے بغیر۔ میری مصروفیات سے یعنی لکھنے کی مصروفیات سے بالکل نہیں گھبرائے۔ کبھی ماتھے پر بل نہیں ڈالا بلکہ باہر سے کھانا منگوا لیتے ہیں۔

میرے میاں صاحب ہوٹلنگ کے بھی بہت شوقین ہیں۔ جب میں ان کے ساتھ گاؤں میں رہتی تھی تب بھی یہ مجھے ہوٹلنگ بہت شوق سے کروایا کرتے تھے اور گھر کے کاموں میں بہت ہاتھ بٹاتے ہیں۔ بچے جب چھوٹے تھے تو فیڈر بھی بنا دیا کرتے تھے اور اب میری مصروفیات میں اپنے کپڑے بھی خود پریس کر لیتے ہیں۔ میرے دونوں بچوں میں سال کا فرق ہے۔ میری بیٹی اسوہ ماشاء اللہ دس سال کی ہونے والی ہے اور وہ کلاس تھری میں ہے۔ حذیفہ 9 سال کا ہونے والا ہے۔ اور کلاس ٹو میں ہے تو بالکل ہاتھ بٹاتے ہیں اور اس بات کو بھی انا کا مسئلہ نہیں بنایا کہ میں یہ نہیں کر سکتا یا وہ نہیں کر سکتا۔

"سسرال والوں کے ساتھ کبھی لڑائی ہو تو کس کا ساتھ دیتے ہیں آپ کا یا اپنے گھر والوں کا؟ مزاج کے کیسے ہیں سعید صاحب؟"

"آپ یقین کریں...... اس میں نہ بناوٹ ہے نہ جھوٹ آج تک میرا سسرال والوں سے کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ میرے سسرال والے واقعی بہت اچھے۔ انہیں میری کوئی بات بری لگتی ہے تو اگنور کرتے ہیں اور مجھے کوئی بری لگتی ہے تو میں اگنور کرتی ہوں۔ میرا بڑا اچھا ریلیشن ہے اپنی جیٹھانیوں سے۔ وہ مجھ سے بڑی ہیں اور میں ان کی بہت عزت کرتی ہوں۔ اور میں ہمیشہ ان سے یہ بات کہتی ہوں کہ میں نے آپ لوگوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

گزشتہ سال میں نے اپنی نند اور جیٹھانی کے ساتھ عمرہ بھی کیا۔ دراصل ہم ایک دوسرے کی ذاتی زندگی میں مداخلت نہیں کرتے اور سعید ہمیشہ میرا ہی ساتھ دیتے ہیں مجھے سپورٹ کرتے ہیں۔ میں بھی ہمیشہ ان کے رشتوں کی قدر کرتی ہوں۔ میرے میاں صاحب مزاجاً تھوڑے ریزرو ہیں۔ تھوڑے سے شرمیلے ہیں کسی سے جلدی گھلتے ملتے نہیں ہیں لیکن بہت اچھے مہمان نواز ہیں۔"

"بندھن مضبوط بھی ہے اور نازک بھی...... اس کو مزید مضبوط کرنے کے لیے کیا ضروری ہے؟"

"میں کہتی ہوں کہ میاں بیوی کے رشتے میں دوستی ضرور ہونی چاہیے۔ اعتماد ضرور ہونا چاہیے۔ ایک اکیلی عورت نہ گھر بنا سکتی ہے نہ بگاڑ سکتی ہے اور نہ ہی مرد۔ دونوں میاں بیوی کو گھر بنانے کے لیے قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ ایک مرد شادی سے پہلے

آزاد ہوتا ہے اور شادی کے بعد اس پر ذمہ داریاں آجاتی ہیں۔ اسے کچن چلانا ہوتا ہے۔ اسے بچے پالنے ہوتے ہیں۔ اسے بیوی کو خرچا دینا ہوتا ہے۔ فیملی کو ٹائم دینا ہوتا ہے۔ اس کے لیے بھی یہ نیا رشتہ بڑا چیلنجنگ ہوتا ہے۔

سعید نے اپنی ذمہ داریوں کو بہت اچھے طریقے سے نبھایا ہے اور نبھا رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے ایک بات کہی تھی کہ میرا نام "سعید کامل" ہے یعنی "مکمل خوشی" تو میں تمہیں ساری خوشیاں دوں گا۔ جب میری شادی ہوئی اور چونکہ اچانک ہوئی تو گھر مکمل نہیں تھا۔ تو یہ بات کسی کو نہیں معلوم میں آج آپ سے شیئر کر رہی ہوں کہ "سعید کو گھر بنانے کا بڑا شوق تھا اور جب گھر کی کوئی چیز بناتے تھے یا لے کر آتے تھے تو کہتے تھے کہ "تم میری مہمان" بن کے آؤ تو میں تمہیں چیزیں دکھاؤں......

تو مجھے یاد ہے کہ انہوں نے اور سسرال والوں نے میرے گھر میں بڑا خوب صورت وائٹ واش کروایا اور جب کام ختم ہوا تو بڑے اچھے سے ڈیکوریٹ کر کے ایک دن رات کو یہ میرا ہاتھ پکڑ کر کہتے ہیں "آؤ میں تمہیں اپنا گھر دکھاؤں۔" اور واقعی مجھے اپنا گھر دیکھ کر ایک انجانی سی خوشی ہوئی تھی اور الحمدللہ مجھے کبھی ان سے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔

"تم نے بتایا تھا کہ سعید صاحب نے کہا تھا کہ دنیا تمہیں چھوڑ جائے مگر میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ تو ایسا ہے؟"

"بالکل کہا تھا اور انہوں نے مجھے ہمیشہ سپورٹ کیا ان کے سپورٹ کی وجہ سے ہی میں اس مقام پر ہوں ورنہ سترہ اٹھارہ سال کی عمر سے لکھنے والی لڑکی شادی کے بندھن میں بندھ کر ذمہ داریوں میں گھر کر لکھنا بھول بھی سکتی تھی لیکن انہوں نے کبھی میرے لکھنے پر اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ مجھے یاد ہے کہ شادی سے پہلے میری جو کہانیاں اور ناول ڈائجسٹ میں چھپتے تھے وہ ڈائجسٹ بھی انہوں نے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے تو انہوں نے کبھی لکھنے سے منع نہیں کیا اور اگر میری تحریروں پر کسی نے تنقید بھی کی تو یہی کہتے تھے کہ تم محنت کرو۔ چھوڑ دو کہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔ تم اگر آگے بڑھنا چاہتی ہو تو اپنے کان بند کر لو۔ انہوں نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا اور دے رہے ہیں۔ ان کے بغیر تو میں کچھ بھی نہیں ہوں۔"

"کبھی ہوٹلنگ پر گئے (جب جوائنٹ فیملی میں تھیں) تو کیا سسرال میں بھی کوئی نہ کوئی ساتھ ہوتا تھا؟ پھر کیسا محسوس ہوتا تھا؟"

"جب ہم گاؤں میں تھے اور سب مل کر رہتے تھے۔ تو جب ہم ہوٹلنگ پر جاتے تھے تو کبھی اکیلے نہیں جاتے تھے۔ بلکہ میں خود کہا کرتی تھی ان کے بھتیجے بھتیجیوں کو کہ ہمارے ساتھ چلو آؤ مل کر چلتے ہیں۔ مجھے کسی کو ساتھ لے جانا کبھی بھی برا نہیں لگا۔ نندیں میری شادی شدہ تھیں۔ سب الگ گھروں میں رہتے تھے۔ بھابھیاں (جیٹھانیاں) اپنے شوہروں کے ساتھ جاتی تھیں اور ان کے بچے کبھی کبھار ہمارے ساتھ چلے جاتے تھے۔ اور مجھے تو بچوں کے ساتھ ویسے ہی فن کرنے کا مزہ آتا ہے...... ان رشتوں کے لیے اگر ہم تھوڑا سا دل بڑا کر لیں تو بڑا اچھا ہو سکتا ہے۔ زندگی مختصر سی ہے۔ نفرت کر کے کیا مل جائے گا۔"

"طلاقیں کیوں ہوتی ہیں؟"

"اس لیے کہ اب برداشت کی بہت کمی ہے۔ اب جو لڑکی بیاہ کر جاتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں خنجر ہوتا ہے۔ منہ دکھائی میں ہی وہ خنجر پیش کر دیتی ہے کہ میرا شوہر صرف میرا ہی ہے اس کے گھر والوں کو اور ان کے رشتوں کو وہ قبول نہیں کرتی۔ ذاتی طور پر جو میرا مشاہدہ ہے وہ یہ کہ لڑکی خود بدلنا نہیں چاہتی بلکہ وہ چاہتی ہے کہ اس کی خاطر باقی سب رشتے بدل جائیں تو ایسا نہیں ہوتا...... آپ دوسرے گھر جا رہی ہو۔ آپ کو ٹوٹ کے نئے سرے سے اپنے آپ کو بنانا ہے۔ جس طرح کمہار مٹی کو گوندھتا ہے پھر اس سے گھڑا

بناتا ہے۔ تو مٹی گوندھنے سے پہلے وہ مٹی کو توڑتا ہے پھر مختلف چیزیں بناتا ہے۔

اسی طرح لڑکی کا بھی فرض ہے کہ اس سانچے میں ڈھلے جس میں اس کا شوہر چاہتا ہے سسرال چاہتا ہے۔ تب ہی گھر بنتے ہیں اور تب ہی نباہ ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ جاتے ہی آپ کی ساری خواہشیں پوری ہو جائیں۔ زندگی پھولوں کی سیج نہیں ہے۔ کسی کے لیے بھی نہیں ہے۔ اور ایک اچھے اور مضبوط ریلیشن شپ میں لڑکی کو بڑا ٹائم دینا پڑتا ہے۔

آج جو ہم میاں بیوی کا پیار ہے۔ سپورٹ ہے چاہت ہے اس کے پیچھے ”دس سال“ کی ڈھیروں ڈھیر ایسی باتیں ہیں جو میں نے برداشت کیں، جو انہوں نے برداشت کیں۔ شروع شروع کے دنوں میں بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح لڑکوں کو بھی سوچنا چاہیے کہ ان کی بیوی نئے ماحول میں آئی ہے اس کو سیٹ ہونے میں ٹائم لگے گا۔ ہم ایک دوسرے کو اسپیس نہیں دیتے۔ ہمیں ہمارے حقوق کا پتا ہوتا ہے دوسروں کے حقوق کا نہیں۔ دوسروں کے فرائض کا پتا ہوتا ہے اپنے فرائض کا نہیں اور یہاں سے ہی بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔

”منہ دکھائی میں کیا ملا تھا؟“

”سونے کی انگوٹھی اور ان کو جتنی بھی سلامیاں ملی تھیں۔ وہ بھی انہوں نے مجھے ہی دے دی تھیں۔ اس طرح میرے پاس اچھے خاصے پیسے جمع ہو گئے تھے۔ اور ہنی مون پر نہیں گئی تھی کیونکہ امی کے لاڈلے بھائی کا انتقال ہوا تھا تو ہم نے مناسب نہیں سمجھا ہنی مون پر جانا۔“

”آپ مزاج کی کیسی ہیں۔ اپنے میاں کی سب سے اچھی بات کیا لگتی ہے۔ اور آپ ان کو کس روپ میں اچھی لگتی ہیں۔ سادہ یا سجی سنوری۔“

”میں تھوڑی سی شارٹ ٹمپرڈ ہوں۔ اگر میں کسی چیز کو اہمیت نہیں دیتی تو بس نہیں دیتی۔ اگر میری سوئی اٹک گئی تو پھر چھوٹی سی بات کو بھی اگنور نہیں کرتی اگر میں کہوں کہ میں موڈی ہوں تو غلط نہ ہوگا۔ اور میاں صاحب کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ کام کے سلسلے میں مجھے اگر کراچی جانا ہے یا کہیں بھی میٹنگ میں جانا ہے، جیسے لاہور یا اسلام آباد تو مجھے یہ بھیجتے ہیں۔ اس معاملے میں مجھے پوری آزادی ہے۔ مگر مجھے تھوڑا پریشان کرتے ہیں۔ فون کر کے کہ تم کہاں ہو۔ تم نے کھانا کھایا کہ نہیں۔ تم کیا کر رہی ہو۔ میٹنگ کیسی ہوئی۔ مطلب کہ بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ اور ان کو شاید اچھا نہیں لگتا کہ میں ان سے دور رہوں۔ میری دوری سے پریشان ہو جاتے ہیں مگر میرے ساتھ جاتے بھی نہیں کہ ہم دونوں کراچی، اسلام آباد یا لاہور جائیں۔ میں کہتی ہوں تو کہتے ہیں کہ میرا کیا کام ہے۔ تم جاؤ تمہارا کام ہے۔ تم اپنی دوستوں کے ساتھ انجوائے کرو اور آپ کے سوال کا آخری حصہ کہ میں میاں صاحب کو سجی سنوری ہی اچھی لگتی ہوں۔

سادگی میں بھی اچھی لگتی ہوں۔ لیکن سچ بات تو یہ ہے کہ مجھے خود بھی بجنا سنورنا اچھا لگتا ہے۔ میں اپنا بہت خیال رکھتی ہوں۔ مجھے نہیں یاد کہ میں بنا کاجل یا لپ اسٹک کے گھر سے نکلی ہوں۔ اور اگر کبھی نہ بنوں سنوروں تو پھر اس بات کو بہت نوٹ کرتے ہیں۔ اگر کبھی کچھ الٹا سیدھا پہن لوں تو فوراً کہیں گے۔ یہ تم نے کیا پہن لیا۔ یہ تم پر سوٹ نہیں کر رہا۔ پھر اسٹائل بتاتے رہتے ہیں کہ تم کس اسٹائل میں اچھی لگتی ہوں۔ کھلے بال ہوں یا کلرڈ بال ہوں وغیرہ وغیرہ۔ یہ میری تعریف بھی بہت کرتے ہیں۔

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے مصباح نوشین سے اجازت چاہی اس دعا کے ساتھ کہ یہ ہمیشہ اس طرح خوش و خرم اور آئیڈیل زندگی گزارتی رہیں۔

(آمین)

☆

لیجنڈری فنکارہ

بدر خلیل سے ملاقات

شاہین رشید

بدر خلیل صاحبہ کینیڈا میں قیام پذیر ہیں۔ فیلڈ کو خیرباد کیے ہوئے تقریباً چار سال ہو گئے ہیں وہاں ان کے دن رات کیسے گزر رہے ہیں۔ فیلڈ کو کیوں خیرباد کہا۔ یہ سب جانیں گے ان سے بات چیت کر کے۔

اپنے کیریئر کے آغاز میں میری ان سے کافی ملاقاتیں رہیں۔ کبھی گھر میں تو کبھی ان کے بوتیک میں...... بہت پیار محبت اور خلوص سے ملتی تھیں۔ پھر مصروفیات آڑے آئیں تو ملاقات کا دورانیہ کم ہوتا چلا گیا...... اور اب گزشتہ چھ سات سال سے تو بالکل ہی رابطہ ختم ہو گیا...... نمبر میرے پاس تھا نہیں اور شاید لوگ بھی بھول چکے تھے کسی سے نمبر نہ ملا۔ سب نے یہی کہا کہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ شکریہ عظمیٰ رزاق کا (سابق کونٹینٹ ہیڈ آف ایوریڈی) جنہوں نے ہمیں بدر خلیل صاحبہ کا نمبر دیا۔

"السلام علیکم بدر خلیل صاحبہ......! کیسے مزاج ہیں اور آپ نے مجھے پہچانا؟" میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"وعلیکم السلام...... اور بالکل پہچان لیا ہے کیسی ہو تم...... اور میں بھی ٹھیک ہوں...... بس تھوڑی بیمار ہوں۔ ٹانگوں میں درد رہتا ہے۔ میری کمر کی ہڈی میں کچھ پرابلم رہتا ہے۔ لیکن اللہ کا شکر ہے ٹھیک ہوں۔ چلتی پھرتی رہتی ہوں...... اور فٹ ہوں۔"

"اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ فٹ رکھے...... بس ایک چھوٹا سا انٹرویو کرنا چاہتی ہوں؟"

"میں تو تین سال سے ریٹائرڈ زندگی گزار رہی ہوں۔ مجھے تو ٹی وی سے، اس فیلڈ سے، اداکاری سے نفرت ہو گئی تھی۔ سینئرز کے لیے تو کوئی اچھا کردار ہی نہیں ہوتا تھا۔ بھئی اگر دادی، پھوپھی کا بھی کوئی کردار لکھنا ہے تو ڈھنگ کا تو لکھو...... یہ کیا کہ "بیٹا! پانی پلا دے، بیٹا کھانا کھلا دے" یہ کر دے وہ کر دے...... اس کے علاوہ کوئی لائنیں ہی نہیں ہوتی تھیں...... تو میں تنگ آ گئی تھی...... اور فیلڈ کو خیرباد کہہ کر یہاں اپنے بیٹے ابراہیم اور عمر کے پاس آ گئی۔ ایک بیٹا دبئی میں ہے کبھی اس کے پاس تو کبھی اس کے پاس...... ایک آدھ ماہ پاکستان میں بھی رہ کر آئی تھی مگر اب مستقل کینیڈا میں ہوں۔ تو کیا انٹرویو کرو گی۔ رہنے دو......"

"آپ نے پہلے تو کبھی مجھے انکار نہیں کیا۔ اب ایسا کیوں؟"

"اچھا چلو پھر سوالات بھیج دو...... ابھی تو یہاں رات ہے۔"

"چلیں ٹھیک ہے میں آپ سے صبح بات کروں

گی۔ اور پھر دوسری صبح بات چیت ہوئی، میرا پہلا سوال تھا۔

"دن رات کیسے گزر رہے ہیں...... اور کیا معروفیات ہیں آپ کی، بچوں کے بارے میں اور بہوؤں کے بارے میں بھی بتائیں؟"

"میں بہت دنوں بعد انٹرویو دے رہی ہوں پیارے پاکستانیوں کے لیے اور پاکستان کے مقبول ڈائجسٹ کے لیے...... شاہین بہت اچھی ہیں انہوں نے مجھے یاد کیا تو میں کیسے انکار کرسکتی تھی...... ورنہ میں دیتی نہیں ہوں۔ اس کے پیار کی وجہ سے انٹرویو دے رہی ہوں۔ (شکریہ بدر خلیل صاحبہ)...... چار سال ہے میں اس فیلڈ سے آؤٹ ہوں۔ اور میں سمجھتی تھی کہ لوگ مجھے بھول گئے ہوں گے...... مگر ایسا نہیں ہے آج کل میری کوئی معروفیت نہیں ہے۔ میں آرام کر رہی ہوں۔ میں نے زندگی بھر بہت کام کیا ہے۔ اپنی زندگی کے پچاس سال میں نے اس فیلڈ کو دیے...... اس میں پرائیویٹ چینلز کے کام بھی شامل ہیں ہر طرح کے رول کیے، آپ کو بتاؤں کہ ایک وقت تو ایسا تھا کہ ایک ساتھ چار سے پانچ سیریل کر رہی ہوتی تھی۔ ایک سیٹ سے دوسرے سیٹ اور دوسرے سے تیسرے سیٹ...... کام کرنا میری ضرورت اور مجبوری تھی کہ خلیل (شہزاد خلیل معروف پروڈیوسر، ڈائریکٹر) کے بعد میں اکیلی تھی دو بیٹوں کا ساتھ تھا میں بہت خوددار تھی حالانکہ میری فیملی میرے ساتھ تھی۔ میرے سسرال والے بھی بہت اچھے تھے مگر میں کسی کے اوپر بوجھ نہیں بننا چاہتی تھی نہ ہی ہاتھ پھیلانا چاہتی تھی...... میں نے یہی سوچا کہ خود کماؤں گی اور اپنے بچوں کی پرورش خود کروں گی...... اور اللہ نے میرا ساتھ دیا۔ خوب محنت کی پھر بچوں کی شادیاں کیں اور فرائض سے سبکدوشی کے بعد میں اتنی تھک گئی تھی کہ میرے جسم کا رواں رواں دکھنے لگا تھا۔

خیر تم نے معروفیت کا پوچھا ہے تو معروفیت کچھ یوں ہے کہ یہاں میں اپنے بڑے بیٹے ابراہیم خلیل کے پاس رہتی ہوں میری دو پوتیاں ہیں اور ایک پوتا ہے۔ بڑے پوتے کا نام شازل ابراہیم ہے جو انیس سال کا ہے پھر پوتی ہے مریشا ابراہیم جو کہ پندرہ سولہ سال کی ہے اور اس کے بعد فاہا ابراہیم ہے جس کی عمر تقریباً چھ سال ہے۔ سب سے چھوٹی پوتی سے میری بہت دوستی ہے...... اور بچے چونکہ یہاں کی پیداوار ہیں تو تھوڑے سے مودی ہیں جب دادو۔ پیار آتا ہے تو میرے پاس آجاتے ہیں...... مگر چھوٹی تو میرے ہی ساتھ رہتی ہے...... تو بس سارا دن آرام ہی کرتی ہوں کہ میرا بیٹا کہتا ہے کہ...... امی! آپ نے ساری زندگی بہت کام کیا ہے اب آپ نے آرام کرنا ہے۔

"میری بڑی بہو کا نام صدف ہے اور وہ جاب کرتی ہے اور ماشاءاللہ اس کی جاب بہت اچھی ہے۔ گھریلو لڑکی ہے۔ گھرداری بھی کرتی ہے، بچوں کا بہت خیال رکھتی ہے اسکول چھوڑنا، لانا سب انہی کی ذمہ داری ہے۔ بڑے بیٹے کی جاب بھی بہت اچھی ہے اور میرا چھوٹا بیٹا "عمر خلیل" دبئی میں رہتا ہے اور تقریباً چار سال بچوں کے پاس رہنے کی روٹین کچھ یوں تھی کہ چھ ماہ میں ابراہیم کے پاس رہتی تھی اور چھ ماہ عمر کے پاس دبئی میں رہتی تھی...... لیکن اب مجھ میں ہمت نہیں ہے کہ میں جہاز کا سفر کروں اس لیے اب میں مستقل طور پر یہاں کینیڈا میں ہی رہتی ہوں۔ مجھے یہاں کی شہریت بھی مل گئی ہے۔

دوسری بہو کا نام "عظمیٰ عمر" ہے اس کی بیٹی کا نام "ارمانی خلیل" ہے عمر بیٹی کے نام کے ساتھ اس کے دادا کا نام لکھتا ہے۔ عمر کی جاب بھی بہت اچھی ہے اور میری بہو عظمیٰ بھی بہت قابل ہے۔ وہ بھی جاب کرتی ہے۔ میری خواہش ہے کہ میرے دونوں بیٹے ایک ہی جگہ پر ہوں تاکہ مجھے سفر نہ کرنا پڑے۔ تو بس معروفیات یہی ہیں کہ صبح اٹھی ناشتہ کیا۔ پوتے پوتیاں جب اسکول سے آجاتے ہیں تو ان کے ساتھ اچھا وقت گزر جاتا ہے۔ کام میں کرتی نہیں کہ میری

بہو مجھے کوئی گھر کا کام نہیں کرنے دیتی کہ بس آپ آرام کریں۔
جب وہ جاب پر جاتی ہے تو میرے لیے کچھ نہ کچھ بہت اچھا کھانا پکا کر جاتی ہے۔ یہاں کے لوگ بہت کام کرتے ہیں۔ میاں بیوی جاب بھی کرتے ہیں اور گھر داری بھی۔"
"تو جناب ریٹائرڈ زندگی کے مزے آرہے ہیں؟"
"جی بالکل...... ریٹائرڈ زندگی بہت اچھی ہوتی ہے۔ بہت اطمینان ہوتا ہے۔ جب انسان ساری زندگی کام کرنے کے بعد ریٹائر ہوتا ہے اور آرام کرتا ہے۔ اپنے بچوں کے ساتھ اپنی بہوؤں کے ساتھ، اپنے پوتے پوتیوں کے ساتھ اور بہت سکون ہوتا ہے سوچ کر کہ ہم نے بھی اپنے دور میں بہت محنت کی تھی۔ میں بہت خوش قسمت ہوں کہ اللہ نے مجھے اتنی عمر دی ہے کہ میں اپنے بچوں کے درمیان ہوں اور آج شکیل بھی ہمارے ساتھ ہوتے تب تو اس زندگی کے اور ریٹائرڈ لائف کے مزے ہی کچھ اور ہوتے۔ دونوں بچے میری بہت قدر کرتے ہیں۔ پیار کرتے ہیں۔ اگر میں اس عمر میں کام کر رہی ہوتی تو یقیناً چڑچڑی ہو جاتی۔"
"اپنے ہاتھ کی کمائی کی عادت ہو جائے تو پھر بندہ بے کار نہیں بیٹھ سکتا...... ایسا ہی ہے نا......؟"
"نہیں، نہیں میں بہت سکون میں ہوں، بہت کمایا ہے میں نے۔ میں تو پہلے بھی بہت گھریلو تھی۔ بس پہلے شوقیہ اور پھر ضرورتاً کام کیا۔ یہاں مجھے کام کی، ہوسٹنگ کی بہت آفرز آتی ہیں مگر اب میرا دل نہیں چاہتا اور پھر میرے بچے مجھے کام کرنے نہیں دیتے۔
"پاکستان یاد آتا ہے آپ کو......؟"
"بہت...... پاکستان، پاکستان ہے اور جو سہولتیں پاکستان میں ہیں وہ کہیں بھی نہیں ہیں۔ اور ہمیں عادت ہے ان سہولتوں کی...... یہاں نوکر نہیں

ہوتے سارے کام خود کرنے پڑتے ہیں...... حتیٰ کہ گھر میں کوئی فرنیچر لاؤ تو اسے بھی خود بنانا ہوتا ہے ...... کوئی چیز خراب ہو تو خود ہی ٹھیک کرنی پڑتی ہے کہ لیبر بہت مہنگی ہے۔ بے شک اچھی بات ہے سارے کام خود کرنے چاہئیں۔ مگر پھر بھی تھوڑا آرام کرنے کے لیے نوکر ہونا چاہیے اور ہم پاکستانیوں اور بھارتیوں کو ویسے بھی عادت ہے نوکر چاکر کی...... یہاں کی زندگی بڑی ٹف ہے تو بس پاکستان کی تو کیا ہی بات ہے۔ وہاں میرے بہت اچھے دوست ہیں روبینہ اشرف ہے، بشریٰ انصاری ہے، بہروز سبزواری ہے شکیل ہے۔ حمیرا اطہر ہے یہ سب مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں اور مجھے فون کرتے رہتے ہیں وہاں کے تو مجھے سارے راستے آتے ہیں۔ جبکہ یہاں کینیڈا کے تو مجھے راستے ہی نہیں آتے ...... اگرچہ کینیڈا بہت خوب صورت ہے...... مگر پاکستان سے پھر بھی مقابلہ نہیں، اپنے وطن کا کسی سے کوئی مقابلہ نہیں ہے۔"
"پاکستان تو یاد آتا ہے، پاکستان کے ڈراموں کے بارے میں کچھ بتائیں اور لوگ کہتے ہیں کہ ڈائجسٹ کی رائٹرز زیادہ آگئی ہیں تو معیار خراب ہوا

ہے؟"

"ڈراما کرنے کو اور ڈراما دیکھنے کو میرا بالکل بھی دل نہیں کرتا کہ ڈراما کیا سے کیا ہو گیا ہے...... اور جہاں تک خواتین رائٹرز کی بات ہے تو ساری زندگی خواتین رائٹرز نے ہی زیادہ لکھا ہے اور میں نے ان ہی کے ڈراموں میں کام بھی کیا ہے، بہت اچھے اور معیاری ڈرامے لکھے ہیں، صرف ساس بہو کی کہانیاں نہیں ہوتی تھیں بلکہ ہر عمر کے لوگوں کی کہانیاں ہوتی تھیں...... ہر موضوع پر ڈرامے لکھے جاتے تھے۔

اب تو ایک لڑکے کے ساتھ دو لڑکیاں پھنسی ہوتی ہیں ایک جل رہی ہے تو ایک پیار کر رہی ہے۔ ایک دوسرے سے جلن، حسد، لڑائی، جھگڑے بس یہی نظر آ رہا ہے۔ پہلے اگر پانچ ڈرامے برے ہوتے تو پانچ اچھے بھی ہوتے تھے، مگر اب تو اچھے ہوتے ہی نہیں ہیں۔

جب شروع شروع میں یہاں آئی تو ایک آدھ ڈراما اچھا بھی لگا۔ اسٹار بھی اچھے لگے مگر اب تو معیار بہت ہی خراب ہو گیا ہے، بہت ہی خراب ڈرامے بن رہے ہیں۔ شکر ہے کہ میں یہاں آ گئی اب تو ایک دن میں لڑکیاں مشہور ہو جاتی ہیں تو انہیں سیکھنے کا شوق بھی نہیں ہوتا...... کیونکہ انہیں ایک کے بعد ایک ڈراما مل رہا ہوتا ہے...... سپاٹ چہرے ہوتے ہیں...... کوئی ایکسپریشن نہیں ہوتے، نہ ٹھیک چلنا آتا ہے نہ بات کرنا...... نہ سین کے حساب سے موو کرنا آتا ہے۔ بس پیسہ مل رہا ہے اور وہ کیے چلی جا رہی ہیں۔ بس دو تین ڈائریکٹر ہیں جو اچھے ہیں اور ڈرامے کے تمام تقاضوں کا خیال رکھتے ہیں...... باقی تو پروا بھی نہیں کرتے...... بس لڑکی کے پیچھے کیمرہ لگا رہتا ہے...... صرف گلیمر ہی گلیمر ہے۔ یہاں کے لوگ اکثر کہتے ہیں کہ آپ کے پاکستانی ڈرامے بہت اچھے ہوتے ہیں تو میں کہتی ہوں کہ اب وہ معیار نہیں رہا تو کہتے ہیں کہ چونکہ آپ نے بہت اچھے ڈرامے کیے ہیں اس لیے آپ کو پاکستان کے آج کل کے ڈرامے پسند نہیں آتے۔ 1980 کی دہائی سے لے کر 2000 تک کے ڈرامے واقعی بہترین تھے۔ ڈائجسٹ کی رائٹرز بہترین ہوتی ہیں۔ ان سے
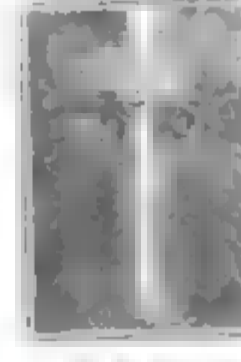
زیادہ لکھوائیں...... ہمارے وقت میں حسینہ معین، بجیا، بانو قدسیہ اور اس زمانے کی ناول نگار سب خواتین ہی تو تھیں۔ آج کل کی رائٹرز خواتین کو کہوں گی کہ ایسا اچھا لکھیں کہ ہمارا ڈرامہ پھر سے مقبول ہو جائے، پتھر کے بت کی طرح ڈائیلاگ بولتے دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے...... میک اپ تھوپا ہوا ہوتا ہے۔ ہال اسٹریٹ کیے ہوتے ہیں۔ کوئی مر رہا تو میک اپ...... سونے کا سین ہے تو میک اپ، نیچرل اداکاری تو ختم ہی ہو گئی ہے آج کل کے فنکار بدصورت نہیں لگنا چاہتے اس لیے کردار نگاری سے زیادہ میک اپ اور گلیمر پر زور ہے۔"

"اپنی زندگی کا احاطہ کریں تو کیا کھویا کیا پایا؟"

"کیا "کھویا" میں نے اپنا میاں کھویا، ماں باپ کھوئے، تین بیٹے پہلے بہن کھوئی پھر پاکستان کھویا باقی میری کوئی بڑی بڑی خواہشیں نہیں تھیں جو پایا ہے۔ وہ دونوں بچوں کو، اپنی بہوؤں کو اپنے پوتے پوتیوں کو اور اپنے دوستوں کو جن میں تم بھی شامل ہو کر تم نے مجھے یاد رکھا اور مجھے یاد ہے کہ شاید سب سے پہلا انٹرویو میں نے تمہارے ڈائجسٹ (خواتین ڈائجسٹ) کو دیا تھا اور اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ عزت پائی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ جوانی میں کام شروع کیا اور پھر جب جوانی میں "بیوہ" ہوئی تو کوئی اسکینڈل نہیں بنا ہمیشہ اپنی عزت کی حفاظت کی اس لیے کسی نے بری نظر سے نہیں دیکھا پیسے سے زیادہ عزت کمائی ہے اور اس لیے میں ہر وقت اپنے رب کا شکر ادا کرتی رہتی ہوں اور مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں ہے اور جن سے گلہ تھا، ان کو میں نے معاف کر دیا ہے اور سب سے معافی بھی مانگ لی اور میری زندگی لاکھوں کروڑوں لوگوں سے زیادہ اچھی گزری ہے۔"

"آپ شہر میں رہتی ہیں کیسا ہے وہ علاقہ یا آپ کا شہر؟"

"بہت خوب صورت جگہ ہے یہاں کا موسم بہت اچھا ہے اور اتنا خوب صورت ہے کہ تم یہاں بیٹھ کر لکھو تو تمہیں لکھنے کا بھی مزہ آ جائے۔ یہ شہر پہاڑی علاقے میں ہے اور بہت پیارا بہت خوب صورت ہے شہر میں ٹورنٹو میں نہیں رہتی کیونکہ وہ بہت رش والا شہر ہے بالکل کراچی کی طرح ہے اور پاکستانی، انڈین بہت ہیں۔"

"بہت شکریہ بدر خلیل صاحبہ...... اور کچھ کہنا چاہیں گی آپ؟"

"بس یہی کہوں گی کہ زندگی بہت اچھی گزر رہی ہے اللہ میاں آگے بھی اچھی گزار دے اور زندگی میں کبھی کسی کا محتاج نہ کرے۔ چلتے پھرتے اللہ میاں سارے کام آسان کرے بس بستر پہ نہ لیٹوں۔"

"اللہ آپ کو بہت لمبی زندگی دے۔ صحت و تندرستی کے ساتھ سلامت رہیں...... (آمین)"

شعاع کے سنگ ساتھ

ادارہ

اسماء عبدالرحمن ۔ چکوال

س۔ شعاع کے ساتھ وابستگی؟

بہت بچپن سے، مجھے یاد ہے ابو نے کچھ نہ کچھ پڑھنے کی عادت ڈال دی یہ اور بات کہ وہ اس بات کو کبھی بھی تسلیم نہیں کریں گے۔ مگر مجھے یقین کہ ابو ہی سے یہ عادت مجھ میں آئی ہے۔ شعاع سے بہت برس پہلے سے تعارف تھا یعنی چھٹی یا ساتویں میں تھی تو پھپھو کے گھر سے چھپا کر ساتھ لے آتی کیونکہ اس وقت اجازت نہیں تھی۔ مگر 2016ء کے مارچ سے باقاعدہ لینا شروع کیا اور میرے پاس تمام رسائل کسی قیمتی متاع کی طرح رکھے ہیں۔ اکثر ابو لا دیتے ہیں۔ دلچسپ واقعہ تو کوئی نہیں مگر مجھے یاد ہے پہلے میں جنون کی حد تک پڑھتی تھی یعنی اگر ایک بار رسالہ شروع کر دیا ہے تو پھر چاہے دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے یا رضائی میں لائٹ رکھنا پڑے تو بھی وہ کہانی ختم ہو کر رہے گی۔"

س۔ صبح سے شام تک کے کام؟

"دن کا آغاز نماز کے ساتھ ہو جاتا ہے پہلے تو نماز کے بعد سو جاتی تھی مگر اب نہیں سوتی۔ بہت زیادہ کام تو نہیں کرتی مگر ہیں ضروری کچھ کام جو صرف مجھے ہی کرنے ہیں۔ یعنی صفائی تو میں نے ہی کرنی ہے۔ دودھ بوائل کرنا، شام کی چائے، برتن دھونا اور زیادہ تر کوکنگ کرنا۔ کتابیں میرے ساتھ ساتھ ہوتی ہیں کیونکہ کورونا کی وجہ سے میرے پیپر (بی اے) کے ابھی تک نہیں ہوئے۔ گھر کی ذمہ داری اس وقت مجھ پر ہوتی ہے جب امی گھر پر نہ ہوں کیونکہ بھائیوں کی اکلوتی اور بڑی بہن ہوں، چاروں بھائیوں کو دیکھنا اور گھر کو بھی تو میں گھن چکر بن جاتی ہوں۔ مطالعے کے لیے میں دوپہر میں وقت نکالتی ہوں۔ وقت نہیں ملتا تھا تو کھانے کے دوران پڑھتی تھی۔ ابو کو میری یہ عادت سخت ناپسند ہے کہ پڑھتی ہوں تو پھر پڑھے ہی جاتی ہوں۔

س: شعاع کی وہ تحریریں جو خوب صورت یاد بن کے دل پر نقش ہو گئیں؟

بے شمار تحریریں ہیں جو نہ صرف لفظوں کی خوب صورت مالا جیسی ہیں بلکہ دل پر واقعی نقش ہو گئیں ہیں۔ کچھ لفظ کچھ جملے ایسے ہوتے ہیں جو دل پر ٹھہر جاتے ہیں۔ مدتوں یاد رہتے ہیں۔ اور شعاع خوش قسمت ہے کہ وقت نے اسے ایسے لوگ دان کیے ہیں۔ جن کی تحریریں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتی ہیں۔ عمیرا احمد، نمرہ احمد اور فرزانہ کھرل کی بے انتہا تحریریں۔ بہت سی تحریریں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کو پڑھ کر دل الجھ سا جاتا ہے۔ مصحف پڑھتے ہوئے دل ضرور الجھا کہ فرشتے جیسی بندی ایسی کیسے ہو سکتی یا وہ ایسا کیسے کر سکتی ہے۔ بہت مشکل ہوتا ہے کہ کوئی کردار آپ کو اپنے جیسا لگے اور پھر یہ بھی لکھاری کا کمال ہوتا ہے کہ وہ ایسا کردار رقم کرے جو عام لوگوں جیسا ہو تو مجھے "محبت جنوری جیسی" فرزانہ کھرل کی مشعل میں اپنا آپ نظر آیا۔ میں بھی اتنی آسانی سے اپنی چیزوں سے دست بردار ہو جاتی ہوں۔ یا پھر فرزانہ کھرل کی رامین حیات کی جگہ اگر میں بھی ہوتی تو میں بھی یہی کرتی۔ کسی بھی لڑکی کو پستی میں گرنے سے پہلے باپ کے اس پہلے بوسے کو یاد کرنا چاہیے جو اس کی آمد پر خوشی سے اس کی پیشانی پر دیا گیا تھا۔ کسی بھی محبت میں اتنی طاقت نہیں ہونی چاہیے کہ وہ ایک بیٹی کو گمراہ کرنے سے پہلے اس کی ماں کا راتوں میں

بقیہ صفحہ نمبر 255 پر

تنزیلہ ریاض

نور القلوب ایک ایسا ادارہ جہاں صندل بی لوگوں کے لیے دعا کرتی تھیں، لوگ اپنے مسائل لے کر ان کے پاس آتے تھے۔ وہ انتہائی خوب صورت خاتون تھیں۔
بٹ گرام میں بنی بری حویلی میں وہ اپنے باپ اور گلے جو اس کی سوتیلی ماں تھی سے ملنے چھٹیوں میں آتا ہے۔ گلے اس کی خالہ تھی جو اس کی ماں کے مرنے کے بعد انتہائی کم عمری میں اس کے باپ سے بیاہی گئی تھی۔
خوشل اپنے باپ کی نسبت گلے سے زیادہ قریب تھا۔
داؤد یہ وکن فیملی کا بچہ تھا جو انتہائی موٹا تھا اس کے وزن کی وجہ سے سب اسے تنقید کا نشانہ بناتے تھے۔ وہ پڑھائی میں بھی اچھا تھا۔ نانی کے مرنے کے بعد اس کی ماں نے اپنا ٹرانسفر دبئی کروالیا تھا وہ بینک میں ملازمت کرتی تھیں۔
گلے کی اداسی دیکھ کر اسے لگا اس کا باپ شادی کر رہا ہے۔ وہ ان سے سخت ناراض تھا۔
اس کا دوست اسے بتاتا ہے کہ لاریب نے خودکشی کرلی ہے۔ وہ حیران ہو جاتا ہے۔
آدھی رات کو بری حویلی میں گھر چڑھن کر وہ باہر نکلتا ہے تو اپنے باپ کے ساتھ لاریب کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔
خوشل لاریب کو اپنے گھر میں دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ وہ ارباب کو فون کرتا ہے لیکن وہ ریسیو نہیں کرتا۔
رفیق کے صاحب اس سے کہتے ہیں کہ لاریب کی تمام تصاویر ان کے گھر سے ہٹادی جائیں ان کے گھر میں لاریب کا چیپٹر بند ہو جاتا ہے۔

مہر افروز ان کے گروپ میں شامل ہو جاتی ہے داؤد کو لگتا ہے کہ وہ ان کے گروپ کی لڑکیوں میں سب سے خوب صورت ہے۔ فرمان کی اس سے نہیں بنتی۔

خوشل گلے سے کہتا ہے کہ لاریب کو فوراً واپس بھیجو، اسے لگتا ہے کہ وہ اسی چوٹی پر بیٹھا ہے جہاں سے لاریب نے اسے دھکا دیا تھا۔

خان بابا خوشل خان کو بتاتے ہیں کہ اس کا نکاح لاریب سے ہو رہا ہے۔

خوشل کو یاد آتا ہے کہ لاریب ڈر گئی ہے، وہ غصے میں جب لاریب کے پاس آتا ہے تو منہ دکھائی میں سگریٹ دیتا ہے جسے دیکھ کر لاریب کی آنکھوں میں چمک آجاتی ہے۔

خوشل ہاسپٹل پہنچا تو ارباب اس کا رویہ دیکھ کر اسے تنگ کرتا ہے۔ آخر میں کہتا ہے کہ جب تک خوشل اسے بتائے گا نہیں اسے کیسے پتا چلے گا۔ خوشل رونے لگتا ہے اور پھر لاریب سے نکاح کا بتاتا ہے۔

مہر افروز، داؤد پر حاوی ہو جاتی ہے۔ داؤد کی ممی اس سے چڑنے لگتی ہے۔ وہ اس کے کہنے پر لندن چلا جاتا ہے۔ ممی اسے جرمنی بھیجنا چاہتی ہیں۔

مہر اس سلسلے میں داؤد کو مطمئن کر دیتی ہے اور اس کی ممی کو بھی قائل کر لیتی ہے۔

ناشتے پر گلے اچھا جا نہیں آتی ہیں۔ خان بابا بیوی کا مزاج سمجھتے ہیں، وہ اسے مناتے ہیں۔

زہرہ کو بڑی حویلی والوں میں دلچسپی ہے۔ تائی شاہدہ اسے سمجھاتی ہیں۔

خان بابا لاریب کے خاندان سے اپنے تعلق کے بارے میں گلے کو بتاتے ہیں کہ کسی طرح خان بابا یعنی حبیب اللہ اس گھر میں پہنچے ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ آج وہ جو کچھ ہیں ان کی ہی وجہ سے ہے۔

شیریں اور داؤد کی شادی طے ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی شادی کو لے کر بہت پرجوش ہے۔ داؤد کی امی چڑتی ہیں۔ داؤد اس سے اسکائپ پر بات کر رہا تھا کہ وہ بے ہوش ہو کر گر جاتی ہے۔

پانچویں قسط

''ٹرن ٹرن ٹرن۔'' الارم کی پہلی آواز کمرے میں گونجی تھی۔ وہ جیسے بے ہوشی سے جاگیں۔ الارم کی آواز ابھی کمرے میں گونج کر پھیلی بھی نہیں تھی کہ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اسے بند کر دیا۔

یہ الارم بس احتیاطاً ہی لگا رکھا تھا ورنہ مسلسل تہجد کے لیے اٹھتے رہنے کے باعث اب انہیں اس کی عادت نہ رہی تھی۔ تہجد سے پہلے ہی خود بخود ان کی آنکھ کھل جایا کرتی تھی لیکن آج تو بات ہی کچھ اور تھی۔ وہ بیدار ہو کر بھی بیدار نہیں ہو پا رہی تھیں۔ رات بھر ٹھیک سے نیند نہیں آسکی تھی۔ کروٹیں بدلتے بدلتے اٹھنے کا وقت ہو گیا تھا اور وجود تھا کہ بستر چھوڑنے میں تکلیف محسوس کر رہا تھا۔

ایسی بیزار کن رات اور بے آرام نیند ان کے اعصاب کے لیے بہت تکلیف دہ ثابت ہوتی تھی جس کی وجہ سے ان کا سر بھاری رہتا تھا اور آنکھیں تھکی ہوئی نظر آتی تھیں۔ وہ اپنی ظاہری شخصیت کے لیے محتاط نہیں تھیں۔ آنکھوں کے حلقے یا چہرے کی جھریاں انہیں پریشان نہیں کرتی تھیں مگر ایسی راتیں جن میں ان کا ماضی چکر بن کر ان کے ذہن میں چنگھاڑتا رہتا تھا ان کو تھکا دیتا تھا۔

ان کا ذہن سویا سویا رہتا تھا اور وہ اپنے مقصد سے ہٹنے لگتی تھیں۔ یہ انہیں منظور نہیں تھا۔ پریشان کن بات یہ تھی کہ ایسی راتیں اب کثرت سے ان کی زندگی میں ظہور پذیر ہونے لگی تھیں۔

وہ بہت ہمت کر کے بستر سے نکلی تھیں حالانکہ نصف رات تک ہیٹر چلتے رہنے کے باعث کمرہ روزانہ کی طرح گرم تھا۔ وضو کے لیے گرم پانی موجود تھا لیکن دل عبادت کے لیے بھی راضی نہیں تھا۔ انہیں اپنے آپ پر

غصہ آیا۔
ہر خیال ذہن سے جھٹک کر انہوں نے بہت دل کے ساتھ تہجد ادا کی تھی مگر وہ لطف نصیب نہیں ہو پایا تھا جو وہ عبادت سے لینے کی عادی تھیں۔ انہوں نے بہت تھک کر اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔
"یا اللہ! میں نے تیری رضا کی خاطر سب کو معاف کر دیا اور ہر وہ رشتہ جو دین کے رستے پر چلنے میں باعث رکاوٹ تھا، میں نے ہر اس رشتے کو دل سے نکال دیا۔ حتیٰ کہ اپنی اولاد کو بھی۔ جب میں سب کو اپنی زندگی سے نکال چکی ہوں۔ تو ان کو بھی توفیق دے کہ وہ مجھے اپنی زندگیوں سے نکال کر مطمئن ہو جائیں۔ مجھے یاد کر یں نہ یاد آئیں۔ میں سب کو معاف کر چکی ہوں۔ تیری رضا کے لیے۔ مجھے اب کسی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ کسی سے بھی نہیں۔ میں تیری خاطر سب کو چھوڑ کر اب خوش ہوں۔"
وہ بظاہر دعا مانگ رہی تھیں مگر دعا میں بھی اکثر اوقات پرانی یادیں ارتکاز کو منتشر کرنے چلی آتی ہیں۔
☆☆☆
داؤد کو رابطہ منقطع ہونے سے بھی پہلے احساس ہو گیا تھا کہ دوسری جانب حالات تسلی بخش نہیں ہیں۔ اس نے فوراً شیریں کی ممی کو کال کی تھی۔ شیریں اس وقت تک ہوش و حواس سے بیگانہ نہیں تھی لیکن اس کی حالت نارمل بھی نہیں تھی۔ وہ بولنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کی کہی ہوئی بات کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، صورت حال بے حد عجیب تھی ذرا سی دیر میں اس کے ڈیڈی اور بھائی بھی آ گئے تھے۔ تب تک وہ بالکل ہوش کھو چکی تھی۔
☆☆☆
اس کی بے ہوشی آٹھ گھنٹے پر محیط رہی تھی۔
"ممی؟" وہ کراہنے والے انداز میں بولی تھی۔ ممی کے بجائے داؤد تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے بستر کے قریب آ گیا۔ وہاں سب ہی موجود تھے لیکن اس کی توجہ صرف اور صرف بستر پر لیٹی شیریں کی جانب تھی۔ باقی لوگ بھی اٹھ کر بستر کے قریب ہوئے تھے۔ مکمل ہوش میں آ جانے کے باوجود وہ دوائیوں کے زیر اثر تھی۔ وہ بے حد بیمار لگنے لگی تھی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور لہجہ بے حد نقاہت زدہ۔ مسلسل ادویات کے زیر اثر رہنے کے باعث اس کی آواز بدلی بدلی محسوس ہوتی تھی۔ داؤد نے محبت سے اس کا ہاتھ تھاما پھر آگے کی جانب جھک کر اس کی پیشانی کو چوما تھا۔
"مجھے کیا ہوا ہے؟" شیریں کو ہاسپٹل کا کمرہ تو سمجھ میں آ رہا تھا لیکن اپنی طبیعت کے متعلق وہ بالکل انجان تھی۔ ساری صورت حال کو واضح ہونے میں کچھ وقت درکار تھا اور اس کا تیزی سے لاغر ہوتا دماغ اس معاملے میں بے بس ہوا جا رہا تھا۔ اس سے چہرے بھی پہچانے نہیں جا رہے تھے
"تم بالکل ٹھیک ہو میری جان۔ کچھ نہیں ہوا تمہیں۔" وہ بہت ہمت سے بولا تھا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ وہ ٹھیک نہیں ہے۔ آٹھ گھنٹے مسلسل بے ہوش رہنے کے بعد اگلے آٹھ گھنٹے وہ ہوش میں آ جانے کے باوجود انتہائی غنودگی میں رہی تھی۔ ڈاکٹرز اس کی حالت کا تسلی بخش جواب نہیں دے پا رہے تھے اور اس قدر طویل بے ہوشی کسی خوف ناک وجہ کی جانب اشارہ کر رہی تھی جس کے متعلق کوئی سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ خاندان جو خوشیوں کے شادیانے بجانے کا منتظر تھا وہاں غم کے بادل چھا گئے تھے۔
کسی کو داؤد کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ اس کو صرف اتنا ہی بتایا گیا تھا کہ وہ بے ہوش ہو گئی تھی اور تین گھنٹے گزر جانے کے باوجود جب اسے ہوش نہیں آیا تو داؤد نے ہر چیز جوں کی توں چھوڑ دی تھی اور اگلی دستیاب فلائٹ سے پاکستان پہنچ گیا تھا۔ تب سے اب تک وہ اور اس کی ممی ہاسپٹل میں ہی آئی سی یو کے باہر

موجود رہے تھے۔

اگلے چند گھنٹے بے حد پریشان کن تھے۔ جس کا جدھر بس چل رہا تھا، وہ چلا جا رہا تھا۔ بہترین ڈاکٹرز سے وقت لیا گیا تھا اور جو بھی میڈیکل ٹیسٹ تجویز کیے گئے تھے ان سب کی تیاری ہو رہی تھی مگر پھر بھی وہ مکمل ہوش میں نہیں آئی تھی اور جب بیس گھنٹے بعد اس کے حواس ذرا بحال ہوئے تھے تو سب کو اپنے قریب اس طرح پریشان دیکھ کر اسے دھچکا سا لگا تھا۔ اگلے چند لمحوں میں اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ہاسپٹل میں بہت دیر سے ہے۔

دوائیوں کی خوشبو، اس کے ہاتھ پر لگی سوئیاں اور پریشان چہرے لیے قریب بیٹھے محبوب لوگ اس کے دل کو دہلا رہے تھے۔ وہ ایک صحت مند، توانا اور پھرتیلی سی لڑکی تھی جو اپنا خیال رکھنے کو ہمیشہ ترجیح دیتی تھی۔ مکمل غذا، جم اور ایکسرسائز فری زندگی اور ان تینوں چیزوں کا پرچار اس کا خاصا رہا تھا۔ وہ ہمیشہ لوگوں کو متوازن زندگی گزارنے کے مشورے دیتی آئی تھی۔ ذرا سے نزلہ زکام کی صورت میں بھی وہ مکمل آرام کرنے کی عادی رہی تھی۔

ایسی صورت حال میں اس کا اس طرح بستر پر آجانا اس کے اپنے اعصاب کے لیے بہت بھاری تھا۔ اپنے وجود کو اس طرح ہاسپٹل کے بستر پر لاچار پڑے دیکھنا اس کے لیے بہت بڑی بات تھی۔

اسے ڈاکٹرز نے جو ٹیسٹ تجویز کیے تھے وہ بھی عام نوعیت کے بلڈ ایگزامینیشن پر مشتمل ہونے کے ساتھ ساتھ سی ٹی اسکین اور ایم آر آئی وغیرہ بھی تھے۔ یہ سب نام اسے ہی نہیں باقی گھر والوں کو بھی ڈرانے کے لیے کافی تھا۔ ہر شخص کے چہرے پر ایک خوف ناک کیفیت لکھی صاف نظر آرہی تھی جو ایک دوسرے سے مخفی رکھنے میں مزید عیاں ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

”میری رپورٹس کب آئیں گی؟“ وہ سرہانے کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کی آواز میں مایوسی اور تھکن کا ملا جلا غبار صاف محسوس کیا جا سکتا تھا۔ اب وہ گزشتہ دن سے بہتر تھی۔ شوگر لیول بھی نارمل تھا اور اندرونی ہر عضو کی کارکردگی بھی نارمل تھی لیکن وہ بے انتہا کمزوری محسوس کر رہی تھی۔ اس کا بلڈ پریشر بھی نارمل نہیں تھا اس لیے ڈاکٹرز مزید جانچ پڑتال کر رہے تھے کہ مسئلہ کیا ہے۔

یہ زیادہ پریشان کن صورت حال تھی کہ پتا نہیں چل پا رہا تھا کہ اس کے ساتھ یہ سب ہوا کیوں ہے۔ اس کے ہاتھ سے اگرچہ کینولا بھی اتار دیا گیا تھا اور دوائیوں کا اثر بھی کم ہو رہا تھا جس سے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ٹھیک ہو رہی تھی لیکن ہاسپٹل سے جانے کی اجازت نہیں ملی تھی اور نئی مصیبت یہ ہوئی تھی کہ اس کی ایک آنکھ کی بینائی متاثر لگنے لگی تھی۔ وہ مسلسل ایک آنکھ کی بینائی میں کچھ دھبے نظر آنے کی شکایت کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی ایگزامینیشن ہو چکی تھی جس کے رزلٹس ٹھیک تھے لیکن مزید تفصیلی چیک اپ لکھ دیے گئے تھے۔ ڈاکٹرز ایم آر آئی کی طرف زور دے رہے تھے۔ وہ سب کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھتی تھی اور وہاں سے کوئی جواب نہ پا کر مزید مایوس نظر آنے لگتی تھی۔

اسے نہیں بتایا گیا تھا لیکن اس کے کنسلٹنٹ سرجن طاہر نے نوے فیصد برین ٹیومر کا خدشہ ظاہر کر دیا تھا۔ دونوں طرف کے خاندان کے لیے یہ ایک بہت بڑا دھچکا تھا اگرچہ سرجن طاہر کے پاس ابھی حتمی رپورٹ نہیں آئی تھی مگر سب لوگ بہت ڈر گئے تھے۔

کہاں لہنگے، غرارے، مہندی چوڑیوں کے تذکرے ہو رہے تھے اور کہاں اب سب ہی ہاتھ میں تسبیح لیے نظر آنے لگے تھے۔ شیریں اپنی امی کے چہرے کو ہمہ وقت دوپٹے کے حلقے میں چھپا دیکھتی تھی۔ وہ مسلسل کچھ پڑھتی اور اس پر پھونکتی نظر آرہی تھیں۔ سب سمجھ رہے تھے، وہ کچھ نہیں جانتی مگر وہ چہرے پڑھ رہی تھی اور ان سب

کی حالت دیکھ کر اس کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔

دو دن میں ہی اس کا چہرہ زرد لگنے لگا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ہو گئے تھے۔ وہ ایسی ہی تھی۔ بیماری سے بھی زیادہ بیمار ہو جانے کا خوف اسے تشویش میں مبتلا کر دیا کرتا تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنی رپورٹس اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھی۔

''کچھ مل گئی ہیں۔ باقی آج شام کو مل جائیں گی۔'' داؤد نے محبت سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے رپورٹس کے متعلق بتایا تھا۔ داؤد کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور اس کی آنکھیں تھکن سے بے حال نظر آتی تھیں۔ نیند جیسے آنکھوں سے روٹھ چکی تھی۔ شیریں یہ سب دیکھ اور محسوس کر سکتی تھی۔

اسے داؤد ہی نہیں اپنے بچوں کی اور ڈیڈی کی حالت دیکھ کر بھی دکھ ہو رہا تھا۔ وہ لوگ اس کی ہمت بندھا رہے تھے مگر ان کے اپنے چہرے ساری کہانی بیان کرتے نظر آتے تھے۔

''تم لوگ مجھے بتاتے کیوں نہیں ہو داؤد۔ مجھے کیا ہوا ہے۔ ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں؟'' اس نے داؤد کا ٹالنے والا انداز دیکھا تو چوکر پوچھا تھا۔ داؤد چند سیکنڈز کچھ سوچتا رہا پھر اسے جواب سوجھ گیا تھا

''شدید اسٹریس اور تھکن نے یہ حال کر دیا ہے تمہارا۔ ہمارے ریسپشن کو سر پر سوار کر رکھا تھا تم نے۔ اس وجہ سے ہوا ہے یہ سب۔'' شیریں میں اتنی طاقت نہیں بچی تھی کہ وہ بحث کرتی لیکن اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔

''میں بچی نہیں ہوں داؤد۔ اور اسٹریس میرے لیے کوئی نئی چیز نہیں رہی۔ بچپن سے سہہ رہی ہوں یہ سب۔ میری تو جاب ہی ایسی نوعیت کی ہے کہ اسٹریس کو ڈیل کرنا خود بخود آجاتا ہے۔ مجھے پتا ہے تم لوگ مجھے نہیں بتا رہے ہو لیکن مجھے اندازہ ہو رہا ہے۔ یہ وقت دو سو سال پرانا نہیں ہے۔ مجھے گوگل کرنا آتا ہے۔ میں اپنی سمپٹمز کو اینالائز کر سکتی ہوں۔ میں جانتی ہوں داؤد یہ کینسر ہے۔''

وہ نظریں چرا کر آنکھیں موندتے ہوئے بولی تھی۔ بند آنکھوں کے باوجود آنسوؤں کی ایک قطار اس کے گالوں پر محو سفر نظر آنے لگی تھی۔ داؤد کو اندازہ تھا کہ وہ یہ کہہ سکتی ہے اس لیے اس نے تاکید کی تھی کہ اس کے ہاتھ میں اس کا موبائل فون نہ دیا جائے مگر ظاہر ہے اس نے کسی سے لے کر کچھ نہ کچھ سرچ کرنے کی کوشش کی تھی یا شاید وہ صرف اندازہ لگا رہی تھی۔

''تم غلط سوچ رہی ہو یار۔ ایسا کچھ بھی۔'' وہ اسے سمجھانا چاہتا تھا لیکن وہ خود اپنے لہجے کو دکھ گیر ہونے سے بچا نہیں پایا تھا۔

''نہیں ہے۔'' جملہ مکمل ہوتے تک اس کی آنکھیں تر ہو چکی تھیں۔ یہ حقیقت تھی کہ رپورٹس ابھی ڈاکٹرز تک مکمل نہیں پہنچی تھیں لیکن سب کی قیاس آرائی کینسر تک جاتی نظر آ رہی تھی۔

صوبے بھر میں ڈاکٹرز کی ہڑتال کے باعث کچھ ہنگامہ آرائی ہوئی تھی جس کی وجہ سے انہیں تاخیر کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس کے ٹیسٹس ہو چکے تھے تین رپورٹس پر لیب کے سینئر کنسلٹنٹ اور سرجن کے آخری جانچ کے بعد دستخط باقی تھے لیکن انہیں منسٹری میں کسی میٹنگ میں جانا پڑ گیا تھا اس لیے تاخیر ہو رہی تھی۔ وہاں سے رپورٹس ملنے کے بعد سرجن طاہر کے مشورے سے انہیں فوراً ہی ڈسچارج کیا جانا تھا۔ ان لوگوں نے ہر کام میں انتہائی پھرتی دکھائی تھی لیکن ڈاکٹرز کی ہڑتال کے باعث دیر ہوئی تھی۔

''مجھے بتا دو داؤد۔ میری رپورٹس میں کیا ہے؟'' اس کا لہجہ نم تھا اور اس میں ہزار ہا خدشات سانسیں لیتے محسوس ہوتے تھے۔ داؤد اس کا ہاتھ تھامے ہی بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے حواس بحال کرتے ہوئے اس کا ہاتھ نرمی سے سہلایا تھا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ اس میں ایسا کچھ نہیں ہے کہ تم پریشان ہو۔ تم بالکل ٹھیک ہو۔ یہ صرف کمزوری ہے۔ تم بس پریشان نہ ہو اور اپنی انرجی کو ضائع مت کرو۔"

وہ محبت بھرے لہجے میں بولا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر جیسے اس کا صبر ختم ہو گیا تھا۔ یہ بات تو اس کا بھائی اور اس کے ڈیڈی بھی اسے بتا چکے تھے کہ "تم بالکل ٹھیک ہو" وہ اس شخص سے کچھ اور امید کر رہی تھی۔

"میرے ساتھ یہ مت کرو داؤد! تم جانتے ہو مجھے جھوٹ سے نفرت ہے۔ تم جانتے ہو میں نے زندگی میں ایک کام جو کبھی نہیں کیا وہ غلط بیانی ہے۔ مجھ سے غلط بیانی مت کرو۔ یہ مجھے تکلیف دیتا ہے۔"

وہ رونے لگی تھی۔ داؤد اپنی جگہ سے اٹھا اور اب کی بار اس کے بستر پر بیٹھ گیا پھر اس نے اپنی بازو اس کی گردن کے گرد حمائل کیا تھا۔

"یہ زندگی میں وہ آخری چیز ہوگی جو میں تمہیں دوں گا۔ میں تو اس خیال سے بھی بچ کر چلتا ہوں جو تمہیں تکلیف دیتا ہو۔ تم نے کیسے سوچ لیا کہ میں تم سے جھوٹ بولوں گا۔ تمہاری رپورٹس واقعی ٹھیک ہیں۔ صرف چند کے رزلٹس باقی ہیں۔ وہ آج مل جائیں گے۔ پھر سب کچھ کلیئر ہو جائے گا۔" وہ دلار سے تسلی دے رہا تھا۔

"پھر مجھے گھر لے جائیں گے نا۔ مجھے یہاں نہیں رہنا۔ یہاں رہنے سے میری بچی کچی طاقت ختم ہو جائے گی۔ مجھے اس کمرے کی دیواروں سے بھی خوف آتا ہے داؤد۔" وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح ضد کرنے والے انداز میں بولی تھی۔ داؤد نے اسے اپنے ساتھ لگایا اور اس کی پشت کو سہلانے لگا۔

"میرے لیے دعا کرو داؤد! مجھے کچھ نہ ہو۔ پلیز میرے لیے دعا کرو۔"

وہ مزید جذباتی ہو گئی تھی۔ داؤد کا اپنا دل لرزنے لگا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اسی دوران اس کی ممی اندر داخل ہوئی تھیں۔ سامنے کا منظر انہیں کچھ بھلا نہ لگا تھا۔ اس نازک ترین صورت حال میں بھی بیٹے بہو کا رومانس انہیں ہضم نہیں ہوا تھا۔

وہ شیریں کے لیے تازہ انار کا جوس اپنے ہاتھوں سے بنا کر لائی تھیں۔ ان کا دل چاہا ہاتھ میں پکڑی نازک شیشے کی بوتل اپنے ہی سر میں مار لیں۔ ان کو دیکھ کر داؤد نے اشارے سے بتایا کہ شیریں رو رہی ہے۔ انہیں یہ بات بھی اچھی نہ لگی۔ وہ جب سے آیا تھا اسے بس شیریں کی فکر تھی۔ ان کی جانب تو شاید نظر بھر کر بھی نہ دیکھا تھا ان کے بیٹے نے۔ بہت محبت سے بنایا گیا انار کا جوس بڑی بے دلی سے دوائیوں والی میز پر رکھ دیا گیا تھا۔

"میں یہاں رکتی ہوں داؤد۔ تم اب گھر چلے جاؤ۔ شاور لو۔ فریش ہو کر آؤ۔ بلکہ گھنٹے دو گھنٹے سو جاؤ تو اچھا ہے۔ تمہیں بھی انرجی کی ضرورت ہے۔ اس طرح تو تم بھی بیمار پڑ جاؤ گے۔" انہوں نے وہی مشورہ دیا جو انہیں بہترین لگا۔

"سرجن طاہر آنے والے ہیں۔ ایک بار ان سے مل لوں پھر جاتا ہوں ممی۔"

اس نے ان کے مشورے کو خاطر میں لائے بغیر جواب دیا تھا۔ وہ مزید کچھ نہیں بولی تھیں۔

☆☆☆

"اچھی بات یہ ہے کہ ٹیومر نہیں ہے۔"

سرجن طاہر کے جملے نے جیسے ان سب کو نئی زندگی بخشی تھی۔ سرجن طاہر کے کیبن میں اس وقت داؤد کے علاوہ شیریں کے ڈیڈی بھی موجود تھے۔ انہوں نے فرط جذبات سے مغلوب ہو کر داؤد کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ یہ ایک تسلی نہیں تھی جو ڈاکٹر طاہر نے دی تھی۔ یہ نئی روح تھی جو باجماعت سارے خاندان میں پھونک دی گئی تھی۔

"بری بات یہ ہے کہ دماغ میں کچھ تو ہے جو ایسی علامات ظاہر ہوئی ہیں۔ اور پھر بینائی کا اس طرح متاثر

ہونا بھی مشکوک ہے۔"

انہوں نے تسلی دے کر چین لی تھی۔

"لائف تھریٹننگ (زندگی کو خطرہ) تو کوئی بات نہیں ہے نا سرجن؟"

ڈیڈی نے پوچھا تھا۔ سرجن طاہر نے نفی میں سر ہلایا اور گہری سانس بھری جو عموماً ڈاکٹر اس وقت لیتے ہیں جب وہ کسی صورت حال کے بارے میں خود بھی پر یقین نہیں ہوتے یا وہ مریض کے اہل خانہ کے سامنے حتمی بات کرنے سے گریز کر رہے ہوتے ہیں

"بظاہر تو نہیں لگتا۔ کیونکہ تقریباً سب رپورٹس نارمل ہیں۔ لیکن مریضہ یہ جو مسلسل بینائی والا مسئلہ بتا رہی ہیں نا اس کی جانچ ضروری ہے۔ وہ بھی ہو جائے تو دیکھتے ہیں کیا کرنا ہے۔"

"آپ کی بات ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! لیکن کچھ تو اندازہ ہو رہا ہوگا نا آپ کو۔ اب جو ٹیسٹ آپ کروا رہے ہیں۔ یہ کس لیے ہے؟ ہمیں کچھ تو بتائیے۔ کچھ تو ہوگا نا آپ کے ذہن میں۔ آپ کی حکمت اس متعلق کیا کہتی ہے۔ کچھ تو بولیں کہ میرے بے چین دل کو سکون ملے۔"

جوان اولاد کی بیماری نے ڈیڈی کو بالکل لاچار کر کے رکھ دیا تھا۔ ان کے لہجے میں ان کا دکھ بولتا تھا۔ دو دن میں ہی وہ بہت بوڑھے دکھائی دینے لگے تھے۔

"دیکھیں کوئی بھی معالج تکے لگانے پر یقین نہیں رکھتا۔ سائنس اور قانون میں ایک چیز تو مشترک ہے۔ دونوں ثبوت مانگتی ہیں۔ میں رپورٹ آنے سے پہلے حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن ممکنہ طور پر کوئی پیراسائٹ لگتا ہے۔ لیکن مجھے صرف شک ہی ہے۔ ٹیسٹ ہو جانے دیں ایک بار۔ پھر ہی واضح ہو سکے سب کچھ۔"

ان کے اس طرح سے کہہ دینے کے بعد مزید کسی سوال کی گنجائش نہ رہی تھی لیکن ان سب کو اندازہ ہو گیا تھا کہ خطرہ پچاس فیصد ٹل چکا ہے مگر پچاس فیصد ابھی بھی باقی ہے۔

دوا کے ساتھ دعا کے سلسلے میں بھی تیزی آ گئی تھی۔ شیریں کے گھر میں دعا کی محافل کے ساتھ ساتھ ہر روز نادار لوگوں کو کھانا کھلایا جا رہا تھا۔ بیش بہا صدقات دیے جا رہے تھے۔ خاندان میں، دوستوں کے حلقے میں انٹرنیٹ پر دعا کی درخواستیں کی جا رہی تھیں گویا جس کی سمجھ میں جو آ رہا تھا وہ کر رہا تھا۔

☆☆☆

"میں اندر آ جاؤں؟"

وہ سرہانے کو ذرا اونچا کیے بے دم سی لیٹی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے ذرا سی گردن موڑ کر دیکھا۔ اجازت طلب کرنے والا باہر ہی کھڑا تھا۔

وہ ذرا حیران ہوئی کیونکہ اس کے حلقہ احباب میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو اتنا فارمل ہو۔ وہ ذرا سا اونچا ہوئی اور پھر نحیف سی آواز میں "یس" کہا تھا۔ اس ایک لفظ کو بولنے کی بھی خواہش نہیں تھی اسے۔ حالانکہ وہ اب کافی بہتر تھی لیکن جسمانی کمزوری سے کہیں زیادہ ذہنی کمزوری بے چین کر رہی تھی۔ دماغ ٹھیک کام کر رہا تھا، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بحال ہو چکی تھی مگر اعصاب اس قدر نڈھال تھے کہ کچھ سوچنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

"کیا وہ مرنے والی تھی۔ کیا زندگی واقعی اس قدر مختصر اور اس قدر ناقابل بھروسا تھی۔ کیا سب کچھ چٹکی بجاتے ختم ہو جانے والا تھا؟"

یہی چند سوال اس کے ذہن میں گردش کیے جا رہے تھے۔ "موت" خوف ناک ہے لیکن موت سے پہلے موت کی آہٹ اصل موت سے بھی زیادہ خوف ناک تھی۔ اس کے سر پر جیسے آسمان ہی تو گر پڑا تھا۔ کہاں ملبوسات اور میک اپ کے متعلق پریشان ہوئی جا رہی تھی۔ اسے بہت فکر تھی اپنے لباس کی۔ بھی دامن ٹھیک نہیں

لگتا تھا اور کبھی آستینیں۔ کبھی گریبان چھوٹا تھا اور کبھی فٹنگ پر اعتراض۔ اور اب دو ہی دن میں اسے ایک بار بھی خیال نہیں آیا تھا کہ اس کی شادی بھی تھی۔ ڈیزائنر نے اس کی ممی کو ڈریس کی تصویر بھیج دی تھی اور ان کے بتانے پر بھی اس کا دل نہیں چاہا تھا کہ وہ تصویر میں ہی اس ڈریس کو دیکھ لے۔

"کیا میں بھی مر سکتی ہوں۔ اتنی جلدی؟" یہ سوال نہیں تھا۔ یہ فلسفہ حیات تھا اور اس فلسفہ کو سمجھنے کے لیے اسپتال میں بستر پر گزارے دو ہی دن دو صدیوں کے برابر لگ رہے تھے۔

"اب کیا ہوگا؟" یہ سوال اسے گھن کی طرح چاٹ رہا تھا۔ اسے ہوا کیا تھا کوئی ■ تا نہیں تھا اور اگر اسے کچھ نہیں تھا تو سب بھاگے دوڑے کیوں پھر رہے تھے۔

"میں آجاؤں؟" دستک دینے کے ساتھ ایک بار پھر پوچھا گیا تھا

"ہاں۔ آجائیں۔"

اس نے اکتا کر ذرا اونچی آواز میں کہا تھا۔ دھیرے سے دروازہ کھول کر اندر آنے والی ایک اجنبی خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ شیریں کو حیرانی ہوئی۔ وہ ایسی کسی خاتون کو نہیں جانتی تھی جو حجاب کرتی ہوں۔ ان کے عقب میں کھنکھار کر ان کا ڈرائیور اندر داخل ہوا تھا۔ شیریں نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا تھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ان کے متعلق پوچھا تھا۔

"آپ کیسی ہیں؟ آپ ٹھیک ہیں نا؟"

اس نے جواب دینے کے بجائے پہلے اس سے سوال کیا تھا اور پھر ہاتھ میں پکڑا سفید پھولوں کا گلدستہ اس کی جانب بڑھایا۔ اس کے لہجے میں فکرمندی تھی۔ وہ ذرا سا مسکرائی۔ گھر کے افراد کی طرح ملازمین بھی اس کی وجہ سے پریشان تھے۔ پہلے اس کی شادی کی وجہ سے گھر کے ملازمین کی دوڑ لگی تھی اور اب اس کی بیماری نے سب کو بے حال کر دیا تھا۔ وہ بھی کافی پریشان نظر آتا تھا۔ چہرہ جیسے بالکل اتر گیا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ پھول لائے ہیں میرے لیے؟" وہ حیران نہیں تھی بس سوال برائے سوال پوچھ لیا تھا۔ اس نے سر ہلایا اور پھول اس کے بازو کے قریب رکھ دیے۔

"آپ کو پسند ہے نا۔ وائٹ للی۔" اس نے پھر مسکرانا چاہا لیکن مسکرا نہ سکی تھی۔ لفظ "پسند" نے جیسے اسے اندر تک جھنجوڑ دیا تھا۔ جس کی زندگی داؤ پر لگی ہو اسے "پسند ناپسند" سے کیا غرض رہ جاتی ہے۔ اس کی آنکھیں بھیگنے کو بے تاب تھیں۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ ڈرائیور کی نگاہیں اس کے چہرے پر ٹکی ہیں۔

"ایسا کیوں کر رہی ہیں آپ۔ کیوں سوچتی ہیں الٹا سیدھا۔ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔ کچھ نہیں ہوگا آپ کو۔"

ان کے گھر کے سب ہی ملازمین گھر کے افراد کی طرح تھے۔ وہ بہت دل سے تسلی دے رہا تھا۔ شیریں نے سر ہلایا اور ایک بار پھر سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ کر کمرے میں موجود دوسری خاتون کے متعلق استفسار کیا تھا۔

"یہ بہت برگزیدہ خاتون ہیں۔ ان کی دعا بہت جلد قبول ہوتی ہے۔ میں نے ان سے ذکر کیا تھا آپ کا۔ یہ آپ کو دعا دینے آئی ہیں۔"

وہ کہہ رہا تھا۔ شیریں اپنی ہتھیلیوں پر وزن ڈالتے ہوئے بالکل اٹھ کر بیٹھ گئی تھی

"یہ تو بہت اچھا کیا آپ نے۔ مجھے دعاؤں کی اشد ضرورت ہے۔" وہ صدقِ دل سے بولی تھی۔

"اتنا پریشان کیوں ہوتی ہو۔ بیماری تو صحت کا صدقہ ہوتی ہے۔ اور صدقہ وقت پر ادا کر دینا اچھا ہوتا ہے۔ ورنہ ضرورت سے زیادہ اور خواہش سے بڑھ کر ادا کرنا پڑتا ہے۔"

ان خاتون نے اپنے چہرے سے حجاب اتارتے ہوئے کہا تھا۔ شیریں ان کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس نے اپنے اردگرد بے حد حسین چہرے دیکھے تھے لیکن اتنا سحر کر دینے والا، اس قدر پرنور چہرہ کبھی نظر سے نہ گزرا تھا۔ اس کی نگاہیں بے اختیار ہو کر جیسے ان کے چہرے پر جم سی گئی تھیں۔

☆☆☆

''میرا اندازہ درست نکلا۔''

سرجن طاہر نے کہا تھا۔ داؤد کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ اس کے جسم کا ایک ایک تار کان بن گیا تھا جو سرجن طاہر سے کچھ اچھا سننے کی امید کر رہے تھے۔

''اسے ٹوکسوپلازموسس۔ اے پیرا سائٹ۔ اے برین انفیکشن ڈس آرڈر ہے۔'' سرجن طاہر ایک ایک لفظ پر زور دے رہے تھے۔ ان کے چہرے پر روز کی نسبت آج زیادہ نرمی زیادہ ملائمت تھی جیسے انہیں اس خاندان کے نقصان پر افسوس ہو۔ اس بار ان کے کیبن میں داؤد اور شیریں کے ڈیڈی کے علاوہ ان کا ڈرائیور بھی موجود تھا جو رپورٹس لے کر آیا تھا۔ وہ تینوں ہی ہمہ تن گوش سرجن کی جانب متوجہ تھے

''ٹاکسوپلازموسس؟'' داؤد نے سمجھ میں نہ آنے والا لفظ دہرایا تھا۔

''ہمیں سادہ زبان میں سمجھائیں سرجن۔ ہمیں یہ مشکل باتیں سمجھ میں نہیں آتیں؟''

ڈیڈی نے تھکے ہوئے انداز میں پوچھا تھا۔ سرجن طاہر کے چہرے پر موجود تاثرات سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ یہ پریشان کن بات ہے یا نہیں لیکن لفظ ''ڈس آرڈر'' نے ان سب کو چونکا ضرور دیا تھا۔ وہ سب پڑھے لکھے لوگ تھے لیکن کوئی کامرس پڑھ چکا تھا، کوئی فائنانس۔ بائیالوجی، اناٹومی سے کسی کو بھی زیادہ دلچسپی نہیں رہی تھی۔

''جی۔ ٹاکسوپلازموسس۔'' انہوں نے پھر نام بتایا تھا۔ سرجن طاہر کے علاوہ ان تینوں نے یہ نام پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ وہ انہیں تفصیل بتانے لگے تھے۔

''بنیادی طور پر یہ ایک پیرا سائٹ ہے جو جانوروں کے فضلے میں پایا جاتا ہے۔ انسان کے جسم میں یہ متاثرہ جانور کے گوشت یا گندے پانی سے منتقل ہونے کا چانس ہوتا ہے۔ میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا لیکن یہ ختم نہیں کیا جا سکتا یعنی اسے کسی سرجری کسی دوائی سے جسم سے نکالا نہیں جا سکتا۔''

سرجن طاہر کی بات مکمل ہونے سے بھی پہلے ڈیڈی نے زار و قطار رونا شروع کر دیا تھا۔

''میری بچی بہت پکی ہے طاہر صاحب۔ یہ مت کہیں۔ یہ مت کہیں۔'' داؤد نے ان کی جانب دیکھا لیکن وہ بھی فی الوقت ان کو تسلی دینے کے قابل نہیں تھا۔ ان کا ڈرائیور ہی آگے بڑھا تھا اور ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''آپ میری بات تو سنیں۔ یہ جسم میں موجود رہے گا لیکن یہ لاعلاج نہیں ہے اور اس سے آپ کی بچی کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ان کی جتنی بینائی متاثر ہو چکی ہے وہ تو واپس نہیں لائی جا سکتی لیکن اگر وہ ایک صحت مند لائف اسٹائل کو فالو کرتی رہیں اور اپنی امیونٹی کو بڑھائے رکھیں تو اس سے ان شاء اللہ مزید کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔ یہ پیرا سائٹ ایک بار جسم میں چلا جائے تو اسے نکالا نہیں جا سکتا لیکن اچھی بات یہ ہے کہ برسہا برس جسم میں موجود رہنے کے باوجود یہ خوابیدہ حالت میں رہتا ہے۔ اور اگر کبھی کمزور مدافعاتی نظام اسے بیدار کر کے ایکٹو کر بھی دے تو جسم میں اینٹی باڈیز پیدا ہو چکی ہوتی ہیں جو اس سے لڑنے میں کام آتی ہیں۔ ابھی ہم مریضہ کا علاج شروع کریں گے۔ ان کو تین دن آبزرویشن میں رکھیں گے۔ اس کے بعد ان شاء اللہ وہ اپنی نارمل زندگی کی جانب لوٹ جائیں گی۔'' وہ اب کی بار جیسے خوش خبری سنا رہے تھے۔ ڈیڈی کے آنسو مزید تیزی سے بہنے لگے

تھے۔

"یا اللہ! تیرا کرم۔ مالک! تیرا کرم۔" ساتھ ساتھ وہ رب کا شکر بجا لا رہے تھے۔ داؤد نے سینے میں کب سے دبی سانس اطمینان سے خارج کی تھی۔ ان کی حالت دیکھ کر سرجن طاہر کے چہرے پر مسکراہٹ سی چمکی تھی۔

"طاہر صاحب! ایک بات میں مزید پوچھنا چاہ رہا تھا کہ یہ پیراسائٹ شیریں کی باڈی میں داخل کیسے ہوا۔ یعنی وہ کیا وجوہات رہی ہوں گی کہ شیریں کو یہ انفیکشن ہوا؟" انہوں نے یہ سوال سن کر سر ہلایا پھر کچھ سوچ کر بولے۔

"ہم اس بارے میں صرف قیاس آرائی کر سکتے ہیں۔ یا اس بارے میں مریضہ خود ہی کچھ بتا سکتی ہیں کہ انہوں نے کیا کھا لیا تھا۔ ہو سکتا ہے متاثرہ پیراسائٹ والا گوشت یا سی فوڈ جو مکمل طور پر پکایا نہیں گیا ہو گا یا شاید وہ گندا پانی پی بیٹھی ہوں گی کیونکہ اس پیراسائٹ کی جسم میں منتقلی کے یہی دو ذرائع ہیں۔ لیکن حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔" پھر وہ ایک لمحے کے لیے رکے۔

"آپ غالباً ان کے شوہر ہیں؟" وہ اس کے چہرے کی جانب دیکھ رہے تھے۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا پھر اس نے اپنے ہمراہ آئے باقی دو لوگوں کی جانب دیکھا اور اطمینان سے سر ہلا دیا۔ اسے نہیں پتا چلا تھا، دو نگاہیں اسے کس قدر ناپسندیدگی سے دیکھ رہی تھیں۔

"ایک مسئلہ اور بھی ہے۔ آپ لوگ جب بھی پریگنینسی پلان کریں گے۔ آپ کو یہ بات اپنی گائنی کو بتانی پڑے گی کیونکہ اس پیراسائٹ کا سب سے زیادہ خطرہ آپ کے ہونے والے بچے کو ہو سکتا ہے۔ اس لیے آپ اپنی گائنی کو اس پیراسائٹ کا نام لے کر پہلے سے بتائیں گے تاکہ وہ ابتدا میں ہی آپ کو احتیاطی تدابیر بتا سکیں۔"

داؤد نے سر ہلایا تھا لیکن مزید کچھ نہیں پوچھا تھا۔ شیریں کے ڈیڈی کی موجودگی میں بالخصوص پریگنینسی کے بارے میں مزید کچھ پوچھنا اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ ابھی وہ صرف شیریں کے متعلق سوچ کر خوش ہونا چاہتا تھا۔

☆☆☆

"تم نے تو رانجھا اور مجنوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے داؤد۔ اس لڑکی کے علاوہ بھی تمہاری زندگی میں کچھ رشتے ہیں۔ تمہیں اتنا بھی احساس نہیں کہ ماں کے پاس دو گھڑی بیٹھ کر اس کا احوال بھی پوچھ لو۔"

ممی نے اسے عجلت میں گھر سے نکلتے دیکھا تو اکتا کر کہا تھا۔ وہ دس منٹ پہلے آیا تھا اور اب پھر باہر نکلنے کی تیاری کر رہا تھا حالانکہ وہ توقع کر رہی تھیں کہ شاید اب وہ ان کے پاس بیٹھ کر ان سے بھی باتیں کرے گا لیکن اسے پھر باہر کی جانب جاتا دیکھ کر انہیں تاؤ آ گیا تھا۔

پاکستان میں ان کا حلقہ احباب ویسے ہی بہت مختصر تھا اور جو چار چھ دوست تھے، وہ سب شیریں کی بدولت ہی ان کے سرکل میں شامل ہوئے تھے۔ آج کل سب کے پاس بات کرنے کے لیے بس شیریں کی غیر متوقع پراسرار بیماری تھی۔ وہ سب بار بار اس "وائرس" کے متعلق بات کرنا چاہتے تھے جس کا نام ان میں سے کسی نے پہلے نہیں سنا تھا جبکہ اس بیماری کی گفتگو سے وہ اب اکتانے لگی تھیں۔ انہیں عجیب عجیب سے خدشات ستانے لگے تھے جن کا ذکر بھی وہ کسی سے نہیں کر سکتی تھیں۔ انہیں اگرچہ داؤد نے ساری تفصیلات بتا دی تھیں مگر انہیں تسلی نہیں ہوئی تھی۔

"ڈاکٹر نے پریگنینسی کی بات اس قدر محتاط انداز میں کیوں کی تھی۔ کیا داؤد کی ہونے والی اولاد کسی جسمانی نقص یا بیماری کا شکار ہو کر پیدا ہونے والی تھی۔" نہ چاہتے ہوئے بھی یہ سوال ان کے ذہن میں گردش کرتا رہتا تھا اور وہ اس کے متعلق کسی سے بات بھی نہیں کر سکتی تھیں کیونکہ انہیں فوراً "خود غرض" ہونے کا طعنہ دے دیا جاتا

"ممی! آئی ایم سو سوری۔ مجھے خود بھی احساس ہے کہ مجھے آپ کے پاس بیٹھنا چاہیے۔ لیکن ابھی

شیریں۔" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ ممی نے اس کی بات کاٹ دی۔
"شیریں شیریں شیریں...... اس کے علاوہ کچھ اور ہے تمہارے پاس۔ میں تھک گئی ہوں اس لڑکی سے۔ اس کی بیماری سے۔ اور تم سے بھی۔" وہ اپنی ہی سوچ کو مناسب الفاظ نہیں دے پا رہی تھیں لیکن ان کی اندرونی کشمکش ان کے چہرے پر لکھی نظر آ رہی تھی۔ داؤد پلٹ کر ان کے پاس آیا تھا۔ وہ کاؤچ پر ٹانگیں چڑھائے بیٹھی تھیں۔ وہ ان کے قدموں میں بیٹھ گیا ان کا چہرہ چند دنوں میں ہی بے حد عمر رسیدہ لگنے لگا تھا۔ داؤد جب سے آیا تھا اس نے واقعی اپنی ممی کو اب نظر بھر کر دیکھا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ممی نے اسے یہ موقع نہیں دیا تھا۔ انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔
"میں تمہاری ماں ہوں داؤد۔ میں تمہارا بھلا ہی چاہوں گی۔ میں کبھی ایسی بات نہیں کروں گی جو تمہارے لیے باعثِ نقصان ہو یا باعثِ آزار ہو۔ ابھی بھی مان لو۔ یہ لڑکی ٹھیک نہیں ہے۔ نکل آؤ اس کے چکر سے۔ میں نے بی بی سے پوچھا تھا۔ وہ کہتی ہیں، اس کے ستارے تمہارے ستاروں سے ٹکراتے ہیں۔ تم لوگ ایک ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکتے۔ تم ہمیشہ مسائل کا شکار رہو گے۔ اب بھی دیکھ لو۔ ایسی بیماری جس کا نام بھی کسی نے نہیں سن رکھا۔ شیریں کو وہ ہوگئی ہے۔ اس میں نشانی ہے داؤد۔" وہ یک دم آگے کو جھکیں اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ دیے۔
"سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے تم۔ ابھی بھی وقت ہے داؤد۔ ابھی بھی بچ جاؤ۔ چھوڑ دو اسے۔ تم خود سوچو۔ یہ سب ہو جانا اس جانب اشارہ نہیں کرتا کہ ابھی بھی وقت ہے۔ ابھی بھی سوچا جا سکتا ہے۔ مان لو داؤد! قدرت تمہیں وقت دے رہی ہے۔" داؤد نے ان کے ہاتھ میں دبا اپنا ہاتھ کھینچ کر الگ کیا تھا۔
"ممی۔" وہ اتنا ہی کہہ سکا۔ الفاظ منہ میں ہی دم توڑ گئے تھے۔ اسے بے حد برا لگا تھا۔ اس کی ممی بہت خود غرض تھیں۔
"یہ وقت ہے ان باتوں کا۔ اور سوچنا کیا ہے۔ شادی گڈے گڈی کا کھیل ہوتی ہے کیا۔ کیا سوچوں میں؟ اور سوچنے کے لائق تو کئی سال پہلے ہی نہیں رہا تھا میں۔ آپ نے بھی رہنے ہی نہیں دیا مجھے اس قابل۔" اس نے اپنی پیشانی کو اپنے بائیں ہاتھ سے سہلانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے الفاظ بے ربط تھے۔ اس کے دل کی حالت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ اسے جیسے بولنے میں دقت ہو رہی ہو۔
"اور آپ اتنی وہمی کیوں ہو گئی ہیں۔ پہلے تو ایسی نہیں تھیں آپ۔ کیوں سوچتی رہتی ہیں الٹا سیدھا۔ کیوں آپ کو ہر بار دوسروں کے ستاروں میں مسئلہ لگنے لگتا ہے۔ ممی ہو سکتا ہے میرے ساتھ میں کوئی مسئلہ ہو کہ میرے ساتھ وابستہ ہر چیز مسائل کا شکار ہو جاتی ہے۔ کیا پتا یہ میں ہوں جو اس لڑکی کو ہمیشہ مشکل میں ڈال دیتا ہوں۔"
وہ مزید کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ان کی بات نے اسے عجیب سے صدمے سے دوچار کر دیا تھا۔ وہ بنا کچھ کہے باہر نکل گیا تھا اور وہ وہیں بیٹھی رہ گئی تھیں لیکن ان کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ ان کا دل بہت بوجھل ہو رہا تھا۔
"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں داؤد۔ یہ ماں کا دل ہے۔ اور ماں کا دل اولاد کے بارے میں ہمیشہ سچ سوچتا ہے۔"

☆☆☆

"مہر افروز۔" بار بار دستک دینے پر بھی جب دروازہ نہیں کھلا تو انہوں نے اس کا نام لیا تھا اور با آواز بلند لیا تھا۔ دروازے کے بالکل ساتھ ایلومینیم کی کھڑکی تھی جس کا ایک شیشہ دائیں طرف ہٹا ہوا تھا۔ اندر کی جانب لگے بلائنڈز بھی ادھ کھلے تھے جس سے اندر کی چہل پہل باہر کھڑے محسوس ہوتی تھی۔ وہیں سے آنے والی موسیقی کی آواز سے بھی بخوبی اندازہ ہوتا تھا کہ اندر کوئی موجود ہے مگر دروازہ نہیں کھل رہا تھا۔ اسی لیے انہوں نے مسلسل دستک سے اکتا کر آواز دے ڈالی تھی۔ انہیں اب ساری صورت حال سے الجھن ہونے لگی تھی۔ وہ فوراً سے بیشتر وہاں سے چلی جانا چاہتی تھیں لیکن پھر بھی کچھ تھا جو ان کو روک لیتا تھا۔
"جب اتنا پٹرول پھونک کر یہاں تک آ ہی گئی ہو تو اب "اس" سے مل کر ہی جانا۔ چند مزید منٹ انتظار کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔"

پہلی دستک کے بعد سے ہی انہوں نے خود کو یہ باور کروانا شروع کر دیا تھا۔ دروازہ پھر بھی نہیں کھلا تھا اور ان کا پارہ مزید ہائی ہونے لگا تھا۔ وہ کبھی مہر افروز سے ملنے نہ آتیں لیکن سات سمندر پار بیٹھا ان کا بیٹا مسلسل فون کر کے انہیں یاد دہانی کروانا نہیں بھولتا تھا کہ......

''مہر اکیلی ہے۔ اس کے والدین پاکستان چلے گئے ہیں۔ وہ کہیں ایز اے پے انگ گیسٹ رہ رہی ہے۔ آپ پلیز اسے کال کرتی رہا کریں۔ ویک اینڈ پر اسے اپنے پاس بلوا لیا کریں۔ اس سے ملنے چلی جایا کریں۔ اس کا خیال رکھا کریں گی۔''

ان کا بیٹا جب جب انہیں فون کرتا تھا، گھما پھرا کر گفتگو کا موضوع ''مہر افروز'' بن جاتی تھی۔ وہ کوئی جاہل قسم کی ان پڑھ خاتون بھی نہیں رہی تھیں۔ ایک پڑھی لکھی ملازمت پیشہ خاتون جتنی فراخ دل، باشعور اور مضبوط ہو سکتی تھی، وہ اس سے کہیں زیادہ تھیں لیکن یہ بات انہیں ہضم کرنا بہت مشکل لگتا تھا کہ وہ جس نیوکلیس کے گرد گھن گھیریاں کھا رہی ہیں، اس نیوکلیس کا نیوکلیس کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔

وہ اپنے دوستوں میں بیٹھ کر بارہا یہ بات کہہ چکی تھیں کہ ''میں ٹیکی کا پٹر ماما نہیں ہوں۔ مجھے یہ چیز پسند ہی نہیں کہ بچوں کے بڑا ہو جانے کے بعد بھی ان کی زندگی اور فیصلوں پر اثر انداز ہوتے رہو۔ داؤد بڑا ہو چکا ہے۔ اپنا اچھا برا سوچنے کے قابل ہو چکا ہے۔ میں اب اس کی زندگی میں مداخلت نہیں کرتی۔''

لیکن حقیقت یہ تھی کہ انہیں اس امر سے تکلیف ہوتی تھی کہ داؤد اپنے فیصلے اب ان سے پوچھ کر کرنے کے بجائے ایک ''جمعہ جمعہ آٹھ دن پہلے زمین سے نکلی لڑکی'' سے پوچھ کر کرتا ہے۔ وہ مہر افروز کو دل میں اسی ''نام'' سے یاد کرتی تھیں لیکن دل ہی دل میں وہ اس بات کی قائل تھیں کہ اس کی شخصیت میں کچھ تو ایسا ضرور تھا کہ جو اس سے ملتا تھا، مرعوب ضرور ہوتا تھا۔ پہلی ملاقات میں وہ جو ایک اچھی چھوڑ جاتی تھی جو دوسری تیسری ملاقات میں گھٹنے کے بجائے بڑھتی جاتی تھی اور انہیں اس سے نفرت تھی۔ وہ اس سے ملنے سے کتراتی تھیں کیونکہ وہ ہمیشہ نا صرف انہیں گھیر گھار کر اپنی مرضی کی بات منوا لیتی تھی بلکہ اس کے فیصلے ہمیشہ درست بھی ثابت ہو جاتے تھے لیکن اس بات کا اعتراف کسی کے سامنے کرنا آسان نہیں تھا سو جب بھی اس سے ملنا ہوتا تھا ایک مصنوعی دلکش مسکراہٹ ان کے چہرے پر چمکتی رہتی تھی مگر ان کا دل کبھی اس سے مل کر خوش نہیں ہوا تھا۔

''آپ......یہاں......!'' دروازہ کھل گیا تھا اور ساتھ ہی مہر افروز کا منہ بھی۔ وہ انہیں دیکھ کر واقعی حیران نظر آتی تھی۔

''میں نے سوچا، میں ہی مل آتی ہوں۔ تم تو آؤ گی نہیں کیونکہ اب داؤد جو یہاں نہیں ہے۔'' وہ چہرے سے حد بیزار نظر آتا تھا، سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ایک شفیق مسکراہٹ سے سج گیا تھا لیکن لہجے میں در آئے طنز کو وہ چھپا نہیں پائی تھیں۔ مہر شکرانہ انداز میں مسکرائی اور انہیں اندر آنے کا راستہ دیا اور ساتھ ہی ان کی بات کا جواب بھی۔

''ایسی بات نہیں ہے۔ داؤد کے ہونے یا نہ ہونے سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔'' انہوں نے اس کے جملے کو ناک چڑھا کر سنا تھا اور دل میں یہ خواہش بھی پیدا ہوئی تھی کہ کاش وہ داؤد کو یہی جملہ سنا کر سمجھا سکتیں کہ یہ لڑکی اس کے بارے میں کیا سوچتی ہے مگر اس کا اگلا جملہ ان کا یہ ارادہ متزلزل کر گیا تھا۔

''میں آپ سے کبھی داؤد کی وجہ سے نہیں ملی۔ آپ اتنی گریس فل، اتنی پاور فل شخصیت کی مالک ہیں کہ آپ سے ملنے کے لیے کسی دوسرے تیسرے سہارے کی ضرورت نہیں پڑتی۔''

اس کے ایک جملے نے ہی انہیں ڈھیر کر دیا تھا جس کے پہلے حصے پر انہیں یقین تھا کہ جھوٹ ہے جبکہ دوسرے حصے پر ایمان کی حد تک یقین تھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے سو وہ مسکراہٹ جو جبر کی چہرے پر سجائی گئی تھی یک دم اخلاص کے لبادے میں لپٹ گئی۔ اپنے برانڈڈ بیگ کو کلائی پر لٹکائے ہائی ہیل کے ساتھ ٹک ٹک کرتے وہ چپ چاپ چھوٹے سے لاؤنج نما ہال میں داخل ہوئی تھیں۔ تنقیدی نگاہیں ادھر ادھر ڈالتے پہلی نظر میں ہی وہ سستی سی اکاموڈیشن انہیں مہر

افروز کے شایان شان نہیں لگی تھی۔ وہ اس کے والدین کے ولاہ میں چند ایک بار جا چکی تھیں۔ یہ عام سا فلیٹ اس ولاہ کے مقابلے میں سرونٹ کوارٹر جیسا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے مہر افروز پر غور کیا تھا۔
مہر سلیپنگ پاجامہ سوٹ میں تھی۔ بالوں کا جوڑا بنا رکھا تھا اور آنکھیں نیند سے بھری تھیں۔ وہ شاید سوئی ہوئی تھی تب ہی دروازہ کھولنے میں تاخیر ہوئی تھی۔ انہیں وہ کچھ کمزور بھی لگی۔
''بہت عجیب سی جگہ ہے۔'' انہوں نے فوراً اپنی رائے دی تھی۔ وہ ان کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھی پھر مسکرائی۔
''میری سیلری میں یہی جگہ افورڈ کی جا سکتی تھی۔'' اس نے کچھ لگی لپٹی رکھے بغیر صاف جواب دیا تھا۔ وہ حیران ہوئی تھیں۔
''کیا مطلب؟'' انہوں نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا پھر کرسی پر ذرا آگے کو اس کی جانب جھکیں۔
''تمہارے پیرنٹس سپورٹ نہیں کر رہے تمہیں۔ فنڈز نہیں دیتے۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ان کا دل فوراً نرم پڑا تھا۔ اس نے کندھے اچکائے۔ انداز ناک سے مکھی ہی نہیں مچھر تک اڑا دینے والا تھا۔
''اٹھارہ سال سے وہی سپورٹ کر رہے تھے۔ مزید کتنی دیر فنڈز لوں ان سے۔''
انہیں یہ بات ہضم نہیں ہوئی تھی۔ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسیں۔ ''تم اولاد ہو ان کی۔ تم لے سکتی ہو۔''
''اولاد اور پیراسائٹ میں فرق ہوتا ہے۔ میں ماں باپ کا خون چوس چوس کر گرو اپ ہونے والی فلاسفی پر یقین نہیں رکھتی۔'' اس کا انداز دوٹوک تھا۔
''یہ عجیب بات کی تم نے۔ تمہارا حق ہے یہ۔ جب تک تم اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں ہو جاتیں، انہیں فنڈز دیتے رہنا چاہیے۔ اتنا تو کر سکتے ہیں تمہارے فادر۔ وہ امیر کبیر انسان ہیں۔ مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ تمہیں یہاں کیوں چھوڑ گئے ہیں۔ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''
وہ ان کی بات کا جواب دینے کے بجائے اٹھ کر فریج کی جانب گئی پھر اس نے دو ٹن نکالے تھے۔ واپس ان تک آتے ہوئے وہ ایک ٹن کھول بھی چکی تھی۔ اس نے دوسرا ٹن ان کی جانب بڑھایا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ اگلے ایک منٹ میں اس نے خالص پاکستانی کلچر کا مظاہرہ کرتے ہوئے بالکل اصرار نہیں کیا تھا بلکہ وہ کھلا ہوا ٹن اپنے منہ سے لگا چکی تھی۔ انہیں یہ بات بھی بے حد بری لگی۔ پہلے وہ ان کی بات کا کوئی جواب دیے بنا اٹھ گئی تھی اور اب مہمان کی تواضع کرنے کے بجائے وہ خود اپنے آپ کو اینٹرٹین کر رہی تھی۔ انہوں نے اپنی رائے پر یقین کی مہر ثبت کی تھی۔
''اسے کوئی سلیقہ، کوئی تمیز نہیں تھی۔ وہ قطعاً ''اچھی بہو'' کی کیٹگری میں فٹ نہیں آتی تھی۔''
''یہ میرا ذاتی فیصلہ تھا آنٹی! آپ میری عزت کریں، میں داؤد نہیں ہوں اور میرے پیرنٹس بھی آپ کے جیسے نہیں ہیں۔ وہ چاہتے تھے، میں وقت پر اڑنا سیکھ لوں۔ اسی لیے میں نے سیکھ لیا تھا۔ مجھے مینیج کرنا آتا ہے۔''
اس کا انداز ایک بار پھر اس قدر دوٹوک تھا کہ وہ چپ رہ گئیں۔ انہیں کوئی سروکار بھی نہیں تھا۔
''میں کافی بناتی ہوں آپ کے لیے۔'' وہ اٹھ کر کچن کی جانب چل دی تھی۔ وہ بھی گہری سانسیں لیتے ہوئے اپنے بلڈ پریشر کو اعتدال میں لانے لگیں۔ اس لڑکی کے ساتھ ان کا رشتہ بے حد عجیب نوعیت کا ہو چلا تھا۔ وہ انہیں اپنے جیسی لگتی تھی۔ مضبوط، نڈر اور اپنے فیصلے پر ڈٹی رہنے والی۔ لیکن وہ اسے پسند نہیں کرتی تھیں۔ ایک میان میں دو تلواریں بھی نہیں رہ سکتی تھیں۔

☆☆☆

''تم سے یہ بات ہضم ہی نہیں ہو پا رہی کہ تمہارے بیٹے نے تم سے رضامندی لیے بغیر ایک لڑکی پسند کر لی ہے۔''
انہوں نے بہت جھجک کر سارا مسئلہ اپنی ایک دیرینہ دوست سے فون پر ڈسکس کیا تھا جو چند سال قبل دبئی سے پاکستان شفٹ ہوئی تھی۔ اس نے ہنستے ہوئے ان کی بات کو مذاق میں اڑا دینا چاہا۔

"مجھے لڑکی پسند کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لڑکی پر ہے۔ داؤد کی چوائس اچھی نہیں ہے۔ وہ کل کو پچھتائے گا۔" انہوں نے گہری سانس بھر کر کہا تھا

"نہیں پچھتاتا۔ وہ ایسا بچہ نہیں ہے لیکن اگر پچھتائے گا تو بھی تسلی رکھو کہ تم سے نفرت نہیں کرے گا۔ اسے یہ بات تکلیف نہیں دے گی کہ اس کی شادی جیسے مسئلے میں اس کی ماں نے ٹیپیکل دیسی ماؤں کی طرح سیاپا ڈال رکھا تھا۔ ویسے بھی میں مہر افروز سے مل چکی ہوں۔ وہ بہترین لڑکی ہے۔ اپنے سرکل میں اس سے اچھی بہو نہیں مل سکتی تمہیں۔" وہ داؤد کو سمجھانے کے بجائے ان کو ہی سمجھانے لگی تھی۔

"میں اپنے دل کا کیا کروں صبیحہ۔ مجھے چین نہیں آتا۔ مجھے ایسے لگتا ہے جیسے میرا بچہ اس لڑکی کی وجہ سے کبھی خوش نہیں رہ پائے گا۔ وہ بہت بارعب، بہت ضدی طبیعت کی مالک ہے۔ اپنے پوائنٹ آف ویو سے ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ہوتی۔ ایسے گھما گھما کر باتیں کرتی ہے کہ اس کی ماننی ہی پڑتی ہے۔ یقین کرو، اس کی اس عادت کی وجہ سے میں اس سے بحث کرتے ہوئے کتراتی ہوں۔ اٹھارہ انیس سال والی لڑکیوں جیسی کوئی بات ہی نہیں ہے اس میں۔ چہرے پر ذرا معصومیت نہیں ہے۔ اور ہو بھی کیوں۔ چودہ سال کی عمر سے پارٹ ٹائم جابز کرتی رہی ہے۔ اب پڑھ بھی رہی ہے اور یہاں دبئی میں ماڈلنگ بھی کر رہی ہے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا ہے۔ میرا معصوم سا اکلوتا بچہ ہے۔ میں کیسے اسے ایک اتنی ہوشیار لڑکی کے چنگل میں پھنسا رہنے دوں۔" وہ روہانسی ہوئی جا رہی تھیں۔ ان کی سہیلی چند لمحے تو کچھ بول ہی نہ سکی جیسے کچھ تدبیر سوچ رہی ہو۔

"اچھا۔ مجھے بتاؤ، تم کیا چاہتی ہو۔ میں کیسے مدد کر سکتی ہوں تمہاری۔ میں بات کروں داؤد سے۔ سمجھاؤں اسے۔ شاید میری ایڈوائس سے کچھ افاقہ ہو۔" بالآخر اس نے پوچھا تھا۔

"نہیں۔ بات ایڈوائس سے آگے نکل چکی ہے۔ میرا احمق بیٹا باتوں سے یا نصیحتوں سے سمجھنے والا ہوتا تو میں اسے سمجھا چکی ہوتی۔ اس کا کچھ علاج کرنا پڑے گا۔" ان کا لہجہ دو ٹوک سا تھا۔

"کیا مطلب......علاج کیسا؟"

"صبیحہ! تمہیں یاد ہے نوشابہ کا بیٹا کسی کرسچن لڑکی کے عشق میں ایسے ہی گرفتار تھا جیسے میرا داؤد ہے۔ اس کا بھی ایسا ہی طوفانی قسم کا افیئر چل رہا تھا۔ تب تم نے کسی پہاڑی علاقے سے کسی پی بی صاحب سے کوئی تعویذ لا کر دیا تھا۔ اور شاید کوئی کھانے کی چیز بھی تھی۔ چینی یا گڑ تھا شاید۔ اس تعویذ کی برکت سے نوشابہ کا بیٹا بالکل راہ راست پر آ گیا تھا۔ چند ہفتوں میں اسے اس لڑکی کی شکل سے بھی نفرت ہو گئی تھی۔ تم پلیز مجھے بھی ان سے تعویذ دلوا دو۔ یا پھر ان سے میرا رابطہ کروا دو۔" وہ منتوں پر اتر آئی تھیں۔ صبیحہ کی جھنجلائی ہوئی آواز بھی انہیں بری نہ لگی تھی۔

"توبہ۔ تمہیں اب تک یاد ہے یہ بات۔ دس سال پرانا قصہ ہے یہ۔ اور وہ تعویذ نہیں تدبیر سے ٹھیک ہوا تھا۔ تین بار وقفے وقفے سے ری ہیب سنٹر چھوڑ کر آئی تھی اس کی ماں اسے۔ کیونکہ وہ کرسچن لڑکی کے چکر میں ہی نہیں تھا، اس کی اپنی بھی ٹھیک ٹھاک قسم کی خراب عادات تھیں۔ ایڈکٹ تھا وہ۔ ہیروئن پیتا تھا اور شراب بھی۔ تمہیں کس نے بتا دیا کہ میرے تعویذ لا کر دے دینے سے ٹھیک ہو گیا تھا وہ۔ ارے بھائی، میں اتنی ہی کارآمد ہوتی تعویذ لانے کے معاملے میں، وہ بھی پہاڑی علاقوں سے۔ تو اپنے بیٹوں کے لیے نہ لے آتی کچھ۔ جو شادیاں کر کے اپنی اپنی بیگمات کو پیارے ہو چکے ہیں۔ میرا مشورہ ہے ان خرافات سے نکل آؤ اور بچوں کو جینے دو اپنی زندگی۔ لڑکے اپنی پسند سے شادی کریں یا ماں باپ کی پسند سے۔ انہوں نے بالآخر ماؤں کی دسترس سے نکلنا ہی ہوتا ہے۔ تم کیوں اپنے اتنے پیارے بیٹے کو اپنے پلو سے باندھ کر رکھنا چاہتی ہو۔ اڑنے دو اسے۔ کھوجنے دو اپنے حصے کا آسمان۔ اپنی مرضی سے جانے دو گی تو ساری زندگی تمہاری طرف پلٹ پلٹ کر آتا رہے گا ورنہ تمہاری شکل دیکھنے کا بھی روادار نہ رہے گا۔"

ایک سہیلی اس سے بہتر مشورہ نہیں دے سکتی تھی انہیں لیکن انہیں بے حد برا لگا۔

"خواہ مخواہ روادار نہ رہے گا میری شکل دیکھنے کا۔ اکلوتی اولاد ہے میری۔ سوئی میں دھاگہ ڈال ڈال کر جیسے ریشم پر پھول کاڑھے جاتے ہیں نا۔ ایسے پالا ہے میں نے اسے۔ اس کے باپ کی وجہ سے جوانی بھی خسارے میں گزار دی اور اب اس کی وجہ سے بڑھاپا بھی خسارے کی نذر کر دوں۔ یہ نہیں ہوگا مجھ سے۔ تم مجھے مشورہ دینے کے بجائے ان بی بی صاحبہ کا نمبر دے دیتیں تو زیادہ اچھا ہوتا۔ لیکن خیر۔ میں تو شابہ سے مانگ لوں گی۔"

وہ بھڑک کر بولی تھیں۔ ان کا لہجہ بھی روکھا سا ہو گیا۔ یہ صبیحہ ہی تھی جس نے اپنے تینوں بیٹوں کو اپنی مرضی سے اپنی بھتیجیوں سے بیاہ دیا تھا اور اب یہی صبیحہ انہیں بیٹے کی لو میرج کا مشورہ دے رہی تھی۔

"اوہو۔ ناراض کیوں ہوتی ہو۔ ڈھونڈ دیتی ہوں تمہیں نمبر۔ لیکن پھر بھی سوچ سمجھ کر اٹھانا کوئی بھی قدم۔ اکلوتا بیٹا ہے تمہارا۔"

وہ ان کی سہیلی تھی، انہیں سمجھانا چاہتی تھی لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ چند دن بعد صبیحہ نے انہیں ایک نمبر ٹیکسٹ کر دیا تھا۔ انہوں نے بھی تاخیر کیے بنا ان بی بی صاحبہ سے فون پر بات کی تھی۔ انہیں کچھ دعائیں پڑھنے کے لیے دی گئی تھیں اور کچھ دعائیں چینی پر دم کر کے اس لڑکی کو کھلانے کی تاکید کی گئی تھی۔ ان کے ذہن سے بوجھ سا ہٹ گیا تھا۔ بی بی صاحبہ سے فون پر بات کرنے کے بعد انہوں نے مہر افروز کو لینڈ لائن پر فون کیا تھا۔ وہ اسے اپنے گھر چائے پر انوائٹ کرنا چاہ رہی تھیں۔ فون اس کی لینڈ لیڈی نے ریسیو کیا تھا۔

"مہر کل رات کی فلائٹ سے لندن چلی گئی ہے۔" انہیں بتایا گیا تھا۔ وہ دنگ رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

"آپ کی چائے۔" ان کا ذہن سویا جاگا سا تھا جب کلے نے چائے کی صدا دی۔

وہ تپائی پر چائے رکھنے کے لیے پلٹی تو وہ باتھ روم کی جانب چل دیے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کلے ان کا زرد چہرہ دیکھے۔ چہرے پر پانی کے چھینٹے مار کر واپس آئے تو وہ وہیں موجود تھی۔ اس کا مطلب تھا اس کا مزاج اب کافی سے زیادہ بہتر تھا۔

انہوں نے ہاتھ میں پکڑا تولیا اسے تھما دیا۔ یہ بھی محبت کی ایک ادا تھی۔ ورنہ وہ اس طرح کے ذاتی کام عام طور سے خود سرانجام دے لیا کرتے تھے لیکن جب ادائے محبوبی دکھانا مقصود ہوتی تھی تو ہر کام کلے سے کروایا جاتا تھا۔ کلے نے بھی ان کے ہاتھ سے تولیا پکڑا اور کھڑکی کی جانب چل دی۔ کھڑکی کا ایک پٹ کھول کر اس نے بہت سلیقے سے اس پر تولیا پھیلا دیا۔ کھڑکی کے کھلنے سے چھنتی ہوئی دھوپ بنا اجازت لیے کمرے میں داخل ہوئی تھی لیکن جب کلے کھڑکی کھولتی تھی تو دھوپ کی آمد میں بھی موسیقیت تھی یا شاید حبیب اللہ خان کو ایسا محسوس ہوتا تھا۔ اب بھی دھوپ کی زرد زرد کرنیں چھن چھن کرتی نہیں بلکہ چھم چھم کرتی ایک قطار میں ان کے بستر تک پھیل گئی تھیں۔ انہیں ہمیشہ ہی لگتا تھا کہ کلے اتنی محبت سے اتنا دل لگا کر ہر کام سرانجام دیتی تھی کہ اس کام کا ردیف قافیہ سُر تال خود بخود درست ہو جاتا تھا۔ یہ عورت انہیں اس لیے بھی عزیز تھی کہ وہ ہر غلط ہوتے کام کو صحیح کر دینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ وہ اُن کا لکی چارم تھی۔ زندگی کے جس معاملے میں کلے کی حمایت ان کے ہمراہ ہوتی تھی، اس معاملے میں انہیں کبھی شکست نہیں ہوئی تھی۔ زندگی کے میدان جنگ میں وہ ان کا ہراول دستہ تھی، ان کا سپہ سالار تھی۔ اسی لیے انہوں نے خوش الحان کو منانے سے بھی پہلے کلے کو اپنی ٹیم میں شامل کرنے کو ترجیح دی تھی۔

انہوں نے کن انکھیوں سے چائے کی ٹرے میں دیکھا جہاں دو پیالیاں موجود تھیں یعنی وہ ان کو چائے پر کمپنی دینے والی تھی جو عام طور سے کم ہی ہوتا آیا تھا۔ چائے کے ہمراہ نازک سی رکابی میں بھی کچھ موجود تھا۔ سرخ رنگ سے انہوں نے اندازہ لگایا کہ شاید گاجر کا حلوہ تھا۔ دوسری رکابی میں ان کی پسندیدہ گھر کی بنی خطائیاں سجا رکھی تھیں۔ چائے کے ساتھ نا صرف اس قدر فراخدلی سے میٹھا دیا جا رہا تھا بلکہ ساتھ بیٹھ کر پینے کا اعزاز بھی بخشا جا رہا تھا۔ دل میں گدگدی ہوئی اور مزید تسلی بھی ہوئی اسی لیے اطمینان سے پلنگ کے ساتھ پڑی بید کی کرسی پر بیٹھ گئے۔

''اتنا اہتمام......'' انہوں نے اپنے تئیں سراہنا چاہا تھا۔ گلّے نے ایک نظر چائے کی جانب دیکھا اور دوسری نظر ان پر ڈالی۔
''خان! ادے کہا کرتی تھی کہ میاں بیوی کو اولاد سے بھی پہلے رزق جوڑتا ہے کیونکہ مرد عورت جب رشتے میں بندھتے ہیں تو ان کا رزق مشترک کر دیا جاتا ہے۔ آپ اور میں لباس یا بستر کے ہی حصہ دار نہیں ہیں بلکہ روٹی کے بھی حصہ دار ہیں۔ ادے کہا کرتی تھی جب جب اپنا مرد بُرا لگنے لگے تو اس کے ساتھ بیٹھ کر میٹھا رزق کھایا کرو۔ رزق کو اپنی حرمت بڑی عزیز ہوتی ہے۔ یہ اپنی لاج رکھتا ہے۔ رزق کی مٹھاس رشتوں میں موجود تلخی کو کم کر کے مٹھاس بڑھا دیتی ہے۔''
اتنی گہری بات کی امید حبیب خان نے کبھی خواب میں بھی گلّے سے نہیں کی تھی۔ چند لمحے وہ کچھ بول ہی نہ سکے پھر جیسے لاجواب ہو کر مسکرائے۔ ہاتھ بڑھا کر ایک خطائی اٹھائی اور خود کھانے سے پہلے اسے کھلائی۔ اس نے ایک ننھا سا لقمہ لیا تھا۔
''ہمارے یہاں تو میٹھا ہر روز کھانے کے بعد کھایا جاتا ہے۔ یعنی بیویوں کو اپنے شوہر اتنے تواتر سے بُرے لگتے ہیں؟'' ان کے چہرے پر شرارتی سی مسکراہٹ تھی۔
''ہو سکتا ہے، ایسا ہی ہو لیکن میں تو آج ہی کھا رہی ہوں۔'' وہ سنجیدہ تھی۔ یہ سچ تھا، وہ میٹھا کم کھاتی تھی اور ان کے ساتھ بیٹھ کر تو بہت ہی کم کھاتی تھی۔ حبیب اللہ خان کو ان ڈھکوسلوں پر یقین نہیں تھا لیکن گلّے کی بات نے انہیں مزا دیا تھا۔
''مجھے افسوس ہے کہ شادی کے اتنے سالوں بعد آج میں آپ کو بُرا لگ رہا ہوں۔'' ان کے چہرے پر ایک بار پھر شرارتی مسکراہٹ چمکی تھی۔ سارا زور ''آج'' پر تھا لیکن گلّے مسکرائی تک نہیں۔ اس نے آگے بڑھ کر ٹرے میں موجود بڑی گاجر کے حلوے کی رکابی کو اٹھایا اور ان کی جانب بڑھا دیا۔
''خان! بے شک یہ پہلی بار ہوا ہے۔ لیکن میں نہیں چاہتی کہ یہ بار بار ہو۔ کوشش کریں کہ یہ موقع دوبارہ بھی نہ آئے۔'' اس کے لہجے میں ایک مان اور بھروسا تھا۔ انہوں نے گہری سانس بھری اور ہاتھ میں موجود بقیہ خطائی کو اس کی جانب بڑھا کر حلوے کی پلیٹ تھام لی مگر منہ سے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکے۔ انہیں جیسے اندازہ ہو گیا تھا کہ گفتگو کس اور جانب مڑنے والی ہے۔
''میں نے کئی بار سن لی ہے یہ کہانی۔ اڑتی اڑتی ہی سہی مگر سن رکھی ہے۔ آپ ان کے احسان تلے دبے ہیں۔ آپ آج جو کچھ بھی ہیں، یہ ان کی مہربانی ہے۔ اگر وہ آپ کا ہاتھ نہ تھامتے تو آپ آج بھی کراچی میں کہیں کسی ڈھابے پر برتن مانجھ رہے ہوتے۔'' وہ لمحہ بھر کو رکی پھر خان کے چہرے کی جانب دیکھا جو بالکل بجھ چکا تھا۔
''خان! ایک بار تسلیم کر کے دیکھیں کہ وہ کچھ اور ہے جس نے آج تک آپ کو باندھ رکھا ہے۔ میں ان پڑھ، جاہل ہو سکتی ہوں۔ نا سمجھ نہیں ہوں خان۔ ایک بار کہہ دیں۔ کہہ کر تو دیکھیں۔ کیا پتا، وہ چیزیں اتنے عرصے سے ٹھیک نہ ہو گئی ہوں۔ آپ کے کہہ دینے سے ٹھیک ہو جائیں۔''
خان نے اس کی جانب دیکھے بنا ہاتھ میں پکڑی گاجر کے حلوے والی رکابی واپس تپائی پر رکھ دی تھی۔ گلّے ایک سادہ عورت تھی انہیں اس بات کا یقین تھا لیکن سادہ عورتیں محاذِ جنگ پر بارود بن جایا کرتی ہیں، اس بات کا یقین انہیں آج آیا تھا۔
''کیا بتاؤں گل لالہ۔ کیا سننا چاہتی ہیں آپ؟'' وہ لاچاری بھرے لہجے میں پوچھ رہے تھے جیسے اب کہے بغیر گزارا نہیں تھا۔

☆☆☆

''حبیب صاحب اس گھر کے ملازم نہیں ہیں بلکہ وہ ہمارے خاندان کا فرد ہیں۔''

یہ جملہ اس کا خون بڑھا دینے کو کافی تھا۔ اٹھارہ سال حبیب اللہ کو اتنے سالوں بعد بھی اس گھر میں اسی نام سے پکارا جاتا تھا جس نام سے پہلے دن پکارا گیا تھا اور اتنا ہی مان بخشا جاتا تھا۔ وہ مالکوں کی ایک صدا پر سر جھکا دینے والوں کے بجائے سر کٹوا دینے والوں میں سے تھا۔ اس کے دل میں اس گھر کی بے پناہ عزت تھی۔ اتنے سالوں میں ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس کی تنخواہ وقت پر نہ دی گئی ہو یا اس کا شکریہ ادا کر کے نہ دی گئی ہو۔ خلیق صاحب وطن میں موجود ہوتے تھے تو اپنے ہاتھوں سے ایک سفید لفافہ اتنے وقار اتنی تعظیم کے ساتھ ''شکریہ'' کہتے ہوئے اسے تھماتے کہ اس کی آنکھیں نم ہونے لگتی تھیں اور اگر وہ وطن سے باہر ہوتے تو سفید لفافہ کسی دوست کے ذریعے اس تک پہنچ جاتا اور اس پر جلی حروف میں ''شکریہ'' ضرور لکھا ہوتا تھا۔

''آپ شکریہ کیوں ادا کرتے ہیں مالک۔ یہ تو مجھے ادا کرنا چاہیے۔'' اس نے ایک بار پوچھ ہی لیا تھا۔ اسے جواب دیا گیا۔

''ارے بھئی، آپ ہمارے محسن ہیں۔ آپ کا شکریہ ادا کرنا واجب ہے ہم پر۔''

''وہ کیوں...... وہ کیسے......؟'' اس نے پھر پوچھا تھا۔ اس کی زبان میں ابھی بھی ہزاروی کی جھلک آتی تھی تو بعض اوقات وہ جملہ دوہرا کر اپنا مفہوم واضح کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

''حبیب صاحب! ہر ملازم اپنے مالک کا محسن ہوتا ہے۔ کیونکہ اسے مالک بنانے والا اس کا ملازم ہی ہوتا ہے۔ آپ میرے حصے کا کام کرتے ہیں کیونکہ وہ کام میں خود نہیں کر سکتا۔ میں اتنا ہی پھنے خان ہوں تو یہ کام خود کیوں نہیں کر لیتا۔ میرے گھر جب کوئی بھی مہمان آتا ہے تو وہ مجھے سراہتا ہے کہ میرا گھر نہ صرف صاف ستھرا ہے بلکہ یہاں موجود ہر چیز میری غیر موجودگی میں بھی نفاست کی اعلا مثال قائم کرتی ہے یعنی وہ مجھے اس چیز کے لیے سراہتے ہیں جو میں کئی سالوں سے کر ہی نہیں رہا۔ وہ تو آپ کر رہے ہیں یعنی آپ نے میری نااہلی کو اپنی مستعدی سے چھپا رکھا ہے۔ میرا پردہ رکھتے ہیں آپ۔ تو پھر آپ میرے محسن ہوئے نا۔ خود ہی بتایئے کیا شکریہ کہنا واجب نہیں ہو جاتا مجھ پر۔'' وہ اپنا نقطۂ نظر بہت اچھے طریقے سے سمجھاتے تھے۔ اس روز حبیب اللہ کی آنکھیں شکر گزاری کے بوجھ سے چھلک پڑیں۔ اس کے سامنے مالک اور ملازم کے رشتے کی ساری تفسیر دو جملوں میں بیان کر دی گئی تھی۔ اللہ کیسا مہربان رہا تھا اس پر۔ اسے رزق بھی عطا کیا جا رہا تھا اور تعظیم بھی۔ ایک حلال رزق ہوتا ہے لیکن جب یہی رزق بے حد تعظیم کے ساتھ آپ تک پہنچایا جاتا ہے تو وہ کمال رزق ہوتا ہے۔ حبیب اللہ کمال رزق پانے والوں میں سے تھا۔

''حبیب صاحب!'' یہ اس کا نام نہیں تھا یہ اس کا اعزاز تھا۔ تمغۂ حسن کارکردگی۔ اور اسے اس اعزاز سے عقیدت تھی۔ اسے اپنا آپ معتبر لگتا تھا۔ وہ اب پہاڑوں میں بسنے والا کوئی عام سا حبیب اللہ نہیں تھا۔ اس کا اندازِ گفتگو، اس کا اٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ اور اس کے پڑھے لکھے ہونے کا رعب اس کی شخصیت کے سحر کو ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھا رہا تھا۔ خلیق صاحب کے اصرار پر وہ پرائیویٹ گریجویشن کر رہا تھا لیکن پڑھائی سے زیادہ اسے دوسری کتابوں کے مطالعہ کا شوق تھا۔ نئی پرانی کتابیں وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتا رہتا تھا اور پھر ان میں گم رہتا تھا لیکن اپنے فرائض سے روگردانی اس نے کبھی بھی نہیں کی اگرچہ گھر کے مالک اپنے کنبے سمیت وطن سے باہر رہتے تھے اور اس کی ذمہ داریاں بہت زیادہ نہیں تھیں مگر جب بھی وہ وطن میں ہوتے تھے تو ان سب کی ایک آواز پر لبیک کہنا اس کی عادت تھی لیکن ان آوازوں میں ایک آواز ایسی بھی تھی جسے وہ سوتے ہوئے بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا اور وہ آواز خلیق صاحب کی بیٹی شیریں کی تھی۔

☆☆☆

''ایسے لگاتے ہیں گیئر۔ ایسے تو کوئی اندھا بھی گیئر نہیں لگاتا ہوگا حبیب صاحب! جیسے آپ لگاتے ہیں۔'' وہ اسے گاڑی چلانا سکھا رہی تھی حالانکہ وہ عمر میں اس سے چھوٹی تھی لیکن تمیز سے مخاطب کرنے کے باوجود وہ ڈانٹتی بھی بہت زیادہ تھی۔ حبیب اللہ نے زندگی میں کبھی طریقے سے گاڑی نہیں چلائی تھی لیکن خلیق صاحب جب

پاکستان آتے تھے تو چھوٹی موٹی کوئی گاڑی خرید لیتے تھے اور مہینے دو مہینے بعد جب واپس جانا ہوتا تھا تو گاڑی بیچ جایا کرتے تھے، اسی لیے اسے تھوڑی بجھ بوجھ تو تھی۔ یہ پہلی بار تھا کہ انہوں نے حبیب اللہ کو ڈرائیونگ سیکھنے کی ترغیب دی تھی اور اسے تھوڑا بہت سکھانا شروع کیا تھا۔

"یہ دیکھیں۔ ادھر ہاتھ رکھیں اور آگے کی جانب پش کریں۔ ڈی پر رکھیں اور ایکسیلیٹ کریں۔ ایسے بتایا تھا ڈیڈی نے۔" اس نے جو کہا وہی کر کے دکھایا لیکن اس سے تصدیق بھی کروانی چاہی تھی۔ حبیب اللہ نے بنا سوچے سمجھے سر ہلایا۔ گاڑی آہستہ سے آگے کی جانب بڑھی تھی

"ہمم پوکو۔" وہ اس کی جانب دیکھ کر فخر سے ہنسی تھی جیسے بہت خوشی ہوئی ہو۔ گاڑی دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگی تھی۔

"آپ کی سمجھ میں آرہا ہے نا؟" وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔ حبیب اللہ کا سارا دھیان ڈرائیونگ کی ہی جانب تھا لیکن اسے سمجھ کچھ بھی نہیں آرہا تھا اور سچ بات یہ ہے کہ اسے ڈر بھی لگ رہا تھا۔ وہ جب ساتھ ہوتی تھی تو اس سے ویسے بھی کوئی کام ڈھنگ سے نہیں ہو پاتا تھا لیکن پھر بھی اس نے سر ہلایا۔

"جی جی۔ میں سیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔ آپ جلد سیکھ لیں گے۔ لیکن یہ سوالا جٹ والا ہاتھ کام نہیں آئے گا۔ ذرا محبت سے ٹریٹ کریں اسے۔ یہ گاڑی ہے آپ کے ابا جان کا ریکارڈ پلیئر نہیں ہے کہ آپ تھپڑ مار مار کر گانے چلے کرتے رہیں گے۔ ایسے ہی بتایا تھا ڈیڈی نے۔" وہ ناک چڑھا کر بولی تھی۔ حبیب اللہ کو بالکل ہنسی نہیں آئی تھی۔

"جی ٹھیک ہے۔" وہ سعادت مندی سے بولا تھا۔ گاڑی تھوڑا سا مزید آگے بڑھی تھی اور اب وہ گھر سے ذرا دور ہو گئے تھے۔ وہ پوش ایریا تھا۔ سڑک پر سناٹا تھا۔ اس وقت لوگوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر ہوتی تھی۔ وہ بہت اطمینان سے گاڑی آگے ہی آگے لے جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اس مقام پر پہنچ گئے جہاں دائیں طرف گلی تھی جبکہ سامنے سے ایک اور گاڑی آرہی تھی۔

"اسے واپس کیسے موڑیں گے؟" یک دم اس نے حبیب اللہ کی جانب دیکھ کر پوچھا تھا۔ وہ چونک کر ذرا سا اس کی جانب مڑا تھا۔

"آپ کو گاڑی چلانی نہیں آتی؟" اس نے پوچھا تھا۔ شیریں نے پہلے نفی میں گردن ہلائی پھر اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

"آتی ہے۔ لیکن اب اتنی اچھی بھی نہیں آتی۔ بھول جاتی ہوں میں کبھی کبھی۔" اسی اثنا میں سامنے سے آنے والی کار ہارن بجانے لگی تھی کیونکہ یہ بالکل سیدھ میں رہے تھے۔

"بریک لگائیں نا؟" اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں مشورہ دیا تھا۔

"وہ کیسے لگاتے ہیں؟" اب کی بار اس کی آواز میں بھی گھبراہٹ تھی۔ سامنے سے آنے والی گاڑی ہارن بجاتے بجاتے خود ہی سائیڈ سے نکل گئی تھی لیکن اس کے عقب میں ایک بائیک چلی آرہی تھی۔

"یہ اس پر پاؤں رکھیں۔ زور سے دبائیں۔ جلدی کریں۔" بائیک کو دیکھ حبیب اللہ کے اوسان مزید خطا ہوئے تھے۔ اس نے بریک پیڈل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ابھی تک اس کو سب سے زیادہ مشکل بریک لگانے میں ہی آئی تھی۔ جبکہ وہ اس کی بتائی ہوئی ہدایات پر عمل کر رہی تھی۔ مگر آج کا دن اچھا نہیں تھا۔

ٹھک کی زوردار آواز آئی تھی۔ اس نے زور سے چیخ ماری تھی جبکہ حبیب اللہ نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔

☆☆

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

افشین نعیم

یار دل آزار

"یار احسن! کل رات، خواب میں، میں نے تیری شادی ہوتے دیکھی ہے۔" عادل نے بولتے بولتے مالٹے کی ایک پھانک منہ میں رکھی اور بیج پچکاری کے سے انداز میں منہ سے نکالا جو سیدھا جا کر احسن کے ہاتھ سے ٹکرایا۔

"ذلیل آدمی۔" احسن بیج ہاتھ سے پرے

پھیکتا ہوا سخت بھنائے ہوئے انداز میں بولا۔

"نہیں یار وہ ذلیل آدمی میں نہیں تو تھا۔"

"میں نے اپنے آپ کو نہیں، تجھے دولہا بنے دیکھا تھا۔" عادل نے دانت نکالتے ہوئے ایک اور پھانک منہ میں رکھی۔

"ذلیل، میں نے تجھے تیری حرکتوں کی وجہ سے کہا ہے۔" احسن نے ادھر ادھر بکھرے مالٹے کے چھلکوں کو دیکھتے ہوئے عادل کو جواب دیا۔

"اور آدمی؟" اس کے منہ سے اتفاقاً نکل گیا۔

"اگر سوچ سمجھ کے بولتا تو ذلیل بابندر بولتا۔" صوفے پر نیم دراز حیدر نے آنکھیں موندے موندے تبصرہ کیا۔

"تو شادی کے بعد سے بہت بدتمیز ہو گیا ہے۔ میں کئی بار نوٹ کر چکا ہوں یہ بات۔" عادل نے آخری پھانک منہ میں رکھتے روئے سخن حیدر کی جانب کیا۔

"پھر تو تجھے شادی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تو بغیر شادی کیے ہی اچھا خاصا بدتمیز ہے۔" حیدر نے فوراً جوابی وار کیا۔

"عادل بھائی! آپ احسن بھائی کی شادی کی بابت کچھ بتا رہے تھے۔" انس جو خاصے اشتیاق سے اس کی بات سن رہا تھا، بے مزہ ہو کر بولا۔

"اپنے کانوں کا علاج کرا...... وہ اپنے خواب کے بارے میں بات کر رہا تھا۔" حیدر نے آنکھیں کھول کر انس کو گھورا۔

"ہاں تو خواب میں احسن بھائی کی ہی شادی ہو رہی تھی نا۔" انس ناک چڑھا کر بولا۔

"ہاں، ہاں...... میں خواب سنا رہا تھا۔" عادل پھر سے احسن کی جانب متوجہ ہوا۔

"تو میں نے خواب میں خوب دھوم دھڑکے کے ساتھ تیری شادی ہوتے دیکھی اور چونکہ سننے میں آتا ہے کہ خواب کی تعبیر ہمیشہ الٹ ہوتی ہے لہٰذا مجھے لگ رہا ہے کہ تجھے کنوارا ہی دارِ فانی سے کوچ کرنا پڑے گا۔"

عادل نے ایک دل جلانے والی مسکراہٹ کے ساتھ بات مکمل کی۔ احسن کا تو دل ہی جل کر خاک ہو گیا، ایسی بے ہودہ تعبیر پر سوختہ کر بولا۔

"اگر انسان کی شکل اتنی منحوس ہوتا جتنی کہ تیری ہے تو اس کو کم سے کم زبان سے اچھی بات نکالنی چاہیے۔"

"او، یار تو...... تو ناراض ہی ہو گیا۔ اچھا چل، غصہ تھوک دے، اب میں اچھی بات نکالتا ہوں زبان سے۔" عادل نے مسکراتے ہوئے احسن کو دیکھا۔

احسن نے محض سر جھٹکنے پر اکتفا کیا۔ جب کہ حیدر اور انس عادل کی طرف منتظر نظروں سے دیکھنے لگے۔

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنی شادی پر سہرا بالا تجھے ہی بناؤں گا۔ اس طرح کسی نہ کسی حد تک تو تیرے ارمان پورے ہو ہی جائیں گے۔"

عادل کی بات ابھی درمیان ہی میں تھی کہ احسن احتجاجاً واک آؤٹ کر گیا۔

"اس کے ارمانوں کو چھوڑ تو اپنی سنا، تیری شادی کا معاملہ کہاں تک پہنچا؟" حیدر نے سکون سے کہتے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔

"حق ہاہ......!" ایک طویل حسرت بھری سانس عادل کے حلق سے خارج ہوئی۔ "یار مجھے اپنی شادی کی نیا پار لگانے کے لیے اپنے ان دور پار کے عزیز و اقارب کو منہ لگانا پڑے گا جنہوں نے آج تک مجھے منہ نہیں لگایا۔"

"یہ انوکھا سا خیال کس نے تیرے دماغ میں ڈالا؟" حیدر نے بہت سے بل ماتھے پر ڈال کر غور سے عادل کو دیکھا۔

"تیرا بھائی خود بڑا جینیس ہے۔" عادل نے فخر سے کالر کھڑے کیے۔

"تو، اس جینیس دماغ نے یہ نہیں سمجھایا کہ جن لوگوں نے آج تک منہ نہیں لگایا، وہ اب کس خوشی میں منہ لگائیں گے؟ جب کہ مطلب بھی ان کا نہیں تیرا ہے......؟"

"ہاں...... یہ تو نہیں سمجھایا، میرے ذہین فطین دماغ نے۔" عادل نے سر ہلاتے ہوئے حیدر کو دیکھا۔

"یار! آپ لوگ بور کر رہے ہیں مجھے۔" انس کچھ بے زاری شکل بنا کر بولا۔

"تو، آپ کی بوریت دور کرنے کے لیے اب کیا آئٹم سونگ پیش کریں؟" عادل نے گردن موڑ کر انس کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"استغفر اللہ۔" بے اختیار و بے ساختہ انس کے منہ سے نکلا۔

"کبھی تو سنجیدہ ہو جایا کریں عادل بھائی۔" انس کچھ جھینپ کر بولا۔

"اتنی سنجیدہ گفتگو کر رہے تھے ہم، میری شادی سے متعلق، تو جناب بور ہونا شروع ہو گئے۔ اب بتا بھائی کیا چاہتا ہے تو......؟" عادل سب کچھ بھول بھال کر انس کے پیچھے پڑ گیا۔

"میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک بار کم سے کم نہال بھائی سے ملنے ضرور جائیں اور......"

"اور بے عزت ہو کر وہاں سے نکلے جائیں۔"

عادل نے درمیان سے بات اچک کر جملہ مکمل کیا۔

تب ہی محب اللہ کمرے میں داخل ہوا۔ ٹوپی سر سے اتار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھی۔

"کیا باتیں ہو رہی ہیں؟" انس اور عادل کو گفتگو میں مصروف دیکھ کر پوچھا۔

"تیری تعریف کر رہے تھے یہ دونوں۔"

جواب حیدر کی طرف سے آیا۔

محب اللہ سمیت تینوں نے اچنبھے سے حیدر کو دیکھا۔

"بھائی! تیری انٹرٹینمنٹ کا بندوبست کرنے والا ہے دھیان سے سن۔" عادل نے انس کے کان میں سرگوشی کی، جس کا دھیان مکمل طور پر حیدر کی طرف تھا۔

دوسری جانب محب اللہ حیدر سے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں تو کیا تعریف ہو رہی تھی میری؟"

"تیری تعریف یہ ہو رہی تھی کہ تو ماشاء اللہ سے شادی کے بعد سے اباجی کا بڑا تابعدار اور فرماں بردار ہو گیا ہے۔"

حیدر نے کھنکھارتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"مطلب......؟" محب اللہ نے آنکھیں سکوڑ کر پوچھا۔

"مطلب، جناب جب سے شادی شدہ ہوئے ہیں۔ ہر ہفتے اباجی کی خیریت دریافت کرنے گھر جاتے ہیں۔ ورنہ پہلے تو مہینے میں ایک چکر، چلو بہت ہوا تو دو۔ ہاں فون پر ہر روز بات ہو جاتی تھی۔ پر، اب......" حیدر نے بڑے معنی خیز انداز میں بات ادھوری چھوڑ دی۔

عادل اور انس نے کھی کھی شروع کر دی۔ حیدر نے بھرپور طریقے سے ان کا ساتھ دیا۔ محب اللہ بس ان تینوں کو گھورتا ہی رہ گیا۔

☆☆☆

"دو بہت اہم خبریں ہیں میرے پاس بلکہ دو، نہیں تین۔" [illegible] آ کر صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھتے ہوئے احسن نے انس کو مخاطب

کیا۔
''اچھی ہیں یا بری......؟'' انس کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔
''ایک بری ہے...... دو اچھی۔'' احسن نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا۔
''آپ کے انتظار میں چائے نہیں پی میں نے اب تک۔ چائے تیار ہے۔ میں لاتا ہوں پھر بات کرتے ہیں۔''
''ہوں، چائے کی طلب تو مجھے بھی ہو رہی ہے۔'' احسن نے سر ہلایا۔
انس، کچن کے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ جب احسن کے بلانے پر رکا۔
''جی......'' مڑ کر احسن کو دیکھا۔
''تیرے اندر اچھی بیویوں والی تمام خصلتیں موجود ہیں۔ بہت ترقی کرے گا۔''
''احسن بھائی! آپ بھی ناں......'' وہ سر جھٹکتا کچن میں داخل ہو گیا۔
چائے لا کر، اس نے میز پر رکھی۔
''جی، تو بتائیں کیا خبریں ہیں آپ کے پاس؟'' سنگل سیٹر صوفے پر بیٹھتے اس نے احسن کو مخاطب کیا۔
''میرا خیال ہے اچھی خبر سے شروع کرتا ہوں۔'' احسن چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے بولا۔
''ہوں۔'' انس ہمہ تن گوش ہوا۔
''سید عباد حیدر۔ دنیا میں تشریف لائے ہیں۔'' ڈرامائی انداز میں احسن نے کہنا شروع کیا۔
''سید عباد حیدر۔'' انس نے زیر لب دہرایا۔
''یہ کون ہیں؟''
''تھوڑا سا زور ڈال اس کمزور سے بھیجے (مغز) پر۔'' احسن نے اس کے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''عباد حیدر......؟'' ایک مرتبہ پھر انس نے دہرایا۔
''حیدر بھائی......'' ایک دم سے وہ اچھل کر کھڑا ہوا۔
احسن نے ہنستے ہوئے ہاں میں سر ہلایا۔
انس فرط مسرت سے احسن کے گلے لگ گیا۔
''کب بجے ہم لوگ چاچو......؟'' انس نے بے تابی سے پوچھا۔
''آج صبح...... حیدر کی کال آئی تھی۔ کہہ رہا تھا سب سے پہلے تجھے خبر دے رہا ہوں۔ باقی گھر والوں کو بعد میں بتاؤں گا۔ تو میرے باقی یاروں کو خبر کر دینا۔'' احسن اپنی اور حیدر کی گفتگو کا خلاصہ سنا رہا تھا۔
''اچھا......''
''اور کیا بتا رہے تھے؟''
''اور......'' احسن نے دماغ پر زور ڈال کر یاد کرنے کی کوشش کی۔
''کہہ رہا تھا، آنکھیں اور کان مجھ پر ہیں اور باقی پورا ماں کی کاپی ہے۔''
انس، بچوں کی طرح خوش ہو رہا تھا۔ ''ہمارے خاندان کا پہلا بچہ......''
''ہمارے خاندان کا......؟'' احسن نے حیرت سے اس کی بات دہرائی۔
''جی...... ہم یاروں کے خاندان کا......''
''بالکل ٹھیک......'' احسن نے تائید میں سر ہلایا۔
''اور مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ ٹریٹ، یہاں آ کر لو گے یا میں وہاں آ کر دوں۔'' احسن کچھ یاد آنے پر بولا۔
''پھر...... آپ نے کیا کہا......؟'' انس کی بے تابی عروج پر تھی۔ میں نے کہا......
''ٹریٹ ہم دیں گے۔ ہمارا بھتیجا ہوا ہے آخر۔'' احسن مسکراتا ہوا بولا۔
''بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔''
''اچھا اور دوسری اچھی خبر......'' انس کو اچانک یاد آیا۔
''پچھلے ماہ...... میرا پروموشن ہوا تھا نا......''

احسن نے کہنا شروع کیا۔
"جی......" انس نے سر ہلایا۔
"تو اس کے ساتھ کچھ مراعات بھی تھیں۔ جو اس آنے والے ماہ مجھے مل رہی ہیں ان شاء اللہ۔"
"ان شاء اللہ!" انس نے اس کے پیچھے دہرایا۔
"کیا مراعات ہیں احسن بھائی......؟" انس نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔
"کمپنی والے رہائش دے رہے ہیں رووات کے علاقے میں۔"
"گڈ......!" انس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
"مگر یہاں سے تو دور پڑے گا مگر جو پروجیکٹ میرے حوالے کیا گیا ہے وہ رووات ہی میں شروع ہو رہا ہے۔ سو رہائش بھی کہیں آس پاس ہی ہوگی۔"
"اوہ......" انس نے ہونٹ سکیڑے۔
"اور بری خبر......" انس نے سوالیہ نظروں سے احسن کو دیکھا۔
"نہال [illegible]ئی کو بہت شدید دل کا دورہ پڑا ہے۔ وہ آئی سی یو میں ہیں۔"
"او میرے خدا......!" انس نے چائے کی پیالی میز پر رکھی۔
"عادل کی کال آئی تھی صبح میرے پاس۔ کہہ رہا تھا کہ محب اللہ اور حیدر تو اپنے اپنے گھروں میں ہیں۔ اس لیے تجھے بتا رہا ہوں کہ نہ جانے کتنے دن ہاسپٹل میں رہنا پڑے۔ پریشان نہ ہونا میری غیر حاضری پر۔"
احسن، چند لمحے کے لیے خاموش ہوا۔
"عادل بھائی کو کس نے بتایا......؟" جو سوال سب سے پہلے اس کے ذہن میں آیا۔ اس نے پوچھ ڈالا۔
"نہال بھائی کے سسر کی کال آئی تھی۔ بچوں کو میکے چھوڑ کر بھابھی ہی اپنے والد صاحب کے ساتھ ہاسپٹل میں بھاگ دوڑ کر رہی ہیں۔ انکل نے پہلے ہی عادل کو کال کی...... وہ اسی وقت نکل پڑا تھا...... مجھے راستے سے فون کیا تھا۔"

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ، دونوں کے درمیان آیا۔
"ہمیں جانا چاہیے...... عادل بھائی اکیلے پریشان ہو رہے ہوں گے۔"
انس کی بات پر، احسن نے پر سوچ انداز میں سر ہلایا۔
"ہاں...... میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔"
"ٹھیک ہے پھر ایک، ڈیڑھ گھنٹے تک نکلتے ہیں۔" انس چائے کے کپ اٹھاتا بولا۔
احسن نے اس کے ہاتھ پکڑے۔
"شہزادے، مجھے دے، میں رکھ کر آتا ہوں۔ تو میری بیوی نہیں ہے۔"
انس نے مسکراتے ہوئے دونوں کپ اس کے حوالے کیے اور خود شاور لینے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

"کتنی دیر تک چلے گی گاڑی استاد......؟"
احسن نے اکا دکا خالی سیٹوں کو دیکھتے ہوئے ڈرائیور سے پوچھا جو نیچے اترنے کی تیاری کر رہا تھا۔
"بس باؤ جی...... یہ دو چار سیٹیں رہ گئی ہیں۔ یہ ذرا پر ہو جائیں تب تک میں یہ سامنے سے چائے پی کر آتا ہوں۔" وہ ہاتھ سے چھپر ہوٹل کی طرف اشارہ کرتا نیچے اتر گیا۔
"کیا خیال ہے جگر......؟" احسن نے انس کی طرف دیکھا۔ "کچھ کھا، پی لیا جائے۔"
"چلیں......" انس، کندھے اچکاتا ہوا بولا۔
وہ دونوں آگے پیچھے نیچے اتر آئے اور تقریباً تقریباً ڈرائیور کے ساتھ ہی ہوٹل میں داخل ہوئے۔
چھوٹے سے ہوٹل میں گنجائش بہت زیادہ نہیں تھی۔ پھر بھی ایک طرف دو خالی کرسیاں نظر آگئیں۔ سو، جلدی سے جا کر ان پر قبضہ کر لیا۔
"بھوک لگ رہی ہے، میرا خیال ہے کھانا منگوا لیتے ہیں۔" انس نے سوالیہ نظروں سے احسن کو دیکھا۔
"گاڑی نہ نکل جائے کہیں......" احسن کچھ

سوچتا ہوا بولا۔

"نہ، نہ باؤ...... آرام سے کھانا کھاؤ۔ آپ کے بغیر گاڑی نہیں چلے گی۔"

عین ان کے عقب سے ڈرائیور کی آواز آئی جو شڑپ شڑپ کر کے چائے پیتے ہوئے ان ہی دونوں کی طرف متوجہ تھا۔

کھانے کا چونکہ وقت نہیں تھا، اس لیے صرف دوپہر کی بچی ہوئی دال ماش دستیاب تھی۔ سو، وہی منگوالی۔

پہلا نوالہ منہ میں رکھتے ہی دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ چہرے کے زاویے خود بخود عجیب سے ہو گئے تھے۔

"اتنا ذائقہ کھانا تو ہم خود گھر میں بھی بنا لیتے ہیں، ناحق روپے برباد کیے۔" انس، بری سی شکل بنا کر بولا۔

"مطلب یہ کہ ہم بھی اپنا ایک آدھ ہوٹل تو کھول ہی سکتے ہیں۔" احسن نے ایک اور نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

اسی وقت اس کے موبائل کی بیپ بجنا شروع ہو گئی۔

"گھر سے فون آرہا ہے۔"

"میں ذرا باہر جا کر سن کر آتا ہوں۔ تو ختم کر کھانا۔ میرا تو پیٹ بھر گیا ہے۔"

وہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

"کوسٹر، چل کیوں نہیں رہی آخر......" چھ منٹ میں وہ نازک اندام حسینہ، یہ سوال کوئی پانچ مرتبہ پوچھ چکی تھی۔ اور کنڈیکٹر اس کو کوئی بھی تسلی بخش جواب دینے میں ناکام ہوا جا رہا تھا۔

"باجی! میں تو کلینر ہوں۔ ڈرائیور کو ملوم (معلوم) ہوگا کہ گڈی (گاڑی) کیوں نہیں چل رہی۔" آخر بے زار ہو کر اس نے نسبتاً ایک معقول جواز پیش کیا۔

"اور کہاں ہے تمہارا ڈرائیور......؟" سخت غصے میں اس نے سوال کیا۔

"وہ بیٹھا ہے......" کنڈیکٹر نے ہاتھ سے چھپر ہوٹل کے اس کونے کی جانب اشارہ کیا۔

جہاں ڈرائیور لمبے لمبے سڑپے مار کر چائے پی رہا تھا۔ مگر جب تک حسینہ نے اس سمت نظر کی۔

تب تک وہ، وہاں سے اٹھ کر واش روم کی جانب بڑھ چکا تھا۔

لہٰذا، اس کونے میں اکیلا انس بیٹھا ماش کی دال زہر مار کرنے کی اپنی سی کوشش کر رہا تھا۔

"ہوں......"

غصے میں تن فن کرتی، انتہائی جارحانہ انداز میں انس کے سر پر کھڑی، وہ اس سے مخاطب تھی۔

"آپ، یہاں مزے سے کھانا تناول فرما رہے ہیں۔ کچھ احساس ہے۔ آپ کو دوسروں کا......؟"

انس تو اس اچانک افتاد پر گھبرا ہی گیا۔

(یا اللہ، تو ہی جانتا ہے، یہ کھانا میں "کس" مزے سے تناول فرما رہا ہوں) دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کو مخاطب کرتے، وہ اس انجان حسینہ کے جملے کو دل میں دہرانے لگا۔

(لگتا ہے بے چاری کافی دیر سے نہیں، کب سے بھوکی ہے۔ پہلا خیال یہی آیا دل میں)

"نہیں...... آپ بھی کھا لیں (مزے سے)۔"

"دماغ تو خراب نہیں ہو گیا آپ کا......؟" وہ غصے سے لال سرخ ہوتے ہوئے بولی۔

"میں آپ کا جھوٹا کھانا کھاؤں گی۔"

"میں اور منگوا دیتا ہوں۔ آپ بیٹھیں تو سہی۔"

(اتنی خوب صورت لڑکی...... وہ بھی اس قدر بھوکی۔ دل آپوں آپ ہمدردی سے بھر گیا۔)

"آپ کو، کوسٹر میں بیٹھے مسافروں کا کچھ خیال ہے......؟"

"ہیں......!" انس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"ان سب مسافروں کو میں نے کھانا کھلانا ہے......؟"

"مسافروں کو کھانا نہیں کھلانا، ان کی منزل تک پہنچانا ہے۔ گاڑی چلانی ہے۔"

"یہ گاڑی میں نے چلائی ہے؟" انس نے گھبرا کر اس بائیس سیٹر مسافر وین کو دیکھا۔
"میں نے گاڑی چلائی تو مسافر یقیناً اپنی حقیقی منزل تک پہنچ جائیں گے۔" (بس سوچ کر رہ گیا۔)
"تشریف لے آئیں اب۔"
"ایک ڈرائیور کو اتنا بھی غیر ذمہ دار نہیں ہونا چاہیے۔" وہ جس تیزی اور غصے سے آئی تھی۔ اسی سے واپس چلی گئی۔
انس کی نظریں جس حد تک اس کا تعاقب کر سکتی تھیں، کر کے جب واپس لوٹیں تو آس پاس کے لوگوں کو عجیب عجیب نظروں سے اپنی طرف دیکھتا پایا۔
بے چارہ، سر جھکا کر رہ گیا۔
"یہ کیا سین تھا......؟" احسن کی آواز پر اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ (غالباً کچھ نہ کچھ اس گفتگو کی بھنک احسن کے کان میں بھی پڑ چکی تھی۔)
"اللہ جانے کون تھی......؟ مجھے ڈرائیور سمجھ کر بے نقط سنا گئی ہے۔" اس کی مسکین شکل، اوپر سے اتنا بے چارہ انداز۔
بے ساختہ ہی احسن کا قہقہہ چھوٹا۔
"ویسے احسن بھائی......" احسن کے کان سے کچھ قریب ہو کر انس نے کہنا شروع کیا۔
"کیا میں واقعی میں...... شکل سے ڈرائیور لگتا ہوں......؟"
"نہیں یار......" بے ساختہ آتی ہنسی کو بمشکل کنٹرول کرتے احسن بولا۔
"شکل سے تو تو پلمبر لگتا ہے۔"
"احسن بھائی......" بہت ہی ناراض نظروں سے اس نے احسن کو دیکھا۔ پاؤں پٹخ کر جانے کی باری اب انس کی تھی۔

☆☆☆

بس اسٹینڈ سے عادل کو کال کرنے کے صرف بیس منٹ بعد وہ دونوں عادل کے سامنے موجود تھے۔
احسن اور انس ہنس ہنس کر بے حال ہوئے جا رہے تھے۔ عادل غصے سے ان دونوں کو ہنستا دیکھ رہا تھا۔
"یار، ایک گیس کے درد کو قبلہ سسر حضور نے دل کا دورہ بنا دیا۔ وہ بھی شدید......" احسن آنکھوں کا پانی صاف کرتے ہوئے بولا۔
"نہال بھائی کو سینے میں درد اٹھا تھا۔ وہ تو یقیناً تکلیف سے بے حال ہوں گے۔" عادل نے بتانا شروع کیا۔ "بھابھی نے ابا جی کو بلوالیا، ابا جی نے خود کو حکیم لقمان سمجھتے ہوئے فوراً سے ہی اس درد کو دل کا دورہ ڈکلیئر کر دیا اور ساتھ ہی مجھے کال کر دی۔
ڈاکٹرز کے ہر طرح تسلی کروا دینے کے باوجود وہ مصر تھے کہ یہ ہارٹ اٹیک ہی تھا۔
"تو، اب کیسی طبیعت ہے نہال بھائی کی۔" انس نے پوچھا۔
"ٹھیک ہے۔ بلکہ اس وقت بھی ٹھیک ہی تھی جب میں یہاں پہنچا تھا۔ میرے یہاں پہنچنے تک ان کو ابتدائی طبی امداد دے کر ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔"
"تو، تو کم سے کم ہمیں تو بتا دیتا ساری صورت حال۔" احسن نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔
"مجھے کیا پتا تھا کہ تم لوگ منہ اٹھا کر یہاں آ جاؤ گے۔"
"تو اب منہ کہاں چھوڑ کر آتے۔ اٹھا کر ہی لانے تھے نا ساتھ۔" انس مسکین سی شکل بنا کر بولا۔
"تو، اس وقت کہاں ہیں نہال بھائی......؟ ملواؤ ان سے۔" احسن بولا۔
"اپنے سسرال میں ہیں، چلتے ہیں وہیں۔" عادل اٹھتے ہوئے بولا۔
"میں تو ان کو گھر پہنچا کر واپسی کے لیے نکلنے والا تھا۔ لیکن نہال بھائی اور باقی سب نے اتنا اصرار کیا کہ مجبوراً مجھے رکنا پڑا۔"
"بھابھی نے بھی......؟" احسن نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔
"جی جناب، سب سے زیادہ تو بھابھی ہی کا

اصرار تھا۔ ابھی بھی میں نے تم لوگوں کے آنے کا بتایا تو بھابھی نے گھر کی چابی تھمادی..... کہ دوستوں سے کہنا اپنا ہی گھر سمجھ کر رہیں۔''

''واقعی......!'' انس کی نظروں میں بھابھی سے پہلی ملاقات کا منظر گھوم گیا۔

''جی، بلکہ بھابھی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ دوستوں کو کھانا وغیرہ باہر سے لاکر کھلانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''تو مطلب..... ہمیں یہاں بھی تیرے ہاتھ کا بدذائقہ کھانا ہی کھانا پڑے گا۔'' احسن نے برا سامنہ بنایا۔

''نہیں، کھانا تو نہال بھائی کے سسرال میں تیار ہو رہا ہے۔ ہمیں تو بس تناول فرمانا ہے۔'' عادل نے ایک بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

''تو پھر......؟'' عادل نے سوالیہ نظروں سے دونوں کو دیکھا۔

''چلو....'' احسن کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

انس نے بھی اس کی تقلید کی۔

آگے پیچھے وہ گھر سے باہر نکلے۔ عادل نے دروازہ لاک کیا۔ دو قدم ہی آگے بڑھائے تھے کہ ماتھے پر ہاتھ مار کر رک گیا۔

''اوہ نو....''

''کیا ہوا......؟'' انس نے اس کی پریشان شکل دیکھ کر پوچھا۔

''چابی اندر رہ گئی کیا......؟'' احسن نے قیاس آرائی کی۔

''نہیں..... افضال بھائی کو فون کرنا بھول گیا۔'' وہ دو انگلیوں سے پیشانی مسلتے ہوئے بولا۔

''چھوڑ یار......گیس کا ہی درد تھا نا......اب کیا ان کو فون کر کے پریشان کرنا۔'' احسن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''وہی تو..... بتانا تھا فون کر کے۔'' عادل رونی شکل بنا کر بولا۔

''ہارٹ اٹیک کا تو میں نے اسی وقت بتا دیا تھا جب مجھے پتا چلا تھا۔''

''تو...... اب بتا دیں۔'' انس نے آسان حل پیش کیا۔

''اب تک تو ان کا جہاز اڑان بھی بھر چکا ہوگا عمان سے۔'' عادل کے پیٹ میں گرہیں سی پڑ رہی تھیں۔

''سیٹ مل گئی تھی ان کو پہلی دستیاب فلائٹ سے آنے کا کہا تھا انہوں نے۔''

''اوہ.....'' احسن نے ہونٹ سیٹی کے سے انداز میں گول کیے۔

''ہم تو نہال بھائی سے ملنے آئے تھے۔ لیکن قدرت کو افضال بھائی سے بھی ہماری ملاقات منظور تھی۔ شاید۔''

''یار..... مجھے لگ رہا ہے۔ نہال بھائی سے تعلقات بحال ہوتے ہی افضال بھائی سے تعلقات خراب ہونے والے ہیں۔''

''عادل......! رونا نہیں یار......!'' احسن نے اس کی شکل پر بارہ بجتے دیکھ کر کہا۔

''ارے بھابھی بھیجیں گی نا۔ ہم نے تجھے مارا ہے۔''

بھابھی کے گھر کی طرف رواں دواں تھا یہ قافلہ، جب عادل کے موبائل کی بیپ بجی۔

موبائل، جیب سے نکال کر نمبر دیکھا اور فون کان سے لگایا۔ تھوڑی دیر بات کی۔

فون بند کیا تو انس اور احسن سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''بڑی بھابھی تھیں عمان سے۔ افضال بھائی صبح چار بجے لینڈ کر جائیں گے۔ انہیں ریسیو کرنا ہوگا۔''

''چل بیٹا! پیٹ بھر کر کھانا کھا لے۔ ہو سکتا ہے افضال بھائی کے ہاتھوں تھوڑی بہت مار بھی کھانی پڑ جائے۔'' احسن نے دانت نکالے۔

عادل، بغیر کوئی جواب دیے بس اسے گھور کر رہ گیا۔

☆☆

لوگ کیا کہیں گے

نور ظفر

"مجھے آج تک یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ ہمارا گھر ہے یا لوگوں کا جہاں ہماری مرضی کم چلتی ہے اور لوگوں کی زیادہ۔ ہر کام میں لوگوں کا کہا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ کوئی بھی کام کرنے سے پہلے یہ فکر ہوتی ہے کہیں لوگ باتیں نہ بنائیں بہت چپ رہ لیا ہم نے اماں! مگر اب نہیں کب تک ہاتھ پہ ہاتھ دھرے، ہم لوگوں کا منہ دیکھیں؟"

"ارے بس کر دے شمی! بس کر دے۔ میرا سر مت کھا۔ تیری بہکی باتیں سن سن کر میرے سر میں درد رہنے لگا ہے۔ تو کیا کم تھی اب چھوٹی تینوں بھی تیرے پیروں پر پیر رکھ رہی ہیں' خدا کا واسطہ ہے تجھے۔ یہ گل افشانیاں اپنے باپ کے سامنے مت کر دینا' وہ تو پہلے ہی لوگوں کی باتیں سن سن کر تنگ آ گیا ہے۔ ویسے میں دیکھ رہی ہوں تیری یہ زبان درازی کے دورے بڑھتے جا رہے ہیں۔ بہت چل گئی ہے تیری زبان۔"

"ٹھیک ہے اماں! اب میں تم سے کوئی بات نہیں کروں گی۔ اب ساری باتیں ابا سے ہی کروں گی۔ آخر ہمارا قصور کیا ہے، ہم کیوں ذلیل ہوں۔ جس کا دل کرتا ہے چند روپوں کے لیے بے عزت کر کے چلا جاتا ہے۔" شمی دھپ دھپ کرتی چلی گئی۔

دیہات کے عام گھروں کی طرح یہ بھی ایک پرانا، بوسیدہ عورتوں سے بھرا گھر تھا جہاں کھانے والے بہت زیادہ اور کمانے والا صرف ایک ہوتا ہے۔ جہاں سارے گھر کا بوجھ صرف دو کندھوں پر ہوتا ہے وہ شام کو کچھ کھانے کو لے آئے گا تو ٹھیک ورنہ سارے بھوکے پیٹ صبر شکر کر کے سو جاتے ہیں۔ وہاں حالات اور بھی دگرگوں ہوتے ہیں جہاں صرف بیٹیاں ہوں۔ یہاں بھی کمانے والا صرف ایک تھا اور کھانے والی سات بیٹیاں' بیوی اور ایک ڈھلتی عمر کی بہن۔ ایسے حالات میں جب آگے کوئی امید کا دیا بھی نہ ہو تو بڑھاپا جلدی پنجے گاڑھ لیتا ہے۔

اسلم خود بھی ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اور پانچ بہنیں، بہنوں کو باپ کے ساتھ مل کر بیاہتے بیاہتے خود اپنے سارے ارمان سلا بیٹھا۔ پھر بھی ایک دہلیز پہ بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہو گئی۔ خود بیٹے کے انتظار میں بیٹیوں سے گھر بھر لیا۔ مگر جو چیز مقدر میں نہ ہو وہ کہاں ملتی ہے۔ بڑی دو شادی کی عمر کو پہنچ چکی تھیں مگر اپنی اتنی گنجائش نہ تھی کہ بیاہ سکتا اور ویسے بھی جہاں جہیز کے نام پر کچھ ملنے کی امید نہ ہو وہاں سے سب ہی آنکھ بچا کر نکلتے ہیں۔ ہاں چار بھی یوں دنوں میں سر نکالتی جا رہی تھیں۔

جیسے جیسے ان کے قد بڑھ رہے تھے ویسے ویسے اسلم کی کمر جھکتی جا رہی تھی۔ اب تو چند قدم چلتا تو سانس پھولنے لگتی۔ یہ تو خدا کا شکر تھا کہ پرکھوں نے تھوڑی سی زمین چھوڑی تھی جس سے سال بعد کچھ نہ

کچھ فصل آ ہی جاتی۔ باقی سال کے دن کہیں نہ کہیں مزدوری مل جاتی۔ دو ٹائم نہ سہی ایک ٹائم سب گھر والے کھانا کھا ہی لیتے آدھا پیٹ ہی سہی۔ پر اب تو اینٹیں اٹھانا، گارا پکڑانا یا پھر چلچلاتی دھوپ میں سیمنٹ کے تھیلے پکڑانا بہت مشکل لگتا تھا۔

☆☆☆

"اے ثمی! ذرا ادھر آ......"

"جی اماں!" یہ دوسرے نمبر والی تھی شمی سے چھوٹی۔

"جا دیکھ' آٹے کے کنستر میں آٹا ہے۔ وہ نکال لا' تیرا باپ آتا ہی ہوگا۔"

"اماں! کنستر تو خالی ہے' بس یہی نکلا ہے۔" کچھ دیر بعد وہ منہ لٹکائے واپس آئی۔

"اچھا تو ایسے کر' میں بھائی رمضو کے گھر سے تھوڑا اور لے آتی ہوں۔"

"رہنے دیں اماں! انہوں نے ٹکا سا جواب دینا ہے۔"

"اچھا چل' بہن آمنہ سے پوچھتی ہوں۔" اماں امید کا دامن چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں۔

"اماں! ان کا بھی آپ کو اچھی طرح پتا ہے۔ دیکھ کر ہی دروازہ بند کر لیتی ہیں۔ رہنے دیں ہم اسی میں گزارا کر لیں گے۔ ہو سکتا ہے آج ابا کو کچھ پیسے مل جائیں۔" ثمی نے جواب دیا۔

"ارے ثمی! یہ تو صرف چار روٹیاں ہیں اور کھانے والے دس۔" اماں کے دل کو کچھ ہوا۔

پھر وہی ہوا جو اکثر اس گھر میں ہوتا تھا۔ ایک روٹی ابا کو دی باقی تین میں سے سب گھر والوں نے چند لقمے لے کر پیٹ کا جلتا چولہا کچھ ہلکا کیا۔ مگر شمی کے حلق سے تو چند نوالے بھی نہیں اتر رہے تھے۔ بغیر سالن کے سوکھی روٹی پانی کے ساتھ جاتی بھی تو کیسے جاتی پیٹ میں۔ اوپر سے آج صبح ہی خالہ فاطمہ نے ہنگامہ برپا کیا تھا چند سو روپے ہی تو تھے جن کے لیے وہ اماں کو اتنا بے عزت کر کے گئی تھیں۔ اماں چھوڑ ان کے اگلے پچھلے کسی کو نہیں بخشتا تھا۔ بس اس نے آج ابا سے وہ بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا جو وہ کئی دنوں سے سوچ رہی تھی۔ وہ آہستہ سے اپنی چارپائی سے اٹھ کر ابا کے پاس گئی۔

"ابا سو گئے کیا؟" اس نے پوچھا۔

"ہوں نہیں پتر کیا بات ہے بیٹھ جا۔" شمی کچھ دیر بغیر کچھ بولے بیٹھی رہی۔ ابا تو ویسے ہی اتنا کم بولتے تھے جیسے اس پر بھی خرچ آتا ہے۔ آخر ہمت کر کے بولی۔

"ابا ایک بات تو بتا ہم کب تک یونہی سسک سسک کر مرتے رہیں گے۔ بتا آخر کب تک؟" اس کی آواز بھرا گئی۔

"میری دھی بتا اس کے علاوہ ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ ہم جیسوں کے لیکھ میں رب سوہنے نے یہی لکھ دیا ہوتا ہے۔" ابا نے شمی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا ابا! آپ سارا قصور نصیبوں کو دے دیتے ہو۔"

"ہم اپاہج تو نہیں ہیں۔" شمی پھر بولی۔

"پر کر بھی کیا سکتے ہیں میں جتنے جوگا ہوں وہ سب کر لیتا ہوں۔ میرا اس سے زیادہ کی ہمت نہیں ہے۔" ابا نے نظر چرائی۔

"ابا بس اب بہت ہو گیا ہے نہیں ترسا جاتا ایک ایک لقمے کے لیے اور نہ ہی اب یہ چند روپوں کے لیے بے عزت ہوا جاتا ہے۔" شمی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"صبر کر میری دھی صبر، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔" ابا نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ابا آپ ہمیشہ صبر کی تلقین کرنا، ہمت نہ کرنے دینا۔ اللہ تو ہمت کرنے والوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ ابا ہم سات ہیں سارا دن فارغ گھر میں رہتی ہیں۔ اگر تیرے ساتھ کھیتوں میں جائیں تو سارے کام چند منٹوں میں ہو جائیں اور......"

"بس شمی! بس کر لوگ کیا کہیں گے کہ اسلم نے

بیٹیوں کی کمائی کھانی شروع کر دی ہے۔ ابھی میں زندہ ہوں۔" ابا کی آواز میں غصہ تھا۔ پر آج ثمی بھی سر پر کفن باندھ کر نکلی تھی۔ کیوں چپ رہتی جبھی

"کب تک زندہ رہیں گے آپ۔ کبھی سوچا ہے اس کے بعد ہمارا کیا ہوگا۔ جہیز کے بغیر کوئی بیاہنے نہیں آئے گا ہمیں۔ چھپی کی طرح ہم بھی بوڑھی ہو جائیں گی۔"

"چپ ہو جا ثمی!" نجانے اماں کب آ گئیں۔ "باپ کے آگے زبان چلاتی ہے لوگ کیا کہیں گے یہ تربیت کی ہے تم لوگوں کی میں نے۔"

"بس کر دے خدا کے لیے اماں! بس کر دے۔ لوگوں کی باتیں سن سن کر ہم اس نوبت کو پہنچے ہیں۔ بتا مجھے اماں جب چھپی اپنی جوانی جہیز نہ ہونے کی وجہ سے یہاں گزار رہی تھی تو کیا کیا لوگوں نے کسی نے اتنی ہمت نہ کی کہ چند جوڑوں میں بیاہ کر لے جائے جب دادا مرا کیسے ابا نے ایک ایک سے بھیک کی طرح ادھار مانگا تھا کفن کے لیے پر کسی نے نہیں دیا۔ ان کے خیال میں ادھار مرنے والے نے چکانا تھا۔

کیسے گھڑے بیچ ابا نے گھر کے برتن تک بیچ دیے تھے تاکہ باپ کو کفن نصیب ہو سکے۔ تب بھی ان لوگوں نے کہا تو بہت کچھ تھا مگر کیا کچھ نہیں تھا۔ دادی کا آخری وقت بھی یاد ہوگا کیسے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مری تھی۔ دوائی تو دور کی بات بے چاری کو زندگی کے آخری دنوں میں بھی کبھی پیٹ بھر کھانا نہیں ملا تھا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے اماں، دادی بیماری سے نہیں بھوک سے مری تھی۔ جب ہر رات ہمارے گھر کا چولہا ٹھنڈا ہوتا ہے تو کھانا تو کوئی نہیں دے کر جاتا۔ بس ابا کل سے ہم تیرے ساتھ کھیتوں میں جائیں گی۔ کریں باتیں جتنی لوگوں نے کرنی ہیں۔" ثمی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے کل آئے گی تو دیکھیں گے رب خیر کا دن چڑھے۔" ابا نے دکھ بھری سانس خارج کی۔ ثمی کے لیے تو اتنی حوصلہ افزائی ہی کافی تھی۔ وہ جلدی سے باقیوں کو یہ خبر سنانے کے لیے نکلی۔

"ناں کیا مطلب ہے تیرا اسلم! اب گھر کی عورتیں باہر کھیتوں میں کام کریں گی کیا اتنا برا وقت آ گیا ہے۔ لوگ کیا کہیں گے؟" اماں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں تو ٹھیک کہتی ہے نیک بخت! لوگ جو بھی کہیں وقت تو بہت ہی برا آ گیا ہے۔ سچ میں بہت برا آ گیا ہے۔" ابا نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"پر اسلم......"

اماں نے بات کرنے کے لیے منہ کھولا۔ مگر ابا نے بات درمیان میں کاٹ دی۔ اور کہنے لگے "تو ہی بتا یہ جو کچھ ثمی کہہ کر گئی ہے کیا اس میں کچھ جھوٹ ہے۔ کب تک ہماری پیڑیاں (نسلیں) یونہی ذلیل و خوار ہوتی رہیں گی تو نے سنا ہوگا کہ جب پیٹ کا پانی کسی طرح نہ بھرے تو مردار کھانے کی بھی اجازت ہے۔ بیٹیوں کی کمائی اس مردار سے تو بہتر ہے جو ہو سکتا ہے اگلے چند سالوں میں کھانی پڑ جائے۔"

بس پھر ابا چپ ہو گئے۔ اماں دیکھتی رہیں کہ کوئی اور بات کرے مگر وہ چپ ہی رہے۔ آخر اماں اٹھ کر اپنی چارپائی پر آ گئیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ چپ تھے مگر ذہنوں اور دلوں میں ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔ خوف کا سمندر۔ ایسا خوف جس نے نسلوں کو تباہ کر دیا تھا۔ مریں کھا گیا تھا۔ جو اپنوں کو دیمک لگ گیا تھا پر اتنا بھوکا تھا کہ اس کا پیٹ پھر بھی نہ بھرا تھا اور وہ تھا لوگوں کی باتوں کا خوف پر نہیں کبھی نہ کبھی تو اس خوف کو ختم ہونا تھا اور کسی اور نے نہیں کرنا تھا۔ انہوں نے خود کرنا تھا۔ بس اب وہ وقت آ گیا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح بڑی ہی حیران کن تھی۔ ابا نے خود ثمی کو جگایا اور کہا۔ "تیاری کر لو جلدی سے۔ ابھی نکلنا ہے کھیتوں کے لیے۔" کچھ دیر تو ثمی حیرت سے ابا کو دیکھے گئی پر پھر یقین آ گیا کہ یہ خواب نہیں ہے۔ چاروں بڑی جو قد میں تقریباً برابر ہی تھیں، ابا کے ساتھ ہی منہ اندھیرے گھر سے نکلیں۔ ابھی کہیں کہیں تارے ٹمٹما رہے تھے جب وہ کھیتوں میں پہنچ گئیں

اور کام کرنے لگیں۔ جب صبح کی روشنی پھیلی تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ چار عورتیں ایک مرد کے ساتھ کھیتوں میں کام کر رہی ہیں۔

یہ رائے (سرسوں) کا موسم تھا۔ اتنی کٹائی ابا بے چارے پانچ دن میں نہ کر سکتے تھے جتنی انہوں نے ایک دن میں کر دی۔ لوگوں نے اس پر بہت باتیں کیں۔ عورتوں نے گھر آ آ کر اماں کو طعنے مارے۔ مردوں نے راستہ روک روک کر ابا کو ذلیل کیا مگر انہوں نے اپنے کان بند کر لیے تھے۔ اپنی فصل ہی کتنی تھی جو کاٹنے میں ٹائم لگتا پھر وہی حال وہی غیر یقینی مستقبل۔

پر اس سب سے ایک فائدہ ہوا ابا اور اماں میں تھوڑا بہت اعتماد ضرور آ گیا۔ ابا کا کچھ حوصلہ اور بڑھا تو اس نے آس پاس کے زمین داروں سے کاٹنے کے لیے سرسوں کے کھیت لے لیے۔ چونکہ اب کھیت اپنے نہ تھے سو یہ لوگ تب جاتے جب لوگ اپنے گھروں میں واپس آ جاتے۔ اپریل کی گرم دھوپ میں یہ لوگ بارہ سے تین بجے تک فصل کاٹتیں۔ دوسرا ٹائم مغرب کے بعد شروع ہوتا وہ تب تک لگی رہتیں جب تک ہمت جواب نہ دے جاتی۔ ہاں چاندنی راتوں میں ماحول بڑا خوش گوار ہوتا۔

ایک ایکڑ کے انہوں نے پانچ ہزار روپے لیے تھے۔ بڑی بھاگ دوڑ کے بعد دس ایکڑ کاٹے تھے یوں ان کے ہاتھ پچاس ہزار آئے تھے۔ اس کے بعد گندم کا سیزن بھی انہوں نے خوب ڈٹ کر لگایا۔ نہ صرف بھڑولے بھر گئے بلکہ کافی مقدار میں اور بھی گندم جمع ہو گئی۔

اب ان کے گھر میں دو وقت تازہ کھانا بنتا۔ پھپھی کی دوائی ٹائم پر آ جاتی۔ ایک دوسری کی اترن کے بجائے سب کے لیے نئے کپڑے آئے۔ اگلا مرحلہ کپاس کی بوائی کا تھا۔ سب لوگ اسی میں مصروف تھے مگر انہوں نے کپاس نہ بوئی۔ ایک تو ان کی زمین کم تھی دوسرا اس پر خرچ بہت زیادہ آتا تھا۔ تیسرا اکثر ایسا ہوتا جیسے ہی فصل پر پھول لگنے لگتے کوئی نئی قسم کی بیماری آ جاتی جو سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیتی۔

بہت سوچ بچار کے بعد انہوں نے سبزیاں اگانے کا سوچا۔ اس پر محنت تو پہلے سے زیادہ کرنی پڑی مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ سبزیوں سے انہیں دو فائدے ہوئے ایک تو آمدن روز کے روز آ جاتی کیونکہ ابا زیادہ تر سبزی قریبی منڈی میں بیچ آتے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ زمین جلدی خالی ہو گئی اور انہوں نے اگلی فصل کی تیاری شروع کر دی۔ اس آمدن سے انہوں نے نہ صرف گھر کی خستہ حال دیواریں پکی کروائی تھیں بلکہ ایک نیا کمرہ بھی بنوا لیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید لوگوں کے لیے اب یہ موضوع پرانا ہو گیا ہے اور دلچسپی ختم ہو گئی ہے مگر کہاں بھولتے ہیں لوگ دوسروں کے زخموں پہ نمک چھڑکنا۔

آج خالہ آمنہ بڑے دنوں بعد آئی تھیں۔ وہ خالہ آمنہ جن کے گھر اگر کوئی بغیر کام کے بھی چلا جاتا تو سب سے پہلے پوچھتیں کیا مانگنے آئی ہو، بڑا مسکرا مسکرا کر طنز کے تیر چلا رہی تھیں۔ جب کسی نے چائے کی پیالی پکڑائی تو بڑی حیران ہوئیں کیونکہ ان کے گھر تو دو وقت کا کھانا بھی نہیں بنتا تھا کجا کہ چائے کی عیاشی۔

"اور سناؤ کتنی کمائی ہوئی اس سیزن سے۔" خالہ نے اپنی طرف سے بڑا خطرناک وار کیا تھا۔

"شکر ہے اللہ کا اب کسی سے مانگنا نہیں پڑتا۔ آپ کو تو پتا ہے کہ اب تو رشتے دار مانگنے پر ادھار بھی نہیں دیتے۔ دیکھتے ہی دروازہ بند کر لیتے ہیں۔" پیٹ کی فکر ختم ہوئی تو بات کرنے کا ہنر بھی آنے لگا گی نے بھی خوب بھگو کر جوتا مارا تھا۔

"ہاں بھئی تم لوگ تو اپنی مرضی کی مالک ہو۔ تمہارا چاچا بھی کہہ رہا تھا کہ اب تو اسلم کے ٹھاٹھ ہیں بیٹیاں جو کماتی ہیں۔ میری شبو اگر گھر سے باہر جانے کا نام بھی لے تو باپ اور بھائیوں کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے کہتے ہیں کہ ہم ابھی اتنے بے غیرت نہیں ہوئے کہ گھر کی عورتیں یوں دندناتی پھریں۔"

خالہ کو جوتا کچھ زیادہ ہی زور کا لگا تھا اسی لیے تڑپ اٹھیں اور خوب زہریلا وار کیا۔

"ہاں خالہ! اس کے بھائی جو ہوئے کمانے والے۔ ہمارا بھائی بھی تو نہیں ہے اسی لیے ہمیں اپنے باپ کا بیٹا بننا پڑا۔" ثمی جانتی تھی یہ ایسے جاہل لوگ ہیں جن کا مقابلہ ممکن نہیں سو جب ہی ہار مان لی۔

خالہ تو کچھ دیر بیٹھ کر چلی گئیں مگر ثمی سوچ رہی تھی یہ کیسے لوگ ہیں جب بھوکے تھے تب بھی باتیں کرتے تھے۔ اب جب بھرے پیٹ ہیں تب بھی انہیں سکون نہیں۔ حالانکہ ثمی اچھی طرح جانتی تھی کہ خالہ آمنہ کے بیٹے کتنے غیرت مند ہیں اور بیٹی کتنی باحیا اور پردہ دار ہے۔ ہر دو ماہ بعد نیا عاشق ڈھونڈ لیتی اور گھر بیٹھے خوب عیش کرتی اسے کیا ضرورت تھی باہر نکلنے کی۔

☆☆☆

آج گھر میں صبح سے چہل پہل سی تھی۔ اس کی وجہ تھی پھپھی زہرا کی فیصل آباد سے آمد۔ پھپھی کا چکر دو سال بعد ہی لگتا تھا اور جب بھی لگتا گود میں ایک نیا بچہ ہوتا اب تو اس سلسلے کو بھی بریک لگ گئی تھی۔ بڑا بیٹا بائیس سال کا تھا اور سب سے چھوٹی بیٹی تین سال کی۔ باقی بچے تو بڑے تھے ساتھ صرف چھوٹے دو ہی لائی تھیں۔ یوں تو وہ آئی تھیں خیریت دریافت کرنے مطلب ہفتہ پندرہ دن رہنے مگر یہاں آ کر پروگرام بدل گیا اور قیام خاصا طویل ہو گیا۔

ان کا زیادہ وقت پھوپھی سعیدہ کے پاس ہی گزرتا۔ اسے دیکھ دیکھ کر ہولتیں جن کے سر کے بال اب تقریباً سفید ہو چکے تھے۔ ابا زہرا پھوپھی کی آمد سے خاصے پریشان تھے' ان کا خیال تھا کہ پھوپھی کو ان کی یہ حرکت ذرا پسند نہ آئے گی کہ کیسے انہوں نے بیٹیوں کو ساتھ کام پر لگایا ہوا ہے۔

ضرور ایک طویل بحث ہوگی۔ خاندانی روایات کو توڑنے پر طعنے دے گی۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو کیسا خاندان اور کیسی روایات۔ یہ تو امیروں کے چونچلے ہوتے ہیں۔ جنہیں پیٹ کی بھوک مٹانے سے فرصت نہ ملے' ان کے لیے روایات بھی ایک بوجھ کی طرح ہوتی ہیں جنہیں جلد یا بدیر اتارنا ہی پڑتا ہے۔

مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ انہیں یہ بات بڑی پسند آئی کہ برے وقت میں آگے بڑھ کر باپ کا بازو بنیں۔ پھوپھی زہرا کی اس بات سے ابا کا حوصلہ اور بھی بلند ہو گیا' دل میں جو تھوڑی بہت خلش تھی وہ بھی دور ہو گئی۔ اسے اپنا فیصلہ ٹھیک لگنے لگا اور خاصا مطمئن رہنے لگا۔

آج صبح سے پھوپھی زہرا کی سرگرمیاں کچھ مشکوک سی لگ رہی تھیں۔ فون پر بھی ساس سے بات کرتیں تو کبھی نند سے۔ اب نجانے پھوپھا سے کون سی بحث کر رہی تھیں۔ کافی لمبی بحث کے بعد وہ ابا کے پاس آ بیٹھیں۔ اور بلی تھیلے سے نکال ہی دی۔ اصل میں وہ ثمی اور کی سے بہت متاثر ہوئی تھیں۔ جنہوں نے اپنے باپ کو ایک نئی راہ دکھائی تھی۔ گھٹ گھٹ کر مرنے کے بجائے سر اٹھا کر جینے کی راہ۔

(اصل کارنامہ تو ثمی نے سرانجام دیا تھا۔ ابا کو منانے کا کریڈٹ بھی برابر کی حصہ دار تھی۔ چھوٹی تو ابھی اتنی سمجھدار نہ تھی بعد میں کہتے ساتھ چل پڑتیں) اسی لیے وہ ان دونوں کی معترف تھیں۔

ثمی کے لیے اپنے دیور اور کی کے لیے اپنے بیٹے کا رشتہ لائی تھیں۔ بات تو پہلے ہی ان کے ذہن میں تھی اور وہ دل و جان سے چاہتی تھیں کہ ایسا ہو جائے مگر فیصلہ تھوڑا سا مشکل لگ رہا تھا مگر یہاں آ کر انہوں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اس کے بعد سارے فیصلے آسان ہوتے چلے گئے۔

یہ پھوپھی زہرا کا وہی دیور تھا جب اسے بیاہنے آئے تھے تو صرف چھ ماہ کا تھا۔ اس پر جو اس کی ساس کا ریکارڈ لگا تھا' وہ علیحدہ قصہ ہے۔ اسلم کو تو یہ سب خواب لگ رہا تھا۔ بار بار اپنے آنسو پونچھ رہا تھا۔ کہاں دو وقت کی روٹی کے لالے پڑے تھے' کہاں بیٹیوں کے رشتے بھی ہو گئے تھے۔ بار بار بہن کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ آخر زہرا کو کہنا ہی پڑا' بس

کردے۔

"بھا اسلم! تو کیا اب مجھے شرمندہ ہی کرتا رہے گا۔ تو ہمارا بھائی ہے ماں جایا ہے تو کیا سمجھتا ہے کہ تیرے حالات کا ہمیں پتا نہیں تھا یا ہمیں یہ سب دیکھ کر تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ یہ جو رشتے والی بات میں تجھ سے آج کر رہی ہوں بہت پہلے سے سوچ رکھی تھی میں نے اور صرف میں نے نہیں سب بہنوں نے۔ بس ٹھیک وقت کا انتظار تھا۔ ہوسکتا ہے اگلے ہفتے چھوٹی شاہدہ آئے تیرے پاس گی سے چھوٹی صبو کا ہاتھ مانگنے۔ بس تو تینوں کو ایک ساتھ ہی ڈولی میں بٹھا دینا۔"

ابا کو لگ رہا تھا کہ یہ سب خواب ہے۔ ابھی آنکھ جھپکے گی اور ٹوٹ جائے گا۔ وہ ٹکٹکی باندھے بہن کی شکل دیکھے جا رہا تھا۔

"بس بھا اسلم اور تو سب ٹھیک ہے۔ جو نہیں ٹھیک وہ بھی ہو جائے گا۔ بس ایک ہی دکھ مجھے کھائے جاتا ہے' کہیں چین نہیں لینے دیتا۔" زہرا نے سعیدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر یہ فیصلہ جو تو نے اب کیا ہے' ہم نے سالوں پہلے کیا ہوتا تو حالات ایسے نہ ہوتے۔ سعیدہ یوں اپنی عمر یہاں بابل کی چوکھٹ پر بیٹھی ضائع نہ کرتی۔ اماں ابا سکون سے جان دیتے۔ ان کی قبریں ٹھنڈی ہوتیں۔" زہرا نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے اپنے آنسو صاف کیے۔

"تو ٹھیک کہتی ہے زہرا! وہ بات جو ہمارے بڑوں کو سمجھ لینی چاہیے تھی۔ وہ ہماری آنے والی نسلیں سمجھ گئی ہیں۔ بس اتنا ہی رب سوہنے کا بڑا کرم ہے۔ گیا وقت تو ہم موڑ کے واپس نہیں لا سکتے۔ پر یہ تو کرسکتے ہیں کہ سعیدہ کی کہانی کو دوبارہ نہ دہرائیں۔" ابا نے آہستہ سے کہا۔

☆☆☆

اگلی شام بڑی ہی خوب صورت اور پررونق تھی کیونکہ فیصل آباد سے پھوپھا اور زہرا پھوپھی کی ساس باقاعدہ رشتہ مانگنے آنے ہی والے تھے اور شاہدہ سے بھی ابا کی بات ہوگئی تھی۔ وہ بھی چاہتی تھی کہ منگنی تینوں کی اکٹھی ہی ہو۔ اس خوب صورت شام کے رنگ میں بھنگ ڈالنے کے لیے خالہ آمنہ آگئیں۔

"ہاں بھئی تم لوگوں نے تو ہمیں کبھی اپنا سمجھا ہی نہیں۔ اندر ہی اندر سارے فیصلے کرلیے اور ہمیں کسی نے پوچھنا تو دور کی بات' بتانا بھی گوارا نہیں کیا۔ ہم نے کون سا منع کرنا تھا رشتے کرنے سے۔ پر بھئی تم لوگ اکیلے ہی کافی ہو۔ سارے فیصلے اندر ہی اندر کرلیے ماں بیٹیوں نے۔ ویسے بتاؤ تو سہی کون سی ایسی ایمرجنسی آگئی تھی جو راتوں رات سب کچھ ہوگیا۔" بات کرنے کی تو پہلے ہی خالہ آمنہ کو تمیز نہ تھی۔ اب بھی سب کے سامنے اندر کی بھڑاس نکال رہی تھی۔

"ایمرجنسی کیسی آمنہ بہن! بس اللہ نے اچھے بر دیے تو تھی کہ ابا نے انکار کرنا کفران نعمت جانا۔ اس لیے۔" اماں بے چاری گھبرا کر وضاحت دینے لگی۔

"جانتی ہوں میں بھا اسلم کی کیا اہمیت ہے اس گھر میں۔ کرتی تو ماں بیٹیاں اپنی مرضی ہو۔" اور پھر تائیدی نظروں سے ابا کی طرف دیکھا پر کوئی من پسند جواب نہ پا کر خاصی بدمزا ہوئی پھر کچھ ادھر ادھر کی باتیں کرکے چلی گئی۔ کافی دیر تک سب اس کی باتوں کے زیر اثر رہے۔ آخر ابا نے چپ توڑی۔

"اور تو کوئی بات سچ ہو نہ ہو بڑکوں کی پتا نہیں' پر ایک بات وہ لوہے کی لکیر جیسی سچ کہہ گئے ہیں۔"

سب نے سوالیہ نظروں سے ابا کی طرف دیکھا۔

"درانتی کے ایک طرف دندے (دندانے) ہوتے ہیں' پر لوگوں کے دونوں طرف ہیں۔ جس طرف بھی ہاتھ لگاؤ' ہاتھ کٹے گا۔"

ابا نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا' جہاں سے ابھی خالہ آمنہ نکلی تھیں۔ سب نے اثبات میں بے ساختہ سر ہلایا کیونکہ بات تو واقعی ہی سچ تھی۔

☆

نعیمہ ناز

طلوع و غروب

کیا محبت سورج ہوتی ہے؟ طلوع ہوتی ہے اور غروب ہو جاتی ہے۔

یا محبت چاند ہوتی ہے؟ نکلتی ہے بڑھتی ہے، گھٹتی ہے، چمکتی ہے پھر ماند پڑ جاتی ہے۔

کیا محبت لہروں کا کھیل ہے؟ ابھرنا اور پھر معدوم ہو جانا۔

یا محبت دلوں کا تال میل ہے، جس میں اگر کوئی سُر غلط لگ جائے تو پورا گیت برباد ہو جاتا ہے۔

کیا واقعی محبت زندگی ہوتی ہے؟ کہ جس کی گھات میں ہمیشہ موت رہتی ہے۔ محبت کیا ہے یا کیا ہے؟ رنج ہے یا نشاط؟ بہت کچھ ہے؟ سب کچھ ہے یا کچھ بھی نہیں؟

کیا سچ مچ محبت ہوتی ہے؟ یا نہیں بھی ہوتی؟ بس ایک وہم، ایک خیال؟

☆☆☆

پرانے اور اچھے وقتوں کا بنا ہوا تین منزلہ مکان تھا، جس کی تعمیرات سے بوسیدگی یا کہنگی نہیں برستی تھی۔ بس قدامت اور مضبوطی کا احساس ہوتا تھا۔ ملحق سو مربع گز پر بنے اس مکان میں وہ سب تھا جو کبھی کسی زمانے میں لوگ بڑی بڑی حویلیوں میں بنواتے تھے۔

اس میں چند ہی کمرے تھے مگر بڑے بڑے، اونچی چھتوں والے، کشادہ صحن تھا۔ لمبے لمبے برآمدے تھے۔ رنگین شیشوں کے پٹ دروازوں، کھڑکیوں اور روشن دانوں میں لگے ہوئے تھے۔ جن میں چڑیاں اور دوسرے پرندے اپنے آشیانے تعمیر کرتے تھے (اور یہ کتنا دلچسپ اور دل خوش کن معاملہ لگتا ہے۔ آشیانے کے اندر ایک اور آشیانہ۔ گھروندے کے اندر ایک اور گھروندا)۔

ناولٹ

اس مکان کے بیرونی حصے میں حجرے کے بھی تھے، جن میں کھڑا ہونے والا نہ بادشاہ تھا، نہ بادشاہ زادہ۔ راجا تھا نہ مہاراجا۔ بس وہ بائیس تیئیس سال کا ایک دبلا پتلا لمبا سالڑکا تھا۔ جس کی آنکھیں اور بال روشن اور چمک دار تھے۔ پہلی نگاہ میں وہ کوئی خاص اور قابل ذکر معلوم نہ ہوتا تھا مگر جب کچھ دیر اسے دیکھتے رہو، بات کرتے رہو تو اس کے خدوخال میں ایک عجیب اپنائیت اور مانوسیت ابھرنے لگتی تھی۔ وہ اچھا لگنے لگتا تھا اور اپنا اپنا سا بھی۔ اس کی شخصیت بہت سادہ سی دکھائی دیتی تھی، اس کے بھاری بھرکم نام اور اس سے بھی زیادہ بھاری اور بوجھل پس منظر کے بالکل برعکس۔

صاحب زادہ ذی وقار اپنی ناتجربہ کار عمر اور اس عمر کے ایک دھڑکتے دل اور اچھوتے احساسات کے ساتھ اپنے کمرے کی کھلی کھڑکی کے پاس کرسی پر بیٹھا تھا۔ چوڑے پٹ اور رنگین شیشوں والی یہ کھلی کھڑکی اس کی نگاہوں کو کتنے نظارے مہیا کر رہی تھی۔ اگرچہ یہ ایک نسبتاً کم چوڑی گلی تھی، جہاں سے کبھی کبھار لوگ گزرتے تھے اور بکری، مرغیاں، بطخیں، گلہری اور کچھ پرندے بھی۔ خوش قسمتی سے یہاں ابھی کچھ درختوں کا وجود باقی تھا۔ لہٰذا پرندوں کی آوازوں سے ساعتیں آشنا تھیں۔

وہ کرسی پر بیٹھا بیٹھا باہر کی جانب تکتا رہتا۔ برگد کی بڑی بڑی جٹاؤں کی مانند پھیلی ہوئی، لٹکی ہوئی جڑوں کو۔ نیم کی کسیلی مہک اور گھنی شاخوں کو۔ پیپل کے سبز پتوں اور چھاؤں کو۔ ان پیڑوں پر اڑان بھرتے، اپنے پروں کو پھیلاتے، سمیٹتے پرندوں کو وہ [illegible] سی دیکھتا اور ذرا گردن جھکا کر نیچے جھانکتا تو کبھی کوئی آواز لگاتا چھابڑی والا، گزرتا ہوا راہ گیر۔ قیں قیں کرتی دو چار بطخیں۔ خاموشی سے دبے پاؤں گزرتی بھوری بلی اور پیر پھیلائے کاہلی سے اونگھتا ہوا کتا۔ جو اپنی نیم وا آنکھوں سے بلی، بطخوں، گلہری اور بکریوں کو گزرتا دیکھتا اور پھر سستی سے اپنی جگہ پڑا رہتا کہ ذرا آگے گھر میں رہنے والے خواجہ صاحب جب پرندوں کے کونڈوں میں دانہ اور پانی ڈالتے تو ہڈیوں کا ایک ڈھیر اس کے آگے بھی ڈال دیتے۔ جنہیں وہ دن بھر چچوڑتا رہتا۔

ذی وقار ان سب کو دیکھتا۔ کبھی پگھلے نیلم جیسی، نیلاہٹ لیے آسمان پر روئی کے سفید بالکل سفید براق سے گالے، ادھر اُدھر تیرتے دیکھتا اور مسحور ہو جاتا۔ دنیا میں ایک سے ایک دل فریب مناظر ہیں مگر آسمان کی پہنائیوں میں جو عظمت اور رفعت ہے اور دن و رات کے مناظر میں جو دل کشی اور اسرار ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اور ذی وقار کو زمین پر بکھرے خشک پتے بھی بہت اچھے لگتے تھے۔ صفائی کرنے والے آتے تھے، جھاڑوں سے سارے پتے سمیٹ کر ایک طرف کر جاتے۔ ہواؤں کی شوخی، شریر بچے کی طرح انہیں پھر سے بکھیر دیتی تھی۔

آسمان و زمین کے درمیان جو مناظر اس کی نگاہوں کی دسترس میں تھے، انہیں دیکھنا اس کا شوق تھا مگر اس وقت مجبوری بھی تھی۔ اپنی بائیک ایک درخت سے ٹکرا دینے کا انجام یہ ہوا تھا کہ پیر پر پلاستر چڑھ گیا۔ نیچے کمرے میں لیٹے لیٹے تنگ آگیا تھا۔ سو اپنے کمرے میں اوپر منتقل ہو گیا۔ جہاں کھڑکی کے قریب اس کی مخصوص کرسی اور میز رکھی تھی۔ یہیں بیٹھ کر وہ اپنی نصابی اور غیر نصابی کتب کا مطالعہ کرتا تھا۔ کتابوں کے مطالعے سے تھک جاتا تو قدرت کا مطالعہ کرنے لگتا اور آج کل تو اپنے اس شوق کی اسے فرصت ہی فرصت تھی اور اس شوق اور فرصت کے عالم میں ذی وقار نے پہلی بار اسے دیکھا جو کالج یونی فارم میں بیگ لٹکائے، فائل سینے سے لگائے وہاں سے گزری۔

صبح کے دھندلکے میں گزرتی ہوئی اس لڑکی کی ناک گلابی ہو رہی تھی۔ سورج بادلوں میں منہ چھپائے ہوئے تھا اور دھند کو راج کرنے کا موقع مل گیا مگر اس دھند کو چیر کر بھی ذی وقار کی نگاہیں جیسے اس کے اندر تک اتر گئیں۔ اگرچہ ان نگاہوں میں بے باکی نہیں تھی، نہ شوخی ـــــ حیرت تھی اور تجسس اور بس...... وہ حد درجہ حسین نہیں تھی نہ ہی بے نظیر۔ کالج میں درجنوں لڑکیاں تھیں جن سے ہیلو ہائے تھی۔ خاندان لڑکیوں سے بھرا

پڑا تھا۔ صنف نازک کا حسن اس کے لیے نئی بات تھی نہ انوکھی اور پھر یہ لڑکی بھی کوئی دنیا جہاں سے انوکھے اور نرالے حسن کی مالک تو نہ تھی۔ مگر پھر بھی، پھر بھی جانے کیا بات تھی۔ کچھ بات تھی اس میں جو ذی وقار کو شدت سے محسوس ہوئی اور ہوتی رہی۔

اگلے کئی روز تک، جب وہ صبح وہاں سے گزرتی اور دوپہر میں واپس ہوتی۔ کالی چادر کے ہالے سے نظر آتا اس کا صبیح چہرہ، فائل کو تھامی ہوئی لمبی مخروطی انگلیاں، جیسے آرٹسٹ افراد کی ہوتی ہیں۔ وہ ناک کی سیدھ میں، نیچے دیکھتی ہوئی نہیں چلتی تھی بلکہ سامنے اور دائیں بائیں نظر آتے ہر منظر اور ہر جان دار و بے جان شے کو دیکھتے ہوئے چلتی تھی۔ اس کی شفاف نگاہیں معصومیت اور حیرت سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔ وہ پیڑوں کے تنوں پر ہاتھ پھیرتی ہوئی، ادھر ادھر پھدکتی ہوئی چڑیا کو دیکھ کر مسکرائی، بھاگتی ہوئی گلہری کی موٹی سی دم کا... اس کی نگاہیں دور تک پیچھا کرتیں۔ ذی وقار کی مختلف منظر دیکھتی نظروں کو ایک منظر اور میسر آگیا۔

وہ بڑی دلچسپی سے اس لڑکی کی محویت، دیکھتا اور مسکرا دیتا، جس نے ایک دو بار اچٹتی ہوئی نگاہ اوپر ڈالی، اس رنگین شیشوں والی کھڑکی پر، جس میں ذی وقار کا چہرہ نصب تھا۔ بس ایک مبہم سی نظر پھر اس کے تیزی سے اٹھتے قدم، ذی وقار کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور یہی وہ لمحہ تھا جب ہوا کے شوخ، لاپروا جھونکے کی مانند مہر افروز کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پلیٹ تھی جس پر کروشیے کا کور ڈھکا ہوا تھا۔ کور کے کناروں پر سرخ موتی لٹک رہے تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے ذی وقار کی مسکراہٹ دیکھی اور تیر کی سی تیزی کے ساتھ کھڑکی کی جانب آئی۔

"اتنی خوب صورت مسکراہٹ اور ایسی محویت، کس کی بدولت ہے؟ منظر کا حسن یا انسان کی دلکشی؟"

اپنی مخصوص شوخ اور مترنم آواز میں بولتی ہوئی وہ کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی اور اسی آن اس کی تیز نگاہوں نے فرد اور معاملے دونوں کو بھانپ لیا۔

"ہوں..... لوگ، عیادت اور فکر کر کے خود پریشان ہو گئے ہیں اور جناب مریض صاحب! مریض عشق بننے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔"

وہیں کھڑے کھڑے اس نے پلیٹ پر سے کروشیے کا کور ہٹا دیا۔ اس میں ڈھیروں ڈھیر میوے اور اصلی گھی کی مہک کے ساتھ پنجیری تھی۔ پلیٹ اس نے میز پر رکھ دی۔

"ابھی تو پہلا قدم بھی نہیں اٹھا، تم آخری منزل تک پہنچ گئیں۔" اس کے "مریض عشق" کے لقب پر ذی وقار مسکرایا۔

"پہلا قدم؟" مہر افروز بدستور گلی میں جھانکتی ہوئی مسکرائی۔

"یہ نظر اور یہ مسکراہٹ ہی تو ہے پہلا قدم۔"

"اور آپ کو یہ پہلا قدم اٹھائے عرصہ گزر گیا؟"

ذی وقار نے خود کو ایک طرف کرتے ہوئے مہر افروز کے کورٹ میں گیند پھینک دی۔ وہ ذی وقار کی تایازاد بھی تھی اور اس کے بڑے بھائی کی منگیتر بھی۔ کزن کم تھی، دوست زیادہ تھی۔

"دوسری بات چھوڑو، پرانی بات ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی کانوں نے ایک ہی نام سنا، پہلا قدم اٹھانے [illegible]۔ تمہاری ایسی محویت اور مسکراہٹ پہلے کبھی نہیں۔"

مہر افروز [illegible]۔ ذی وقار کو اس لمحے ادراک ہوا۔

"اپنی لائن میں وہ جو نیلا بنگلہ ہے نا [illegible] انکل کا۔ ان کی بھانجی ہے۔ والدین فوت ہو گئے ہیں۔ وہ اپنے پاس لے آئے ہیں۔"

مہر افروز نے گلی سے گزرتی ہوئی لڑکی کی جھلک ہی نہیں، شکل بھی دیکھ لی تھی۔" فر فر سارا آموختہ سنا دیا۔

"تم جانتی ہو اسے؟" ذی وقار چونکا۔

"زیادہ نہیں جانتی مگر ملی ضرور ہوں۔" مہر افروز میز پر بکھری ہوئی بے ترتیب کتابیں، ترتیب سے رکھنے لگی۔

"کیا نام ہے؟" جھجکتے ہوئے سوال میں ایک

بے تابی پوشیدہ تھی۔
"جو دل چاہے، رکھ لو۔" مہر افروز شرارت سے مسکرائی۔
"کیا دنیا میں کوئی نام ہے ایسا جو اس کے شایان شان ہو؟"
ذی وقار بخیری سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ مہر افروز اس کے سوال پر لطف اندوز ہوئی اور مسکرائی۔
"گل آرزو...... نام ہے اس کا۔"
"گل آرزو۔" ذی وقار نے دہرایا۔ مہر افروز کے جانے کے بعد بھی وہ اس نام کو دہراتا رہا۔ اضطراری طور پر بھی اور غیر ارادی طور پر بھی۔ یہاں تک کہ وہ نام بھی اس کی دھڑکنوں سے جڑ گیا۔ جیسے کہ وہ خود ذی وقار کے دل سے اور دھڑکنوں سے جڑ گئی تھی۔

☆☆☆

دو ہفتے کے لیے پلاستر چڑھا تھا۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ آج اس ہفتے کا آخری دن تھا۔ چھ دن اور چھ راتیں۔ وہ بس کھڑکی سے جڑا باہر دیکھتا رہا۔ پڑھتا رہا اور اپنی ڈائری لکھتا رہا۔ جسے لکھنا اس کے معمولات میں شامل تھا اور ہاں ان سب کے ساتھ ساتھ اپنے دوستوں اور ملاقاتیوں کو بھی بھگتتا رہا تھا۔
سورج غروب ہونے کے بعد گلی میں اندھیرا چھا جاتا تھا۔ وہ کھڑکی کا پردہ کھینچ کر کرسی سے متصل بیڈ پر بیٹھ جاتا۔ اپنی ڈائری اور قلم لے کر۔ دن بھر کی روداد کے علاوہ وہ سب کچھ لکھتا جو دل میں ہوتا یا دل میں آتا تھا۔
اس وقت بھی وہ اپنی ڈائری لے کر بیٹھا تھا۔ آج اس کی تحریر ڈائری کے پچھلے صفحات کے مقابلے میں بہت مختلف تھی۔
28 جنوری 1984ء...... ڈائری کا ایک ورق۔
آج کی تاریخ اور مہینہ میں نے تحریر کے آغاز میں ہی لکھ دیا ہے جو ہماری دنیا میں رائج کیلنڈر کے مطابق ہے۔ ایک کیلنڈر ہمارے دل اور ہماری ذات کے آغاز کا بھی ہوتا ہے اور میری ذات کے کیلنڈر کی شروعات اس دن سے ہوئی ہے جب ایک دھند آلود صبح تمہارا شفاف چہرہ دیکھا تھا جو سیاہ چادر کے ہالے میں چمک رہا تھا اور تمہاری لانبی، فنکاروں والی انگلیوں نے فائل کو تھاما ہوا تھا۔
تمہاری آنکھوں میں معصومیت اور سادگی تھی اور تمہاری چال میں لاپروائی اور الھڑپن۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کس وجہ سے ٹھہر گیا۔ یہ جو انسان کے رکنے اور ٹھہرنے کی وجہ ہوتی ہے، یہ کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے چاند چہرا، ستارہ آنکھوں کی ضرورت نہیں۔ نہ سرو قامت، گھنا زلف یا خوش جمال و خوش ادا ہونے کی شرط ہوتی ہے۔
تو میرا دل ٹھہر گیا۔ اس لیے نہیں کہ تم انتہائی خوش شکل ہو، میں بہت دل پھینک ہوں۔ نہیں بلکہ ہوا یہ کہ جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں پہلے بھی تمہیں دیکھ چکا ہوں۔ تمہیں جانتا ہوں۔ تم بالکل بھی اجنبی نہیں لگیں بلکہ بہت مانوس اور اپنی اپنی سی لگیں۔
شاید یہ لائنیں کچھ فلموں یا ڈراموں جیسی یا افسانوں جیسی لگ رہی ہوں مگر میں بہت شاندار اور اچھوتے لفظوں میں اپنے جذبات کا اظہار کرنے سے قاصر ہوں کیونکہ میں کوئی ادیب ہوں نہ شاعر۔ ہاں ان دونوں کو شوق سے پڑھتا ہوں تو مجھے الفاظ کا بس معمولی سا ہی استعمال آتا ہے لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ یا شاید پڑتا ہو، کچھ کہہ نہیں سکتا۔ میں تو بس یہ سمجھتا ہوں کہ اگر احساسات اور جذبات سچے ہوں تو وہ خود ہی اپنے آپ کو منوا لیں گے۔ اس کے لیے بھاری بھرکم اور شان و شوکت رکھنے والے لفظوں کی حاجت نہیں ہوتی۔
اچھا تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میرے دل کے کیلنڈر کی یہ جو ابتدا ہوئی ہے۔ یہ میرے لیے بڑی غیر معمولی بات ہے (ویسے دل کے معاملات غیر معمولی ہی ہوتے ہیں...... ہے نا؟) مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ "واردات" یوں بیٹھے بٹھائے ایک دم سے ہو جائے گی۔ ایک نظر میں اور ایک پل میں...... اور یہ ایک پل کیسے مجھے اپنے حصار میں، بلکہ اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے، اسے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں لفظوں کے معاملے میں خاصا تہی داماں ہوں۔

اب دیکھو ذرا، رات کو نیند نہیں آئی۔ صبح ہو گئی، جاگتا رہا، سوچتا رہا...... جانے کیا کیا سوچ لیا۔ محبت کے آغاز سے لے کر انجام تک۔ اچھے برے، ہر طرح کے خیالات آتے رہے۔ حالانکہ میں جس عمر اور جس کیفیت میں ہوں، اس میں انسان کو دنیا بڑی خوب صورت نظر آتی ہے۔ ہر رنگ گلابی' ہر خواب دھانی دکھائی دیتا ہے مگر میں کیا کروں، محبت فقط خوش رنگ خواہشوں کی تتلیاں ہی اپنے ساتھ نہیں لاتی بلکہ اوہام اور خدشات کے بدصورت سائے بھی اس کے ہمراہ ہوتے ہیں۔ ایک شاعر سے مستعار لیے گئے الفاظ میں......

ایک رات کیا جاگے، باقی عمر کی نیند ہی اڑ گئی
اک خواب کیا دیکھا کہ دھڑکا لگ گیا تعبیر کا

☆☆☆

ڈائری لکھنا تو میرا شوق ہے مگر تمہیں خط لکھنا کیا ہے؟ انتہائے شوق؟ یا محبت کی ضرورت یا دل کی طلب؟ یا اس کے سوا کچھ اور؟ بہرحال کچھ بھی ہو۔ بات دراصل یہ ہے کہ بہت سی باتیں ہیں جو میں کہنا چاہتا ہوں تم سے۔ بے معنی رومانوی مکالمات نہیں بلکہ یوں ہی بس ایسی باتیں جو میں کسی اور سے نہیں کر سکتا۔ ہاں بس تم سے کہہ سکتا ہوں۔ میں سوچ رہا تھا کہ محبت میں "اظہار" کتنا ضروری اور اہم ہوتا ہے۔

میں نے ایک کہانی پڑھی "او ہنری" کی۔ ایک ستر سالہ بوڑھا اپنے ماضی کو سوچتا ہے بار بار...... بلکہ ہر وقت۔ اس وقت کے بارے میں جب اسے ایک لڑکی سے الفت ہو جاتی ہے۔ دریا کنارے، پکنک کے دوران، اسے موقع ملتا ہے اس لڑکی کے ساتھ وہ تنہا ہوتا ہے۔

وہ محبت کے جذبات کے لیے سوچتا ہے، ڈرتا ہے، جھجکتا ہے کہ کہیں وہ برا نہ مان جائے۔ اس کے جذبات کو پذیرائی نہ بخشے۔ کہیں اسے دھتکار نہ دے۔ یہ ڈر اور خوف اس کی زبان کو مفلوج کیے دیتے ہیں۔ وہ قیمتی لمحے یوں ہی خاموشی کی نذر ہو جاتے ہیں۔

اس لڑکی کی شادی اسی کے ایک دوست سے ہو جاتی ہے۔ چالیس برس گزر جاتے ہیں اور ان چالیس برسوں میں کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ وہ شخص یہ نہ سوچتا ہو کہ اگر وہ اظہار کر دیتا تو کیا ہوتا؟ اور بالآخر ایک روز یہ چبھن اور الجھن اس کے بس سے باہر ہو جاتی ہے۔

وہ اپنے دوست کے گھر جاتا ہے اور اس خاتون کو چالیس سال پہلے ہونے والی پکنک اور تنہائی کے ان لمحوں کا حوالہ دے کر سوال کرتا ہے۔

پینسٹھ برس کی اس خاتون کو وہ دن یاد ہوتا ہے، وہ کہتی ہے۔

"پیارے...... اگر تم اس روز اظہار الفت کرتے تو میں تمہیں ہرگز مایوس نہیں لوٹاتی۔ آج میں تمہاری ہوتی۔"

تم سوچو کہ اس جواب کے بعد اس شخص کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ پچھتاوے کا احساس کیسا جان لیوا ہوتا ہے۔ وہ کسک جو آخری سانس تک اس کے ساتھ رہی۔ کس کس طرح نہ تڑپایا ہوگا اسے۔ مجھے یہ کہانی ہمیشہ یاد رہتی ہے۔

میرا مطلب ہے کہ اس کہانی کا خیال، اس بوڑھے کا خیال اکثر میرے ساتھ رہتا ہے اور پھر میں یہ سوچتا ہوں کہ میرا بڑھاپا یا اس سے پہلے کی عمر میرے ساتھ خدانخواستہ اس قسم کی کوئی کسک، کوئی پچھتاوا نہ ہو۔ اظہار نہ کرنے کی کسک اور محبت کو کھونے کا دکھ...... مجھے اس دکھ سے بہت ڈر لگتا ہے۔

تم شاید سوچو کہ میں مرد ہو کر ڈرتا ہوں تو ہاں...... ہر مبتلائے الفت ایک خوف کو اپنے ساتھ لیے چلتا ہے، چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ لیکن ہمارے معاشرے میں مرد حضرات کو ہر معاملے کی طرح اس معاملے میں بھی سہولت، آزادی اور فوائد میسر ہیں۔ انہیں استعمال کرتے ہوئے میں اس نارسائی کے دکھ سے بچنے کی کوشش کروں گا۔

تمہیں میری باتیں بہت ثقیل اور بوجھل لگ رہی ہوں گی۔ محبت ناموں کو اتنا بھاری بھرکم نہیں ہونا چاہیے، نہ ہی اداس اور پریشان کن۔

تو تم بتاؤ، تمہیں کیا کیا اچھا لگتا ہے؟ میرے پاس

تو اس سوال کے جواب میں ایک طویل فہرست ہے۔ جس میں سرِفہرست تم ہو۔ تم میرے دریچے کے نیچے سے گزرتے ہوئے جس طرح پیڑوں کے تنوں پر ہاتھ پھیرتی ہوئی جاتی ہو، جس حیرت و معصومیت سے پرندوں کو تکتی ہو۔ ایک بار تم نے زمین پر سے خشک، زرد پتا اٹھا کر اپنی فائل میں رکھا تھا۔ یہ انوکھی بات ہے۔ لوگ عموماً کتابوں میں پھول رکھتے ہیں۔ تم خزاں آلود پتے جمع کرتی ہو۔ شاید اس لیے کہ وہ پھول جو کتابوں میں تر و تازہ رکھے جاتے ہیں، وہ بھی بالآخر ایک روز خشک، بے جان اور مرجھائے ہوئے ہو جاتے ہیں۔

تم بھی سر اٹھا کر میری جانب دیکھتی ہو۔ مجھے سب اچھا لگتا ہے۔ تمہارا دیکھنا، ٹھہرنا، گزرنا...... مجھے سب ہی بہت بھلا لگتا ہے۔ میں نے تمہاری آواز نہیں سنی۔ میں تمہیں سنتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہیں سننا چاہتا ہوں اور یہ کوئی ناممکن تو نہیں، کیوں؟

☆☆☆

کھلی ڈائری کا پورا ورق پڑھ کر اس کے ہونٹ سیٹی کی شکل میں گول ہو گئے۔ ایک معنی خیز نظر اس نے ذی وقار کے چہرے پر ڈالی۔

"اتنی جلدی مجنوں بن گئے؟ ایک ہی ہفتے میں؟"

"ایک ہفتہ تو بہت ہوتا ہے۔" ذی وقار مسکرا دیا۔

"یہ تم نے اس کے لیے لکھا ہے تو یہ خط تمہاری ڈائری میں کیا کر رہا ہے؟" مہرافروز اس صفحے کو ڈائری سے پھاڑ کر نکالنے لگی جس پر 28 جنوری 1985ء کی تاریخ لکھی ہوئی تھی۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟"

"جس کے لیے ہے، اسے پہنچا دوں گی۔"

"مگر......؟" وہ ہچکچایا۔

"کیا بات ہے، ڈرتے ہو؟" مہر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"اپنے لیے نہیں، اس کے لیے۔ اس کے لیے ڈرتا ہوں۔"

"اس کے لیے بھی مت ڈرو۔ ڈر...... محبت کو کھا جاتا ہے۔" مہرافروز نے وہ صفحہ تہ کر کے اپنے ہاتھ میں رکھا۔

"مہر......" ذی وقار نے مضطرب ہو کر اسے پکارا۔

"اب کیا ہے؟" اس نے جاتے ہوئے پلٹ کر دیکھا۔

"اگر اس نے انکار کر دیا تو؟"

"تو پھر تم بھی اپنے قدم پیچھے ہٹا لینا۔ یک طرفہ محبت سے بڑی خواری کوئی نہیں۔"

☆☆☆

10 فروری 1985ء

انسان صرف اس وقت بادشاہ نہیں بنتا، جب وہ تخت و تاج کا مالک ہو جائے بلکہ ایک انسان اس وقت بھی بادشاہ ہوتا ہے جب اقلیمِ محبت اسے حاصل ہو جائے۔ تو اب سے میں بادشاہ ہوں اور تم میری ملکہ۔ وہ ملکہ جو اپنے بادشاہ پر حکومت کرتی ہے۔

خزاں بس کچھ ہی عرصہ ہے پھر رخصت ہو جائے گی۔ لوگ بڑے چاؤ اور شدت سے بہار کا انتظار کرتے ہیں، نئے رنگ برنگے پھولوں کے لیے، نئی روشنیوں، خوشیوں اور کامیابیوں کے لیے۔ اگرچہ بہت سے افراد بہار آنے کے بعد بھی ان سب سے محروم رہتے ہیں۔

مجھے خزاں اچھی لگتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ میں مایوس، دکھی یا قنوطیت پسند ہوں۔ ہرگز نہیں...... میں بالکل بھی ایسا نہیں۔ بس یہ ہے کہ مجھے ہر موسم اچھا لگتا ہے۔ ہر موسم کا اپنا ایک حسن، ایک لطف ہوتا ہے۔ بے شک کچھ شواہد بھی ہوتے ہیں۔ محبت کے بھی موسم ہوتے ہیں۔ انتظار کا موسم، امید و ناامیدی کا موسم، فرقتوں اور قربتوں کا موسم...... ہر محبت کرنے والے کی زندگی میں آخری موسم یعنی وصل کا موسم آئے نہ آئے، باقی سارے موسم آتے ہیں اور یہ لکھتے ہوئے مجھے خیال آ رہا ہے کہ شاید تم سوچو، یہ محبت کے خطوط ہیں یا لیکچر اور فلسفے سے بھرے ہوئے صفحات......

چلو، تم کچھ بھی سمجھ لو، اور کچھ بھی سوچ لو...... میں تو بس وہی لکھتا چلا جاتا ہوں جو ذہن میں آتا ہے۔ تو بات یہ ہے کہ خزاں کے رنگ بھی بڑے حسین ہوتے ہیں، زرد، قرمزی، جامنی، عنابی، گلابی...... پتوں کے یہ

سارے رنگ خزاں کے مرہون منت ہیں۔
بہار میں تو فقط ایک سبز رنگ کی پوشاک ملتی ہے ان بے چاروں کو۔ مگر یہ بھی ہے کہ ان رنگوں کے عوض شاخوں سے بچھڑنا مقدر ہے۔ تو محبت میں یہ جو انتظار کا، امید کا، جوانی کا الگ الگ رنگ ہوتا ہے۔ اس کی اپنی ایک دلکشی اور اہمیت ہے مگر ان رنگوں کے ساتھ بے چینی، بے قراری، اضطراب کی کیفیات مقدر ہیں۔
جب کوئی ساتھ نہیں ہوتا، سامنے نہیں ہوتا تو اس کا تصور، اس کا خیال ساتھ ہوتا ہے۔
اچھا خاصا بیٹھے بیٹھے گم ہو جاتا ہوں
اب میں اکثر میں نہیں رہتا، تم ہو جاتا ہوں
تو میں سوچتا ہوں کہ تم کیسے ہنستی ہو، کیسے مسکراتی ہو اور تمہیں غصہ کیسے آتا ہے؟
ویسے تمہیں کس بات پر سب سے زیادہ ہنسی آتی ہے؟ اور کس بات پر غصہ آتا ہے؟ میں تمہاری ہنسی کی قدر اور غصے کا احترام کروں گا، یہ دعوا نہیں ہے، میری خواہش ہے......

☆☆☆

22 فروری 1985ء۔
شکر ہے اب میرا پیر بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔ اگر تمہارا گزرا اور پھر یہ واردات قلبی جو میرے ساتھ ہوئی۔ نہ ہوتی تو میرے لیے قید بلکہ کسی حد تک قید تنہائی گزارنا بہت مشکل ہو جاتا۔ تمہارے تصور کے ساتھ تمہیں سوچتے ہوئے اور تمہیں لکھتے ہوئے۔
اور ابھی ابھی پتا ہے مجھے کیا خیال آیا؟ دور تک پھیلے وسیع و عریض خشک بیاباں اور چمکیلے سنہری ذرات والے صحرا میں کھڑا ایک اکلوتا درخت۔ یہ خیال کیوں آیا؟ مجھے؟! اگرچہ تمہاری محبت ایک سرسبز درخت ہے میرے اندر۔ مگر میری ذات کوئی بنجر، بیابان صحرا تو نہیں۔ پھر پتا نہیں کیوں؟
خیر یہ الجھا دینے والی باتیں چھوڑو، چلو آج میں تمہیں اپنے گھر والوں کے بارے میں بتاتا ہوں۔ شاید مہر نے بھی تمہیں بتایا ہو، مگر میں خود بتانا چاہتا ہوں۔
میرے ایک بابا ہیں، بہت شفیق اور نرم دل۔ پیر سید عبد الرحمان جیلانی، وہ روایتی پیروں سے مختلف اور الگ ہیں مگر خاندانی روایت کے مطابق وہ دادا جان کے، ان کے آستانے اور گدی کے وارث جانشین ہیں۔ وہ بہت دین دار، متقی قسم کی شخصیت ہیں۔
میرے بڑے بھائی بھی بابا کی طرح ہی ہیں۔ بہت مذہبی، خاندانی وراثت کے امین' مگر میں جانے کیوں ان دونوں سے تھوڑا مختلف ہوں۔ اگرچہ میں خدانا خواستہ مذہب سے بے گانہ یا دور تو نہیں مگر دنیا کی دل فریبی اور رنگینیاں بھی (اس لفظ سے کوئی غلط مطلب نہ سمجھنا) اپنی جانب کھینچتی ہیں، میں ایک عام سا انسان ہوں اور انسان ہو یا فطرت مجھے ہر خوب صورتی مسحور کر دیتی ہے۔
اللہ کی تمام تر تخلیقات میں سب سے حیرت انگیز تخلیق انسان ہے۔ سب سے حسین دلچسپ، عجیب اور کہیں کہیں عبرت انگیز۔ الگ الگ مزاج طبیعت، خصلت اور فطرت رکھنے والے لوگ، پھر بھی کچھ لحاظ سے ایک جیسے لوگ۔
انسانوں کے ساتھ ساتھ مجھے کتابوں کا مطالعہ بھی جنون کی حد تک پسند ہے۔ اگرچہ بابا اور بھیا کا کلیکشن زیادہ تر مذہبی کتب پر مشتمل ہے مگر میرے پاس ہر طرح کا ادب اور ہر طرح کی کتابیں ہیں۔
دیکھو ذرا میں اپنے گھر والوں کا تعارف کرواتے کرواتے کہاں سے کہاں آ گیا تو میں بتا رہا تھا کہ میری امی، دنیا کی سب سے اچھی امی ہیں (اور دنیا کے ہر بچے کو شاید یہی لگتا ہے) تم ان سے ملو گی تو تم بھی یہی کہو گی اور میری ایک آپا ہیں، ایک بھیا۔ دونوں مہر کی بھابھی ہیں، مہر میری ہونے والی بھابھی ہے۔ ہنسنا مت، ہمارے خاندان میں کچھ اسی طرح کی رشتے داریاں ہیں اور ہاں، کسی قسم کے وسوسے کو دل میں جگہ نہ دینا۔ میں نے بتایا نا کہ بابا بہت شفیق ہیں۔ شادی کے معاملے میں اولاد کی مرضی کو اہمیت دی جاتی ہے۔
سوچو تو یہ سب کتنا خوش گوار اور دل آویز ہے۔ ظالم سماج یا اس طرح کی کوئی رکاوٹ ہمارے راستے میں نہیں ہے۔ مہر بتا رہی تھی کہ تمہارے ماموں، ممانی

بہت سویٹ قسم کے ہیں۔ میرا فائنل ہو جائے تو میں آپا پاپا بجیا کے ذریعے اپنی خواہش امی بابا تک پہنچا سکتا ہوں۔ تم سوچو گی کہ میں خود تو خواب دیکھ ہی رہا ہوں، تمہیں بھی دکھا رہا ہوں تو کیا حرج ہے؟ اور ویسے دراصل میں نے خواب دیکھنا اس دن شروع کیا، جس دن تم نے میری جرأت کو، میرے اظہار کو پذیرائی بخشی۔

میں بہت بے تابی سے مہر کا انتظار کر رہا تھا اور جب وہ آئی تو لٹکے ہوئے منہ کے ساتھ، میرا تو دل ہی ڈوب گیا اور پھر مہر نے کہا کہ گل آرزو نے یعنی کہ تم نے وہ خط لینے سے انکار کر دیا ہے اور اسے ڈانٹ کر بھگا دیا ہے۔

کیا تم یقین کرو گی کہ اس وقت میری کیا کیفیت تھی؟ مجھے یوں لگا جیسے میں اس دنیا میں کہیں نہیں بلکہ کسی اور ویران، بیابان کرہ پر کھڑا ہوا ہوں۔ تنہا، اکیلا اور خوف زدہ۔ جہاں میرے سوا کوئی ذی روح نہیں۔ نہ انسان، نہ حیوان، نہ چرند نہ پرند، نہ کوئی جنگل، نہ پہاڑ، نہ پھول، نہ پتا، نہ درخت۔ بس ایک لق و دق صحرا اور میں اکیلا۔

کچھ لمحوں بعد جب وہ ہنسی تو مجھے احساس ہوا کہ وہ کتنی بڑی اداکارہ ہے۔ اس کے چہرے کے تاثرات نے مجھے سچ مچ کچھ دیر کے لیے تو مار ہی ڈالا تھا اور پھر مجھے دوبارہ زندگی مل گئی۔

☆☆☆

24 مارچ 1985ء۔

پھر نگاہ لوٹ کر نہیں آئی
ان پر قربان ہو گئی ہو گی

مہر نے آج شام کیا غضب کیا، بلکہ غضب کا احسان کیا مجھ پر۔ وہ تمہیں اپنے ساتھ لے آئی۔ تم صحن میں امی جی کے پاس بیٹھی تھیں۔ میں نے اوپر سے تمہیں دیکھا اور دیکھتا رہا۔

امی کی کسی بات پر تم مسکرائیں اور مجھے یوں لگا جیسے یہ مسکراہٹ، یہ منظر میں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ پتا نہیں کب اور کیسے؟ خواب میں یا حقیقت میں؟ اچانک یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ لمحہ جانا پہچانا ہے۔ جیسے پہلے بھی کبھی ہم اس لمحے سے گزر چکے ہیں۔ اس کیفیت کو التباس کہتے ہیں۔ کیا تم کبھی اس کیفیت سے گزری ہو؟

زندگی اور اس کے معاملات کبھی کبھی کتنے حیرت انگیز لگتے ہیں۔ تم نے نیلا آنچل سر پر ڈالا ہوا تھا۔ تمہاری لانبی انگلیوں میں بسکٹ کا ٹکڑا، تمہاری مسکراہٹ، سب کچھ میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ کیا میں بھی تمہیں کچھ مانوس اور کچھ اپنا اپنا لگتا ہوں یا ابھی تک مجھے اجنبی سمجھتی ہو؟

تم نے مہر سے کہا کہ خط کے جواب کی خواہش یا امید نہ رکھنا۔ یہ تمہارے لیے ممکن نہیں تو میری پیاری، میں کب کوئی جواب مانگتا ہوں تم سے نہ کوئی بدلہ، نہ خطوط کا، نہ محبت کا، جو میرے اندر ایک سرسبز درخت بن کر کھڑی ہے۔

میں تو بس تمہیں دینا چاہتا ہوں۔

وہ ساری چاہت، الفت، عزت، احترام اور خوشیاں جو میرے بس میں ہوں۔ جو میرے اختیار میں ہوں اور جو میرے دل میں ہوں۔

وہ ساری دعائیں جو تمہاری زندگی میں آسانیاں اور سکھ لے کر آئیں۔ میں کبھی نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تمہاری زندگی میں کوئی مشکل یا پریشانی آئے۔

تم نے مہر کو بتایا کہ میرے خطوط پڑھتے ہوئے تمہیں کبھی سچائی کا احساس ہوتا ہے۔ کبھی شاعری کا اور کبھی مبالغہ آرائی کا۔ تو بات یہ ہے کہ ان لفظوں میں میرے جذبات ہیں، میرے خیالات ہیں، انہیں تم کچھ بھی سمجھتی ہو مگر بس کبھی مذاق یا جھوٹ نہ سمجھنا۔ میں جو کچھ لکھتا ہوں، بہت سچائی کے ساتھ لکھتا ہوں اور یہ ممکن ہے کہ اس میں تمہیں شاعری اور مبالغہ آرائی کی آرائش محسوس ہوتی ہو۔

اچھا تو آج میری ایک خواہش پوری ہوئی۔ میں نے تمہاری آواز سنی۔ تمہیں بولتے ہوئے، بات کرتے ہوئے دیکھا۔ محبوب سے وابستہ کوئی خواہش پوری ہو تو کیسی خوشی ہوتی ہے۔ بیان سے باہر ہے مگر

تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں تھیں؟
اور مہر نے بتایا کہ تم بہت مشکلوں سے آمادہ ہوئیں میرے گھر آنے کے لیے۔ تمہیں ڈر لگ رہا تھا اور شرم بھی آرہی تھی اور تمہاری ان باتوں پر مجھے ہنسی آرہی تھی۔ اچھا، یہ بتاؤ۔ دوبارہ تو آؤ گی نا؟ مجھ پر احسان کرکے تمہیں ضرور اچھا لگے گا۔

☆☆☆

30 اپریل 1985ء۔
"محبت میرا مذہب اور تم میرا عقیدہ ہو۔"
کیٹس نے یہ الفاظ اپنی محبوبہ فینی کے لیے کہے تھے۔ اب یہ الفاظ ہر محبت کرنے والے کے لیے ہیں اور بے شک الفاظ کسی اور کے ہی، جذبات تو خالصتاً میرے اپنے ہیں۔ ہر مبتلائے عشق بے چارہ شاعر اور ادیب تو نہیں ہوتا نا۔ ہم جیسے عام لوگ بھی اس قطار میں کھڑے ہوتے ہیں اور مجبوراً کسی کے شعر اور کسی کی نثر پر ہاتھ صاف کرنا پڑتا ہے۔
مہر جب بھی آتی ہے یا تو اس سے کرید کرید کر تمہارے بارے میں پوچھتا رہتا ہوں یا خود ہی تمہارا تذکرہ کرتا رہتا ہوں۔ مہر بہت ہنستی ہے مجھ پر۔ کہتی ہے تم پاگل ہوگئے ہو۔
وہ عشق ہی کیا جس میں انسان پاگل نہ ہو۔ ویسے جسے پاگل پن یا دیوانگی کہا جاتا ہے، وہ دراصل محبت کے آداب و رسومات ہیں۔

یا تیرا تذکرہ کرے ہر شخص
یا ہم سے کوئی گفتگو نہ کرے

مہر بتا رہی تھی کہ تمہیں شاعری پسند ہے۔ کاش کہ میں ایک شاعر ہوتا۔ ویسے تمہارے لیے تھوڑی بہت شاعری تو کرسکتا ہوں۔ وہ جو ایک فلمی شاعر نے کہا ہے نا کہ "میں شاعر تو نہیں مگر اے حسین......"
اچھا تو دیگر احوال یہ ہے کہ امتحان کا موسم نزدیک ہے اور جی کڑا کرکے کتابوں سے دل لگانا پڑ رہا ہے۔ ایک شاندار اکیڈمک رزلٹ اپنے لیے ہی نہیں، ہونے والی سسرال کے لیے بھی خاصا خوش آئند اور خوش گوار ہوتا ہے۔
میرے امتحانوں کے بعد گھر میں بھیا کی شادی کی تیاریاں شروع ہوجائیں گی۔ مہر کو کبھی یوں ہی شرارت میں اس حوالے سے چھیڑ دوں تو جھینپ کر فوراً تمہاری باتیں کرنے لگتی ہے۔
سوچتا ہوں کہ تم شرمائی ہوئی کیسی لگتی ہوگی؟ مزاج کے ہر رنگ میں تمہارا تصور کرتا ہوں کہ تم کیسی لگتی ہوگی؟ ہنستی اور مسکرائی ہوئی، کبھی اداسی میں، کبھی خفگی میں، کبھی غصے میں، کبھی شرماتے ہوئے اور کبھی تو وہ مبارک وقت آئے گا جب تمہاری ذات کے، مزاج کے سارے رنگ، میری زندگی میں گھل مل جائیں گے۔
اف یہ خواب! سچ میں جینا حرام کردیا ہے ان خوابوں نے...... لیکن پھر بھی مجھے پیارے ہیں یہ۔
بہار کا موسم آگیا ہے۔ درختوں، پتوں اور پھولوں پر بہار کے رنگ اب چھائے ہیں۔ ہماری زندگی میں تو یہ رنگ دسمبر میں آگئے تھے جب تمہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ ویسے کیا یہ سچ ہے کہ آنکھوں میں ایک تصویر ازل سے موجود ہوتی ہے۔ جب بھی وہ کہیں نظر آجائے تو پورے وجود پر قبضہ جما لیتی ہے؟

تمہارے معاملے میں خود میرا دل
میرے مد مقابل ڈٹ گیا ہے

☆☆☆

22 مئی 1985ء۔
چلچلاتی دھوپ، بہتا پسینہ، ہوا بند ہے۔ پتے ساکن، دم سادھے، شاخوں پر سر دیے کر پڑے ہیں۔ سردی، بہار، خزاں، برسات ہر موسم کم یا زیادہ رومانٹک ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے مگر گرمی کا موسم تو بس...... بالکل بھی رومانس نہیں اس میں۔ مگر یہ کم بخت دل۔
اس شکر دوپہر میں بھی تمہیں دیکھنے کو مچل گیا۔ سات دن، چھ گھنٹے اور تادم تحریر تقریباً بتیس منٹ ہوگئے ہیں تمہیں دیکھے ہوئے۔ محبت کرنے والوں کو آزماتے ہیں، نہ ستاتے ہیں۔ ان پر کرم کرتے ہیں۔ موسم باہر نہیں ہوتا، انسان کے اندر ہوتا ہے اور محبت ہر شے کو اور ہر موسم کو حسین بنا دیتی ہے تو پیاری! یقین

جانو یہ جیسی بجری دوپہر بھی بری نہیں لگ رہی۔ سوچتا ہوں کہ تم کبھی وہ سب محسوس کر سکو گی جو میں سوچتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں؟

"اک نظر تم میرا محبوب نظر تو دیکھو"

محبت انسان کو کیا کچھ بنا دیتی ہے۔ خوب صورت بھی اور اداس بھی۔ تنہا بھی اور کبھی شاعر، ادیب، فلسفی یا دانش ور۔ مجھ پر محبت کے کتنے روپ آئے ہوئے ہیں۔

محبت انسان کو خود غرض بھی بنا دیتی ہے۔ میں بھی کبھی خود غرض ہو کر سوچتا ہوں کہ لفظوں کے سہارے کب تک تم سے ملتا رہوں۔ اب نصف کے بجائے پوری ملاقات کو جی چاہتا ہے۔ بے شک چند منٹ ہی سہی۔ پھر اپنی خود غرضی پر ندامت بھی ہوتی ہے کہ میں تمہیں کسی امتحان یا مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا اور اپنی بے بسی پر پھر فراز و شہ یاد آتے ہیں۔

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
خون جگر ہونے تک اب دل کا رنگ جو بھی ہو

بہر حال اسے قبول بھی کرنا ہے اور برداشت بھی۔ یہ جو ذرا دیر کو خیالوں ہی خیالوں میں خود غرض ہو جاتا ہوں تو اس لیے کہ ایک عام سا انسان ہوں، فرشتہ نہیں۔

مہر بتا رہی تھی کہ تمہیں سمندر کا کنارہ، موتیے کے پھول، دھیمی دھیمی ہوا، بارش کے بعد اٹھتی مٹی اور سبزے کی مہک۔ ابن انشاء اور جون ایلیا کی شاعری، بے حد نیلا آسمان اور اس پر سفید بادل، فضاؤں میں پرواز کرتے پرندے، ہر رنگ اور ہر قسم کے پھول، گرمیوں کی صبحیں اور سردیوں کی راتیں، بلی کے بچے، کبوتر اور خرگوش، خوب بڑے بڑے چھتنار درخت، پچاس اور ساٹھ کی دہائی کی رومانٹک فلمیں...... اردگرد سے بے نیاز کھیل میں مگن بچے، چاندی بالوں والے اپنے سونے جیسے ماموں ممانی، پروین شاعر کی "خوشبو" نیرہ نور کی آواز میں "کبھی ہم خوب صورت تھے"۔ اور میرے خطوط (زہے نصیب) بہت اچھے لگتے ہیں۔

اور......

مجھے وہ سب اچھا لگتا ہے جو تمہیں پسند ہے۔

ایسا کیوں لگتا ہے کہ جیسے میں تمہاری آنکھوں سے یہ دنیا دیکھتا ہوں اور میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میرے دل سے اس الفت کو محسوس کرو اور میری نگاہوں سے خود کو دیکھو۔ تمہیں خود اپنے آپ سے پیار ہو جائے گا۔ خود کو لاکھ سمجھاتا ہوں، اس دل پر پہرے بٹھاتا ہوں پھر بھی یہ دل، یہ میرا پاگل دیوانہ دل۔ یہ میری منتظر نگاہیں تمہیں دیکھنے کی، تم سے ملنے کی التجا کرتی ہیں۔ خود کو سمجھانا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے؟

رات کو اداس دیکھیں
چاند کو نراس دیکھیں
تمہیں جو نہ پاس دیکھیں
آؤ پاس آؤ نا، آؤ پاس آؤ نا

☆☆☆

آخری پیپر دے کر زندگی کا جیسے سب سے بڑا بوجھ سر سے اتر گیا تھا۔ بقول دوستوں کے، امتحانی ڈاہیات ختم۔ گرمی کی گرمی بھی بری نہیں لگ رہی تھی۔ وہ گھر والوں کے ساتھ تھا۔ راہ میں نظر آتے ہر شخص اور ہر منظر کو پیار سے دیکھتا ہوا۔ تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ گرمی سے پگھلتی ہوئی تارکول کی سڑک۔ چہرے اور جسم کے پسینے کے بہتے ریلوں سے بے نیاز سامان ڈھوتا مزدور، بس کے انتظار میں، درخت کی چھاؤں تلے کھڑے لوگ۔ ٹھنڈے شربت اور جوس کی ریڑھیوں پر جمع بچے اور بڑے۔ مختلف دکانوں میں کام کرتے لڑکے اور مرد حضرات۔ گیراج میں گاڑیاں ٹھیک کرتے ہوئے عرفان انکل اور دوسرے مکینک۔ گھنگریالے بالوں والا چھوٹو۔ دکان کے تھڑے پر بیٹھے توندیل شاہد بھائی اور ان کے ساتھ سیاست پر بحث کرتے بے حد جذباتی اللہ بخش چاچا۔ گرلز کالج سے نکلتی ہوئی لڑکیاں۔

اور ذی وقار کا پورا جسم آنکھ بن گیا مگر ہر منظر بس لمحہ بھر کے لیے سامنے آیا اور پھر اوجھل۔ نوید، اس کا دوست اور کلاس فیلو۔ جس کی نئی ویسپا پر وہ بیٹھا تھا۔ نوید اپنی ویسپا بہت تیز چلا رہا تھا۔ ذی وقار کو گھر

چھوڑ کر پھر اسے اپنے گھر پہنچنے کے لیے گاڑی بھگانی تھی۔ راستے بھر کے مناظر اپنی آنکھوں میں سمیٹے ذی وقار گھر پہنچا۔

آج اسے بہت طویل اور بہت بہت پیارا سا خط لکھنا تھا۔ گل آرزو کا حکم تھا کہ جب تک پیپرز ہو رہے ہیں، وہ کوئی خط نہیں لکھے گا۔ آج سے یہ پابندی ختم۔

ذی وقار کا پورا وجود کسی پرندے کی طرح سبک ہوا کی مانند ہلکا پھلکا تھا۔ کتنی ساری باتیں جمع ہو گئی تھیں۔ وہ گھر آیا، کھانا تیار تھا۔ اس کی آمد کا انتظار ہو رہا تھا۔ دستر خوان بچھا دیا گیا۔ کھانا چُن دیا تھا۔ ذی وقار نے پلیٹ میں سالن نکالا، لوکی گوشت۔ اس کے پسندیدہ کھانوں میں سے ایک، ابھی پہلا نوالہ اٹھا کر منہ تک لے کر ہی گیا تھا کہ باہر شور اٹھا، بہت ساری آوازیں۔

"الٰہی خیر۔" بیک وقت سب کی زبانوں سے نکلا۔

اور خیر ہی تو نہیں رہی تھی۔

بڑا گیٹ کھول دیا گیا تھا۔ صحن کے بیچوں بیچ، چارپائی پر اس جوان رعنا کا جسد خاکی رکھا ہوا تھا جو شاہ صاحب کا اور ان کی خاندانی روایتوں کا وارث تھا اور تین ماہ بعد جس کی شادی تھی۔ ذی وقار کا بڑا بھائی۔ شاہ صاحب کا بڑا بیٹا سید زوار شاہ جیلانی ٹریفک حادثے میں موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا تھا۔ اس گھر میں اور کتنی آنکھوں میں اندھیرا اتر آیا تھا۔

☆☆☆

ایک ماہ گزر گیا تھا اور سب کو سنبھالتے سنبھالتے ذی وقار اب خود ڈھے رہا تھا۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ وہ کھڑکی کھول کر کھڑا باہر دیکھ رہا تھا۔ گھپ اندھیرے میں بس تاروں کی جھلملاہٹ تھی جو روشنی کا عنوان بن رہی تھی۔

"تم خوش نصیب ہو، تمہارے لیے اجالوں کی امید ان ستاروں میں ہے اور میرے لیے روشنی کے سارے امکان مسترد ہو چکے ہیں۔"

خود کو اتنا بے بس اور اتنا بے اختیار پہلے کبھی نہیں محسوس کیا تھا ذی وقار نے۔ زندگی کا اختتام ایک بند گلی میں ہو رہا تھا۔ آگے کوئی راستہ نہ تھا۔ کوئی روزن، نہ دریچہ۔ وہ ٹھہر گیا۔ رک گیا اور..... اور مر گیا۔

سید ذی وقار جیلانی اپنے بھائی کی موت کے بعد جیتے جی مر گیا یا اسے مار دیا گیا۔

کبھی بھی ہو، اس سے کیا فرق پڑتا ہے بس حقیقت تو یہ تھی کہ اسے پھانسی کے پھندے پر جھولنے کا حکم دیا گیا تھا اور بے شک اسے اختیار بھی دیا گیا تھا کہ وہ اس پھندے کو گلے میں ڈال لے۔

اگر وہ چاہے تو اس بند گلی سے واپس مڑ جائے۔ اگر وہ چاہے تو اس تختہ دار پر نہ چڑھے اور اگر وہ چاہے تو بے شک اپنی مرضی سے اپنی زندگی کا انتخاب کر لے۔ مگر ذی وقار بے بسی اختیار کر سکتا تھا، بے حسی نہیں۔

وہ موت کا انتخاب کر سکتا تھا مگر خود غرضی کا نہیں۔ اسے اپنے والدین سے محبت ہی نہیں عقیدت بھی تھی۔ وہ بوڑھے، بہت پیارے اور انتہائی غم زدہ والدین جو اپنے جوان بیٹے کی موت کا صدمہ سہہ رہے تھے۔ اس بیٹے کی جواں مرگی کا دکھ جسے چند ماہ بعد اپنی نئی زندگی کا آغاز کرنا تھا۔ جس کے سر پر سہرا سجنا تھا۔ وہ سفید کفن اوڑھ کر منوں مٹی تلے جا سویا اور اب اس بیٹے کی جگہ ذی وقار کو لینی تھی۔

نیم تاریکی میں کھڑے ذی وقار کی لہو رنگ آنکھوں میں وہ منظر ٹھہر گیا تھا۔ وہ وقت، وہ بات سب کچھ نقش ہو کر ٹھہر گیا جب بابا نے اسے بتایا۔

"بیٹے وقار! مہر کو اسی گھر میں آنا ہے۔ وہ بچپن کی منگ ہے اور ہمارے گھر کی عزت بھی۔ خاندان، حسب اور نسب کے معاملات آڑے آ رہے ہیں۔ اس کے دونوں بھائی جو ہمارے داماد بھی ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ مہر بہو بن کر اسی گھر میں آئے جیسے کہ برسوں پہلے طے ہوا تھا۔" بابا سائیں اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں بتا رہے تھے۔

"مگر...... یہ کیسے ممکن ہے؟" ذی وقار کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہ تھی۔

"یہ ایسے ممکن ہے کہ وہ آپ کو اپنے بڑے بھائی کی جگہ لینی ہوگی۔" سید صاحب نے اپنے بیٹے کا چہرہ دیکھا جو اس قیدی کے مشابہ لگ رہا تھا جسے سزائے موت کا حکم سنایا گیا ہو، ان کے دل کو کچھ ہوا، انہوں نے پھر کہا۔

"مگر یہ کوئی حکم نہیں ہے آپ کے لیے۔ صرف ایک التجا ہے اور بس......"

ذی وقار نے اپنے عزت دار اور وضع دار باپ کی سفید داڑھی دیکھی۔

ذی وقار نے ان کے سر پر رکھا وہ شملہ دیکھا جس کے ہر بل میں اس خاندان کی عزت، عظمت اور حرمت بندھی ہوئی تھی۔ ان کی آن بان شان تھی۔

ذی وقار نے بے بسی سے آنکھیں میچ لیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے ایک نیلا آنچل لہرایا اور دو متحیر مگر شفاف آنکھیں مسکرائیں۔

ذی وقار نے آنکھیں کھول دیں۔ بند آنکھوں میں تو خواب ہی نظر آتے ہیں۔ زندگی اور اس کے حقائق کا سامنا کھلی آنکھوں سے کرنا ہوتا ہے۔

ہمارے مشرق میں کچھ رواج جتنے خوب صورت اور زندگی عطا کرنے والے ہیں اور کچھ رسم و رواج جیتے جی مار بھی دیتے ہیں۔ رشتوں ناتوں کے ریشم بڑی خوب صورتی سے ایک دوسرے کو جوڑ کے رکھتے ہیں اور کبھی یہی ریشم پھانسی کا پھندا بھی بن جاتے ہیں۔ اس ریشم نے ذی وقار کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیں۔ اگرچہ اسے اختیار دیا گیا تھا مگر اسے جرأت نہ ہوئی کہ وہ ان بیڑیوں سے آزاد ہو کر آسمان کی وسعتوں میں پرواز کر سکتا جو نیلا آنچل بن کر لہرا رہا تھا۔

ذی وقار کی زندگی اور اس کا وجود ایک بہتے ہوئے سفر کرتے دریا سے بدل کر ایک منجمد برف بن گئے تھے۔ ایسی برف جس کا پگھلنا اب شاید ناممکنات میں سے تھا۔ وہ کسی مصور کی تخلیق کردہ تصویر بن گیا تھا جو کیسی ہی شاہکار کیوں نہ ہو، ہوتی تو بے جان ہی ہے۔ اس کے رنگ کتنے ہی شوخ، چمک دار کیوں نہ ہوں، وہ کبھی حرکت نہیں کر سکتے۔ زندگی کی رمق سے خالی، اپنی جگہ ٹھہرے ہوئے، رکے ہوئے رنگ۔

ذی وقار کچھ نہ بولا۔ اس روز وہ خاموشی سے مر گیا۔ محبت میں پہلے سے فنا وہ نوخیز لڑکا مر ہی تو گیا۔

☆☆☆

تین ماہ زیادہ عرصہ تو نہیں ہوتا۔ بعض دکھ ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں رونے کے لیے اور بھلانے کے لیے صدیاں بھی ناکافی لگتی ہیں۔ وہ رو رو کر تھکی نہیں تھی مگر اب خوف زدہ تھی۔ بہت زیادہ ڈری ہوئی۔ کل کا دن آنے والی تاریخ کا وہ دن تھا جس کا انتظار بہت شدت سے تھا کبھی۔ مگر آج اسے لگ رہا تھا کہ آنے والی کل اس کا یوم مرگ ہے۔

بچپن سے وابستہ، خود سے جڑا ہوا ایک نام۔ رگوں میں بہتے، جسم میں دوڑتے لہو کے ایک ایک قطرے میں سمائی محبت، ایک جھٹکے میں کیسے نکال کر الگ کی جا سکتی ہے؟

مہر نے پتھرائی ہوئی نظروں سے اس جوڑے کو دیکھا، جو کل اسے اپنے تن پر سجانا تھا۔ اس تن پر جس کے ایک ایک روئیں پر ذی وقار کا نام ثبت تھا۔

کاغذوں میں ایک نام ہٹا کر دوسرا نام لکھا جا سکتا ہے۔ دل اور روح سے نقش مٹانا اتنا آسان تو نہیں، کبھی تو عمر ہی گزر جاتی ہے۔ کتنی تکلیف اور اذیت سے گزرنا پڑتا ہے۔ نقش مدھم ہو بھی سکتا ہے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ۔

اور جو اگر محبت کا انجام پہلے ہی معلوم ہو جائے تو کوئی محبت نہ کرے، جن کے نصیب میں آگے جدائی لکھی ہے۔ مہر کو بھی اگر معلوم ہوتا کہ جس سے لڑکپن میں ہی منسوب کر دی گئی ہے، وہ یوں بیچ راہ میں چھوڑ کر چل دے گا تو وہ کبھی خوابوں کا تاج محل نہ کھڑا کرتی جس میں اب اس کی محبت اور وہ خود دفن ہونے کو تھی۔

"مہر...... مہر......" بڑی بھابھی جانے کب

کمرے میں آئی تھیں اور کب سے اسے آوازیں دے رہی تھیں۔

"جی..." وہ جانے کس دنیا میں تھی۔ کہاں سے واپس آ کر اس نے بدقت بڑی بھابھی کو دیکھا۔

"تم نے دیکھ لیں چیزیں تو الماری میں رکھ دوں؟" انہوں نے عروسی جوڑا اور اس سے متعلق دیگر اشیا کہیں۔

"بھابھی... کوئی میرا گلا گھونٹ دے، مجھے مار دے مگر اس آزمائش میں نہ ڈالے۔" مہر بلک اٹھی۔ "ابھی وقت ہی کتنا ہوا ہے اسے گئے ہوئے؟ اتنی جلدی تو یقین بھی نہیں آتا، صبر کیسے آئے؟"

"بابا سائیں کا فیصلہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جو تاریخ اور جو دن اس کام کے لیے مقرر ہوا ہے، یہ کام اسی دن ہو۔ وقت کے ساتھ ساتھ یقین بھی آ جائے گا اور صبر بھی۔ حوصلہ رکھو، خود کو سنبھالو۔ اللہ کی مرضی پر راضی ہونے میں ہی عافیت ہے۔ انسان کی بھلائی ہے، اس کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں ہم۔ ہمارے بس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

وہ بڑی تھیں، عمر میں بھی، زندگی کے تجربے میں بھی۔ سو اسے سمجھا رہی تھیں کہ انہوں نے اسے نند سے زیادہ چھوٹی بہن سمجھا تھا۔ مگر بات ایسی نہ تھی کہ کسی کی بھی دو چار نصیحتوں کے بعد وہ سمجھ جاتی یا سنبھل جاتی۔

"وقار کو بھی میرے ساتھ سولی پر ٹانگنا ضروری تھا؟" مہر تلخ ہوئی۔ اسے وقار کا خیال جب بھی آتا گل افروز بھی اس خیال کے ساتھ ساتھ بندھی چلی آتی۔

اور وقار کا کیا حال ہوگا؟ میرے جیسا یا مجھ سے بھی زیادہ برا؟ مہر اپنے ساتھ ساتھ ذکی وقار کے لیے بھی رو رہی تھی۔ وہ جو بڑا پیارا کزن اور ساتھی تھا اس کا۔ مہر اس کی راز دار تھی، اس کی محبت اور شدتوں کی گواہ بھی۔

یہ زندگی کس رخ کے ساتھ، کن رنگوں کے ساتھ سامنے آئی ہے؟ ایک انتہائی خوب صورت رشتہ جو زندگی میں خوشیاں اور حسن بکھیر دیتا ہے۔ دو اجنبیوں کو ایک دوسرے کے سب سے قریبی ہم راز بنا دیتا ہے۔ وہ رشتہ اب یوں بننے جا رہا تھا کہ زندگی میں حسن باقی بچ رہا تھا، نہ خوشی کے آثار تھے۔ مزید ستم تھا کہ دو محرم راز جو ایک دوسرے کے قریب تھے، وہ اس رشتے کی ڈور میں بندھ کر ایک دوسرے سے دور ہونے کو تھے۔

☆☆☆

ستم شعار وقت گزر گیا۔ ہونے کام سارے ہو ہی گئے۔ وہ رخصت ہو کر اس گھر اور اس کمرے میں آ گئی، جہاں وہ سیکڑوں، ہزاروں بار آ چکی تھی مگر کبھی سوچا نہیں تھا کہ اس روپ میں وہ یہاں آئے گی اور یہ روپ، یہ تیاری، یہ لباس سب اسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ خود کو ان سب سے آزاد کر کے وہ ہلکی پھلکی نہ ہوئی، کسی طرح اس کی تسلی نہ ہوئی۔ مذہب اور اخلاق کا قاعدہ تو یہی تھا کہ اب وہ اس کے بارے میں نہ سوچے جو دنیا سے جا چکا ہے بلکہ اس کے خیال سے دل کے نگر آباد کرے جو زندگی میں آ چکا ہے مگر مہر کے بارے میں سوچتے ہوئے اس حقیقت کے [illegible] رشتے تھے، جن سے وہ واقف تھی۔ وہ ذکی وقار [illegible] اور [illegible] زندگی میں مہر [illegible]

اور وہ خود بھی تو مہر کے ان سب تمام رازوں سے واقف تھا۔ ایک دوسرے کی دلی کیفیات اور جذبات سے باخبر، دونوں ایک دوسرے کو کیسے اور کیونکر قبول کریں گے؟

مہر کے اندر اتنے سوالات تھے کہ اس کا وجود ہی مجسم سوال بن گیا تھا۔ گھبرا کر وہ کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ سلک کے خوب صورت، نئے، ریشمی پردے سرکائے تو حیرت کا آسمان ٹوٹ پڑا اس پر۔ وہ کھڑکی جس کے پاس ذکی وقار کی کرسی اور میز رکھی تھی، اس کی کتابیں اور ڈائری ہوتی تھی، وہ کھڑکی بند تھی۔ بالکل بند کر کے اس کے دوبارہ کھلنے کا امکان صفر کر دیا گیا تھا۔ اس پوری کھڑکی پر کیلیں جڑے تختے

لگے ہوئے تھے۔

مہر نے گھبرا کر وہ پردہ ہاتھ سے یوں چھوڑا جیسے وہ پردہ نہیں کوئی سانپ ہو۔

"مہر......!" عین اسی وقت ذی وقار نے اسے پکارا تھا۔

اور مہر یوں مڑی جیسے سانپ نے اسے ڈس لیا ہو۔ ذی وقار کو یوں اپنے سامنے اس نئے رشتے کے حوالے سے دیکھنا ایک قیامت تھی اور اس قیامت کا سامنا کرنا ہی تھا۔

وہ ہارا ہوا، لٹا ہوا سا بیڈ کے کنارے بیٹھا تھا۔ ایسا محروم جو اپنا سب کچھ گنوا بیٹھا ہو۔ گم کر بیٹھا ہو، حتیٰ کہ اپنی سانسیں، اپنی دھڑکنیں، اپنی زندگی بھی......

"یہ کیا کیا تم نے؟" مہر نے کھڑکی کے آگے پڑا۔ پردہ سمیٹ دیا۔ بند کھڑکی کے آگے لگا تختہ کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے ان دونوں کی زندگی۔ کوئی روزن، کوئی درز نہیں، بس ایک دیوار اور بس......

"سارے راستے بند ہو گئے تھے، میں نے اسے بھی بند کر دیا۔"

ذی وقار وہیں بیٹھے بیٹھے کہہ رہا تھا۔ اس نے تو نظر اٹھا کر بھی اس کی طرف نہ دیکھا تھا۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ اس کھڑکی کے آگے لگے تختے اس کا وہم ہیں، جیسے یہ کھڑکی کھلی ہوئی ہو اور اگر اس کی نگاہ پڑی تو اسے دھند آلود، وہ سرد شامیں نظر آئیں گی۔ ان صبحوں میں جاتی ہوئی، گزرتی ہوئی وہ خوشبو دار ہوا سی لڑکی! اسے وہ ساری شامیں، وہ سارے مناظر سب نظر آئیں گے۔

اس لیے اس کھڑکی کو بند کرنے کے باوجود بھی وہ بند کھڑکی کو دیکھنے سے بھی گریزاں تھا اور ذی وقار کو علم نہیں تھا کہ وہ سارے مناظر، اس کھڑکی کے پاس، اس گلی میں نہیں ٹھہرے ہوئے بلکہ وہ تو اس کے اپنے اندر اتر گئے ہیں۔ اس کی اپنی آنکھوں میں ٹھہر گئے ہیں۔ ان سب سے فرار حاصل کرنا مشکل اور نجات حاصل کرنا مشکل ترین تھا۔

مہر اسے اتنی اچھی طرح سمجھتی اور جانتی تھی کہ اسے ذی وقار کی نگاہوں میں ٹھہرا، وہ سارا وقت نظر آ رہا تھا۔

مگر بہت سارا وقت اور بہت سارے خواب تو اس کے اپنے اندر بھی منجمد تھے۔ وقت کی آگ ہی انہیں دھیرے دھیرے پگھلا سکتی تھی۔

"تقدیر نے یہ کھیل ہمارے ساتھ کیوں کھیلا؟"

ذی وقار نے نہ جانے یہ سوال کس سے کیا تھا۔ مہر سے یا اپنے آپ سے...... مگر اس کا جواب دونوں میں سے کسی کے پاس نہیں تھا۔

☆☆☆

بے بسی کی انتہا کو پہنچے ہوئے دو انسانوں کے پاس جب اپنی بے بسی کا کوئی حل نہیں ہوتا تو وہ خود کو ان تھک مصروفیات کے سمندر میں ڈال دیتے ہیں۔

مہر نے خود کو اتنے بڑے گھر کے ڈھیروں ڈھیر کاموں میں غرق کرنا چاہا۔ باوجود ملازماؤں کے، وہ چھوٹے بڑے کتنے کاموں کو خود سے نمٹاتی رہتی۔ کبھی کروشیے اور ریشم کے ساتھ خود کو الجھاتی، کبھی چادروں اور غلافوں پر ریشم کے پھول سجاتی۔ سردیاں آئیں تو اون کے گولے اور سلائیاں اس کے ساتھی بن گئے۔ مگر کوئی بھی مصروفیت اسے لایعنی سوچوں سے نجات نہیں دلا سکی۔ اس کے الجھے ہوئے خیالات، سوالات ہر لمحے، ہر مصروفیت میں اس کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔

اگر ذی وقار کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید...... شاید وہ خود کو سمجھا لیتی۔ قسمت کے لکھے کو قبول کر کے حالات سے سمجھوتا کر لیتی۔ مگر ذی وقار کے ساتھ بہت مشکل تھا، کانٹوں پر چل چل کے وہ تھک رہی تھی۔ مگر وہ گریز، وہ تناؤ، وہ جھجک جو دونوں کے درمیان تھی، اسے پاٹنا دونوں کے لیے ہی بہت مشکل ہو رہا تھا۔

ذی وقار نے خود کو دنیا کے جھمیلوں میں گم کرنا چاہا مگر اس دنیا کے اتنے بڑے میلے میں اور ڈھیروں ڈھیر جھمیلوں میں بھی وہ گم ہونے میں ناکام تھا۔ دن بھر کے بعد رات گئے تک جب وہ اپنے کمرے میں

آتا تو گل آرزو کا خیال، اس کی یاد، ذی وقار کے دھیان میں لپٹے ہوئے چلے آتے ساتھ ساتھ۔ اس کی انگلی تھامے جیسے میلا دیکھتا ہوا کوئی بچہ جو اپنے باپ کی انگلی مضبوطی سے پکڑے میلا دیکھ رہا ہو۔

☆☆☆

ذی وقار اندر داخل ہوا۔ مہر اون کا گولہ گود میں رکھے سلائیاں تھامے سویٹر بُن رہی تھی۔

کتاب کے صفحات میں خود کو گم کرنے کی کوشش میں وہ بھٹک بھٹک کر پھر اسی جنگل میں پھر تا رہا جہاں سے نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔

یہ محبت کوئی آسیب ہے، بلا ہے؟ جو ایک بار چمٹ جائے تو چھٹکارا پانا ناممکن سا ہو جاتا ہے؟

"تم نے ڈائری لکھنا کیوں چھوڑ دی؟" مہر کی نگاہیں دھاگے کے دھاگوں اور سلائیوں پر تھیں، سوال ذی وقار سے تھا۔

"یوں ہی مصروفیات بڑھ گئی ہیں۔ ڈائری لکھنے کا وقت بھی تو نہیں ملتا۔"

"کیا وہ تمہیں اب بھی یاد آتی ہے؟" مہر کا لہجہ نرم اور سادہ تھا مگر سوال کسی زہریلے خنجر کی کاٹ لیے ہوئے تھا۔

"چھ ماہ میں بارھویں دفعہ یہ سوال پوچھا ہے تم نے۔ اگر اتنی جلدی جلدی سوال نہ کرو تو شاید میں اسے بھلانے کی کوشش میں کامیاب ہو جاؤں۔" ذی وقار کا لہجہ بہت تحمل لیے ہوئے تھا۔

"میں نے اس بار یہ سوال اس لیے پوچھا ہے کہ پچھلے بیس منٹ سے تم کتاب کھول کر بیٹھے ہو، مگر ایک صفحہ بھی نہیں پلٹا اور پچھلی بار اس لیے سوال کیا کہ تم نے سوتے میں نہیں بلکہ بیداری میں مجھے دو بار اس کے نام سے پکارا..... اور چاہو تو میں تمہیں دس اور وجوہات بھی بتا سکتی ہوں یہ سوال کرنے کی۔"

"مجھے اذیت مت دو مہر! اسے بھلانے میں میری مدد کرو۔" ذی وقار کی التجا ایسی تھی جیسے ڈوبتے ڈوبتے کوئی ساحل پر کھڑے کسی اپنے کو پکارے۔

"میں خود محتاج ہوں مدد کی۔ ایک ڈوبتا ہوا فرد کسی ڈوبتے ہوئے دوسرے فرد کو کیسے بچا سکتا ہے؟" مہر نے بے زبان خاموشی کہا۔

"ہم کتنے اچھے دوست تھے ایک دوسرے کے؟" ذی وقار کا لہجہ مضطرب ہوا۔

"وہ ماضی تھا جو گزر گیا۔ جب بلا جھجک ایک دوسرے سے اپنے دل کی باتیں کر لیا کرتے تھے۔ اب رشتہ کچھ اور ہے۔" مہر نے اسے دیکھا۔

عجیب سا رشتہ، عجیب سا تعلق۔ نفرت نہیں تھی، بے زاری اور بے گانگی بھی نہیں۔

دونوں ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے۔ عزت کرتے تھے، قدر کرتے تھے۔ یہ بھی محبت کا ہی ایک روپ ہے مگر محبت کا ایک روپ اور بھی تو ہوتا ہے، جو ایک دوسرے کا جیون ساتھی ہوتے ہوئے بھی ان کی زندگی میں مفقود تھا۔

"میں تم سے کبھی ایسے نہیں شرما سکتی، جیسے زوار کے سامنے شرمائی اور نہ ہی تم مجھے یوں پور پور محبت میں بھگو سکتے ہو جیسے گل آرزو کو۔

تمہاری آنکھوں میں میرے لیے اگرچہ اپنائیت اور اپنائیت کے رنگ ہیں، مگر وہ الوہی، وہ بہت منفرد اور انوکھا رنگ کبھی نہیں آ سکتے جو گل آرزو کے لیے اترا کرتے تھے۔

اور میرا دل بھی تمہارے لیے یوں نہیں دھڑک سکتا جیسے تمہارے بھائی کے لیے دھڑکتا تھا۔

ہم اپنے ماضی کو فراموش کر سکتے ہیں جو ہمیں کرنا ہی چاہیے مگر وہ احساسات، وہ جذبات زبردستی اور مصنوعی طور پر اپنے اندر نہیں لا سکتے کہ یہ احساسات، باہر سے نہیں آتے، اندر ہی سے کہیں پھوٹتے ہیں۔

باوجود اس کے کہ ہم الفت کی ڈور سے بندھے ہیں مگر یہ چاہت، وہ نہیں جس کی آرزو کی تھی جس کے خواب دیکھے تھے، جس کی تمنا میں صبح سے شام اور شام سے رات کی تھی۔" وہ سوچتی رہی۔ کہہ نہ سکی۔

"جو کچھ سوچتی ہو، وہ کہہ دیا کرو مہر! دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔" ذی وقار نے کافی دیر سے اس کی خاموشی

دیکھ رہا تھا۔ نرمی سے بول اٹھا۔

"ہر بات کہنے کی نہیں ہوتی، کبھی کبھار اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر کے دوسرے کے دل کا بوجھ بڑھا دیتے ہیں۔" مہر نے اون کا گولہ لپیٹا، سلائیاں اور ادھ بنا سوئٹر تھیلے میں ڈال دیے۔

"میرے دل کے بوجھ کی پروا مت کرو تمہاری خاموشی پر، اداسی پر اپنا آپ مجرم محسوس ہوتا ہے۔" ذی وقار کا لہجہ بدستور نرم تھا۔

"میں بھی یہی سوچتی ہوں مگر نہ تم مجرم ہو، نہ میں قصوروار۔ پھر بھی یوں لگتا ہے جیسے کسی سزا کو جھیل رہے ہیں۔" مہر نے اداسی سے اسے دیکھا۔

"ایسے مت سوچو، تم تو کتنا ہنستی تھیں، یاد ہے میں ہاتھ جوڑتا تھا تمہارے آگے کہ بس کرو۔ اب تو تم نے مسکرانا بھی چھوڑ دیا۔"

"تمہاری" تمہاری مسکراہٹ بھی تو غائب ہو گئی ہے کہیں۔" مہر نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ آنکھیں جن میں گل آرزو کی صورت اور اس کے خواب سجے دیکھے تھے اس نے۔ مہر نے اپنے لب بھینچ لیے۔

لاعلمی بھی ایک نعمت ہے۔ آگہی اور شعور بھی بڑے عذاب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

"کاش ہم ایک دوسرے کے ماضی سے بے خبر ہوتے۔"

"چھ ماہ گزر گئے۔ ہم آج بھی وہیں کھڑے ہیں۔" ذی وقار اس کی سوچوں سے بے خبر اپنی دھن میں بول رہا تھا۔

"تو کیا ہوا، اگر وقت ہمیں روندتا ہوا پیچھے چھوڑتا ہوا آگے نکل جائے؟" سب سے پیچھے رہ جانے کا کم از کم ایک فائدہ تو ہے کہ پھر ہمارے آنسو، ہماری شکست دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔

"میں اکیلا ہوں مہر! میری دوست مجھے لوٹا دو۔ جو مجھے ہنس کر، مسکرا کر حوصلہ دیتی تھی۔" ذی وقار گڑگڑا اٹھا۔

"کیا دو ٹوٹے ہوئے دل ایک دوسرے کو جوڑ سکتے ہیں؟" مہر نے بے یقینی سے اسے دیکھا اور سوچا۔

☆☆☆

آدھے صحن سے دھوپ سرکتی سرکتی دیوار پر آن ٹھہری تھی۔ کچھ وقت اور گزرتا، یہ دھوپ یہاں سے بھی غائب ہو جاتی اور صبح، دوپہر، شام، رات...... سب آتے ہیں، چلے جاتے ہیں مگر زندگی میں کوئی وقت ایسا بھی ہوتا ہے جو ٹھہر جاتا ہے۔ اس رکے ہوئے وقت میں جینا بہت کٹھن ہوتا ہے۔

"محبت میرا مذہب ہے اور تم میرا عقیدہ ہو۔"

گل آرزو نے دھندلائے ہوئے الفاظ پڑھے اور دہرائے۔

کیا اتنی جلدی مذہب بدلنا اور عقیدے کو چھوڑ دینا ممکن ہے؟ اتنی بڑی دنیا میں ایک انسان زندگی میں آتا ہے اور ایک عظیم دکھ دے کر واپس ہو جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

محبت کا دعوا بہت بڑا ہوتا ہے مگر محبت اس دعوے کے برابر نہیں ہو پاتی۔ سماجی قدریں اور انسانی معاملات اس دعوے کو غلط ثابت کر دیتے ہیں، پھر جب دعوا باقی نہیں رہتا تو محبت باقی رہتی ہے یا نہیں؟

ایک اجنبی کو قریب کر کے پھر سے اجنبی کر دینا، کیا یہ بھی محبت کے آداب میں شامل ہے؟

اپنی لایعنی سوچوں میں گھری گل آرزو نے اپنی نم آنکھیں جھپکیں۔ اچھی بھلی زندگی گزر رہی تھی، کسی بھی غم سے بے نیاز۔ اندیشوں سے آزاد۔ اس پرسکون جھیل میں ایک پتھر کیا گرا، سارا اطمینان غارت ہو گیا۔ سکون تہ و بالا ہو گیا۔

شاید غلطی میری ہے۔ بغیر سوچے سمجھے الفت کے خوش رنگ پرندے کو خوش آمدید کہا اور دل کے پنجرے میں قید کر لیا۔ اب پرندہ نہیں رہا اور زندگی قید ہو گئی۔ گل آرزو نے اپنی ہتھیلیوں کو غور سے دیکھا۔

جو میں جانتی، پریت کرلیے دکھ ہوئے
تو نگر ڈھنڈورا پیٹتی، پریت نہ کریو کوئے

اور زندگی نام کا جو معمہ ہے، اس کی بر پہیلی کا

جواب اپنے وقت پر ملتا ہے۔ ہر راز اپنے وقت پر کھلتا ہے۔ ان ہی کے تانوں بانوں سے تو خوشی اور غم بنتے ہیں۔ کامیابی اور ناکامی ملتی ہے، اگر سب راز پہلے سے ہی معلوم ہو جائیں، ہر کام کا انجام، ابتدا میں ہی معلوم ہو جائے تو دکھ سکھ، کامیابی، ناکامی، سارے استعارے اپنی اہمیت کھو بیٹھیں۔

تو پھر اب زندگی کا پیرا کیسا ہو؟

اس عمر کے اور اولین محبت کے غم کو سینے سے لگا کر زندگی گزاری جائے؟ یا حقیقت کا سامنا کیا جائے۔

اگرچہ حقیقت قبول کرنا ایسا ہی ہے جیسے خود اپنے وجود کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

مگر اس تقسیم کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں۔

اسی انداز میں تین عمر چھوڑ کر وہ گھر ہے جہاں وہ دشمن جاں سانسیں لے رہا ہے۔

تقدیر کی ستم ظریفی ہے یا الزام انسانوں پر پڑا!! جو بہر حال اس کی زندگی کی ڈور سے منسوب ہو چکی ہے۔ ان آنکھوں کو اب اجازت ہے [illegible] آ [illegible] دیکھیں [illegible] دل کو بھی کہ وہ گل آرزو کو [illegible]

اور خود گل آرزو کو بھی اسی ڈگر پر چلنا ہے کہ اتنے قریب ہوتے ہوئے اس کا خیال دل سے نکالنا بہت مشکل تھا۔

اس کے خطوط (جو وہ بار بار پڑھتی تھی) انہیں پڑھتے ہوئے رکاوٹ نہ ہونا کیسے ممکن تھا؟

اب ان راستوں پر مڑ مڑ کر دیکھنا خود کو اذیت میں ڈالنا ہے۔ ان ہواؤں سے بچنا ہے جو اسے چھو کر آتی ہیں اور گل آرزو کو گدگداتی ہیں۔ اس کا دل کوئی مٹھیوں میں مسل رہا تھا۔ اس کے ملیح چہرے پر زردیاں کھنڈی ہوئی تھیں۔

اس نے سر اٹھا کر نیلے آسمان اور اس پر تیرتی سفید ٹکڑیوں کو دیکھا۔ اتنی فراخ زمین اور اتنا بڑا کھلا آسمان، پھر بھی گھٹن کا احساس تھا کہ مارے ڈال رہا تھا۔

''گل...... گل۔'' ممانی نے کئی آوازیں دے ڈالیں۔

''جی۔'' اپنے خیالات میں محو وہ بڑبڑائی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔

''پتا نہیں کیا...... کیا سوچ رہی تھی میں؟'' گل آرزو کچھ کھوئی کھوئی سی تھی۔

''خالدہ آپا نے جواب مانگا ہے، تمہارے ماموں کی مرضی تو ہے مگر انہوں نے کہا ہے کہ تمہاری مرضی بھی معلوم کی جائے۔'' ممانی نے اس کا پریشان چہرہ دیکھا۔

''میری مرضی؟'' گل آرزو نے ان کی بات دہرائی۔ ''میری اپنی مرضی تو کچھ بھی نہیں، جو آپ کو ٹھیک لگے۔''

''پھر؟ کہہ دوں تمہارے ماموں سے۔'' ممانی نے ایک بار اور تصدیق چاہی۔

''جی......'' گل آرزو نے پل صراط پر قدم رکھ دیا۔ محبت کی سزاوار تو وہ بھی ہوئی تھی۔ اب وجود کٹ کٹ کے رہ جاتا۔

☆☆☆

[illegible] کا دھاگا ہر طرف سے بے نیاز اپنی دھن میں، اپنی مخصوص سمت میں بہہ رہا تھا۔

قضا کے ہاتھ بابا سائیں کی جانب بڑھے اور انہیں اچک کر اپنے ساتھ لے گئے۔ ان کی گدی پر اب صاحب زادہ ذی وقار کو بیٹھنا تھا۔ جو پہلے سے بھی کم گو اور دھیمے مزاج کا ہو گیا تھا۔

وراثت کی کلاہ اپنے سر پر رکھتے ہوئے ایک لمحے کو تو وہ کانپ ہی گیا۔

''میں اس قابل نہیں ہوں...... اس پگڑی کا ہر پل تقویٰ کا مطالبہ کرتا ہے۔ میں تو ایک عام سا، گناہ گار سا انسان ہوں۔'' ذی وقار نے مضطرب ہو کر بابا کے ساتھی اور دوست سید یوسف جیلانی کو دیکھا۔

''جب یہ کلاہ سر پر آتی ہے تو اس سے وابستہ رحمتیں، برکتیں اور تقویٰ اس انسان کے اندر جذب

ہوتا رہتا ہے جو اس کا اہل ہو۔ تم شاہ جی کے سپوت ہو۔ وہ سب کچھ تمہارے اندر ہے جو ان کے اندر تھا۔ بس تھوڑی سی محنت اور ریاضت کی ضرورت ہے۔"

"مجھے کوئی اس آزمائش میں نہ ڈالے۔" ذی وقار کا پورا وجود بے آواز کرلایا۔

اب وہ مسند پر براجمان تھا جس پر کبھی اس کے بابا سائیں تھے۔ ایک خلقت جو یہاں پہلے آتی تھی، اب بھی لوگوں کی وہ آمد جاری تھی۔ ہر آنے والا چاہے مرد ہو یا عورت، ہر ایک کے پاس خواہشوں کی' آرزوؤں کی، تمناؤں کی گٹھڑیاں تھیں جنہیں وہ بڑے احترام سے ذی وقار کے سامنے کھولتے اور بہت لجاجت سے اسے مخاطب کرتے۔

"ہمارے لیے دعا کریں شاہ جی! وہ آپ کی ضرور سنے گا۔"

ذی وقار کا پورا وجود کانپ جاتا۔

جو بھی اسے پکارتا ہے، بلند آواز سے یا چپکے چپکے، وہ سب سے باخبر ہے وہ "سمیع" ہے "سننے والا۔"

اس کے آگے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے تو دل خود بخود پرسکون ہو جاتا ہے۔

ذی وقار سمجھانے کی کوشش کرتا مگر یہ باتیں ان لوگوں کے سر پر سے گزر جاتیں، جن کے اندر صدیوں کی اور نسلوں کی جہالت کے اندھیرے تھے۔

"ہم تو گناہ گار ہیں، وہ ہماری کیوں سنے گا؟ کیوں قبول کرے گا ہماری دعائیں؟" اسے سننے والے حیران ہو کر سوال کرتے۔

"کیونکہ تم اس کے بندے ہو، گناہ گار ہو یا معصوم، وہ اپنے ہر بندے کو ستر ماؤں سے بڑھ کر پیار کرتا ہے۔ دعا، پکار وہ ہر ایک کی سنتا ہے۔ قبولیت کے معاملے میں اس کی اپنی حکمتیں ہیں۔"

ذی وقار بولتا تو خود حیران ہو جاتا۔ ایسا لگ رہا تھا، جیسے وہ دوسروں کو نہیں بلکہ خود اپنے آپ کو سمجھا رہا ہو۔

اور انسان کو سمجھانے والے تو بہت ہوتے ہیں۔ دوسرے انسان...... خدائی کلام...... نیکوکاروں کا الہام، وقت، حالات، سب ہی انسان کو سمجھانے کی سعی کرتے ہیں۔ انسان سمجھے تو سنبھل جائے۔ نہیں تو سودائی بن جائے۔ ذی وقار سودائی تو نہیں بنا، بس کبھی کسی لمحے اسے محسوس ہوتا جیسے وہ سودائی ہے اور اگلے ہی لمحے اس کیفیت سے باہر آ جاتا۔

شادی کے دسویں برس ایک پیاری سی بچی اس کی گود میں آئی تو اسے دیکھتے دیکھتے وہ کہیں خیالوں میں کھو گیا۔

"اس کا نام کیا رکھو گی؟" ذی وقار نے سوال کیا۔

"گل آرزو......" مہر ایک لمحے کو رکی۔" کے سوا کچھ بھی......"

اس نے اپنا جملہ مکمل کیا۔ اس نامکمل زندگی میں کم از کم جملے تو ادھورے نہ ہوں۔ تخلیق کے کرب کے علاوہ اور بھی تکالیف تھیں جو اسے محسوس ہو رہی تھیں۔

"تم بھولیں نہیں اب تک اسے؟" ذی وقار کی گھنی سیاہ داڑھی میں کہیں کہیں سفید بال جھانکنے لگے تھے۔

"کیا تم بھول گئے؟"

"تمہیں کوئی شک ہے مہر!" ذی وقار کے لہجے میں ٹھہراؤ اور نرمی تھی۔

"مجھے یقین ہے۔"

"اس یقین کی وجہ؟"

"دس سال ہو گئے، یہ کھڑکی آج بھی بند ہے۔" مہر نے بند کھڑکی کی جانب اشارہ کیا۔

"تم چاہو تو اسے کھلوا سکتی ہو۔"

"میں چاہوں تو؟" مہر نے اس کی بات دہرائی۔

"اور تم...... تم کیا چاہتے ہو۔ اس کھڑکی کو کھولنا یا بند رکھنا۔"

"میں تمہاری خوشی چاہتا ہوں مہر!"

"تم اپنی خوشی کیوں نہیں چاہتے وقار؟" مہر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”تمہاری خوشی میں میری خوشی ہے۔“ وقار نے نظریں نہیں چرائیں۔

”عبادت اور ریاضت کے سمندر میں اترنے سے انسان کا اپنا آپ گم نہیں ہو جاتا۔“ مہر نے جتایا۔

”میں نے خود کو کہیں گم نہیں کیا۔ میں ان راستوں کا مسافر ہی نہیں۔ یہ تو بڑے مشکل راستے ہیں۔ مجازی سے حقیقی تک کا سفر کوئی بچوں کا کھیل نہیں، نہ ہی اتنا آسان۔ یہ سفر وہ انسان کر سکتا ہے جس کے اندر عشق اترا ہو یا جو عشق کے سمندر میں غوطہ زن ہو۔ میں نے تو فقط.....“ ذی وقار بولتے بولتے ٹھہر گیا۔

”وہ عشق نہیں تھا، محبت تھی۔ میرا دل، میرا اندرون اتنا شفاف نہیں ہے کہ یہاں عشق بسیرا کر سکے اور مہر! مجھے اللہ نے اپنی رحمت سے نوازا ہے، مجھے خوش ہونے دو پلیز۔“

مہر یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔ یکا یک اس کی آنکھوں میں بے بسی اور اداسی اتر آئی۔

”مجھے معاف کر دو وقار! مجھے معلوم ہے کہ کبھی کبھی میرے الفاظ، میرا رویہ تمہیں تکلیف پہنچاتے ہیں۔ مگر یقین کرو، میں جان بوجھ کے نہیں کرتی۔ مجھے شرمندگی ہوتی ہے، اپنے آپ پر ندامت ہوتی ہے مگر بس جب بھی..... یہ بند کھڑکی ان خیالات سے آزاد نہیں ہونے دیتی۔“ مہر نے اعتراف کرتے ہوئے سر جھکایا۔

”تو کیا اس کے کھل جانے سے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا؟“

”پتا نہیں.....“ مہر اب بھی بے یقین سی تھی۔

☆☆☆

تمنا تو یہی تھی کہ اپنے آپ کو اتنی دور، اتنی دور لے جائے کہ وہ ہوائیں بھی اس تک نہ پہنچیں جو ذی وقار کو چھو کر فضاؤں میں پھیل جاتی ہیں تو یہ خواہش اس کی پوری ہو گئی۔ وہ اتنی دور آ گئی کہ اس کے اور ذی وقار کے درمیان سات سمندر مزید حائل ہو گئے۔ اگرچہ حالات و واقعات پہلے ہی دونوں کے درمیان حائل تھے۔

اپنے چھوٹے سے ایک کمرے کے اپارٹمنٹ میں، نئے ہم سفر کے ساتھ بہت زیادہ خوش نہیں تھی تو ناخوش بھی نہیں تھی۔ کوشش تو یہی کر رہی تھی کہ شادی شدہ زندگی کے ابتدائی چند ماہ اسی مسرت اور سرخوشی کے عالم میں گزارے جس طرح اس کا شوہر گزار رہا تھا۔

شاہد احمد جو کہ نیویارک میں ایک فرم میں ملازم تھا اور گل آرزو جیسی خوب صورت بیوی پا کر بہت خوش تھا۔ ہنی مون پیریڈ میں شاہد کے مزاج اور عادات کا اتنا اندازہ نہیں ہوا کہ گل آرزو کو ڈارلنگ، ڈیر اور ہنی پکارتے ہوئے وہ اسے مون لائٹ اور روز سے تشبیہ دیتا رہا تھا۔

گل آرزو ان لفظوں سے بہلنا چاہتی تھی مگر وہ چند خطوط اور چند سوالفاظ اس کے بہلنے کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے تھے مگر ہمیشہ نہیں، کبھی کبھار تو وہ خود کو سمجھانے میں، بہلانے میں کامیاب ہو ہی جاتی۔

آٹھویں منزل پر واقع اپنے اپارٹمنٹ کی کھڑکی سے نیچے جھانکتے ہوئے اس نے سڑک پر دوڑتی بھاگتی گاڑیاں اور ویسے ہی دوڑتے بھاگتے لوگ دیکھے۔

”یہاں کی زندگی بہت تیز رفتار ہے۔ ہر کوئی جلدی میں رہتا ہے، تمہیں بھی خود کو یہاں کے مطابق ڈھالنا ہے۔“ ہنی مون ختم ہونے کے آخری روز شاہد نے اسے پہلی نصیحت کی تھی یا مشورہ دیا تھا۔

”یہ شلوار قمیص پاکستان کے لیے تو ٹھیک ہے، مگر یہاں بالکل آؤٹ آف فیشن بلکہ آؤٹ آف کلاس ہے۔ یہ پہنا کرو، قیامت لگو گی۔ پہن کر دکھاؤ۔“ شاہد اس کے لیے دو تین جینز لے کر آیا تھا۔ بہت محبت سے لایا تھا اور جو کچھ کہا تھا وہ بھی بہت پیار سے کہا تھا۔

”گھر میں تو ٹھیک ہے مگر باہر.....“ گل آرزو متذبذب تھی۔

”ایک دو بار جھجک ہوگی، پھر عادت پڑ جائے

گی۔ امبر بھابھی کو دیکھو، پاکستان میں برقع پہنتی تھیں۔ اب انہیں دیکھ کر کوئی کہہ سکتا ہے کہ......" شاہد نے جدید وضع قطع کی حامل اپنی بھابھی کا حوالہ دیا۔

"روم میں وہی کرو جو رومن کرتے ہیں۔" اس کی ہچکچاہٹ پر شاہد نے ایک آنکھ دبائی۔

وہ گل آرزو کو گھمانے بھی لے جاتا تھا۔ شاپنگ بھی کرواتا تھا اور اپنی مرضی اور من مانی کو بھی مقدم رکھتا تھا۔

"آپ کو شاعری پسند ہے؟" بک شاپ میں شاہد کے ساتھ کتابوں کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے اردو شاعری کی کوئی کتاب ڈھونڈنا چاہی، جو ذرا مشکل سے ملی اور اس کا سوال سن کر شاہد ہنس پڑا۔

"مجھے تو بس ایک ہی شعر یاد رہ گیا ہے، بچپن میں اسکول اسمبلی میں پڑھتے تھے۔

"لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری"

"اچھا۔" گل آرزو نے ایک گہری سانس لی۔

"یار! وہ شعر وعر سمجھ میں نہیں آتے۔" بیوی کی مایوسی پر اس نے سر کھجا کر مزید وضاحت کی۔

☆☆☆

برف باری ہوئی تو ہر طرف سفید چادر بچھ گئی۔ درختوں، پودوں، جھاڑیوں پر برف کی قلمیں لٹکنے لگیں۔ روزانہ سڑکیں صاف ہوتیں اور ٹریفک کی روانی کا اہتمام کیا جاتا۔ جن کے انجن گرم ہونے میں بھی وقت لگاتے تھے، شاہد روزانہ جھنجلاتا تھا۔

"مجھے تو یہ واہیات موسم بالکل بھی پسند نہیں ہے۔" وہ سات سال کی عمر میں والدین کے ساتھ یہاں آیا تھا اور پچھلے پچیس برسوں میں اس موسم سے خاصا اکتا گیا تھا۔

"آپ کو برف باری اچھی نہیں لگتی؟" کھڑکی کے شیشے سے باہر گرتی ہوئی برف دیکھتی گل آرزو چونک کر مڑی۔ کمرے میں ہیٹر کی گرمی تھی، باہر نقطہ انجماد منفی تھا۔

"بالکل اچھی لگتی ہے یار! اگر اس موسم میں گھر سے باہر نکل کر نوکری پر جانا پڑے، گاڑی نہ چلانی پڑے، برف نہ ہٹانی پڑے۔" شاہد نے گرما گرم چاکلیٹ کافی کا گھونٹ بھرا۔

"آپ کو خزاں کا موسم اچھا لگتا ہے۔" گل آرزو کے پاس کرنے کے لیے بہت سے سوالات تھے۔

"خدا کو مانو یار! خزاں کسے اچھی لگتی ہے؟ ٹوٹلی بور کردینے والا موسم، ہر طرف خشک پتوں اور اس سے بھی خشک ہوا۔ مجھے تو بہت ہی برا لگتا ہے یہ موسم۔"

"مگر یہ موسم، بہار کی آمد کا اعلان کرتا ہے۔"

"ہاں تو اعلان کر کے چلا جائے، ہر طرف اداسی کیوں بکھیرتا رہتا ہے۔" شاہد نے منہ بنا کر اعتراض کیا۔

"موسم تو انسان کے اپنے اندر ہوتا ہے، باہر کچھ بھی ہو، کیا فرق پڑتا ہے۔" گل آرزو کو کچھ پڑھے ہوئے الفاظ یاد آئے۔

"کیوں فرق نہیں پڑتا۔ چاروں طرف رنگ بکھرے ہوں، پھول کھلے ہوں، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا ہو، مست کردینے والا موسم ہو۔ اچھے بھلے روتے بسورتے بندے کا موڈ بھی اچھا ہو جائے۔" شاہد کے پاس اپنے دلائل تھے۔

"مجھے خزاں کے سوکھے، زرد پتے اچھے لگتے تھے۔ میں انہیں جمع کرتی تھی۔"

"گل تمہیں دماغ کے ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں، ٹھیک سے چیک اپ کرواؤں گا۔"

"میری پسند کی کوئی اہمیت نہیں آپ کے نزدیک؟" شاہد کے تبصرے سے گل آرزو کو دھچکا لگا تھا۔

"اتنی عجیب وغریب پسند؟ کیا شاعری پڑھنے والے تمام لوگ تمہاری طرح ہی ہوتے ہیں، تھوڑے کھسکے ہوئے۔" وہ ہنسا۔

"کیا آپ میری ہنسی کی قدر اور غصے کا احترام کریں گے؟" گل آرزو جانے کہاں پہنچی ہوئی تھی آج۔

"تمہاری ہنسی تو بہت خوب صورت ہے تمہاری طرح۔ مگر میرے سامنے غصہ کرنے کی حماقت مت کرنا۔ وہ کیا ہے نا...... میرا اپنا غصہ ہی بہت زیادہ ہے تو اپنے سامنے کسی اور کا بھرم برداشت نہیں کرتا میں۔" شاہد نے دو چار دانے کاجو کے منہ میں ڈالے اور منہ چلایا۔

گل آرزو کچھ دیر یک ٹک اسے دیکھتی رہی۔

"آپ تو کہتے ہیں کہ آپ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں؟"

"بالکل کرتا ہوں، کوئی شک نہیں ہونا چاہیے تمہیں۔" شاہد نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

"تو پھر جس سے محبت ہوتی ہے، اس کی اچھی بری ہر بات پسند ہونی چاہیے نا؟"

"مائی ڈیر وائف! تم میری بیوی ہو۔ بیوی اور محبوبہ میں فرق ہوتا ہے۔ ایسی باتیں شاید کتابوں میں اچھی لگتی ہوں گی، رئیل لائف میں۔۔۔" شاہد نے بات ادھوری چھوڑ کر ایک قہقہہ لگایا۔

"ویک اینڈ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اسے ان کتابی باتوں میں ضائع کریں، کیوں؟"

☆☆☆

اوون سے اس نے ٹرے کھینچ کر نکالی۔ چکن روسٹ تیار تھا۔

"کیا زبردست خوشبو ہے یار! اس کی بھی اور تمہاری بھی۔" شاہد اس کے قریب ہوا۔

"یہ رومانس کرنے کی جگہ ہے نہ ٹائم۔ یہ سلاد لے جا کر ٹیبل پر رکھیں۔" گل آرزو پیچھے ہٹی۔

"کبھی تم شکایت کرتی ہو کہ میں رومانٹک نہیں۔ رومانس کرو تو دور بھاگتی ہو۔" شاہد نے سلاد کی پلیٹ اٹھائی۔

"ایک محبت وہ ہوتی ہے جو دل سے ہوتی ہے، روح سے ہوتی ہے۔" گل آرزو کی پلکیں اٹھیں اور جھک گئیں۔

"دل اور روح کی محبت؟" شاہد پلیٹ ٹیبل پر رکھتے ہوئے ہنسا۔ اس کی ہنسی میں تمسخر تھا۔

"سویٹی! دل اور روح کی محبت بے چارے مجبور لوگ کرتے ہیں، جن کی پہنچ اپنے محبوب تک نہیں ہوتی۔"

"اف......" گل آرزو نے لب بھینچ لیے۔ روسٹ کی ٹرے ٹیبل پر رکھ کر وہ دوبارہ کچن میں چلی گئی اور پلاؤ نکالنے لگی۔

"کیا ہوا؟ ایک تو تمہارا موڈ بہت جلدی اڑ جاتا ہے۔" شاہد نے کھیرے کا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھا۔

"مجھے پتا تھا، آپ ہمیشہ کی طرح مذاق اڑائیں گے۔ پھر بھی پتا نہیں کیوں میں......" گل آرزو بولتے بولتے رک گئی۔

"خوابوں، خیالوں کی، کتابوں کی دنیا سے باہر نکل آؤ بی بی!" شاہد نے کرسی پر بیٹھنے سے پہلے اس کے گال پر چٹکی بھری۔

"اور شاید کسی بیوی کو اس دنیا میں رہنے کا حق نہیں، جسے اس کا شوہر احمقوں کی دنیا سمجھتا ہو۔" کھانے کے لیے بیٹھتی ہوئی گل آرزو نے آزردگی سے سوچا۔

شادی کے اگلے برس دو جڑواں بیٹوں کی ماں بن کر گل آرزو کی مصروفیت میں اضافہ ہو گیا تھا مگر کچھ خواب تھے جو ابھی جگے تھے۔ کچھ صفات، کچھ الفاظ جو دل پر نقش ہو گئے تھے۔ وہ اب بھی گاہے بگاہے اپنی اس خواب نگری میں جا نکلتی اور شاید کہ ہر بار اسے مایوسی ہی ہوتی کہ خوابوں کی دنیا، حقیقی دنیا سے بہت الگ ہوتی ہے اور سپنوں جیسے لوگ، اصل دنیا میں خال خال ہی کہیں ہوتے ہیں۔ محبت کے پروں پر لکھی گئی تحریریں عملی زندگی میں نقش بر آب ثابت ہوتی ہیں۔

گل آرزو کی آزردگی اور تشنگی کبھی حسرت بن جاتی، کبھی خواہش، کبھی سوال۔

"بات سنیں۔" دونوں بچوں کو سلا کر وہ ذرا فراغت سے بیٹھی تھی۔ موسم بدل رہا تھا۔ خزاں کی زردی، دھیرے دھیرے سبز پیراہن میں ملبوس ہوتی جا رہی تھی۔

''ہوں۔'' شاہد کچھ دیر پہلے ہی ٹی وی بند کر کے سونے کے لیے لیٹا تھا۔ تکیے میں منہ گھسائے گھسائے ہنکارا ابھرا۔

''میرا دل چاہتا ہے، آپ مجھے خط لکھیں۔''

''خط......؟ تم کہاں جارہی ہو، پاکستان؟'' شاہد نے چونک کر تکیے سے منہ باہر نکالا۔

''افوہ! کہیں نہیں جارہی میں۔'' گل آرزو جھنجلائی۔

''پھر؟''

''اگر آپ کو مجھ سے محبت ہے اور ہماری ابھی شادی نہیں ہوئی، آپ مجھے کیا لکھیں گے خط میں؟''

''اوہ...... لو لیٹر؟'' شاہد کی بھنوؤں کے بل ذرا اونچا ہوا۔

''جی۔'' گل آرزو کی پرشوق نگاہیں اس پر جم گئیں۔

''میں اپنے لو لیٹر میں لکھوں گا......'' شاہد سوچ سوچ کر بولنے لگا۔

''مائی ڈیر لولی، سویٹی، پریٹی...... آئی لو یو سو مچ......''

''اور......؟''

''آئی مس یو۔''

''کچھ اور؟ یہ تو گھسے پٹے فقرے ہیں۔'' گل آرزو مایوس ہوئی۔

''کچھ اور تو پھر یہی ہے کہ ڈیٹ پر کب چلو گی میرے ساتھ؟'' شاہد تفریح لے رہا تھا۔ حسب عادت قہقہے لگانے لگا۔

''آپ کو میری ہر بات مذاق لگتی ہے۔'' گل آرزو کلس کر رہ گئی۔

''مائی ڈیر وائف! تم یہ رومانٹک شاعری پڑھنا کم کرو اور اپنی ڈائٹ اور ایکسر سائز کی طرف دھیان دو۔ موٹی ہوتی جارہی ہو۔ میں نے کہا تھا کہ کم از کم پندرہ سال تک ایسی ہی رہنا، جیسے شادی کے وقت تھیں۔'' شاہد یک لخت چولا اتار کر حاکم شوہر بن گیا جو کہ وہ اکثر معاملات میں بنتا تھا۔

''اگر میں موٹی بھدی ہو جاؤں گی اور جب بوڑھی ہو جاؤں گی تو کیا آپ کا پیار ختم ہو جائے گا؟'' گل آرزو نے چڑ کر سوال کیا۔

''جب بڑھاپا آئے گا، جب کی جب دیکھی جائے گی۔ ابھی تو حسین ہو، اسمارٹ ہو۔ بیس سال تک انہیں ایسے اپنے ساتھ، پاس رکھو، کیا سمجھیں؟''

''سمجھ گئی۔ جب تک میں حسین اور جوان ہوں، آپ کی محبت بھی حسین اور جوان ہے۔'' گل آرزو نے آہ بھری۔

حسن کو چاند، جوانی کو کنول کہتے ہیں
ان کی صورت نظر آئے تو غزل کہتے ہیں

''یہ جو رومانٹک شاعری تم پڑھتی ہو، ان میں بھی حسن و جوانی کے ناولکس ہیں۔ بڑھاپے پر کون غزلیں کہتا ہے؟'' شاہد نے بات ختم کر کے دوبارہ تکیے میں منہ گھسالیا۔

''اتنا حقیقت پسند بھی نہ ہو انسان کہ کسی کے خواب اور تصورات ہی ملیا میٹ ہو جائیں۔'' گل آرزو نے بے بسی کی نگاہ اپنے شوہر پر ڈالی۔

☆☆☆

فضا میں لوبان کی خوشبو مہک رہی تھی۔ روایتی پگڑی اور چوغہ پہنے اپنی مخصوص مسند پر براجمان صاحبزادہ ذی وقار کی داڑھی اور سر کے بالوں میں چاندی چمک اٹھی تھی۔ بڑا سا ہال نما کمرہ ہمیشہ کی طرح انسانوں سے بھرا ہوا تھا۔ عقیدت مند لوگ، پریشان حال افراد، حاجت مند لوگ۔ ذی وقار پچھلے کئی برسوں سے ایسے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ سن رہا تھا۔

''میرے پاس کسی کو دینے کے لیے کچھ نہیں۔ میں تو خود نامراد رہا۔ وہ کسی کو کیا سرفراز کرے گا جو خود بامراد نہ ہوا ہو؟'' وہ لوگوں کو بتاتے بتاتے تھک گیا مگر عقیدت کے مارے دل ذی وقار کی بات سمجھنے سے عاری تھے۔

''شاہ جی کی دعاؤں میں بہت اثر ہے۔'' کئی حاجت مندی جن کے دل کی مرادیں اللہ نے پوری کردی تھیں۔ وہ فور عقیدت میں اسی ذی وقار سے

منسوب کر کے کئی دوسرے انسانوں کو بھی ذی وقار کا عقیدت مند بنا رہے تھے۔

حسب معمول عشاء کے بعد مخصوص ورد کر کے سونے کے لیے آیا تو رات گہری ہو رہی تھی۔ دو چار گھنٹوں بعد پھر تہجد کے لیے اٹھنا تھا۔ اس کے بعد اس کی مصروفیات شروع ہو جاتی تھیں۔

اسے دیکھ کر مہر نے ہاتھ میں پکڑی کتاب ایک طرف رکھ دی۔

"اتنی رات تک میرے لیے نہ جاگا کرو مہر! سو جایا کرو۔" ذی وقار روز کی طرح نرمی سے کہتے ہوئے بیڈ پر بیٹھا۔

"نریم جاگ رہی تھی، جب تک وہ نہیں سو جاتی مجھے بھی نیند نہیں آتی۔"

"ہوں۔" ذی وقار نے تکیے پر سر رکھا۔

"یونی ورسٹی والے ٹرپ پر لے جا رہے ہیں، جانے کی ضد کر رہی ہے۔ میں نے منع کر دیا ہے۔" مہر نے اطلاع دی۔

"کیوں منع کر دیا؟ جانے دو۔ یہ وقت پھر نہیں آئے گا۔" ذی وقار نے بند آنکھیں کھولیں۔

"آپ اس کی ہر ضد پوری کر دیتے ہیں۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔"

"جو ہمارے بس میں ہے، وہی خواہش پوری کرتے ہیں اور سب کچھ تو ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے نا۔ کیا پتا آگے کیا زندگی جینی ہے اسے۔"

"ہاں، کیا پتا، آگے کیا زندگی جینی ہے اسے؟" مہر نے دل ہی دل میں ذی وقار کی بات دہرائی۔ نیم تاریکی میں آنکھیں اس نے بھی بند کر لی تھیں۔ مگر بند آنکھوں تلے نہ پوری طرح اندھیرا تھا نہ مکمل اجالا۔ بس جھٹ پٹا سا تھا۔ ان دونوں کی زندگی جیسا۔

گزرے تیس سال کسی آئیڈیل لائف کی طرح بہت اچھے نہیں تو اتنے برے بھی نہیں تھے کہ جن پر افسوس اور ماتم کیا جائے۔ ذی وقار نے خود کو عبادت و ریاضت کے پردے میں چھپانا چاہا اور مہر نے خاموشی اور سنجیدگی کے۔ مگر پتا نہیں کیا بات تھی ماضی تھا کہ کوئی آسیب...... پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہا تھا۔

"نہ جانے "وہ" کہاں ہوگی؟ کیسی ہوگی؟ کس حال میں...... اور کیا زندگی جی رہی ہوگی؟ ایک خوش و خرم زندگی یا ایک ناخوش زندگی؟ یا ان دونوں کے بین بین؟"

مہر کو اکثر ہی گل آرزو کا خیال آتا تھا اور جب بھی اسے اپنے آپ پر ترس آتا تو ذی وقار پر اور گل آرزو پر بھی ترس آ جاتا۔ اولین عرصے کی رقابت کے جذبات گھٹتے گھٹتے معدوم ہی ہو گئے تھے۔

"کتنی رومان پرور لڑکی تھی۔ میری طرح، خوابوں میں زندہ رہنے والی اور جو خوابوں میں زندہ رہنے کے عادی ہوتے ہیں، وہ حقیقی زندگی کو بہت مشکل سے قبول کرتے ہیں۔" مہر نے دل ہی دل میں آہ بھری۔

☆☆☆

نیو ایئر نائٹ کا جشن منا کر، شہر اور شہریوں کی رونقیں اور سرخوشی سمیٹ کر وہ لوگ گھر پہنچے تو رات بہت ہو چکی تھی مگر نیند دونوں میں سے کسی کو نہیں آ رہی تھی۔ بچے تو تھک ہار کے سو گئے۔ گل آرزو، شاہد کی پسندیدہ چاکلیٹ کافی بنا کر لے آئی۔ ڈنر باہر سے کر کے آئے تھے مگر کافی وہ گل آرزو کے ہاتھ کی ہی پیتا تھا۔

"یہ لیں۔" گل آرزو نے کافی سے بھرا مگ شاہد کے ہاتھ میں دیا جس میں سے کافی کی تلخ اور چاکلیٹ کی سوندھی سوندھی مہک، بھاپ کے ساتھ اٹھ رہی تھی۔

"تھینک یو یار!" شاہد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔

"ایک بات کہوں؟" گل آرزو کو اس کا خوش گوار موڈ غنیمت لگا۔

"ایک نہیں، دس کہو۔ سو کہو، بولو میری جان۔" شاہد بڑی ترنگ میں تھا۔

"مجھے ایک بچی چاہیے۔"

"پھر وہی رٹ؟" شاہد کا موڈ خراب ہونے لگا۔

"مجھے بہت شدت سے خواہش ہے بیٹی کی، آپ سمجھتے کیوں نہیں؟" گل آرزو کی آنکھوں میں جو حسرت تھی۔ وہ شاہد کی نگاہوں سے اوجھل تھی۔

"تین بیٹے ہیں تمہارے پاس، ان میں سے ہی کسی کو بیٹی سمجھ لو۔ میرے لیے تو بس دو بچے بھی کافی تھے۔ تمہاری ضد پر تیسرا بھی ہوگیا۔ اب مزید کسی کو پڑھانا میں افورڈ نہیں کرسکتا۔" شاہد نے کافی کا گھونٹ بھرا۔

"روزی اللہ کے ہاتھ میں ہے، بندوں کے نہیں۔"

"بحث مت کرو، کئی بار سمجھا چکا ہوں تمہیں۔ تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتا خود تو مگن رہو بس۔"

شاہد ایک بار پھر روایتی شوہر ہی تھا۔ جس معاملے میں اس کی مرضی نہ ہو۔ گل آرزو لاکھ زور لگالے اس کی ناں، ہاں میں نہیں بدلتی تھی۔ وہ صرف اپنی منوانا جانتا تھا۔

گل آرزو کو بیٹی کی بہت چاہ تھی۔ شاہد کے لیے تین بچے بہت تھے۔

"ایک بیٹی ہی اپنی ماں کی سہیلی ہوتی ہے۔" گل آرزو بولی۔

"ایک شوہر بھی اچھا دوست ہوتا ہے۔ تم مجھے اپنی سہیلی بنالو۔"

"کیا ستم ہے کہ مجھے اولاد پیدا کرنے کے لیے اپنے شوہر کی منت سماجت کرنی پڑ رہی ہے۔" گل آرزو کا ڈپریشن بڑھ رہا تھا۔

☆☆☆

اور آنے والے چند برسوں میں جب نائن الیون کا واقعہ ہوا تو بہت سوں کی طرح شاہد کی نون بھی بدل گئی۔ اب اسے اپنی بیوی کے اسلام میں بہت کمی نظر آنے لگی تھی۔

"تمہیں اسکارف پہننا چاہیے۔ تمہارا لباس ٹھیک ہونا چاہیے۔ کسی مسلم دوشیزہ کی طرح۔" شاہد اسے نصیحتیں کرتا رہتا۔

"آپ کو شاید یاد نہیں کہ آپ نے ہی دوپٹا اتروایا تھا یہ کہہ کر کہ روم میں ایسے رہو جیسے رومن رہتے ہیں۔" گل آرزو نے اسے یاد دلایا مگر شاہد کو شرمندہ ہونا نہیں آتا تھا۔ ہاں کرنا آتا تھا۔

"تم مجھے بتا سکتی تھیں کہ میں غلط تھا۔"

"آپ جب بھی درست تھے اور اب بھی ٹھیک ہیں کیونکہ ایک مرد ہیں، ایک شوہر ہیں۔" گل آرزو جھنجلا جاتی۔

"کیا عورت کی اپنی کوئی مرضی نہیں۔ موم کی گڑیا بنا کر جہاں دل چاہے رخ موڑ دو۔"

گل آرزو کو ڈپریشن ہونے لگتا تو دل پر نقش کچھ الفاظ روشن ہوجاتے۔

"تمہارے وجود، تمہاری مرضی، تمہاری خوشی کا احترام مجھ پر لازم ہے۔"

"اف ف آخر یہ الفاظ مٹ کیوں نہیں جاتے، ختم کیوں نہیں ہوجاتے۔ کاش کہ میری یادداشت کھو جائے۔ میرا ماضی مجھ سے چھن جائے۔"

گل آرزو پریشان ہوا کرتی تھی جب بھی شاہد کی طرف سے حیات اس پر تنگ ہونے لگتی تو وہ ان لفظوں کی دنیا میں، ان خوابوں کی دنیا میں پناہ لیتی۔ جیسے کبھی کوئی نشہ ہو۔ اور کیا پتا محبت ایک نشہ ہی ہوتی ہو۔ جس کے سرور میں انسان اردگرد سے بے خبر سب کچھ بھول جاتا ہو؟

راہ حیات میں اپنے اندرون کی کشمکش سے گھبرا کر ایک روز تقریباً بیس سال بعد اس نے ایک فیصلہ کیا ایک بار پاکستان جانے کا فیصلہ

☆☆☆

ایک ایک کرکے سب چلے گئے۔ بس ایک عورت تھی جو باقی رہ گئی تھی۔ سب سے آخر میں وہ کھڑی ہوئی اور چل کر صاحبزادہ ذی وقار کی مسند کے عین سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گئی۔ ذی وقار کی نگاہیں

حسبِ معمول جھکی ہوئی تھیں۔ سائل ہو یا سائلہ، وہ کسی آنے والے عقیدت مند کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ آج بھی اپنی نظریں نیچی کیے وہ ہمیشہ کی طرح بیٹھا تھا۔

"میں بہت عرصے بعد، بہت دور سے آئی ہوں۔ میری عرضداشت ذرا طویل ہے۔ میں نے اس میں لکھ دی ہے۔" خاتون نے ایک لفافہ ذی وقار کے سامنے رکھا۔

وہ آواز تھی کہ کیا...... ذی وقار کا پورا وجود سنسنا اٹھا۔ اس کی نگاہیں لفافے پر تھیں۔ آنکھوں پر منوں بوجھ آن پڑا تھا اور دل پر شاید اس سے بھی کہیں زیادہ۔ بیس برس شاید بہت زیادہ عرصہ ہوتا ہے ایک انسان اپنی آواز سمیت سرتاپا بدل جاتا ہے۔ ایک اٹھارہ بیس سال کی لڑکی، پچاس، باون برس کی ہو جائے تو بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ آنکھیں وہ آنکھیں نہیں رہتیں۔ وہ زلف، وہ ہونٹ، وہ چہرہ، وہ جسم...... کچھ بھی تو وہ نہیں رہتا جو تھا۔

اور اتنے عرصے میں تو دل و دماغ بھی بدل جاتے ہیں، وہ نہیں رہتے جو کبھی تھے مگر پھر بھی جانے کیسے ذی وقار کے دل نے ایک گواہی دی۔

صاحبزادہ ذی وقار جو شاہ مسند پر بیٹھا تھا جس کے سر پر کلاہ تھی اور جس کے سر اور داڑھی کے بیشتر بال چاندی رنگ میں نہا چکے تھے اور جس کے دل کی دھڑکنیں عرصہ ہوا، ایک لے پر دھڑک رہی تھیں۔ وہ دھڑکنیں آج، اس لمحے اچانک ہی بے ترتیب ہو گئیں۔

وہ عورت کھڑی ہو گئی تھی اور مڑ کر واپس جا رہی تھی۔ جس نے ایک بڑی سی چادر سے خود کو ڈھانپ رکھا تھا۔

صاحبزادہ ذی وقار نے کانپتے ہاتھوں سے وہ لفافہ اٹھایا۔ نظر اٹھانے کی جرأت اب بھی نہیں ہوئی تھی۔ اب جب کہ وہ عورت دروازے سے باہر نکل رہی تھی۔

لفافہ کھولتے ہوئے بھی ذی وقار کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور جو کچھ اس لفافے سے نکلا، اس نے تصدیق کی کہ ذی وقار کے جسم کی سنسناہٹ اور دھڑکنوں کی بے ترتیبی غلط نہیں تھی۔ اس کے وجدان نے جو سرگوشی کی۔ وہ درست تھی۔

کیا واقعی محبت بھی الہام بن کر بھی دلوں پر اترتی ہے؟

کیا محبت ہمیشہ "ہے" رہتی ہے یا "ہے" اور "تھی" کے درمیان سفر کرتی ہے؟

کیا یہ ہمیشہ "یاد" کے پیکر میں زندہ رہتی ہے یا کبھی "بھول" اور "فراموشی" کی چادر میں خود کو چھپا لیتی ہے؟

صاحبزادہ ذی وقار کی نگاہیں کاغذ پر لکھے لفظوں پر پھسلتی جا رہی تھیں۔

یکم فروری 2017

"معذرت چاہتی ہوں کہ آپ کو مخاطب کرنے کے لیے کوئی موزوں لفظ سمجھ میں نہیں آیا اور سمجھ میں یہ بھی نہیں آ رہا کہ اس نامے کی شروعات کیسے اور کہاں سے کروں؟

چلیں، میں اس کہانی سے شروع کرتی ہوں جو آپ نے ایک خط میں لکھی تھی۔ جس میں ایک شخص چالیس برس تک سوچتا رہتا ہے کہ اگر وہ اظہارِ الفت کرتا تو کیا جواب ملتا؟ آپ نے بھی بہت سے لوگوں کی طرح یہی سوچا کہ بڑھاپے میں پچھتانے سے بہتر ہے کہ انسان جس سے محبت کرے، اسے بتا دے۔

اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ دنیا میں ہر انسان کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی کی محبت میں مبتلا ہو ہی جاتا ہے اور اظہار بھی کر دیتا ہے۔

بعض محبتوں کے نصیب میں ملن ہوتا ہے اور کچھ کے مقدر میں جدائی رقم ہو جاتی ہے۔ لوگ سنبھل بھی جاتے ہیں۔

اس معاملے کا دوسرا رخ دیکھیے۔ آپ نے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ ایک ایسی لڑکی سے جو سخت رومان پسند تھی۔ خوابوں، خیالوں کی دنیا میں رہنے والی۔ وہ خطوط، وہ الفاظ اس کے دل پر نقش ہو گئے۔

اظہار الفت نے جیسے ایک اندھے کو آنکھیں عطا کر دیں۔ اس کی رومان پسند اور کچھ خود پسند طبیعت اور مزاج کو اور مہمیز کر دیا۔

تب مجھ کو علم ہوا کہ محبت یوں بھی کی جاتی ہے، کسی کو سراہنے کا ڈھنگ یہ بھی ہوتا ہے۔ آپ نے اپنے جذبوں کو لفظوں کا پیراہن عطا کیا اور یہ پیراہن میرے دل نے، میری روح نے پہن لیا۔

پھر آنے والے وقت میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں اچھی لڑکیوں کی طرح تقدیر کے فیصلے کو قبول کر لیتی، اور یقین کریں کہ میں نے یہی کوشش کی، ایک اچھی بیوی کی طرح اپنے شوہر سے محبت کروں، اسے خوش رکھوں۔ اس کے ساتھ خوش رہنے کی کوشش کروں۔

مگر یہ ہوا کہ زندگی میرے لیے ایک ایسی ہموار صاف ستھری سڑک نہ بن سکی۔ جس پر آسانی کے ساتھ، بغیر رکے میں قدم بڑھاتی رہتی۔ وہ الفاظ جو اگرچہ بہت زیادہ بھی نہیں۔ وہ اظہار جو اتنی دنیا سے انوکھا، نرالا بھی نہیں۔ وہ میرے راستے میں، میری عمر، میری زندگی کے راستے میں جگہ جگہ رکاوٹ بنتا رہا۔

میں اپنی زندگی میں، اپنے شوہر میں اسی فرد اور اسی محبت کو کھوجتی رہی، تلاشتی رہی جس کے خواب آپ نے دکھائے اور میں اعتراف کرتی ہوں کہ قصور سارا آپ کا بھی نہیں بلکہ میری اس طبیعت اور مزاج کا بھی ہے جسے حقیقی دنیا سے زیادہ خوابوں خیالوں کی دنیا میں رہنا اچھا لگتا ہے۔

"میں جانتی ہوں، اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ وہ عالم جسے انسان عالم محبت میں بناتا ہے اور بستا ہے وہ اس دنیا سے یکسر الگ اور مختلف ہوتا ہے جس میں کہ انسان رہتا ہے۔ مگر سب کچھ جانتے ہوئے، سمجھتے ہوئے میں بے بس ہو گئی۔ مجبور ہو گئی۔

میں نے اپنی ازدواجی زندگی میں تلخیاں تو نہیں گھولیں کہ ایسا کرنا ممکن بھی نہ تھا۔ اپنے شوہر کی خوبیوں، خامیوں، اچھائیوں اور کمزوریوں کے ساتھ زندگی گزارنے کی اس طرح کوشش کی کہ اس کی انا زندہ رہے۔ بے شک میرے اندر کی عورت مر جائے۔

میرا شوہر کبھی ہنس کر مذاق اڑاتا تھا کہ کتابی باتوں نے میرے دماغ کے کچھ اسکرو ڈھیلے کر دیے ہیں۔ جی ہاں، میری جذباتی اور رومانی طبیعت کے لیے یہی الفاظ استعمال ہوتے تھے۔

میں ناشکری نہیں جو کچھ زندگی میں عطا ہوا، خوب ہوا۔ دھوپ چھاؤں سی زندگی اتنی بری بھی نہیں گزری، مگر بس اب بھی، اس عمر میں جہاں بس بڑھاپے کا آغاز ہونے والا ہے۔ میں ماضی کے ان چند مہینوں اور چند خطوط کو بھلانے کی کوشش کرتی ہوں اور ناکام ہو جاتی ہوں۔ جیسے کوئی کوشش کرے کہ وہ اپنا نام بھول جائے، اپنے چہرے کے خدوخال بھول جائے، اپنے آپ کو بھول جائے۔

غلطی میری ہی ہے۔ مجھے حقیقت پسند بننا نہیں آیا۔ اور خوابوں کی دنیا میں رہنے کا انجام اتنا خوش گوار نہیں ہوتا۔

میری زندگی میں آسانیوں اور خوشیوں کے باوجود بھی، دل کے ایک کونے میں روح کے ایک گوشے میں ایک تاریک خلا ہے۔

میں سوچتی ہوں کہ کاش، آپ کو محبت نہ ہوتی۔

کاش کہ آپ اظہار نہ کرتے۔

کاش کہ میں ان جذبوں سے آگاہ نہ ہوتی۔

تو اس زندگی میں بے معنی اداسی اور خاموشی شاید نہ ہوتی۔

میرے دل کا بوجھ بہت بڑھ گیا ہے۔

اس خط کے ذریعے بس وہ بوجھ کم کرنے کی کوشش کی ہے۔

فقط وہ......

جس سے اظہار الفت نہ کیا جاتا تو اچھا ہوتا۔"

☆

ساجدہ لطیف

آج اتوار تھا۔

کتنے دنوں کے بعد "شاہ خاور نے جلوہ افروز ہو کر اپنی آب و تاب" دکھائی تھی۔

اس لیے موقع غنیمت جان کر صبح ہی صبح کپڑے دھونے کے لیے مشین لگائی۔

کپڑے دھو کر فراغت ملی تو کمرے کی صفائی کرنے لگی تھی۔

ساتھ فون پر بہن کے ساتھ مہنگائی کا رونا رو رہی تھی۔

او...... میری...... جان...... جاناں......

او...... میری...... جان...... جاناں......

فیصل نے حسب عادت گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے آوازیں لگانا شروع کر دیں۔

فیصل کی آواز سن کر فون کاٹ دیا۔

"کیا ہوگیا۔ کیوں شور کر رہے ہیں؟" میں نے انہیں شاپروں سے لدے پھندے دیکھ کر [illegible] پوچھا۔

[illegible] اب وہ کوئی محنت طلب فرمائشی پروگرام کا پلندہ اٹھوانے والے ہیں۔

کیونکہ جب بھی وہ مجھے او میری جان جاناں کہتے تھے۔

ضرور ان کا "کوئی فرمائشی پروگرام تشکیل" کرنے کا ارادہ ہوتا تھا۔

وہ میری "بات کو نظر انداز کرتے" کچن میں بڑھ گئے۔

میں بھی ان کے پیچھے پیچھے کچن میں چلی گئی۔

شاپروں کا جائزہ لینے لگی۔

کسی میں چاول...... کسی میں چکن...... کسی میں پودینہ...... کسی میں دہی۔

ان کے علاوہ اور بہت سا سامان۔

میری بیزاری عروج پر تھی۔ کیونکہ کپڑے دھونے کے بعد صفائی کر رہی تھی۔ اب میرا کوئی بھی مشقت یا محنت طلب کام کرنے کو بالکل دل نہیں تھا۔

وہ میرے چہرے کی بیزاری کو نظر انداز کرتے جوش سے بولے۔

"او میری جان جاناں۔ آج تو ایک تہہ والی بریانی بناؤ کہ مزہ آجائے۔"

انہوں جوش سے منت بھرے لہجے میں کہا۔

دل تو بالکل نہیں تھا۔ لیکن میں شوہر نامدار کی فرماں بردار، تابع دار بیوی۔ مجبوراً زبردستی کی مسکراہٹ سجائے۔ ہاں کر دی۔

جسے دیکھ کر وہ خوش ہو گئے۔

"یہ صفائی تو تم بعد میں کر لینا۔ پہلے مجھے پانی گرم کر دو میں نہا لیتا ہوں۔

پھر جلدی جلدی مزے دار تہہ والی بریانی بنا دینا۔"

وہ منت بھرے انداز میں ہدایت دیتے کچن سے نکل گئے۔

بار بار تہہ والی بریانی اس لیے کہہ رہے تھے۔ کہیں میں سادہ بریانی بنا کر انہیں ٹرخا نہ دوں۔

ان کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے۔ پانی کا پتیلا گیس کے چولہے پر رکھا۔ لیکن کمبخت ماری گیس آ ہی نہیں رہی تھی۔

پچھلی حکومت نے گیس کا مسئلہ تو حل کر دیا تھا۔

اس حکومت نے تو وہ بھی چھین لی۔

گیس سے چولہا تو جل نہیں رہا تھا البتہ دل جل [illegible]۔

مزید [illegible] سے کیا ہوتا۔ [illegible] ہی جلنا تھا۔

اس [illegible] کے ساتھ [illegible]

[illegible] پروگرام [illegible]

جلدی جلدی چکن دھویا۔ چاول چن کر صاف کیے۔

چاول بھگو کر بریانی کا سامان تیار کرنے لگی۔

فیصل مصروفیات کو دیکھتے ہوئے اپنے کپڑے خود ہی استری کرنے لگے تھے۔

میرے بچے کرونا کی چھٹیوں کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے کمرے میں طوفان بدتمیزی برپا کیے ہوئے تھے۔

پہلے تو ایک اتوار کا دن ہے ہم ماؤں پر بھاری گزرتا تھا۔ اب تو پورا سال ہونے کو آیا تھا۔ نہ کرونا ختم ہوا۔ نہ ہی ماؤں کا رونا۔

لیکن خیر میں بات کر رہی تھی بریانی کی۔ فیصل کو پانی گرم کر کے دیا تو "وہ نہا دھو کر" ٹی وی آن کر کے کمبل میں گھس کر بیٹھ گئے۔

میں جلدی جلدی سارا سامان سمیٹ کر چھت پر لے گئی۔

کم سے کم بریانی تو ٹائم پر بن جائے۔

بریانی بناتے وقت سوچ رہی تھی۔ دو، تین آن لائن بزنس شروع کیے تھے۔ کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ الٹا نقصان ہی ہوا۔ دل کو بہلانے کے لیے ایک چھوٹی سی کہانی لکھ کر فیس بک پر پوسٹ کی تھی۔

"اسنیک پیک" کا تو بہت اچھا رسپانس ملا تھا۔

اس کے بعد پہلی قسط اپلوڈ کی تھی۔

اس کا رسپانس بھی تو دیکھوں کیسا رہا۔

اسی اشتیاق میں جلدی سے نیچے آئی۔

موبائل اٹھا کر چھت پر ہی لے آئی۔

ریڈرز کے کمنٹس دیکھ کر تو "جیسے میں آسمانوں میں اڑنے لگی تھی۔"

ایک سرشاری نس نس میں دوڑ رہی تھی۔

ساتھ ساتھ بریانی بھی بن رہی تھی۔ اور میں لوگوں کو جواباً میسج بھی کر رہی تھی۔ آخر کو مستقبل کی معروف رائٹر بننا کوئی آسان کام تھوڑی نا ہے۔

لوگوں کو اپنا موقف بتائیں گے۔ تب ہی تو ہماری تحریروں کو پڑھیں گے۔

اس لیے ہر میسج کا جواب تفصیل سے دے رہی تھی۔

چاول بھی ابل گئے تھے۔ مسالہ بھی تیار ہو گیا تھا۔

اب بس تہہ لگا کر دم لگانا رہ گیا تھا۔

سو وہ کام بھی جلدی سے نمٹا دیا۔

"رائمہ......!" فیصل کی آواز سن کر موبائل ہاتھ میں پکڑے مصروف سے انداز میں سیمنٹ کی سیڑھیاں اترتی نیچے آئی۔

"تمہیں پتا بھی ہے تمہارے لیے تہہ والی بریانی بنا رہی ہوں۔ کتنی مشقت، محنت اور لگن سے بنتی ہے۔ اور ذرا سی لاپروائی سے ساری بریانی کا مزا خراب ہو جاتا ہے۔"

میں نے بظاہر خفگی سے کہا۔ ورنہ دل تو اپنی پہلی کامیابی پر خوشی سے اچھل لگ رہا تھا۔

"میں یہ کہہ رہا تھا کہ بریانی کے ساتھ تھوڑا سا رائتہ بھی بنا لینا۔"

انہوں نے مجھے موبائل میں مصروف خاموش دیکھ کر ایک اور فرمائش کی۔

میں تو اتنی خوش تھی اس وقت، اگر وہ مجھے گاجر کا حلوہ بنانے کا کہتے۔ تو خوشی خوشی بنا دیتی۔

وہ تو پھر ایک رائتہ تھا۔

"اس کے لیے دہی لے آؤ۔" میں نے کہا۔

میں ابھی لے کر آیا تھا۔

پورے پچاس کا دہی تھا۔ فیصل نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں تو وہ سارے کا سارا دہی بریانی کے مسالے میں ڈال دیا ہے۔ بریانی نہیں بنانی تھی۔" میں نے اطلاع دی۔

"تم نے پورے پچاس کا دہی بریانی میں ڈال دیا؟" وہ جیسے صدمے سے پوچھ رہے تھے۔

مہینے کا آخر چل رہا تھا۔ میں جانتی تھی ان کی جیب آج کل کافی ٹائٹ ہے۔

"تو سارا بریانی میں ڈال دیا۔ اتنی مہنگائی میں پچاس کا دہی آتا ہی کتنا ہے۔

گریوی بنے گی تو مسالہ بنے گا۔ مسالہ زیادہ ہوگا تو ہی تہہ والی بریانی بنے گی۔ ورنہ تو پھیکے چاول ہی بنتے ہیں۔"

میں نے بھی شکوہ کرتے ہوئے اپنی مجبوری کا رونا رویا۔

"اچھا چلو! پھر میں، بیس کا دہی اور لے آتا ہوں۔" فیصل نے چپل پہن کر جیکٹ پہنتے ہوئے کہا۔

"بیس کا نہیں پچاس کا لے کر آنا۔ بیس کا دہی آتا ہی کتنا ہے؟ وہ تو سارے کا سارا شاپر پر چپک جاتا ہے۔"

میں نے پیچھے سے آواز لگائی۔

وہ گردن ہلا کر دروازہ بند کرتا باہر نکل گیا۔

اور میں فیصل کی جگہ کمبل میں گھس کر بیٹھ گئی۔

موبائل میں ریڈرز کے کمنٹ پڑھنے لگی۔

ایک بار پھر سے سارے سارے کمنٹس کا تفصیلی

جائزہ لیا۔ اور موبائل لاک کر کے سائیڈ پر رکھا۔
بیڈ کراؤن کو ٹیک لگا کر سوچنے لگی۔
ابھی میری کہانی کی پہلی قسط ہی لوگوں نے اتنی پسند کی ہے۔ جب پورا ناول ہو جائے گا۔ پھر تو اس کی دھوم پوری فیس بک پر ہو جائے گی۔ ڈائجسٹ کے لوگ بھی نئے لکھاریوں کی کہانیوں کا جائزہ لینے کے لیے فیس بک پر چکر لگا لیتے ہیں۔
وہاں ہر گروپ کے ریڈرز اور ایڈمنز نے صرف میرے ہی ناول کی تعریف اور تبصرہ کر رکھا ہوگا۔
جلد ہی کوئی نہ کوئی بڑا ڈائجسٹ ایڈیٹر مجھے ڈائجسٹ میں باقاعدہ لکھنے کی آفر کرے گا۔
پھر لوگ مجھے باقاعدہ ڈائجسٹ رائٹر کے طور پر جاننے لگیں گے۔ میرے ڈائجسٹ کی کہانی اتنی مقبول ہو جائے گی جلد ہی اسے کتابی شکل میں دیکھنے کے لیے بڑے بڑے پبلشرز مجھ سے رابطہ کریں گے۔ میری لکھی کہانیاں اتنی مقبول ہو جائیں گی کہ ڈرامہ اور فلم کے پروڈیوسرز میرے پیچھے پیچھے ہوں گے۔ ڈرامے کے لیے تو میں لکھ دوں گی۔ لیکن فی الحال فلم کا کوئی ارادہ نہیں۔ اس کے بارے میں بعد میں سوچوں گی۔ جلد ہی میرا شمار بڑی بڑی رائٹرز کی لسٹ میں ہوگا۔ ہو سکتا ہے دو تین سال تک اچھوتے کردار اور کہانی اتنی مقبول ہو جائیں کہ اس سال کا بیسٹ رائٹر ایوارڈ مجھے ہی مل جائے۔ بانو قدسیہ، نمرہ احمد، عمیرہ احمد کے بجائے لوگ صرف میرا ہی نام لیں گے۔
پھر میں اس دو کمرے کے تین مرلہ کے گھر کے بجائے کوئی اچھا سا بنگلہ لے لوں گی۔ صفائی کرنے کے لیے ایک ملازمہ اور کھانا پکانے کے لیے ایک ایکسپرٹ شیف رکھ لوں گی۔ اور میں صرف کہانی لکھا کروں گی۔
لوگ میرا آٹوگراف لیا کریں گے۔ کسی بھی کتاب کی تقریب رونمائی ہوگی۔ یا کسی بھی بڑے ڈرامے کا پریمیئر شو ہوگا۔ ریڈ کارپیٹ پر چلتے ہوئے، لوگ مجھ پر پھول نچھاور کریں گے۔
میں لبوں پر فخریہ مسکان سجائے سوچ رہی تھی۔
فیصل کو مجھ پر کتنا فخر ہوگا۔ وہ سب کو فخریہ بتایا کرے گا کہ میں اس کی بیوی ہوں۔
"رائمہ......او......رائمہ۔"
فیصل پھر سے آوازیں لگاتا کمرے میں آ گیا۔
"اتنی دیر لگا دی تم نے؟؟"
میں نے لگاوٹ سے شکوہ کیا۔
"یار! کیا کرتا۔ گلی میں دوست مل گیا تھا۔ اسی سے بات کرتے کرتے اتنا وقت لگ گیا۔"
"تم یہ بتاؤ بریانی تیار ہے؟"
اس نے ندیدے پن سے پوچھا۔
"جی......جی...... میں دم پر لگا آئی تھی۔ آپ ایک کام کریں۔ پتیلا اتار کر نیچے لے آئیں۔ میں اتنی دیر میں آپ کے لیے رائتہ بنا دیتی ہوں۔"
میں پرجوش انداز میں بولی۔
وہ بھی جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھتا اوپر جانے لگا۔ میں دوبارہ سے موبائل اٹھائے ایک ہاتھ میں دہی کا شاپر اور دوسرے ہاتھ میں موبائل کا لاک کھولتی کچن میں آ گئی۔
ایک نیا کمنٹ آیا تھا۔ جوش سے پڑھنے لگی۔
جسے پڑھ کر منہ لٹک گیا۔ مشورہ دے رکھا تھا۔
"بی بی لکھنا ہی تھا تو کسی اصلاحی متن پر قلم اٹھا لیتیں۔ یہ کیا سب کی دیکھا دیکھی۔ وہی گھسی پٹی کہانی۔ لڑکا لڑکی کو اغوا کر کے لے گیا۔ زبردستی نکاح کر لیا۔ پھر وہی واہیات اور لچر کہانی شروع ہو جائے گی۔ جو دوسرے بے ہودہ رائٹرز لکھ رہے ہیں۔"
لگتا ہے کوئی زیرک خاتون تھیں ڈھکے چھپے لفظوں میں اچھی خاصی درگت بنا گئی تھیں۔
وہ تو پہلی قسط پڑھتے ہی پوری کہانی کا خلاصہ بیان کر گئی تھیں۔
اب انہیں کون سمجھاتا کہ آج کل اسی طرح کی کہانیاں، لوگ پسند کرتے ہیں۔
اس لیے میں نے بھی نیم حکیم کی طرح مریضوں کو دھوکا دینے کے لیے دوائیوں کو ادل بدل کر نسخہ تبدیل کرنے کا چورن لگایا تھا۔
جو سب کو اچھا لگا تھا۔ لیکن وہ خاتون میرے

دھوکے میں آنے والی نہیں تھیں۔
انہیں کون سمجھاتا کہ اچھا لکھنے کے لیے اچھے منصوبے اور وسیع تجربے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو وقت کے ساتھ ہی حاصل ہوتا ہے ان سے یہ بحث بے کار تھی کہ نمرہ احمد نے جنت کے پتے۔ اور عمیرہ احمد نے پیر کامل پہلی ہی بار میں نہیں لکھ دی تھی۔
لیکن خیر کسی ایک کے کچھ کہہ دینے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جب تک ناقدین نہیں ہوں گے۔ لکھنے میں نکھار نہیں آئے گا۔ یہ سوچ کر دل کو تسلی دی۔
لیکن آنے والے کمنٹ کو رپلائے بھی تو کرنا تھا۔
اس لیے جی کڑا کر کے میسج ٹائپ کیا۔
"آج کل یہی کچھ پسند کیا جا رہا ہے۔ اس لیے ایسی کہانیاں لکھنا ہی وقت کی ضرورت ہے۔"
میں نے مختصر میسج کر کے بات خلاصہ کر کے جان چھڑائی۔ اور موبائل سائڈ پر رکھ دیا۔
لیکن فوراً ہی ایک اور تبصرہ آیا تھا۔
"بی بی خدا کا خوف کھاؤ۔ تم آج کل کے معاشرے میں بدامنی اور انتشار پھیلا رہی ہو۔ آج کل کے بچوں کو کیا سبق دے رہی ہو کہ جاؤ کسی کی بچی کو اٹھا کر لے جاؤ۔"
"یہ کیسا ہیرو ہے؟ جو کسی کی عزت پہ ہاتھ ڈالتا ہے؟"
شاید کوئی ادھیڑ عمر کے آدمی تھے۔ جس کو میری کہانی سے اختلاف تھا۔
ابھی اسی شش و پنج میں مبتلا تھی کہ بڑے میاں کو رپلائی کروں کہ نہ کروں۔
اسی زیرک خاتون کا تبصرہ آیا۔
"یہ وقت کی ضرورت نہیں۔ تم جیسی سستی رائٹرز کو وقتی شہرت۔ اور غائب دماغ، عقل سے فارغ ریڈرز کے بڑھتے ذہنی خلجان کو وقتی سکون دینے کے لیے ہے۔"
سستی شہرت کا پڑھ کر تو دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔ بڑے میاں کا میسج پڑھ کر دل میں خدا کا خوف بھی جاگ اٹھا۔ اسی لیے بقیہ کہانی لکھنے سے توبہ کرتے ہوئے بددلی سے موبائل ایک طرف شیلف پر رکھ دیا۔
اتنی دیر میں فیصل بھی چھت سے آواز دینے لگا۔
بے دھیانی میں دہی کا شاپر ہاتھ میں پکڑے چھت پر چلی گئی۔
سامنے کا منظر دیکھ کر دل دہل سا گیا۔
آنکھیں مارے صدمے کے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اور دہی کا شاپر ہاتھ سے گر کر پھٹ گیا۔
بے چارہ فیصل بھی صدمے سے مجھے دیکھ رہا تھا۔
دم لگانے کے بعد چولہے سے کوئلے باہر ہی نہیں نکالے تھے۔ جس وجہ سے ساری کی ساری بریانی جل کر کوئلہ ہوئی پڑی تھی۔ ڈھکن کھلنے کے بعد جلنے کی تیز مہک کے ساتھ دھواں بھی اٹھ رہا تھا۔
فیصل سر پر ہاتھ رکھے کبھی بریانی کو اور کبھی مجھے، حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔
تھوڑی دیر بعد صدمے کی کیفیت سے باہر نکلا۔ دہی والا شاپر اٹھایا۔ شکر تھا دہی ڈبل شاپر میں تھا۔ اس لیے گرنے کے بعد بھی دوسرے شاپر میں ہونے کی وجہ سے بچت ہو گئی۔
اپنی محنت پر پانی پھرتا اور بریانی سے اٹھتا دھواں دیکھ کر میری آنکھوں سے باقاعدہ آنسو نکلنے لگے تھے۔
"دہی کا رائتہ بنالو۔ میں بازار سے نان اور پکوڑے لے آتا ہوں۔"
فیصل نے مایوسی سے دہی کا شاپر میرے ہاتھ میں تھمایا۔ سیڑھیاں اتر کر نیچے جانے لگا۔ اسے شاید زیادہ بھوک لگی تھی۔ یا بریانی کے جل جانے کا صبر آگیا تھا۔ لیکن میں کھڑی اپنے خیالی پلاؤ کے ساتھ ساتھ بریانی جل جانے پر آنسو بہا رہی تھی۔
یہ تو صد شکر تھا کہ ساس ماں اور سسر جی دونوں میرے جیٹھ جی کے گھر گئے ہوئے تھے۔ ورنہ ان آنسوؤں میں رزق کے ضائع ہونے کا بھی رونا شامل ہوتا۔
☆

امتہ العزیز شہزاد

بادل بڑی زور سے گرجا تھا۔

اس قدر زور سے کہ کراچی کی اس مضافاتی بستی کے ایک بھربھری اینٹوں والے بے رنگ و روغن کمرے میں، واہنی دیوار سے پشت لگائے، پچھلے تین گھنٹے سے ایک ہی زاویے سے بیٹھی وہ اختر جلنے والی ذی روح بے طرح چونک کر سہم ہی گئی مگر دوسرے ہی پل گویا کسی طلسم سے ہو کر کمزور گھٹنوں پر زور دے کر بمشکل تمام کھڑی ہوئی اور کمرے سے ملحقہ مختصر سے کچے فرش والے صحن کی جانب اپنے تئیں بڑی پھرتی سے دوڑ کر گئی۔

"یہ کراچی کے جھوٹے، بے وفا، دغاباز بادل۔"

اس نے کھلے صحن کے وسط میں کھڑے ہو کر الجھے بالوں والا سر اٹھا کر آسمان پر چھائی بدلی کو تنفر سے دیکھا۔

"جب برسنا جانتے نہیں تب بے وجہ چنگھاڑتے نہ جانے کیوں ہیں؟ ہونہہ...... شاید اپنے کمزور سے وجود کی اہمیت جتانے کی خاطر۔" تب ہی ایک موٹی سی ٹھنڈی بوند نے اس کے جھریوں زدہ، زمانے...... بلکہ شاید خود سے بھی خفا چہرے کو چوم کر اسے شانت کرنے کی ادنیٰ سی کوشش کی مگر اس نے بڑے تنفر سے وہ بوند جلدی سے اپنی بوسیدہ اوڑھنی سے پونچھ کر گویا اس کی کوشش پر پانی پھیر دیا اور سرعت سے صحن کے عین درمیان موجود اپنا مختصر سا اسباب سمیٹ کر چھت کے نیچے لانے کے جتن کرنے لگی۔

ایک عدد نائیلون کی ادوائن والا لوہے کا چھوٹا سا پلنگ، مٹی کے تیل کا چولہا، چند برتن بھانڈے اور ایک عدد جستی بکس...... جس پر کسی زمانے میں ہرا رنگ پوتا گیا تھا اور جواب اس بکسے پر شاذ ہی کہیں دکھائی دے رہا تھا کہ جابجا زنگ لگ چکا تھا۔ بادل ایک مرتبہ پھر حلق کے بل چلایا مگر اس مرتبہ بانو پر ذرا سا فرق نہ پڑا کہ وہ اب بکسے میں موجود سامان پر نگاہ کیے بڑی بے چارگی سے یہ سوچنے میں مشغول ہو چکی تھی کہ کیا میرے پاس بس یہی کچھ تھا؟

دو چار لان کے بدرنگ جوڑے، ایک سستی سی ہوائی چپل، جابجا ادھڑی ریگزین والا سرمئی پرس اور

مکمل ناول

پرس میں موجود کالے بٹوے میں موجود مبلغ ڈھائی ہزار روپے......بس......یہی کچھ؟

لیکن میلی پوٹلی میں بند چھوٹی قینچی، سفید سوئی دھاگہ، کنگھی، بالی پن کا پتا، گلابی ازار بند ڈالنی، عود کے عطر کی خالی شیشی، سرمہ، چٹخا ہوا دستی آئینہ اور آئینے میں دکھائی دیتا اس بدروح کا ٹوٹا ہوا عکس جسے دیکھ کر وہ خود خوف زدہ سی ہو گئی۔ اب اس نے پرس کا دوسرا حصہ کھنگالنا شروع کیا۔ وہاں چھالیہ سے رکھے پڑے تھے اور سونف کی دو پڑیاں......

وحشت سے اس کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔

اس نے بکسے میں ایک مرتبہ پھر سے کچھ تلاشنا چاہا۔ اب کی بار وہاں سے ایک خستہ حال خاکی لفافہ برآمد ہوا تھا۔ جسے اس نے الٹ پلٹ کر دیکھا اور ایک طرف یوں ہی ڈال کر بڑی برق رفتاری سے سرمئی گھسا ہوا کلیں جلد والا البم اپنے قبضے میں لیا کہ جس پر اس کی نگاہ ابھی ہی پڑی تھی۔ وہ بڑی بے تابی سے تصاویر الٹنے لگی۔ ہر تصویر اپنی جگہ مجسم کہانی تھی۔ وہ کہانی جو بھی کسی نے اس سے سنی ہی نہیں...... پر آج وہ کسی کو سنانا چاہتی تھی۔ یہ بتانا چاہتی تھی کہ نہیں...... میرے پاس بس یہی کچھ نہیں تھا...... بلکہ میں تو......

☆☆☆

20 مارچ 1952ء بمقام بمبئی......

قمر بلڈنگ کے ایک کمرے میں بڑی چینی گڑیا سی خوب صورت مگر بدنصیب ماں نے مجھے جنم دیا تھا۔ بدقسمت یوں کہ ابھی اسے تیرھواں لگا تھا کہ تقسیم کے ہنگامے میں، میں اپنے خاندان سے بچھڑ کر تیرے میرے گھر گویا زندگی کے دن پورے کرتی کسی طور اجمیر سے بمبئی آ پہنچی۔ اس عرصے میں اس پر کیا کچھ بیت گیا؟ کبھی ذکر کرتی تو سرمئی آنکھیں رو رو کر سرخ انگارہ سی ہو جاتیں۔ والدین کا سایہ تو عرصے پہلے ہی اٹھ چکا تھا۔ بھائیوں سے بھی جدا ہوئی تو جیسے اس کی دنیا ہی اندھیر ہو گئی۔ بمبئی پہنچی تو یہاں کسی دور پرے کی منہ بولی تائی نے بجائے اسے بھائیوں کے پاس کچھ جتن کر کے لکیر کے اس پار بھجوانے کے، اپنے سر پر پڑی بلا ٹالنے کی خاطر ایسے ویسے سے پکڑ کر بیاہ دیا۔ میرے بابو جی کا اس کم بخت ایسے ویسے کے بڑے بھائی سے دوستانہ تھا، انہی کے ہاں میری ماں ہانڈی روٹی کے عوض دو لقمے کھاتی تھی کہ وہ ایسا ویسا تو عموماً اوباشوں کے اڈے یا پھر شواجی تھانے کی کسی کوٹھڑی میں پایا جاتا تھا۔

وہاں سے چھوٹتا تو لوٹ کر ماں پر برتن لے کر توڑنا اپنا فرض اولین تصور کرتا۔ وہ ایک ایسا ہی دن تھا کہ جب وہ نشے میں دھت میری ماں پر بید برسائے چلا جا رہا تھا اور بے چاری ماں بس یہی کہے چلی جاتی تھی کہ "اگر جو میرے بھیا ہوتے تو میں دیکھتی کہ تو میرے ساتھ کیسے یہ سلوک کر پاتا" ماں کی قسمت کہ اس روز دوسرے کمرے میں اس ایسے ویسے کا بھائی میرے بابو جی کو بٹھا کر کسی کام سے باہر گیا تھا۔ ماں کی فریادی آواز اور کرب ناک چیخیں سن کر بابو جی کی رگوں میں دوڑتے افغانی خون نے جوش مارا اور وہ بس بلا ارادہ ہی ادھر چلے آئے اور آئے تو آئے...... مستزاد اس ایسے ویسے شخص کا ماں کو زخم دیتا ہاتھ پکڑ کر دو ایک لگا بھی دیے۔ بس پھر کیا تھا؟ اس ایسے ویسے نے بابو جی اور ماں کے کردار کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ بابو جی کو بہت غیرت آئی۔ وہ پیسے والے آدمی تھے اور اپنی پہلی بیگم، جو ان سے عمر میں چند برس بڑی تھیں سے کسی قدر دل برداشتہ بھی۔ سو انہوں نے ماں کی طلاق کا ذمے دار خود کو ٹھہراتے ہوئے بخوشی ماں کو اپنا لیا۔ نہ صرف اپنا نام دیا بلکہ قمر بلڈنگ میں بڑی ماں جنہیں سب پٹھانی آپی کہتے تھے کے ساتھ لا بسایا۔ فربہ جسم اور سانولی رنگت کے باعث تیزی سے سفید ہوتے سر والی پٹھانی آپی کے دل پر کم سن اور حسین سوکن پا کر جو بھی بیتی، وہ اس وقت تو انہوں نے کمال ہوشیاری سے اپنے دل میں چھپا کر میری ماں کا وجود کچھ ایسے تسلیم کیا کہ گھر کا سارا کام ماں کے سپرد کر کے خود تخت نشین ہو گئیں۔ پٹھانی آپی کے یکے بعد دیگرے لڑکے ہو کر مر چکے تھے، دو بیٹیاں راشدہ بانو اور جمیلہ بانو البتہ زندہ تھیں۔ راشدہ آپا جب دس برس کی تھیں، اسی سال میں پیدا ہوئی۔ مردوں کی

فطرت کے عین مطابق تو میرے بابو جی کو افسردہ ہونا تھا مگر وہ بھلے مانس نہ ہوئے بلکہ ماں بتاتی تھیں کہ انہوں نے گلابی پھول دار دوپٹے میں لپٹی اپنی سرخ و سپید گل گوتھنی سی بچی کو عطیہ خداوندی سمجھتے ہوئے بڑے پیار اور احتیاط سے اپنی بانہوں میں اٹھا کر ایک دم ہی کہا تھا۔

''ام اس کا نام سلطانہ بانو رکھے گا زیتون!''

''پر سلطانہ تو اس مردود ڈاکو کا نام ہے۔'' چارپائی پر نڈھال مگر خوشی سے بے حال پڑی میری سادہ لوح ماں بڑی پریشانی سے بولی تھی۔

''اوئے خانہ خراب۔'' بابو جی ہنس پڑے۔ ''سلطانہ امارا ماں کا بھی نام اے...... بس ام اس گلابی گڑیا کا نام اس کے نام پر رکھتا ہے۔''

☆☆☆

''سلطانہ بانو...... کدھر ہے بچی؟'' میرے سرخ و سپید، دلیپ کمار جیسے بابو جی حسب معمول بیوپار سے گھر لوٹتے ہی مجھے آوازیں دے رہے تھے اور میں بھی حسب عادت ان کے گھر لوٹنے کے لیے سفید جھالر والی چادر سے ڈھکے اپنی ماں کے پلنگ کے نیچے جا چھپی تھی۔

کیا معلوم کیا بات تھی جو میں اپنے بابو جی سے خاصی خوف زدہ رہا کرتی تھی۔ شاید اس کی وجہ وہ غصہ تھا جو بابو جی راشدہ آپا اور جمیلہ باجی پر کیا کرتے تھے۔ دراصل ان کا جی پڑھائی میں لگتا تھا نہ رسوئی کے کام کاج میں۔ میرے بابو جی کپڑے کے بڑے کامیاب بیوپاری تھے، ہمارے گھر میں روپے پیسے کی کوئی تنگی نہ تھی۔ ایک بائی (کام والی) دن میں دو بار جھاڑو ٹھکا کرنے کو آتی۔ باہر کے کاموں کے لیے چھمن بھی موجود تھا اور سچ بتاؤں تو بابو جی کام کے معاملے میں آپا اور باجی پر سختی کرتے ہی نہیں تھے۔ یہ تو بڑی ماں ہی گھر آتے کے ساتھ بابو جی سے کہانی شروع کر دیتیں تب انہیں غصہ آ جاتا اور وہ آپا اور باجی کی وہ کھنچائی کرتے کہ بس میں تو تھر تھر کانپنے ہی چلی جاتی۔ حالانکہ مجھے اس کی چنداں ضرورت نہ تھی کہ میں شروع ہی سے ماں کے پڑھائے اسباق کے زیر اثر ایک نیک، فرماں بردار بلکہ بابو جی کی ''احسان مند'' (کہ ماں نے میرے من میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ اگر جو تیرے بابو جی مجھ بے آسرا پر رحم نہ کرتے تو میرا ٹھکانا یا تو دوزخ ہوتا یا پھر وہ محلہ...... جہاں راتیں جاگتی ہیں)۔

ذہین و فطین سی بچی تھی۔ سارے بابوؤں کی طرح میرے بابو جی بھی بس یہی چاہتے تھے کہ ان کی اولاد پڑھ لکھ کر کچھ بن جائے۔ میری بڑی بہنوں سے تو توقع فضول تھی ہاں مگر میری بات دوسری تھی۔ اسی لیے تو ابھی کہ میں جب چار برس کی تھی تو میری عمر دو برس زائد لکھوا کر (کہ چھ برس سے کم عمر بچوں کو داخلہ نہ مل سکتا تھا)۔

گھر کے نزدیک کے سرکاری اسکول میں میرا داخلہ کروا دیا گیا اور میں نے بھی بابو جی کو تعلیمی میدان میں مایوس نہ کیا اور یوں بہت جلد ان کی آنکھوں کا تارا بن گئی۔ بابو جی روز گھر واپسی پر میری من پسند پائن ایپل والی کینڈی [illegible] جیلی والے بسکٹ لاتے اور مجھے باقاعدہ آواز لگا کر چیزیں دیتے۔ آپا اور باجی کو نادری پان اور کھٹا میٹھا املی چٹخارہ [illegible] بہت مرغوب تھا بابو جی ان کے لیے بھی لاتے [illegible] تو ضرور لگتا ہوگا، مگر میں نے کبھی [illegible] ہوگا کہ ایک دن۔

☆☆☆

رو رو کر ماں کی آنکھیں اور مجھے دونوں ہاتھوں سے مار مار کر دونوں ہاتھ بری طرح سوج چکے تھے۔ مگر وہ جو سوال کر رہی تھیں اس کا جواب میرے پاس فقط ایک ''نہ'' کے علاوہ تھا ہی نہیں تو میں انہیں کیا دیتی؟

''تو نے بڑی ماں کی شیشے دانی سے پیسے نکالے ہیں بانو؟'' میری حواس باختہ پریشان و رو رو کر بے حال ماں نے سہمے لہجے میں ایک مرتبہ پھر پوچھا۔

''کیا کرنے تھے مجھے پیسے؟'' میں نے ہچکیوں کے درمیان بمشکل جواب دیا تو ماں بے بسی سے مجھے گلے لگا کر اس بری طرح روئیں کہ میری ہچکیاں تھم

گئیں۔

اور اس لمحے مجھ پر ایک دردناک انکشاف ہوا کہ میری معصوم ماں اندر سے عدم تحفظ اور شدید خوف کا شکار تھی۔

"تیرے بابو جی احمد آباد سے لوٹنے والے ہیں ری...... تیری بڑی ماں آتے ہی انہیں بتادے گی کہ ان کی شیشے دانی سے روپے غائب ہیں۔" ماں کا وجود عاور بانہیں [illegible] کے پتے کی مانند لرز رہا تھا۔

"فکر کیوں کرتی ہیں ماں۔" میں نے اپنی ماں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر جیسے انہیں شانت کرنے کی کوشش کی۔ "جب ہم نے روپے لیے ہی نہیں تو ہم کاہے کو ڈرتے پھریں۔" ماں اس پر کچھ نہیں بولیں۔ پر میں نے دیکھا کہ اس لمحے ماں کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک اتر آئی تھی۔

اور وہ چمک مجھ پر بھروسے کی تھی۔ مجھے اپنا سہارا سمجھ لینے کی تھی، یہ میں نے بہت بعد میں جانا۔ اس روز بابو جی کو آنے میں تاخیر ہوگئی۔ سو اگلی دوپہر میری ان کے سامنے پیشی ہوئی۔

"یہ ام کیا سنا سلطانہ بانو؟" نیلی دھاری دار ریشمی تہ بند اور سفید براق ململ کے کرتے میں ملبوس بابو جی اس وقت صحن میں بچھے بڑی ماں کے تخت پر ان ہی کے برابر میں براجمان تھے اور میں گلابی قمیص شلوار میں ملبوس سر پر سفید چنری کا دوپٹا منڈھے کھڑی تھی۔ بڑی ماں کی طرف آپا اور باجی بھی بڑی مودب سی بنی کھڑی تھیں۔ البتہ ان کے ساتھ نیکر شرٹ میں ملبوس کھڑا اشعا کچھ بے چین سا تھا۔ ننھے سے نے میرے دو سال بعد بڑی ماں کے ہاں آنکھ کھولی تھی اور اس وقت بھی کھلی آنکھوں میں ترحم و تاسف بھر کر مجھے دیکھ رہا تھا کہ کیا معلوم بابو جی...... میرا کیا حشر کر ڈالیں۔

"دیکھیں خان صاحب!" ماں گھگھیائے لہجے میں ابھی میرے حق میں دو لفظ کہنا چاہتی تھیں کہ بڑی ماں نے انہیں بڑی حقارت سے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"چپ کر تو...... خود تو جیسے آسمان سے ٹپکی ہے یا زمین سے اگی ہے۔ پر تیری بٹی نے تو حیات خان کے گھر آنکھ کھولی ہے۔ اسی کا کچھ شرم لحاظ کر کے بچی کو "خاندانی پن" سکھا دیا ہوتا۔ آدھا دن تو یہ اسکول میں پڑی رہتی ہے وہاں سے گھر آ کر ان کتابوں میں سر گھمائے نہ معلوم کیا کچھ سیکھ رہی ہے جو آج یہ چاند چڑھا بیٹھی۔" بڑی ماں کے الفاظ سے زیادہ ان کا لہجہ تحقیر آمیز و زہر آلود تھا۔ ماں کا قندھاری انار سا چہرہ احساس تذلیل سے بینگنی ہو گیا۔

ماں سے اب کوئی توقع بے کار تھی لہٰذا اس بار بڑے مودب سے لہجے میں از خود بابو جی سے مخاطب ہوئی۔

"مجھے صفائی کا موقع ملے گا یا صرف سزا سنانی ہے۔" اپنی دس سالہ، پانچویں جماعت کی ہونہار، لائق فائق بٹی کے منہ سے ایک نپا تلا مکالمہ سن کر بابو جی بے طرح چونک گئے۔

"سزا سنانا ہوتا تو ام پہلے ہی تمہارے کو دو تھپڑ مار چکا ہوتا۔" بابو جی بہت غور اور دلچسپی سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولے۔

"تب پھر ٹھیک ہے۔" میں قدرے طمانیت اور معصومیت آمیز اعتماد سے بولی۔

"بات سوچنے والی ہے کہ بڑھیا سے بڑھیا کپڑا لتا آپ ہمیں لادیتے ہیں۔ جوتے بھی باٹا کی دکان سے بنواتے ہیں۔ چوڑی، ہار، بندے اور دوسری الا بلا ہم "چاچا مینا" (گھر گھر گھوم کر سودا بیچنے والی بنجارن) سے خود خرید لیتے ہیں۔ رسالے، کتابیں مجھے اپنے پاٹ شالہ (اسکول) کی لائبریری سے مل جاتی ہیں یا پھر جو سوا روپیہ مجھے روز کا جیب خرچ ماں کی طرف سے ملتا ہے، میں اسے جوڑ کر خرید لیتی ہوں تب پھر میرے پاس اپنے ہی گھر میں چوری کرنے کی کیا وجہ باقی رہ جاتی ہے۔ اور ابن صفی بتاتے ہیں کہ ہر جرم کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ضرور چھپی ہوتی ہے۔ جب کہ میرے پاس کوئی وجہ ہی نہیں تب میں یہ جرم کیوں کرنے لگی؟ اور پھر مجھے تو معلوم ہی نہیں کہ بڑی ماں اپنی شیشے دانی رکھتی کہاں ہیں؟" مجھے موقع ملا تھا تو میں اپنی صفائی میں بے تکان کیوں نہ بولتی۔ ایسے ہی تو پچھلی جماعت میں میری اردو کی

استانی مس شبانہ عبدالقدوس نے سالانہ مقابلہ تقریر میں میرا انتخاب نہ کیا تھا۔ ہر حال میں اپنی بات مکمل کر کے جملہ حاضرین کے چہروں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ تب میں نے دیکھا کہ بڑی ماں کا پورا منہ مارے حیرت، یا اللہ معلوم کس کیفیت کے زیر اثر کھلا ہوا تھا اور انگشت شہادت سوئی ناک کی پھننگ پہ ٹھہری ہوئی تھی اور وہ خاصے اچنبھے سے میری جانب دیکھ رہی تھیں۔ آپا اور باجی جزبز سی ہوئی جاتی تھیں البتہ تنہا چچا مسکرا رہا تھا غالباً یہ سمجھ رہا تھا کہ میں بابو جی کو لاجواب کرنے میں کامیاب ہو چکی ہوں۔

"اوئے سالا۔" میرے خاموش ہوتے ہی بابو جی نے تیز لہجے میں سوال پوچھا۔ "یہ ابن صفی خاناں کون ہے؟" وہ میری جانب تفاخر آمیز متبسم نگاہ سے دیکھ رہے تھے اور ماں کچھ اس انداز سے جیسے کہ انہیں یقین نہ آتا ہو کہ جو کچھ انہوں نے ابھی سنا وہ میں نے ہی کہا ہو۔

"بہت اچھے لکھاری ہیں۔ جاسوسی کہانیاں لکھتے ہیں۔ میں نے انہیں ابھی پڑھنا شروع کیا ہے۔" میں نے فخر سے بتایا اور بابو جی نے بے ساختہ اپنی نشست سے اٹھ کر مجھے سے لگالیا۔ ہاں منہ پر دو چار کے ایک دم مہمک کر رو دیں۔ بڑی ماں کی تیوری پر ان گنت بل پڑ گئے اور آپا اور باجی کے منہ اتر گئے پر چچا بہت خوش تھا۔

"ہمارے کو پہلے ہی یقین تھا کہ ہمارا سلطانہ بانو چوری نہیں کر سکتا۔" بابو جی نے مجھے ساتھ لگا کر رخ بڑی ماں کی جانب کیا تو وہ ترخ کر بولیں۔

"تو پھر کس نے کیا ہے؟"

"چھوڑو ناماں۔" راشدہ آپا نے انہیں گھبرا کر روکا۔ "مجھے لگتا ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ ابھی تم نے اپنا آبنوسی صندوق کہاں دیکھا ہے۔ کیا معلوم شیشے والی تم نے بھول سے اسی میں رکھ دی ہو۔"

☆☆☆

"ہائے اللہ۔ پھر کیا ہوا؟"

اگلے روز چھاجوں برستے مینہ میں، میں برساتی پہنے، جیب میں موجود گرما گرم لیموں، لال مرچ سے لتھڑا بھٹہ نکال کر جڑے سے چبائی ہوئی اپنی ہم جماعت سہیلی نسیمہ کے ہمراہ گلی میں کھڑے پانی میں چھم چھم کرتی اپنے اسکول کی جانب رواں دواں۔ اس کے سامنے گزرے کل کا قصہ دہرا رہی تھی۔ سانولی سلونی نسیمہ کو بھی یقیناً یہ واقعہ کچھ زیادہ ہی دل چسپ معلوم ہورہا ہوگا تب ہی تو جب میں بھٹے کے دانے دانت سے نوچنے کی خاطر لمحہ بھر کر خاموش ہوئی تب وہ خاصی بے تابی سے مخاطب ہوئی تھی۔

"ہونا کیا تھا؟" میں سوں سوں کرتی ہوئی بولی۔ "بابو جی تو میری بات سے اتنا خوش ہوئے کہ بولے، تو میری سب سے ذہین بچی ہے، تجھے تو بس ڈاکٹرنی بناؤں گا۔"

"تو بن جائے گی؟"

"ہاں، کیوں نہیں۔" میں برسات کے مخصوص گھٹنوں تک آتے ربڑ کے کشتی جوتوں میں مقید اپنے پیر زور زور سے پانی میں مار کر چھینٹے اڑاتی ہوئی بولی۔ "یوں بھی ماں کہتی ہیں کہ بابو جی کا ان پر احسان ہے اور میں ان کی بچی...... مجھے تو بابو جی کی بات کا زیادہ مان رکھنا چاہیے نا۔"

"یہ تو ہے۔" نسیمہ فوراً متفق ہوئی۔ کچھ خیال آنے پر پوچھنے لگی۔

"اور وہ تیری بڑی ماں کی شیشے والی، وہ ملی کہ نہیں؟"

"کرم خدا کا کہ مل گئی۔" میں نے دانتوں سے خالی بھٹہ دور پھینکتے ہوئے بتایا۔

"راشدہ آپا جی نے کہیں سے برآمد کر کے دی۔"

"خود ہی نے چھپائی ہوگی؟" نسیمہ چلتر پن سے آنکھیں مٹکا کر بولی۔

"نہیں...... وہ ایسی تو نہیں ہیں۔" میں نے ازحد برا مان کر کہا۔ چھوٹی عمر میں کسی غیر کے منہ سے اپنے بڑوں کے لیے ایسے تبصرے سن کر یوں بھی بڑا برا سا لگتا ہے۔

"اور میں جو تمہیں اپنی سہیلی سمجھ کر تم سے اپنے

من کی باتیں کرتی ہوں تو اس کا ہرگز یہ مطلب تو نہیں کہ تم میری بہنوں کے بارے میں اناپ شناپ بولنا شروع کر دو۔‘‘

’’اچھا...... اچھا۔ ناراض کیوں ہوتی ہو۔ دیکھو، تو بلدی رام کیسی گرم گرم جلیبیاں اتار رہا ہے۔ چار آنے کی دلا دو نا۔‘‘ اس نے گلی کے نکڑ پر بنی بلدی رام حلوائی کی دکان کے سامنے ٹھہر کر ندیدے پن سے کہا۔

’’ہاں لے لو۔ یوں بھی بابوجی نے کل میری تقریر سے خوش ہو کر مجھے پورے پانچ روپے انعام دیا ہے۔‘‘

☆☆☆

پھر دو چار برس مزید ہوا کے کسی لطیف و معطر جھونکے کی مانند گزر گئے۔

ماں کی گود میں ذہنی معذور منو کے اگلے ہی برس سرخ و سپید، صحت مند و توانا گڈو آ گیا۔ ماں مطمئن ہو گئی اور بڑی ماں مزید مضطرب کہ بیٹیوں کے بعد اب اکلوتے بیٹے کا حریف بھی دنیا میں آ چکا تھا۔ وہ تو بابوجی کی جانب سے ذرا سختی تھی ورنہ میں سمجھتی ہوں کہ بڑی ماں کا زور چلتا تو کبھی کا ہمیں قمر بلڈنگ سے اٹھا کر باہر پھنکوا دیا ہوتا۔ بہرکیف...

میں اب نویں جماعت کی طالبہ تھی۔ ’’شیر الاسلام گرلز ہائی اسکول‘‘ کی ایک ممتاز طالبہ۔ مقابلہ تقریر کا ہو یا کرکٹ کا۔ اول انعام مجھے ہی ملتا۔ ڈراموں میں کوئی مشکل گیٹ اپ والا رول مجھ سے کروایا جاتا۔ اس سب کے ساتھ ساتھ میرا تعلیمی ریکارڈ بھی شان دار تھا، تب میں کیوں نہ ستارہ بن کر چمکتی۔ میرے پاس ٹرافیوں، تمغوں کی بہتات تھی۔ میں بجا طور پر اپنے بابوجی کا فخر تھی انہیں مجھ سے بہت ساری امیدیں وابستہ تھیں اور میں انہیں مایوس نہیں کرنا چاہتی تھی سو اس لیے شبانہ روز محنت کر رہی تھی۔ مجھے مرتے دیکھ کر انہی دنوں بڑی ماں کو کچھ احساس ہوا اور انہوں نے بابوجی سے کچھ کہہ سن کر آپا اور باجی کے لیے کہیں سے ایک عدد ٹیوٹر کا بندوبست کروا دیا۔ موصوف کا نام تھا...... ذوالفقار علی عرف زلفی...

☆☆☆

’’تمہاری بہن ٹیوشن کیوں نہیں پڑھتی؟‘‘ صحن میں بچھے بڑی ماں کے تخت کے ساتھ دھری کرسی پر براجمان ماسٹر صاحب نے حساب کا کوئی سوال باجی کو سمجھاتے سمجھاتے درمیان میں اچانک ہی سوال داغا تھا۔ انہیں ہمارے گھر پڑھانے آتے ڈیڑھ ماہ ہو گیا تھا۔ پہلے پہل تو بڑی ماں ماسٹر صاحب کی ’’لیاقت‘‘ جانچنے کی خاطر خود بھی، صحن میں لگنے والی اس دو گھنٹے پر مشتمل ’’کلاس‘‘ میں بنفس نفیس موجود رہا کرتی تھیں بعد ازاں مطمئن ہو گئیں تو اب کمروں کے آگے بنے برآمدے میں پلنگ ڈالے پڑی رہتیں اور ہمارے نوکر چھٹن سے جو باجی سے روپے اینٹھ کر بطور خاص ہفتے کی شام گزارنے ’’رم جھم کلب‘‘ جایا کرتا تھا۔ اس سے وہاں آنے والے فلمی ستاروں اور جدوجہد کے دور سے گزرتے اداکاروں کے نت نئے چٹ پٹے قصے بڑے شوق سے سنا کرتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ کسی جیتندر نامی لڑکے کا قصہ چھیڑے بیٹھا تھا، جو وہاں ناچنے آیا کرتا تھا۔ اب سنا ہے کسی پکچر میں ہیرو کا کام مل گیا ہے اسے۔

اس کا قصہ ابھی نامکمل تھا کہ بڑی ماں کے خراٹے گونجنے لگے۔ تب وہ قدرے بے مزا ہو کر گھر سے باہر نکل گیا۔ تمام بچے بڑی مدت سے غائب تھے۔ منو اور گڈو سو رہے تھے اور ماں کے پاس [illegible] بیٹھی تھی۔ ان دونوں کی باتوں سے چونکہ میری پڑھائی میں خلل واقع ہو رہا تھا سو میں اپنی کتابیں لے برآمدے میں بچھی دری پر آ بیٹھی اور تب ہی میرے کانوں میں ماسٹر صاحب کی پرتجسس آواز پڑی۔

یوں تو بظاہر ماسٹر صاحب بڑے ظرف تھے، سلیقے کے مہذب آدمی معلوم ہوتے تھے پر میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ آتے بہانے مجھ سے بے وجہ مخاطب ہونے کی کوشش کیا کرتے اور تو اور جب میں ان کی موجودگی میں کسی کام کی غرض سے صحن پار کر کے رسوئی میں جاتی، تب وہ مجھے مسلسل کن انکھیوں سے دیکھا کرتے۔ کوئی الجھن سی الجھن تھی جو میں ان کی موجودگی میں بہت شدت سے محسوس کیا کرتی۔

''کاہے کو پڑھنے لگیں وہ ٹیوشن۔'' آپا کی سلگتی آواز سنائی دی۔

''خدا نے فضل کر رکھا ہے، خیر سے پوری علامہ ہیں۔ ان کے کمرے کا بچان جا کر دیکھیں کسی روز...... بھرا پڑا ہے انعامات سے۔ بہت چالاک اور تیز ہیں۔ کہنے کو بہن ہیں ہماری پر ہماری طرح کی نہیں۔'' آپا کا بے زار لہجہ گویا میرے ہنر کو عیب بنا کر پیش کر رہا تھا۔ میرا دل اتنا دکھی ہوا کہ میں نے اپنے سامنے کھلی ریاضی کی کتاب ہی بند کر دی۔

''یہ تو بھئی تم نے سولہ آنے درست بات کی کہ وہ تم دونوں کی بہن نہیں لگتیں۔'' جواباً وہ متبسم لہجے میں بولے تو اس مرتبہ بھابی شہ پا کر شروع ہو گئیں۔

''کیسے لگیں گی؟ میں بتاؤں ان کی ماں بڑوا سے کے وقت......''

اس سے زیادہ مجھ میں سننے کی تاب نہ تھی، نہ انہیں جا کر ٹوکنے کی ماں کی جانب سے اجازت تھی۔ سو میں بڑی دل گرفتگی سے اپنی کتابیں سمیٹ کر دوبارہ کمرے میں آ گئی۔

☆☆☆

''اتنا تو تیرے سامنے روئی میں گوری ماں۔ ولی دو نا میرے کو ہجار روپیہ۔''

زملا اگلے روز ماں کے کمرے میں پھر آ بیٹھی تھی اور ان کا گھٹنا بڑی لجاجت سے تھامے اصرار کر رہی تھی۔ میں ابھی ابھی پاٹ شالا سے لوٹی تھی۔ کمرے کے اندر بنے کابک نما کمرے میں کپڑے بدلنے چل دی۔

''ماں کسم......'' اس نے اپنا پکا سیاہ کھردرا ہاتھ یقیناً اس وقت ماں کے گھٹنے سے ہٹا کر کندھے پر رکھا تھا۔ میں سوچتے ہوئے تیزی سے کپڑے تبدیل کر کے باہر آ گئی۔

''سورج کے جنگل سے چھوٹتے ہی میں دے گی نا تیرے کو واپس۔''

''تیری مصیبت اپنی جگہ مگر میں ایسے کیسے......''

ماں جو بائی کی دگرگوں حالت دیکھ کر آب دیدہ تھیں، کسی قدر ہچکچاہٹ سے بولیں۔

''تیرے کو میری بات کا یقین نہیں تو تو میری کھولی کے یہ پکے کاغذ رکھ لے۔ اس سے جیادہ میں تیرے کو یقین نہیں دلا سکتی۔'' چھکوں پھکوں روتی زملا نے اچانک ہی اپنے داہنے ہاتھ میں تھاما کوئی اسٹامپ پیپر کی طرح کا کاغذ آگے کیا۔ ماں تو ایک دم ہی گھبرا گئیں۔ میں نے آگے بڑھ کر وہ کاغذ زملا سے لے لیا۔

''دکھانا تو ذرا......'' پکا کاغذ واقعی اس کی کھولی کا تھا۔ مجھے ازحد افسوس ہوا۔ تب ہی ماں فیصلہ کن انداز سے اٹھ کر اپنی لوہے کی دو پٹ کی الماری کی جانب بڑھیں اور ہزار روپے لا کر اسے تھمائے۔

''اب تو نے حجت کرنے کو باقی ہی کیا چھوڑا ہے۔'' ماں نے کہا۔ ''یہ روپے دے اور چھڑا لا اس بدبخت کو۔''

''گوری ماں تیرے کو بھگوان رکھے۔'' وہ روپے پا کر تشکر سے دوبارہ رو پڑی۔

''جانتی تھی میں کہ پٹھانی آئی تو کچھ دیں گی نکل...... پر تو میرے کو کھالی ہاتھ نہیں لوٹائیں گی۔ اب چلتی ہے میں۔ کل تو وہ اٹھ کر ادھر آ جائیں گی کچ کچ کرنے کو۔'' اپنے میلے سرمئی بلاؤز کے گریبان میں روپے اڑستی زملا کا اشارہ بڑی ماں کی طرف تھا۔ میں مسکرا دی۔

''اچھا اچھا...... یہ اپنا کاغذ تو لیتی جا۔'' ماں نے ہنس کر کہا۔

''رکھ رکھ تو...... ادھ رکھ۔ جب تک میں تیرا پیسہ نہیں لوٹا دیتی اسے اپنے پاس ادھ سنبھال کر رکھ۔ کھالی تم لوگ کائیں، اپن کا بھی کوئی جبان ہوتا ہے۔''

زملا اپنی کنیا گروی رکھ کر ہمیں دعائیں دیتی چلی گئی۔

اور ماں نے وہ کاغذ سر جھٹک کر مجھ سے لیا اور ہنستے ہوئے الماری میں ایک طرف ڈال دیا۔ جلد ہی واپس نکالنے کے لیے۔

☆☆☆

''بابو جی! میرا من نہیں کر رہا ان سب کے

ساتھ پکچر کے لیے جانے کو۔"

میں نے مناسب موقع دیکھ کر دبے پاؤں بابوجی کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے خاصے جھجکتے ہوئے ان سے کہا۔ کیا معلوم کیا بات تھی کہ اس روز صبح ہی سے میرا دل کچھ عجیب انداز سے دھڑک رہا تھا۔ حالانکہ بظاہر سب کچھ اپنی جگہ پر درست ہی تو تھا۔ میں حسب حال نویں، امتیازی نمبروں سے پاس کر چکی تھی۔ آپا اور باجی روتے دھوتے جیسے تیسے کسی دسویں کے پرچے دے کر آج کل چھٹیاں منا رہی تھیں۔ اس روز ہفتہ تھا اور گھر والے معمول کے مطابق چیتن کے ہمراہ سینما میں لگنے والی امتیاز کی نئی پکچر دیکھنے جا رہے تھے، پر میرا جی ہر شے سے اس قدر اچاٹ سا ہو رہا تھا کہ میں بابوجی کے پاس چلی آئی تا کہ وہ ماں کو کہہ کر مجھے اپنے پاس ٹھہرا لیں۔

"تم کو کیا ہوا سلطانہ بانو؟" نیلی چیک دار سفید ریشمی تہہ بند سوئی کرتے ہمراہ پہنے میرے شہزادوں کی سی آن بان والے بابوجی جو اس وقت اپنی مسہری پر نیم دراز گود میں اپنا ننھا سا ٹرانسسٹر لیے بیٹھے رفیع کا کوئی نغمہ سن رہے تھے، میری بات سن کر حیرت سے میری جانب دیکھنے لگے۔

"کچھ نہیں بابوجی! بس میرا من نہیں آج کہیں جانے کو۔" میں نے اصرار کیا۔

"اپنی ماں کے ساتھ جاؤ بانو! تمہارا ماں اکیلا منو اور گڈو کو کیسے سنبھالے گا۔"

انہوں نے پچکار کے مجھے سمجھایا اور ماں کی پریشانی کا خیال کر کے میں بے دلی ہی سے سہی پر چلی گئی اور اے کاش کہ اس روز میں دل کی بات مان جاتی۔

☆☆☆

"بے حس کہیں کی...... دیکھو تو کیسے پتھر کے مانند گم سم بیٹھی ہے۔ اری رو لے بانو۔ دنیا دکھاوے ہی کو سہی پر آنکھ سے دو آنسو بھی ٹپکا لے۔ اری باپ مرا ہے تیرا۔ یتیم ہو گئی ہے تو۔" کسی نے مجھے بری طرح جھنجوڑا تھا۔ میں گویا چونک کر ہوش میں آئی تو دیکھا صحن، برآمدہ، کمرے...... ہر جگہ لوگ ہی لوگ ہیں۔

"یہ سب یہاں کیوں جمع ہیں؟" میں نے الجھ کر جھنجوڑنے والی سے سوال کیا۔

"ہائے، لگتا ہے غم سے بانو کا دماغ الٹ گیا۔ ارے کوئی اسے بتاؤ...... باپ جھلس کر مر گیا ہے اس کا۔" کسی نے بین ڈالا تھا۔ میں جیسے کہنے والی کا منہ نوچ لینا چاہتی تھی تب ہی بپھر کر شیرنی کی مانند کھڑی ہوئی۔

"خبردار۔ جو کسی نے اب یہ منحوس بات منہ سے نکالی تو...... میرے بابوجی کو کچھ نہیں ہوا۔ وہ اندر اپنے کمرے میں ریڈیو سن رہے ہیں۔ خبردار...... خبردار......" میں زور زور سے چلا کر سب کو دھمکا رہی تھی کہ تب ہی ایک زناٹے دار تھپڑ ماں نے میرے منہ پر مارتے ہوئے مجھے گلے سے لگا لیا۔

"ہائے میری بچی...... بے وقت کی آئی تجھ پر جان چھڑکنے والے کو لے گئی۔ ہمیں بے آسرا کر گیا جانے والا۔ ہائے بانو...... میرے بچے یتیم ہو گئے۔" ماں مجھے گلے سے لگائے زار و قطار رو رہی تھی اور میں اس لمحے ایک عجیب جذبے سے روشناس ہوئی کہ جب دل میں نا قابل تلافی غم کا طوفان کروٹیں لینے لگے تو بعض آنکھیں بنجر بھی ہو جاتی ہیں۔ جیسے کہ میری آنکھ بنجر تھیں...... برستی تو چھلک جاتی اور چھلک جاتی تو دل خالی ہو جاتا اور میں نے اب اس کرب سے دل کو خالی نہیں کرنا تھا۔

☆☆☆

"رحم کیجیے میرے حال پر بڑی آپا۔ جوان بچی اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو لے کر میں اس وقت کہاں جاؤں گی؟" ماں نے فقیرانہ انداز میں اپنے سونے ہاتھ مسہری پر پھیل کر بیٹھی بڑی ماں کے آگے جوڑ رکھے تھے۔

بابوجی کے بعد پہلی جمعرات کو دسویں کا ختم دلاتے ہی گھر مہمانوں سے خالی ہو چکا تھا اور بڑی ماں کا نہ جانے کب سے انتقام کی آگ میں جلتا دل رحم سے...... سو انہوں نے بڑی آسانی سے ہمیں قمر بلڈنگ سے نکل جانے کا حکم سنا دیا تھا۔

"ڈھونڈ لے اپنا کوئی ہوتا سوتا اور جا وہیں پر۔"

بڑی ماں نے حقارت سے کہا۔ "یا پھر پھانس لے کوئی تیسرا مرد اپنے بچے پلوانے کو۔ گوری چٹی ہے۔ زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی۔" بڑی ماں نے یقیناً ماں کا یہ گناہ بھی معاف ہی نہیں کیا تھا۔ بس بابو جی کے آگے دم مارنے کی مجال نہ تھی اور جب وہ ہی نہ رہے تو اب ڈر کا ہے کا۔

"آپا!" اس طعنہ زنی پر ماں کی روح تک بلبلا اٹھی۔ "کوئی ہوتا سوتا موجود ہوتا تو میں یوں کا ہے کو در بدر پھرتی۔"

"ہاں بھئی!" بڑی ماں نے گویا ناک پر سے مکھی اڑائی۔ "سن رکھی ہے تمہاری رام کہانی مگر میں بھی اب کیا کروں؟ خانو (بھائی) چاہتا ہے کہ میں اپنی عدت کے بقیہ دن اس کے گھر کلہار پور میں پورے کروں۔ سب جانتے ہیں کہ قمر بلڈنگ جنت مکانی نے خانو کے پاس گروی رکھوا کر روکڑا (روپیہ) کھرا کیا تھا۔ اب یہ بلڈنگ خانو کی ہے۔ وہ جو چاہے سلوک اس کے ساتھ کرے۔ یہ چار توبیوں بھی کئی برس سے ان کی جان کا روگ بنا ہوا تھا۔ میں نے تو کہا ہے خانو سے کہ خسارے میں جاتی دکان بھی بیچ باچ کر روپیہ اپنے ہی دھندے میں لگا کر میرے ننھے کو بھی اپنے ہی ساتھ رکھ لے۔"

بڑی ماں کا سکہ واقعی مضبوط تھا۔ سو اسی لیے وہ بیوہ نہیں ہوئی تھیں بلکہ مختار کل بن کر دھڑا دھڑ فیصلے صادر کر رہی تھیں۔

"آپا! تمہیں خدا کا واسطہ، ہمیں گھر سے مت نکالو۔" ماں نے پھر التجا کی۔

"چھوٹی ماں! تمہیں اماں نے ابھی پوری تفصیل سنائی تو ہے، تمہیں پھر بھی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" اس بار بڑی بیٹی راشدہ آپا بڑی بے زاری سے بولی تھیں اور اتنی دیر سے خاموش کھڑی ضبط کے کڑے مراحل طے کر رہی تھی، زندگی میں پہلی بار ہر مصلحت اور ماں کی ہر نصیحت بالائے طاق رکھتے ہوئے بلا ارادہ چلا اٹھی۔

"میری ماں سے بدتمیزی کرنے کی ضرورت نہیں ہے کسی کو، بے آسرا نہیں ہے، نہ میرے بھائی، ابھی میں زندہ ہوں۔"

☆☆☆

"تو روتی کیوں نہیں ہے بانو۔ رو لے...... تاکہ تیرا جی کچھ تو ہلکا ہو۔"

میری لب کشائی کی پاداش میں بڑی ماں نے ہمیں اسی وقت حقیقتاً دھکے دے کر قمر بلڈنگ سے نکال دیا تھا۔ محلے کے دو چار لوگوں نے انہیں سمجھانے کی کوشش بھی کی مگر چوں کہ وہ سب کچھ طے شدہ منصوبے کے تحت کر رہی تھیں سو اپنی کر کے رہیں اور میں اپنی ماں اور بھائیوں کو لے کر ہماری حالت پر از حد غمگین چچن کی مدد سے زہرا کی اس کھولی میں چلی آئی کہ جو اس نے ہمارے پاس گروی رکھ چھوڑی تھی۔

گھر بدری کی وہ پہلی رات بہت سیاہ، بے حد خوف ناک اور طویل لگ رہی تھی مجھے اور میں دس بائی چودہ کی اس بنا چھت کی کھولی میں کھردری دری پر پڑی پوری آنکھیں کھولے آسمان کی جانب تکتے بس ایک اسی سوچ میں گھری تھی کہ اب آگے زندگی کا نقشہ کیا ہوگا۔ تب ہی چارپائی پر منو اور گڈو کو ساتھ لیے لیٹی ماں عجیب سے لہجے میں بولیں۔

"کس کس بات کو روؤں ماں؟" میں ہنوز آسمان کی جانب ٹمٹماتے تاروں کو دیکھتی ہوئی بے تاثر لہجے میں بولی۔

"بابو جی کے اس طرح بچھڑنے کو؟ تمہاری سونی کلائیوں کو؟ اپنوں کے آنکھ بدل لینے کو...... اپنے ہی باپ کے گھر سے نکال دیے جانے کو...... منو کے معصوم چہرے کو یا پھر اس بدنصیب کو جسے ابھی ٹھیک سے بولنا تک نہیں آتا۔" ماں نے زور زور سے رونا شروع کردیا تھا اور میں نے انہیں ٹوکا نہیں کہ جان چکی تھی یہ رونا تو اب عمر بھر کا ہے۔

☆☆☆

"ہم سارے تو چچن کے ساتھ پکچر دیکھنے گئے تھے۔ اللہ بخشے جنت مکانی کی عادت تھی، ہمارے پیچھے اپنے لیے چائے بنانے رسوئی میں چلے

جاتے... اور چائے کا برتن ہمیشہ اپنی تہ بند سے پکڑ کر اتارتے۔ اس منحوس دن بھی یہی کیا ہوگا۔ بس اب اور کیا کہوں بلاوا آ گیا تھا سو چولہے کی آگ تہ بند نے پکڑ لی۔ دیکھتے ہی دیکھتے آدھا شریر جھلس گیا۔ آوازیں سن کر محمد بھائی (پڑوسی) گھر میں داخل ہوئے۔ شفا خانے بھی وہی لے کر گئے مگر مرحوم جاں بر نہ ہو سکے۔"

عدت کے باعث گھونگھٹ کیے بیٹھی ماں اپنی جانب سے رخ موڑے نیچے دری پر ہماری خستہ حالی دیکھ کر رنجیدہ سے بیٹھے ماسٹر صاحب کو بتائے گئیں۔ وہ کل ہی اعظم گڑھ سے لوٹے تھے۔ قمر بلڈنگ کو خالی پا کر آس پڑوس سے ماجرا سنا اور وہیں کسی سے ہمارا ٹھکانا پوچھ کر اب آئے بیٹھے تھے۔

"خدا خان صاحب کے درجات بلند کرے۔ مرحوم بہت اچھے آدمی تھے۔" انہوں نے پرسہ دیا تو چند لمحوں کے لیے ماحول پر سوگواریت سی طاری ہو گئی۔

"آپ لوگوں نے اب آگے کا کیا سوچا ہے؟" اس مرتبہ انہوں نے براہ راست میری جانب دیکھ کر سوال پوچھا۔

ایک ایسا سوال کہ جس کا جواب میں پچھلے ایک ہفتے سے ڈھونڈ رہی تھی۔ سو اسی لیے میں احمقوں کی مانند ان کی جانب ٹکر ٹکر دیکھے گئی۔

"میں مدن پورہ میں رہتا ہوں۔ وہاں آپ کے لیے بھی کوئی کھولی دیکھ لیتا ہوں۔ یہاں ایسے رہنا تو بالکل نامناسب ہے۔ وہ بھی آپ جیسوں کے لیے۔" انہوں نے ہماری چٹائی کی دیواروں والی مختصر سی کٹیا پر ایک طائرانہ مگر گہری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

اپنا مختصر سا اسباب ہم نے بہت حد تک ایک کونے میں ترتیب دے کر مٹی کے تیل کا چولہا بھی سامنے ہی رکھ دیا تھا۔ مگر سب سے زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ چھت ندارد تھی اور دروازے کی جگہ ٹاٹ کا پیوند لگا پردہ لگا تھا۔

زندگی عرش سے گر کر فرش پر بکھر گئی تھی اور میری سمجھ میں نہ آتا کہ میں وہ جادوئی چھڑی کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں جو اس بے رنگ گھر کو چھو منتر کر کے سب پہلے کی طرح کر دے......

"ہم اب ایسے ہی ٹھیک ہیں۔" میں نے اس عرصے میں پہلی بار لب کشائی کی تو اپنا لہجہ سن کر افسردہ ہو گئی۔ یہ دھیما، مدھم ذرا سہما اعتماد سے عاری لہجہ میرا تو نہ تھا۔

"آپ تردد نہ کریں۔ یہ جگہ تو کہیں کہ اچھی ہی ہے۔ وہاں چول کا بھاڑا (کرایہ) میں کہاں سے ادا کر پاؤں گی۔"

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے بانو۔" ماں نے میری بات کی تائید کی۔ "سر چھپانے کی یہ جگہ جیسی تیسی ہی سہی پر موجود تو ہے......"

"اے بھیا! اگر تم کو ہمارا بھلا کرنا ہی ہے تو ہمیں کوئی کام دلوا دو کہ رات کی روٹی کی فکر تو دور ہو۔" ماں کھسیائے سے لہجے میں بولیں۔ تو ماسٹر صاحب ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ابھی آتا ہوں کہہ کر باہر نکل گئے۔

جب واپس لوٹے تو ہاتھ میں پاؤ بھاجی کا لفافہ اور چائے کا سامان تھا۔ خشک دودھ کا ڈبا اور منو، گڈو کے لیے میٹھی نانفیاں اور پارلے جی بسکٹ۔

"آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہ تھی۔" مجھے سخت برا محسوس ہوا تھا۔ میں نے اپنے پلو میں بندھے روپے نکال کر انہیں تھمانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میرے خلوص کو شرمندہ مت کرو بانو۔" وہ گمبھیرتا سے بولے۔ "بھلا برا وقت سب پر آتا ہے۔ اگر کچھ دینا ہی مقصود ہے تب میرے دامن کو بس دعاؤں سے بھر دو۔ اور کل صبح تیار رہنا تمہیں میرے ساتھ ایک جگہ پر چلنا ہوگا۔"

☆☆☆

"یہ آپ مجھے کہاں لیے چلے جا رہے ہیں۔" اگلی صبح میں ماسٹر صاحب کے ساتھ کام کی تلاش میں چلی آئی تھی کہ اس کے بنا اب چارہ نہ تھا۔ مگر جب

وہ مجھے لیے ساکلی اسٹریٹ پر پہنچے تب میں بڑی زور سے چونکی۔

"تمہارے اسکول...... ارے بھئی میٹرک کی کلاسیں شروع ہونے کو ہیں۔ تمہیں آگے نہیں پڑھنا؟" وہ میرے ہمراہ چلتے بڑی بے تکلفی سے یوں بولے گویا ہمارے درمیان صدیوں کا دوستانہ ہے۔ مجھے بہت غصہ آیا۔ میں جہاں کی تہاں ٹھہر گئی۔

"آپ تو مجھے کام دلوانے لے جا رہے تھے۔"

"پڑھنا لکھنا بھی تو ایک طرح کا کام ہی ہے بلکہ بہت ضروری کام ہے۔" وہ مسکرائے۔

"مجھے اب نہیں پڑھنا۔" میں نے خفا خفا سے لہجے میں کہا تو وہ میری جانب بڑے غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔

"پڑھو گی نہیں تو پھر اور کیا کرو گی بانو؟"

"مجھے کوئی کام دلوا دیں۔"

"انڈر میٹرک کو کوئی ڈھنگ کا کام ملنا بہت دشوار ہے۔" انہوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

"مگر میں اب ڈاکٹر نہیں بن پاؤں گی۔" میری آواز بھیگنے لگی تھی۔

"چلو...... کلکٹر ہی بن جانا۔" وہ مجھے بہلانے کو شگفتگی سے بولے مگر میں ایک دم ہی ارد گرد سے بے نیاز ہو کر کسی نادان بچے کی طرح عین سڑک پر اینٹھ کر چیخ اٹھی۔

"یہ کوئی مذاق کی بات تو نہیں ہے ماسٹر صاحب! میرے بابو مجھے ڈاکٹری پڑھانا چاہتے تھے۔ اب اگر مجھے ڈاکٹر نہیں بننا تو پھر کچھ بھی نہیں بننا۔"

میری آواز اتنی بلند تو ضرور تھی کہ آس پاس سے گزر کر تیزی سے اپنے کام کاج کو جاتے لوگوں میں سے چند ایک نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اور پھر سر جھٹک کر اپنی راہ لی۔ تب ہی ماسٹر صاحب اس بار میرے نزدیک آ کر بہت گمبھیرتا سے بولے تھے۔

"زندگی گزارنے کا اصول بہت سادہ ہوتا ہے بانو کہ یہ جو دے...... اسے بخوشی لے لو۔ اور جس چیز کو ہم سے دور کر دے اس کے تعاقب میں مت بھاگو...... بس اس پر صبر کر لو اس یقین کے ساتھ کہ اسی میں ہماری بہتری ہو گی...... اب چلو...... ہمیں دیر ہو رہی ہے۔"

☆☆☆

ادریس چچا نے تب تک خود کو بڑا مضبوط اور بہادر بنا چکی تھی اس روز آرٹس کا داخلہ فارم اپنے ہاتھوں میں دیکھ کر یوں روئی کہ اس سے انتظامی دفتر میں موجود ہر شخص آب دیدہ ہو گیا۔

ظاہر ہے، میں اسکول کا درخشاں ستارہ تھی۔ پورا اسکول مجھ سے اور مجھ پر گزرنے والی ناگہانی سے واقف تھا۔ اور میرے اساتذہ چاہتے تھے کہ میں میٹرک سائنس ہی میں کروں مگر اب یہ میرے لیے کسی طور پر ممکن نہ تھا کہ معاشی مسائل اپنے نوکیلے جبڑے کھولے ہمیں نگلنے کو تیار تھے۔ میرے پاس اب پڑھنے کے لیے دھن تھا نہ وقت......

سو اس روز میں نے اپنا پہلا خواب خود اپنے ہاتھوں بڑی بے رحمی سے قربان کر ڈالا اور یہ جانا کہ قربانی تو فقط پہلے خواب، پہلی خواہش ہی کی دینا ہوتی۔ اس کے بعد تو گویا ہر خواب پلکوں پر اترنے سے پہلے کسی خودکار نظام کے تحت اپنی موت آپ ہی مر جاتا ہے۔

"دیوارے دیوا...... گوری ماں...... تیرے کو ادھر سے باہر نکال کر، ادھر کمو (خود) رانی کے ماتک (طرح) بیٹھی عیش کرتی ہے رے وہ۔" آج بڑے دن بعد نرملا کی ممبئی آمد ہوئی تھی کہ اسے اور اس کے پتی کو سولہ پور کی کسی مل میں کام مل گیا تھا۔

وہ قمر بلڈنگ گئی تو وہاں سے بابو جی کا معلوم پڑا اور محلے ہی میں بسے کسی سے ہمارا بھی...... سو یوں اب وہ یہاں موجود تھی۔ پہلے تو آتے ہی ماں کے گلے لگ کر بابو جی کے غم میں آنسو بہائے جب اچھی طرح دل ہلکا کر چکی تب ہماری دگرگوں حالت کی جانب نظر گئی تو بس...... ضبط نہ کر سکی......

غم و غصے کی ملی جلی کیفیت کے زیر اثر پھٹ پڑی۔.....اور ماں تو جیسے یہ سن کر مارے صدمے کے اپنی جگہ گنگ سی بیٹھی رہ گئیں۔ تب مجھے ماں کی بے ریا آنکھوں میں تحیر اور معصوم چہرے پر پھیلا کرب دیکھ کر بے حد رنج ہوا کہ کیا تھا اگر جو یہ "راز" ہمارے لیے راز ہی رہتا۔

ماسٹر صاحب کے جیتے پرونے کا کام کہیں سے لا کر دینے پر بھی قل ہی تو وہ مجھے کچھ مطمئن سی لگی تھیں۔ وگرنہ بابو جی کے بعد سے تو وہ ذہنی وجسمانی طور پر اس قدر منتشر و مضمحل ہو گئی تھیں کہ لاچاری سے گھٹنوں ایک ہی زاویے سے بیٹھی روتی رہتیں۔ منو اور گڈو کے پکارنے پر بھی متوجہ نہ ہوا کرتیں۔ تب ہی جیسے تیسے منو اور گڈو کے ساتھ ساتھ چولہا چوکی بھی سنبھال رہی تھی۔ اس کے علاوہ اسکول بھی۔

اسکول میں امتحان اگلے ماہ سے شروع ہونا تھیں۔ مجھے ان کی بھی فکر تھی اور اس تین روپے ماہوار کی ٹیوشن کی بھی جو ماسٹر صاحب ہی نے اپنے کسی جاننے والوں کے ہاں مدن پورہ میں بلوائی تھی۔ مجھے تو گھر سے اسکول اور اسکول سے گھر تک ہی کا راستہ معلوم تھا۔ اور اب اس زندگی نے کیسے کیسے پرخار راستوں پر مجھے برہنہ پاؤں دوڑانے کی ٹھان لی تھی۔

"تو سچ کہہ رہی ہے؟" ماں نے کچھ دیر توقف کے بعد اسی افسردگی سے پوچھا جو یہ اطلاع پا کر اس سے میں خود بھی محسوس کر رہی تھی۔ "تو کیا قمر بلڈنگ بکی نہیں؟"

"اے گوری ماں..... جھوٹ کائے کو بولے گی میں۔" زملا برا مان کر بولی۔

"تیرے کو اگر اپن کی بات کا بھروسہ نہیں تو جا کر خود دیکھ لے ادھر۔"

"جہاں سے ہمیں رات کے اندھیرے میں بے رحمی سے دھکے دے کر نکالا گیا وہاں جا کر اب ہمیں کچھ نہیں دیکھنا۔" میں طیش میں آ کر ماں سے پہلے بول پڑی۔

"اور بائی آئندہ یہاں آ ؤ تو قمر بلڈنگ کا کوئی ذکر نہ نکالنا کیوں کہ اب جو ہے یہی ہے۔" میرے لہجے میں بڑی کاٹ دار خود اذیتی تھی۔ ماں نے اپنی جابجا چھیدوں سے چھنی میلی سی اوڑھنی آنکھوں پر رکھی اور رونا شروع کر دیا۔

"ایسے کیسے؟" زملا تڑپ ہی تو گئی۔ "ادھر نہ تم کو چھت ہے نہ درواجہ (دروازہ) اور ادھر (قمر بلڈنگ) میں رہنے کا تم لوگ کا برابر حق ہے اے۔" وہ ہماری ہمدردی میں مجھے سمجھانے لگی۔

"ہاں حق ہے۔" میں نے کہا۔ "تب ہی تو بڑی ماں نے بڑی ہوشیاری سے ہمیں گھر سے نکال باہر کیا۔ جانتی تھیں نا کہ ماں کے آگے پیچھے کوئی نہیں..... حق کیا مانگنے آئے گی یہ۔" گھر سے نکالے جانے کا تذلیل آمیز وقت یاد کر کے میری کنپٹیاں سلگنے لگیں۔

"ہوتا میرا ابھی اگر کوئی تو دیکھتی آپا کیسے کرتیں ظلم میرے بچوں کے ساتھ۔" ماں اونچا اونچا رو رہی تھیں۔

ماں کی آواز سن کر چارپائی پر گرمی سے بے حال پڑا گڈو بھی اٹھ کر جا چکا تھا۔ بلکہ منو جو اپنے مٹی کے کھلونوں کی دوکان سجائے گلی کے ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ ایک نظر ہماری طرف دیکھ کر دوبارہ اپنے کھیل میں مگن ہو گیا۔

"کائے کو روتی تو گوری ماں۔" زملا نے ایک جھٹکے روتے ہوئے گڈو کو اٹھا کندھے سے لگا کر تھپکتے ہوئے کہا۔

"چل گولی مار آئی کو۔ ابھی میں ہے نا..... میں بولتی ہے نا سورج کو ادھر چھیڑ ڈالنے کو۔"

"نہیں باقی رہنے دو۔" میں نے ایک دم ہی اسے جھڑک دیا۔ "میں کرلوں گی کچھ نہ کچھ بندوبست۔"

☆☆☆

مختلف مواقعوں پر ملنے والے گیارہ عدد گولڈ میڈلز..... سولہ ٹرافیاں..... تقریری مقابلے میں ضلعی

سطح پر اول آنے پر باؤجی کی جانب سے ملنے والی سونے کی بالیاں اور دائیں آنکھ سے باوجود ضبط کے نکلنے والا واحد سرکش آنسو...... یہ اس کی چھت کی قیمت تھی کہ جس کے نیچے بیٹھی میں آج بہت دن بعد جیسے خود کو کس قدر مامون محسوس کر رہی تھی۔

ٹاٹ کے پردے کی جگہ اب لکڑی کا چور بازار سے خریدا گیا دروازہ نصب تھا۔ آج بڑے دن بعد جب کھولی میں استعمال شدہ اسٹینڈ فین کی گھر گھر گونجی تو مجھے میرے بابل کا گھر یاد آ گیا۔ ساتھ ہی مالا کے کمرے میں موجود کوٹھری بھی جسے بس کچھ ہی دن قبل میں نے اپنے حساب سے آراستہ کر کے اپنے مطالعے کے کمرے کی صورت دی تھی۔

وہاں چھوٹا سا پلنگ بھی لگایا تھا اور سرہانے دیوار پہ پنکھا بھی...... بس مجھے کی کمی تھی میرے لیے سانسوں میرے کی طور کم نہ تھی...... کہ اسی آواز کی بدولت تو میرا رابطہ باہر کی دنیا سے کٹ جایا کرتا تھا تب ہی میں پورے انہماک سے مطالعہ کر پاتی تھی...... اور جب رات کو اس نرم بستر پر لیٹ کر میں عادتاً اپنا کوئی من پسند ناول پڑھا کرتی تو ماتو خود کو اس لمحے میں دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھا کرتی تھی کہ میری شربتی آنکھوں میں اترنے والے سارے خواب تب تک سلامت تھے اور اب......

سات بائی دس کی اس خستہ حال کھولی کے ایک کونے میں ناہموار زمین کے اوپر گرد و غبار سے اٹی ہوئی دری بچھا کر جب میں پلکیں موندنے کی کوشش کرتی ہوں تو آنکھ رات بھر نندیا کی راہ تکتی ہے ایسے میں خواب کیا بنے گی؟

مجھے میری جنت سے بے دخل کر کے آپ نے اچھا نہیں کیا بڑی ماں...... اب میرے پیروں تلے انگارے ہیں اور نشان منزل دور دور تک نہیں......

جا بڑی ماں...... آپ کو خدا رکھے۔

☆☆☆

"بی۔ ایم۔ سی (ممبئی میونسپل کارپوریشن) میں نوکریاں نکلی ہیں، میں یہ فارم لے آیا ہوں۔ اچھی بیبیوں کی طرح دیر کیے بغیر بھر کر مجھے لوٹا دو۔"

ماسٹر صاحب خاکی رنگ کا فارم مجھے تھماتے ہوئے اپنائیت آمیز رعب سے بولے اور کھولی کی دائیں دیوار کے ساتھ لگی بان کی ڈھیلی چارپائی کے ٹھیک برابر دھرے تین پایوں والے اسٹول کی ادھڑی گدی پر جا بیٹھے...... اور منو، گڈو کو دودھ والی مٹھی ٹافیاں تھما کر گدگدانے لگے تو گھٹن زدہ کھولی میں ابھرتے منو اور گڈو کے معصومیت سے لبریز قہقہوں نے احساس دلایا کہ روحانی اذیت سے معمور جسمانی محنت و مشقت سے عبارت دو برس گزر چکے ہیں جو لگتا تھا کہ کبھی نہ گزریں گے۔

ذہنی پراگندگی کے باوجود میں نے میٹرک امتیازی نمبروں سے پاس کر لیا تھا اور اب میں مہاراشٹر کالج آف آرٹس اینڈ سائنس میں سال اول کی طالبہ تھی۔ قمر بند تک میں گزری شاہانہ زندگی تو اب خواب و خیال ہی کی بات تھی۔ بہر حال جو میسر تھی وہ اب بری نہ لگتی تھی یا بری ہوگی پر مجھے ہی محسوس نہ ہوتی تھی۔

"مجھ جیسی میٹرک پاس کو سرکار نوکر کیوں رکھنے لگی؟" میں نے فارم پر سرسری سی نظر ڈال کر ایک طرف ڈالتے ہوئے بیزاری سے کہا۔ اور اٹھ کر ایک کونے میں پڑے مٹی کے تیل والے چولہے کے پاس آ بیٹھی تاکہ چائے کا پانی چڑھا سکوں۔

"دیکھ رہی ہیں نوری ماں۔" وہ ماں کو مخاطب کر کے سخت خفگی سے بولے کہ انہیں میرے لہجے میں رقصاں مایوسی شدید ناگوار گزری تھی۔

"ایک تو میں اتنی مارا ماری کے بعد یہ فارم لے کر آیا ہوں اور یہ بجائے میری بات ماننے کے الٹا مجھ سے بحث بحثی پر اتر آئی ہے۔"

"اے تو کس لیے چخ چخ کر رہی ہے میرے بچے کے ساتھ؟" ماں کے لہجے پر بعض اوقات (Hience) ہنیس کا رنگ حاوی ہو جاتا تھا۔

"چخ چخ نہیں کر رہی۔ صرف ایک سوال پوچھا تھا۔" میں نے چولہے کے پاس چڑھے سلور کے تھمر

سے تھیلے میں سے چائے کی پتی برآمد کرتے ہوئے مدھم لہجے میں کہا۔

"سوال انٹرویو پینل کرے گا۔ تم صرف جوابات کی تیاری کرو۔" وہ ترکی بہ ترکی بولے تو مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

"فارم ابھی بھرا نہیں اور آپ انٹرویو تک جا پہنچے۔"

"کیا کروں خوش امید ہوں...... اب تم جلدی سے چائے تیار کرنے کے بعد فارم بھر کر مجھے دو بلکہ یوں کرو کہ یہاں آ کر بیٹھو...... فارم بھی میں خود ہی بھروائے دیتا ہوں۔ تم بھی کیا یاد کرو گی کہ کس سخی سے پالا پڑا ہے۔"

☆☆☆

"آپ کو مراٹھی آتی ہے مس خان؟" بی ایم سی کی بلڈنگ میں جاری انٹرویو میں مراٹھی میں کیا جانے والا پہلا سوال تھا۔

فارم بھروا کر جمع کروانے سے لے کر انٹرویو کے لیے میرے منتخب ہو جانے پر اس کی شان دار تیاری کروا کر مجھے اس "کمرہ امتحان" تک پہنچانے میں ماسٹر صاحب کی مجھ پر کی جانے والی محنت اور "میرے لیے" کی گئیں ماں کی بہت سی دعاؤں کا بڑا دخل تھا۔ تاحال سب کچھ بھلا ہی معلوم ہو رہا تھا مگر اس ایک سوال پر میں ذرا سی ذرا گھبرا سی گئی۔

"جی...... مجھے آتی ہے۔" میں نے زبان کی لڑکھڑاہٹ پر قابو پا کر جواب دیا۔

"گڈ...... بولنا آتی ہے تب پڑھنا بھی آتی ہوگی...... ذرا یہ پڑھ دیں۔" پینل کے ایک افسر نے "بمبئی" (اخبار) کا مراٹھی ایڈیشن میرے سامنے دھرتے ہوئے ایک شہ سرخی پر انگلی رکھ کر فرمائش کی۔

"آج پاکستان میں سیاسی جماعتوں پر عائد پابندی اٹھالی گئی......" میں نے اخبار کو غور سے دیکھتے ہوئے بنا اٹکے روانی سے خبر پڑھ دی جس پر انٹرویو پینل نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو خفیف سا اشارہ کیا۔

"مالنا کہاں ہے۔" تیسرے پینلسٹ جو نسبتاً جواں عمر تھے یکلخت کہیں سے مالنا برآمد کر کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"بھوتان میں۔" میرا جواب بے ساختہ تھا جس پر جملہ حاضرین کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ اس آخری سوال کے بعد انٹرویو ختم اور میرا انتظار شروع ہو گیا۔ اور ٹھیک ایک ماہ بعد ابھی جب میں انٹر کے پرچوں کی تیاری کر رہی تھی کہ ڈری سہمی تقدیر نے مجھے مسکرا کر دیکھا۔

یعنی B.M.C میری خدمات حاصل کر چکا تھا۔

☆☆☆

زندگی ایک دم بہت مصروف، تیز رفتار مگر بہت حسین ہو چکی تھی۔ سرکاری نوکری کا مل جانا بڑی بات تھی پر تعلیم تو ادھوری نہیں چھوڑی جا سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے کالج پرنسپل سے خصوصی اجازت نامہ حاصل کیا تھا۔ چوں کہ میں کالج کی ہونہار طالبہ ہونے کے علاوہ بزم اردو ادب کمیٹی کی روح رواں بھی تھی سو سب ہی نے اس مرحلے پر میرا بڑا ساتھ دیا۔

صبح پونے سات سے دس بجے تک کلاس لینے کے بعد بھاگم بھاگ کالج کے باہر سے بوری بندر وکٹوریہ ٹرمینل کے لیے بس لیتی۔ چونکہ اس زمانے میں وہاں ٹریفک کا نظام بہترین تھا سو ساڑھے دس تک دفتر پہنچ کر حاضری لگوا دیتی۔

ماسٹر صاحب خود بھی ڈاکیارڈ میں ملازم ہو گئے تھے۔ وہی اپنے ساتھ واپسی پر مجھے یہاں چھوڑ کر مدن پورہ چلے جاتے۔ میں انہیں اپنے لیے اس قدر کشٹ اٹھاتے دیکھ کر بہت شرمندہ ہو جاتی۔ کئی بار جی میں آیا کہ انہیں ٹوک کر کہہ دوں کہ آپ میرے لیے اس قدر تردد نہ کیا کریں مگر ہر بار یہی سوچ کر خاموش سی ہو جاتی کہ کہیں وہ برا محسوس نہ کریں کہ بہرحال وہ میرے محسن اور خیرخواہ تھے۔

اگر وہ نہ ہوتے تو شاید زندگی آج بھی کونے میں منہ دیے سسک رہی ہوتی۔ سو میں ان کے لیے

اپنے دل میں بہت احترام، احسان مندی اور تشکر کے جذبات محسوس کیا کرتی تھی۔ اور خود ان کے دل میں میرے لیے کیا تھا؟

☆☆☆

"آؤ کچھ دیر کو یہاں بیٹھ جائیں بانو......" اس روز ممبئی کا آسمان ابر آلود تھا۔ مجھے بیشور (بازار) سے چند ضروری اشیاء کی خریداری کرنی تھی۔ ابھی ہم واپسی کے سفر پر تھے کہ چشم زدن میں بوچھاڑ پڑنے لگی۔ چوں کہ موسم برسات کا تھا سو میرے پاس احتیاط کے پیش نظر گلابی پھول دار چھتری موجود تھی۔ جو ماسٹر صاحب نے میرے ہاتھ سے لے کر کھولی اور میرے سر پر تانے خود ساتھ ساتھ چلتے ہوئے چوپاٹی پر پہنچ کر عجب تھکے لہجے میں بولے۔

مجھے [illegible] حیران زدہ [illegible] سوالنگار سے بھی ساحل کے ساتھ [illegible] پر نسبتاً کم رش والی جگہ دیکھ کر [illegible] پر براجمان ہو گئے۔ [illegible] سڑک کے سامنے ساحل پر ایک قطار میں بڑے منظم طریقے سے بڑی دور تک ٹھیلے والے کھڑے دکھائی دیتے تھے۔ پاؤ بھاجی، ناریل پانی، [illegible] مکئی دانے، ڈھوکلہ، پانی پوری، بھیل پوری، مسالہ چائے، لیموں پانی وغیرہ...... کیا تھا جو یہاں دستیاب نہیں تھا؟

"بھیل پوری لادوں بانو......" انہوں نے مناسب فاصلے پر براجمان ہوتے ہوئے استفسار کیا۔

"نہ......" میں نے تاحد نگاہ پھیلے ممبئی کے گدلے سمندر پر نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ بوچھاڑ اب تھم چکی تھی پیلے بارڈر والی ہری سوتی ساڑھی چوں کہ اچھی خاصی بھیگ چکی تھی۔ سو نم ہوا میں مجھے سردی محسوس ہو رہی تھی۔

"ٹھنڈ محسوس ہو رہی ہے؟" وہ میرے سپید پڑتے تراشیدہ لبوں کو دیکھ کر تشویش سے بولے۔

"جی ہاں......"

"ٹھہرو...... میں کوئی بندوبست کرتا ہوں۔" وہ بولے اور میرے منع کرنے سے قبل اٹھ کر چل دیے۔ واپس لوٹے تو ہاتھوں میں گرما گرم بھاپ اڑاتی مسالہ چائے کے دو گلاس موجود تھے جس میں سے ایک ان کے کہے بغیر میں نے بلاتوقف تھام لیا کہ اب میری کپکپی چھوٹ رہی تھی۔ (کپکپی طاری ہوگئی تھی)۔

وہ مسکرا کر دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

"میں اس زندگی سے تھک چکا ہوں بانو۔" چند ثانیے بڑی بوجھل سی خاموشی سے چائے کے گھونٹ بھرنے کے بعد وہ دفعتاً بولے تو میں جو افق پر چھائے اودے، دلوں کا غروب آفتاب کے باعث نارنجی پڑتا رنگ دیکھنے میں منہمک تھی چونک گئی۔

"آپ اور تھک گئے...... کیسے بنا رہے ہیں؟" میں نے ہنس کر کہا تو وہ مزید سنجیدہ سے ہو گئے۔

"میں سچ کہتا ہوں بانو! گھر جاؤں تو لگتا ہے جیسے یہ تنہائی مجھے مار ڈالے گی۔"

"کچھ دن اعظم گڑھ رہ آئیں۔" میں نے اپنی سمجھ کے مطابق مشورہ دیا تو وہ پہلے تو خاصے جھنجلائے [illegible] محسوس ہوتا تھا جیسے [illegible] ہیں۔

"یہاں زندگی [illegible] آیا تھا [illegible] اب واپس جا کر کیا کروں گا۔"

"تو پھر شادی کرلیں...... [illegible] کا یہی واحد حل ہے۔" میں نے کہا اور ان کے خوب رو چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔

"شام ڈھلنے کو ہے۔" چند ثانیے کسی کش مکش کا شکار رہنے کے بعد بالآخر وہ بڑے تھکے تھکے انداز میں بولے۔

"آؤ تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔"

وہ اپنی چائے یوں ہی ادھوری چھوڑ کر عجیب ہی اضطراب کے عالم میں اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ہاں چلیے۔" میں تو اپنا گلاس کبھی کا خالی کر چکی تھی سو ساڑھی کا پلو کندھے پر اچھی طرح جما کر کھڑی ہو گئی۔ "یوں بھی گھٹنا سر پر سوار ہے۔ ماں پریشانی سے

راہ دیکھتی ہوں گی۔"

یوں ہم دونوں آگے بڑھ گئے پر وہ لمحہ جو ہماری زندگی میں وارد ہو کر بھی میسر نہ ہوا۔ وہ چائے کے ان دو گلاسوں کے درمیان ہمیشہ کے لیے کہیں پڑا رہ گیا۔

☆☆☆

"ہائے میری ماں...... کدھر کدھر رلی میں...... ہائے بھیا کیا تمہارے کو بھی میرا کھیال (خیال) تک نہ آیا......" رات پڑنے سے قبل ماسٹر صاحب مجھے وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گئے تھے۔ میں معمول کے مطابق روزانہ کا سودا سلف محلے کے بازار سے لیے جس دم گھر لوٹی۔ کھولی سے آتی ماں کی کرب ناک چیخوں نے میرا وجود ہلا کر رکھ دیا۔ نیم وا دروازے کے باہر کھڑی شبنم عقیلہ وغیرہ (ہمسائی) اندر جھانکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

میں انہیں ایک طرف کرتی، لڑکھڑاتے قدموں سے کھولی کے اندر داخل ہوئی اور پھر ایک دم جیسے اپنی جگہ منجمد ہو گئی۔ بکھرے بلیے والی ماں کسی اجنبی عورت کے سینے سے لگی دھاڑیں مار رہی تھیں۔ گڈو منو ایک کونے میں دبکے ہوئے تھے۔

"ماں جائی ہے تو...... خیال کیسے نہ آتا...... پر یہ کب پتا تھا کہ تو زندہ ہے؟" ہلکے کتھئی رنگ کے سادہ سے شلوار قمیص میں ملبوس وہ باریش اجنبی جو ماں کو گلے سے لگائے خود بھی ہچکیاں لے لے کر آنسو بہا رہے تھے بھرائی ہوئی آواز میں بولے تو میں لمحے کے ہزارویں حصے میں گویا خود بخود پہچان کے سارے مراحل طے کر گئی۔

"ماں کے بھیا؟" میرے لبوں سے بے یقینی میں ڈوبی سرسراتی آواز برآمد ہوئی۔ تو دونوں نے چونک کر بیک وقت پیچھے مڑ کر دیکھا۔

"ہاں بانو......" ماں فرط انبساط سے ہولے ہولے کپکپاتی ہوئی میرے اندازے کی تصدیق کرتی ہوئی بولیں۔ "میرے بھیا...... تیرے شہاب ماموں...... میرے کو ڈھونڈتے ہوئے آج ادھر آ ہی گئے۔"

"ما...... موں؟" اس لفظ کے ذائقے سے میری زبان اس قدر نامانوس تھی کہ دہراتے ہوئے لڑکھڑا سی گئی۔

"ہاں بھئی...... تمہارا ماموں۔" انہوں نے جو میرا حیران پریشان سا ردعمل دیکھا تو جیسے یقین دلانے کی خاطر، دو قدم آگے بڑھ کر میرے بے سائبان سر پر اپنا دست شفقت رکھ دیا۔

"اب میں آ گیا ہوں نا...... اب تمہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

☆☆☆

"شنو بھیا! آپا بھوری...... ملکی...... چھوٹے نانا اور کاکا...... سب کیسے ہیں بھیا؟" برس ہا برس سے اپنے خون کے رشتوں کو ترستی ماں نے اس رات شہاب ماموں کو واپس اندھیری اپنے اس دوست کے ہاں جانے ہی نہ دیا کہ جس کے توسط سے کب کے بچھڑے لہو کا یہ معجزاتی ملاپ ممکن ہوا تھا۔ دراصل مینا باجی جو چند ماہ قبل ہماری پڑوسن بنی ہوئی تھیں۔ وہ اشرف بھائی (ماموں کے دوست) کی ہمشیرہ بنی تھیں۔ رشتے داری کی بنا پر ظاہر ہے کہ ان کا وہاں آنا جانا رہتا تھا۔ اور یہ محض اتفاق نہیں بلکہ تقدیر کی کارستانی تھی جو آج وہ بے پورا آئے تھے اپنے دوست یعنی شہاب ماموں کے ہمراہ مینا باجی کے ہاں کسی کام کی غرض سے چلے آئے اور واپسی پر ماموں کی نگاہ کھولی کی باہری دیوار کے ساتھ بندھی رسی پہ سے سوکھے کپڑے اتارتی ماں پر گئی۔ اور کاتب تقدیر کا لکھا پورا ہوا۔

اب ماں اپنی جھلنگا چارپائی پر سامنے بیٹھے اپنے ماں جائے کے سفید پڑتے سر کو دیکھ کر آہیں بھرتے ہوئے بڑی بے قراری سے کرید کرید کر اپنے دیگر قرابت داروں کا احوال معلوم کر رہی تھیں۔

طاقچے میں دھرے دیے کی لو۔ رات کے ساتھ اپنا وجود کھو رہی تھی۔ منو اور گڈو تو کبھی کے نیچے بچھی سرخ و نیلی دھاری دار دری پر پڑ کر نندیا نگری کی سیر پر نکل چکے تھے۔ پر بے انتہا تھکاوٹ کے

باوجود میں تا حال بیدار تھی اور ماں اور ماموں کی گفتگو سن رہی تھی۔

"پانچ برس قبل چھوٹے نانا تو راہی عدم ہوئے اور باقی سب بفضل اللہ ٹھیک ہیں پر گوری..... میں دیکھ رہا ہوں تم ٹھیک نہیں..... تم بالکل بھی ٹھیک نہیں۔" ماموں تاسف سے بولے تو ماں نے ایک مرتبہ پھر دبی آواز سے رونا شروع کر دیا۔

"پر اپنا حق تمہیں یوں آسانی سے چھوڑنا نہیں چاہیے تھا۔" ماموں نے اگلی بات کی۔

"پاؤں تلے زمین تھی نہ سر پر آسمان۔" میں نے گلابی دوپٹے سے اپنی آنکھیں بے دردی سے رگڑتے ہوئے سر جھٹک کر کہا۔ "اس لمحے زیادہ ضروری اپنی بقا کی وہ جنگ تھی جو میں نے لڑی۔ ایسے میں ان جھمیلوں میں کون پڑتا؟"

"چھوڑو نا بھیا۔" ماں نے اچھی طرح رونے کے بعد ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"اب لکیر پیٹنے کا فائدہ بھی کیا ہے.....

میں جانتی ہوں اپنے بھائی کو..... وہ ہمارے کو ایک دھیلا بھی نہیں دے گی۔"

"ہمیں چاہیے بھی نہیں ان سے۔" میں تیز ہو کر بولی۔ ماموں نے ہولے سے مسکرا کر تائید اً سر ہلایا۔

"اچھی بات ہے۔ خودداری اچھی صفت ہے۔ اور پھر گوری کی بات اپنی جگہ درست کہ اب لکیر پیٹنے کا فائدہ بھی کیا ہے..... جو ہو گیا سو ہو گیا..... پر اب میرا مشورہ تم لوگوں کے لیے یہی ہے کہ چھوڑو ہندوستان..... اب وہاں چل کر ہمارے ساتھ رہو۔"

☆☆☆

"ماسٹر صاحب..... اب تم ہی کچھ سمجھاؤ اس اڑیل (بے وقوف) کو۔" ماں نے گڑ والی چائے کی گرما گرم پیالی اسٹول پر بیٹھے ماسٹر صاحب کے حوالے کرتے ہوئے خاصی جھلاہٹ آمیز خفگی سے کہا تو دو روز بعد اعظم گڑھ سے بس ابھی ابھی لوٹے ماسٹر صاحب نے چونک کر میری جانب استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"دراصل سمجھانے کی ضرورت مجھے نہیں..

ماں کو ہے، ماسٹر صاحب۔" دو روز کی مسلسل ضد نے مجھے زچ کر رکھا تھا۔ تاہم میں صبر کا دامن چھوڑے بغیر بہت تحمل سے بولی مگر اس پر بھی چارپائی پر اپنی سلائی لیے بیٹھی ماں بگڑ گئیں۔

"تو مجھے کیا سمجھانے کی اے بالو..... بچپن سے پل رہی ہوں میں اپنوں سے بچھڑ کر۔ اچھی طرح سمجھتی ہوں میں کہ انسان اپنے کھاندان کے بنا دو کوڑی کا بھی نہیں۔"

ماں کی دلیل میں وزن تھا۔ میں لاجواب ہو کر اداس نظروں سے کھولی کے بھاڑ کی طرح کھلے دروازے کے باہر محض نیکر میں ملبوس، قمیص سے بے نیاز منو، گڈو کو ان ہی کی طرح کے دیگر بچوں کے ساتھ کھیلتے دیکھنے لگی۔

"کیا بات ہے؟" ماسٹر صاحب نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے گمبھیرتا سے پوچھا۔ "کیا قم ہندوستان سے کوئی آیا تھا؟" انہوں نے قیاس آرائی کی۔

"ہاں بے بڑی؟" پہ آ کر ادھر جھانکنے کی۔" ماں تڑخ بولیں۔ "میرے بھیا آئے تھے..... پاکستان سے۔"

"اوہ..... پاکستان سے۔" وہ بھرپور انداز سے چونکے۔ "یعنی آپ کی دعائیں رنگ لے ہی آئیں گوری ماں..... یہ تو بہت مسرت کی بات ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولے کہ سارے حالات سے واقف ہی تھے۔

"ہاں..... ان کا آ جانا تو واقعی مسرت کی ہی بات ہے۔" میں نے بچوں سے نگاہ ہٹا کر ان کی جانب دیکھا۔ "پر ہمارا ادھر جانا میرے خیال سے کسی طور پر مناسب نہیں۔"

"کدھر جانا؟" وہ نا سمجھی سے مجھے دیکھنے لگے۔

"پاکستان۔" میں سر جھٹک کر ہولے سے بولی تو ماسٹر صاحب نے چائے کی پیالی ایک دم زمین پر رکھ دی۔

"پر تم لوگ پاکستان جانے ہی کیوں لگے؟" ان کے لہجے میں بڑی بے ساختہ ختم کی بے قراری عود آئی جو ماں محسوس کیے بنا خفگی سے بولیں۔

"کیا ماسٹر صاحب تم بھی...... جب میرا کھاندان ادھر ہے تو کیا میں نہیں جاؤں گی؟"

"پر گوری ماں آپ لوگ تو ادھر آرام سے ہیں اور پھر اب تو بانو کو سرکاری نوکری بھی مل گئی ہے۔" وہ متوحش سے ہو کر بے ربط سے جملے بولتے ہوئے ماں کو سمجھانے کی سعی لاحاصل کرنے لگے۔

"تم کو کون بولا کہ میں ادھر آرام سے ہوں۔" ماں نے ہاتھ میں موجود بلاؤز تہ پائی کرتے کرتے نیچے پٹخ دیا اور تیور کڑے کرلیے۔ "ارے پچھلی کے مانگ ترپتی ہوں میں اپنے ہوتے سوتوں کے واسطے، ساری جندگی تو ناسموں کے ہاتھ گھر گئی۔ تو کیا آخر میں بھی مجھے اپنوں کے قریب رہنا نصیب نہیں ہوگا۔"

"ماموں کی آپ کو وہاں بلانے کی دعوت سر آنکھوں پر...... مگر یہ اتنا سہل نہیں ہوگا ماں۔" میں عاجز آکر بولی تب ماں نے بلند آواز سے ایک دم رونا شروع کردیا میں نے بڑی بے بسی سے ماسٹر صاحب کی جانب دیکھا۔ فی الوقت معاملے کا حل چوں کہ ان کی سمجھ سے بھی باہر تھا۔ سو انہوں نے ایک سرد سی سانس کھینچی اور زندگی میں پہلی بار بنا سلام دعا اٹھ کر کھولی سے باہر نکلتے چلے گئے۔

ماں کے رونے میں شدت آگئی۔ اور میرا دل چاہا کہ میں اسی لمحے خود کو ختم ڈالوں مگر دل ناداں کی ہر خواہش پر لبیک بھی تو نہیں کہا جاسکتا۔

☆☆☆

"ماں کی کیفیت بالکل اس بچے کی مانند ہو چکی ہے کہ جس کا من پسند کھلونا اسے دور سے دکھا کر کہیں چھپا دیا گیا ہے...... سو اسی لیے ان کی سمجھ میں میری کوئی عقلی دلیل آ ہی نہیں رہی۔ ان حالات میں اب آپ ہی بتایئے کہ میں کروں تو کیا کروں؟"

اگلے روز معمول کے مطابق میں ماسٹر صاحب کے ہمراہ دفتر سے واپسی کے سفر پر تھی۔ تب ہی ماسٹر صاحب نے یہ موضوع نکال لیا۔

"تم جانا چاہتی ہو؟" ون نمبر لینڈ (بس) میں مناسب فاصلہ رکھ کر میرے برابر بیٹھے ماسٹر صاحب نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے استفسار کیا۔

"گندوا ابھی چھوٹا ہے۔ کل کو جب لڑکپن کی حدود میں داخل ہوگا تب میں اس کی تربیت کیسے کرسکوں گی۔ پر یہ بات بھی سچ ہے کہ انسان اگر اپنے لوگوں کے درمیان رہے تو اس کی حیثیت مضبوط رہتی ہے۔" میں خود نہیں جانتی کہ میرے ذہن میں اس سوچ نے کیسے جڑ پکڑی شاید بڑی ماں کو ہر وقت اپنے مائکے (میکے) پر اتراتے دیکھ کر۔

"یعنی تم خود کو ابھی غیروں کے درمیان تصور کرتی ہو؟" ماسٹر صاحب کے لہجے میں شکوہ در آیا۔

"نہیں نہیں...... بخدا یہ بات تو نہیں۔" میں جلدی سے بولی مباداوہ خفا نہ ہو جائیں۔

"آپ تو ہمارے اس برے وقت میں اپنوں سے بھی بڑھ کر ثابت ہوئے ہیں۔ مگر کون جانے یہ ساتھ کب تک ہے؟ کل کو آپ کی ذمہ داریاں بڑھیں گی۔ تب میں ہر بات کے لیے آپ کو پکاروں اچھی لگوں گی کیا؟" میرے ذہن میں جو تھا میں نے کہہ دیا یہ غور کیے بنا کہ وہ چپکے چپکے پراسرایت سے مسکرا رہے ہیں۔ میں اپنی کہہ کر خاموش ہوئی تو مجھے سمجھانے کی غرض سے بولے۔

"دیکھو بھئی بانو...... تم ابھی سے مستقبل کی فکر میں نہ پڑو...... جب وہ وقت آیا تب کی تب دیکھی جائے گی...... فی الحال بس تم اپنی پڑھائی اور نوکری پر توجہ مرکوز رکھو۔"

"اور ماں کی وہ پاکستان جانے کی ضد...... اس کا کیا کروں؟" میں ان کے بے فکرے انداز پر تھوڑا سا چڑ گئی۔

"چند روز کے لیے انہیں بھجوادو اپنے بھیا کے پاس...... وہاں رہ آئیں گی تو ان کی روح کو ذرا قرار آجائے گا۔"

☆☆☆

''اے میرے کھدا (خدا) یہ کیا ہو گیا رے.....
ہائے میرا کھوٹا نصیب.....اب میں اپنوں سے ملے بنا ادھر ہی مر جاؤں گی۔'' ماں نے اپنے فگار سینے پر دو ہتڑ مارتے ہوئے دہائی دی۔ اور میں ماں کی قلبی کیفیت کا اندازہ کرتے ہوئے افسردہ تو ضرور تھی مگر اس افسردگی سے کہیں زیادہ اس لیے فکر، پریشانی اور سراسیمگی محسوس کر رہی تھی۔

سو میں نے اپنے ہاتھ میں موجود ہٹاچی کے اس ٹرانسسٹر کی آواز بڑھادی جو انٹر پاس کرنے پر مجھے ماسٹر صاحب نے تحفتاً دیا تھا اور جو اس لمحے بڑی دردناک خبریں نشر کر رہا تھا۔ اس روز ماسٹر صاحب کا دیا مشورہ مجھے صائب محسوس ہوا تھا پر ماں کا تو حال یہ تھا کہ میری انگلی تھامے بنا ان کا اشوک پاڑہ (نزدیکی بازار) تک تو جانا محال تھا پھر بھلا وہ میرے بغیر پاکستان کیسے جا سکتی تھیں؟ لہٰذا اپنی جانب سے میں نے طے یہ کیا کہ اپنے سالانہ امتحانات کے بعد چند روز وہاں ہو آؤں کی بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ سو اسی خیال کے تحت میں نے ماسٹر صاحب کے ساتھ جا کر ویزے کی درخواست پاکستانی سفارت خانے میں جمع کروا دی۔ اور ماں ایک ایک دن اپنی انگلیوں پر گن گن کر گزارنے لگیں۔

ہماری درخواست کے جواب سے پہلے سن 71ء کا دسمبر آ گیا۔ اور ایک عام سے دن یہ دل دوز خبر جنگل کی آگ کی مانند پھیل گئی۔ پاک بھارت جنگ چھڑ چکی تھی۔ کیا معلوم فوجوں کے مابین یہ جنگیں کیوں چھڑ جاتی ہیں پر اتنا ضرور جانتی ہوں کہ روزانہ فکر معاش کی جنگ لڑتے پہلے ہی سے ادھ موئے عوام چاہے کسی بھی دیش کے کیوں نہ ہوں۔ ان کے لیے مہلک ہتھیاروں کے ساتھ لڑی جانے والی یہ جنگیں ایک خوف ناک خبر کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتیں۔

سو میرا بھی دل خبریں سنتے لمحے لرزاں تھا۔ اور پھر میری سمجھ میں تو یہ بھی نہیں آ رہا تھا کہ میں کس کی ہار اور کس کی جیت کی دعا مانگوں؟

☆☆☆

''مس خان...... یہ لیٹر آیا ہے آپ کا سعودی عرب سے۔'' بی ایم سی کی مخصوص وردی میں ملبوس چپراسی شندے میری میز پر نیلا لفافہ رکھ کر پلٹ گیا۔

چند روزہ جنگ بالآخر مشرقی پاکستان کی ہمیشہ کے لیے علیحدگی پر پہنچ کر ختم ہو گئی تھی۔ مسلم اکثریتی علاقے گہرے سوگ میں ڈوب گئے تھے۔ جہاں مخلوط آبادیاں تھیں وہاں دبے دبے سے فسادات پھوٹ پڑے تھے۔ آئے روز خبر ملتی کہ فلاں علاقے میں بوتلیں چل گئیں (یعنی کانچ کی خالی بوتلوں سے ایک دوسرے پر حملہ کر دیا گیا)۔

الغرض جنگ بظاہر تو ختم ہو گئی مگر اس کے اندرونی اثرات وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتے رہے۔ مسلمانانِ ہند اپنے آپ کو مکمل ہندوستانی سمجھنے اور ''سمجھانے'' کے باوجود عدم تحفظ کا شکار تھے۔ مگر ان سارے مسائل و مصائب کے باوجود زندگی اپنی مخصوص رفتار سے رواں دواں تھی۔ میں بھی اس وقت انگریز دور کی یادگار اونچی چھت کے بڑے بڑے گندمی رنگ کے پتھروں سے بنے اپنے دفتر میں موجود دفتری امور بڑی تندہی سے سر انجام دینے میں مصروف تھی۔ شندے کی آواز پر میں نے بے طرح چونک کر رجسٹر سے اپنا سر اٹھا کر دیکھا۔

''یہ سعودی عرب سے تجھے کس نے گھت (خط) بھیج دیا؟'' میری ساتھ والی میز پر میرے دفتر کی دو ساتھیوں میں سے ایک یعنی رما حیرت سے بولی تعلق روایتی مہاراشٹرین گھرانے سے تھا جب کہ ڈیزی کرسچن تھی۔ ہمارا یہ گروپ دفتر میں ''مہاراشٹر الکیتا'' کے نام سے مشہور تھا۔

''میں خود یہی سوچ رہی ہوں۔'' میں نے لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ کوئی ضمیر الدین صاحب تھے۔ میری حیرت دو چند ہو گئی۔ چوں کہ ہم تینوں کی میزیں ساتھ ہی لگی تھیں سو مارے تجسس کے ڈیزی بھی میری میز کے نزدیک آ کھڑی ہوئی۔

"اس کو تم کھولنا مانگتا۔" ہلکے نیلے اسکرٹ اور گلابی پھول دار بلاؤز میں ملبوس ملیح چہرے اور مخمور آنکھوں والی ڈیزی اپنے مخصوص شرارتی لہجے میں بولی۔

"ہاں بھئی...... ضرور کھولنا مانگتا......" میں نے مسکراتے ہوئے لفافہ چاک کیا اور میرے مسکراتے لب یکلخت باہم پیوست ہو گئے کہ کاپی کے سات صفحات پر مشتمل اردو میں لکھا یہ خط بنام ماں، شہاب ماموں کی طرف سے تھا جو کراچی سے انہوں نے بذریعہ سعودی عرب ادھر بھجوایا تھا کہ بظاہر ان دنوں ہم دو پڑوسی ممالک کے درمیان اب عوامی سطح پر خط وکتابت وغیرہ پر غیر معینہ مدت کے لیے پابندی لگ چکی تھی۔

"باتو...... سب کشل منگل تو ہے؟" رما نے میرے تاثرات دیکھتے ہوئے نرمی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے استفسار کیا۔ تو میں جو خط کی عبارت میں کھو کر ان دونوں کی موجودگی فراموش کر چکی تھی ایک دم چونک گئی۔

"آں...... ہاں......" میں نے ایک گہری سانس لے کر زبردستی مسکراتے ہوئے صفحات تہہ کر کے دوبارہ ملفوف کر دیے۔

"ماموں کا خط آیا ہے کراچی سے...... بے چارے ہماری خیریت جاننے کے لیے بے تاب ہیں۔"

"ہے رام......" رما جی بھر کر حیران پریشان ہو کر بولی۔ "ادھر کا کھت (خط) ادھر کیسے پہنچ گیا؟"

"یو ڈفر...... ادھر سے سعودی بھجوایا...... سعودی عرب سے ادھر کو آیا...... ابھی سب ایسے ایچ چلتا مانگتا۔" ڈیزی نے دائیں آنکھ دبا کر رازداری سے کہا اور وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی کہ واقعی ان دنوں یہاں سے بھی زیادہ تر بذریعہ سعودی عرب ہی خطوط پاکستان بھیجے جا رہے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ماموں کے اس خط نے مجھے ایک بے نام سی اداسی کے سمندر میں دھکیل دیا تھا۔

کمرے کے باہر سے سرگوڈے (باس) گزرے تھے۔ سو وہ دونوں ترنت اپنی اپنی نشست پر جا بیٹھیں۔ میں نے بھی خط پرس میں ڈالا اور دوبارہ کھاتا کھول کر اندراج کرنے لگی مگر اب میرے انداز میں وہ سابقہ پھرتی اور دلجمعی نہ تھی۔ نا جانے کیوں؟

☆☆☆

یوں ماں نے حالات کے آگے پسپائی اختیار کرتے ہوئے ماموں کے ماہ بہ ماہ موصول ہونے والے خطوط سے ناتا جوڑ لیا...... اور ماموں کا خط بھی کیا ہوتا تھا گویا وہاں کے رہن سہن کا دھندلا سا عکس، جسے اپنی تیزی سے بوڑھی ہوتی آنکھوں سے دیکھ کر ماں تڑپ تڑپ جاتی اور جواباً آہیں، سسکیاں بھرے نوحے مجھ سے ماموں کو لکھواتیں۔

ماں کے جذبات اور خواہشات سے پرے یہاں شب روز کی کہانی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ میں نے بمبئی یونیورسٹی میں بی اے آنرز میں داخلہ لے لیا۔ مجھے زندگی کے شانہ بشانہ دیکھ کر ماسٹر صاحب کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ تھا۔ مشکل چاہے کوئی بھی کیوں نہ ہو...... وہ میری مدد کے لیے ہمیشہ موجود تھے۔ اور ان دنوں میری ساری فکر اور پریشانی گڈو کو شہر کے کسی اعلا اسکول میں داخل کروانے کے حوالے سے تھی۔ میں چاہتی تھی کہ بابو جی کا وہ خواب جو زندگی نے مجھے پورا نہ کرنے دیا وہ اب گڈو شرمندہ تعبیر کرے۔ اس معاملے میں بھی ماسٹر صاحب نے گڈو کی "سینٹ میری اسکول" میں داخلے کے لیے اچھی تیاری کروانے سے لے کر داخلہ ہو جانے تک ہر مقام پر میری بڑی مدد کی۔ اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ میری زندگی سے اگر اس ایک شخص کو منہا کر دیا جائے تب میری زندگی کا رنگ کیا ہوگا؟

اور مقام افسوس تو یہ ہے کہ اس سوال کا جواب جاننے کی خاطر مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔

☆☆☆

"چھوٹی آپا؟"

اخراجات بہت بڑھ گئے تھے۔ اب خالی خولی تین سو اسی روپے ماہوار میں گزر بسر دشوار تھی۔ سو اسی لیے میں نے ماسٹر صاحب کے مشورے پر ان ہی کی ایک واقف کار انو بھا دیدی جو گھر بیٹھے شادی بیاہ کے کپڑے تیار کر کے بازار سے کہیں کم داموں فروخت کیا کرتی تھیں سے کپڑے لے کر دفتر، اور ماں جن بیگمات کے کپڑے سلائی کیا کرتی تھیں کو فروخت کرنا شروع کر دیے تھے۔

اس وقت بھی میں زرق برق کپڑوں، ساڑھیوں وغیرہ سے بھرا بڑا سا تھیلا لے کر اپنی کھولی کی جانب رواں دواں تھی۔ تب ہی دفعتاً عقب سے کسی نے مجھے پکارا۔ انداز تخاطب ایسا شناسا تھا کہ میں ٹھٹک کر پکارنے والے کی جانب گھومی۔ وہ ایک سترہ اٹھارہ برس کا خوش قامت سا نوجوان تھا جس نے کھلے پائنچوں کی سستی پتلون اور کالی پھول دار شرٹ زیب تن کر رکھی تھی۔ سانولے سے چہرے کے نقوش پھیکے مگر جاذب نظر تھے۔ جب کہ گھنگھریالے بالوں کا ایک چھوٹا سا گچھا اس کی کشادہ پیشانی کو چومتا تھا۔ بالکل بابو جی کی طرح!

نھے یہ تم ہو؟'' ہونا تو نہیں چاہیے تھا لیکن میں اسے دیکھ کر جذباتی ہو گئی۔

''واہ مان گئے چھوٹی آپا۔'' وہ چہکتے ہوئے بولا۔ ''یادداشت غضب کی ہے تمہاری۔ کیسے چہرے کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔''

''کیسے نہ پہچانتی؟'' میرا لہجہ افسردہ ہو گیا۔ ''بھلا اپنوں کے چہرے بھی بھلائے جا سکتے ہیں۔'' میں نے اسے جتایا جس پر وہ از خود کچھ خفیف سا ہو کر وضاحتی لہجے میں بولا۔

''ماں نے اچھا نہیں کیا تھا اس رات تم لوگ کے ساتھ، پر میں بے بس اور کمزور تھا چاہ کر بھی کچھ نہ کر پایا۔ پر اللہ کی قسم...... میں تم لوگ کا ٹھکانا برابر ڈھونڈتا رہا۔''

''تمہیں صفائی دینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔'' اس رات کے تذکرے پر میرے مندمل زخم پھر سے ہرے ہو گئے۔ تاہم میں اسے ٹوکتے ہوئے بولی کہ اس سارے قصے میں وہ تو قصوروار نہ تھا۔

''بس جو مقدر میں تھا اس کے ظہور کا بہانا بن گیا۔ میں کسی کو مورد الزام کیوں ٹھہراؤں۔''

''اللہ کی قسم آپا......'' وہ دانت نکوستے ہوئے اس قدر بے تکلفی سے بولا گویا فاصلے کبھی درمیان آئے ہی نہ ہوں۔ ''میرے کان ترس گئے تھے تمہاری یہ شدھ اردو سننے کے واسطے...... رہتی کہاں ہو؟ کیا گھر جا رہی ہو چلو میں بھی ساتھ ہی چلتا ہوں۔ پھر بندا اس بات کریں گے اپن لوگ۔'' اس کے لہجے میں محسوس کی جانے والی اپنائیت اور خلوص تھا چنانچہ میں اسے چاہ کر بھی انکار نہ کر سکی۔ اور یوں اس قریلڈنگ کہ جس کے دروازے ہم پر کبھی کے بند کر دیے گئے تھے، کا ایک دریچہ ہماری کھولی میں چپکے سے کھل گیا۔

☆☆☆

''بابو جی کی ہینڈی کرافٹ والی دکان تو کبھی کی ماموں ہڑپ کر گئے۔ رسوئی کا کھرچ (خرچ) محمد علی روڈ والی چوبی کے بھاڑے سے پورا پڑ جاتا تھا۔ پر ماں نے وہ راشدہ آپا کے نکھٹو شوہر کو دہیج (جہیز) میں دے ڈالی، اس طرح اب اپن لوگ اس سے بھی گئے۔''

نھا ماں کے استفسار پر اپنے ازلی لاپروا اور غیر سنجیدہ انداز سے بتانے لگا۔ ماں پہلی بار تو اسے میرے ساتھ گھر آتے دیکھ کر ٹھٹکی تھیں بعد ازاں ساتھ لپٹا کر رونے لگیں۔ اسے دیکھ کر یقیناً وہ بھی بابو جی کو یاد کر رہی تھیں۔ اب تو خیر وہ ہر دوسرے تیسرے روز ادھر ہی موجود ہوتا تھا۔ آتا گھنٹوں ادھر ادھر کی باتیں بگھارتا چلا جاتا۔

منو اور گڈو کے ساتھ کھیلتا۔ ایک آدھ بار سیر کی غرض سے انہیں اپنے ساتھ حاجی علی بھی لے گیا۔ ماں کے چھوٹے موٹے کام جیسے کہ تاگا (دھاگہ) لا کر دینا یا سلائی کے تیار کپڑے کہیں پہنچا آنا بھی اس انداز سے سرانجام دینے لگا گویا ہمیشہ ہی سے ہمارے گھر کا مکین ہو۔ کھلنڈرا سن موجی بھی تھا جس کہ علیحدہ

یعنی قمر بلڈنگ کے دیگر مکینوں سے یکسر مختلف المزاج......

''اللہ رے......'' ماں چولہے پر پتیلی دھرتے ہوئے رات کی ہنڈیا کی تیاری کررہی تھیں۔ بے ڈھنگے انداز سے پیاز کترتے ہوئے بے ساختہ بولیں۔ ''تو اب گھر کا کھرچ کیسے چلتا ہے تم لوگوں کا؟''

''قمر بلڈنگ کا نیچے والا مالا (فلور) بابوجی کے فالتو سامان سے کھالی (خالی) کرکے اسے بھاڑے پر دے دیا ہے۔ ماں نے۔'' لوڈو کی گوٹی چلتا ہوا مگن سے انداز میں بولا۔

''اور تم...... تم کیا کرتے ہو...... تمہیں بھی تو کچھ کرنا چاہیے نا۔'' میں نے ماں کے پاس سلائی کے لیے آئے ہوئے کرتے کے بٹن ٹانکتے ہوئے اسے سمجھانے کی غرض سے کہا۔ تو وہ ایک دم بڑی زور سے ہنس دیا۔ اور اس لمحے مجھے یوں لگا جیسے کھولی کے ناتواں و غیر محفوظ بے در و دیوار بھی اس کے ساتھ مل کر بے فکری سے ہنس پڑے ہوں کہ انہیں کہاں عادت تھی ایسے اونچے اونچے قہقہوں کی۔

''عشق کرتا ہوں اپنی روبینہ سے...... اور کیا کروں؟''

''ہیں؟'' میں نے اس کی بے باکی پر اسے تیہا گھورا۔

''یہ روبینہ کون ہے؟''

''تم کو یاد نہیں وہ قمر بلڈنگ کے باجو (برابر) میں رہنے والے حاجی صاحب۔'' اس نے لوڈو سے گردن اٹھا کر میرے چہرے کی جانب بڑے پیار سے مسکراتے ہوئے دیکھا۔

''ان کی چھوٹی بیٹی ہے روبینہ...... خدا کی قسم...... پتی بنائی زینت امان ہے۔ چاہے تو شرط لگالو۔''

''باؤلا ہے رے تو۔'' ماں نے پیاز ہنڈیا میں جھونکتے ہوئے سر جھٹکا۔ منو، گڈو کی آنکھیں پیاز کی جھاس سے جل رہی تھی۔ سو وہ کھیل ادھورا چھوڑ کر کھولی سے بھاگ گئے۔ میں نے بٹن ٹانک کر کرتا تہہ کرکے ایک جانب رکھ دیا اور پوری توجہ اور سنجیدگی سے اسے سمجھانے میں جت گئی۔

''دیکھو ننھے! یہ عمر ان عشق و عاشقی کے جھمیلوں میں پڑنے کے بجائے کچھ بننے کچھ کر گزرنے کی ہے۔ پھر اب تو بابوجی کی چھوٹی دوکان بھی تمہارے پاس نہیں۔''

''میرے کو پتا ہے سب۔'' وہ ایک بھرپور انگڑائی لے کر قدرے سنجیدگی سے بولا۔

''اسی لیے تو سالا دبئی کا ویزہ...... لگوا رہا ہوں...... وہاں جاکر کھوب (خوب) درہم کماؤں گا...... تب دیکھتا ہوں مجھے رشتہ دینے سے وہ حاجی صاحب کیسے انکار کرتا ہے۔'' وہ دائیں ہاتھ کا مکا بائیں ہتھیلی پر مارتا ہوا بڑے فلمی سے انداز میں بولا تو مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔

''ہنس لو...... تم بھی ہنس لو آپا۔'' وہ لہک کر بولا۔

''پر تیاری پوری رکھو ہوسکتا ہے میرا رشتہ لے کر روبینہ کے ہاں تمہارے کو جانا پڑے۔''

''دھت بے وقوف۔'' میں نے بڑی بہنوں والی شفقت سے اسے ڈپٹا۔ ''تم بھی بولتا رہتا ہے پگلا۔'' میں اس لمحے واقعی یہی سمجھی کہ وہ یقیناً از راہ مذاق یہ بات کرگیا ہے مگر نہیں۔ اس نے کوئی مذاق نہیں کیا تھا بلکہ مذاق تو تقدیر ہمارے ساتھ کرنے چلی تھی۔ بھیانک مذاق۔

☆☆☆

''قمر بلڈنگ والوں کو خبر ہے کہ ننھا تم لوگوں سے ملنے جلنے لگا ہے؟'' اس روز مہینے کا پہلا روی وار (اتوار) تھا اور میں نے یہ دن چند ماہ سے ماں، منو اور گڈو کے خیال سے ''یوم سیر و تفریح'' مقرر کررکھا تھا۔ کبھی کبھار ماسٹر صاحب بھی ہمارے ساتھ چل پڑتے تھے تو اس روز بھی ہم اپنا یوم سیر و تفریح منانے جوہو بیچ پر آئے ہوئے تھے سوئے اتفاق اس روز ماسٹر صاحب کے علاوہ ننھا بھی ہمارے ہمراہ تھا۔ ننھا

اس سے پتلون کے کھلے پائنچوں کو گھٹنوں تک چڑھائے منو اور گڈو کا ہاتھ پکڑے لہروں سے اٹکھیلیاں کرتا مجھے بڑا معصوم لگ رہا تھا۔ ماں برقعے کا نقاب گرائے بپھرے سمندر پر اپنی خاموش نگاہیں جمائے خلاف معمول خاموش سی بیٹھی ہوئی تھیں کہ تب ہی اچانک ماسٹر صاحب کو نا جانے کیا خیال گزرا جو وہ یہ سوال مجھ سے کر بیٹھے۔

"کبھی پوچھا نہیں اس سے۔" میں نے سرکش ہوا کے زور پر اپنے چہرے پر رقصاں ایک آوارہ لٹ کو بے دردی سے کان کے پیچھے اڑستے ہوئے مدھم مگر لاپرواہ سے لہجے میں جواباً کہا۔

"تو پوچھنا چاہیے تھا ناں تو...... کیا معلوم وہ لاعلم ہوں۔" ان کے نرم لہجے میں چھپا وہ کچھ جو میں سمجھ نہ سکی۔ کچھ نہیں پائی اور جب وقت نے سمجھایا بڑی دیر ہو چکی تھی۔

یہ ڈیڑھ دو ہفتے بعد کی بات ہے۔ ماسٹر صاحب گزشتہ دو چار روز سے اپنے کسی نجی کام کے سلسلے میں اعظم گڑھ گئے تھے۔ اور ما نواں دنوں دفتر سے گھر واپسی میرے لیے کافی دشوار ثابت ہو رہی تھی کیا اتنی دور کا سفر تن تنہا مجھے کرنے کی عادت نہ ہو سکی تھی۔ ماسٹر صاحب ہر جگہ ہر وقت ہر مقام پر میرا سایہ جو بنے رہتے تھے۔ بہرکیف اس روز چھٹی کے وقت دفتر کی عمارت سے جو میں باہر نکلی تو احاطے میں منتظر کھڑے ننھے کو دیکھ کر یکلخت چونک گئی۔

"ارے ننھے۔ تم یہاں، خیریت تو ہے ناں۔"

"ارے ہاں آپا...... سب کھیر (خیر) ہے" ہری شرٹ اور کستھی پتلون میں ملبوس ننھا جو نجانے کب سے میرا انتظار میں وہاں کھڑا تھا۔ میرے تشویش زدہ استفسار پر گویا۔ زبردستی مسکرا کر بولا۔

"وہ اصل میں میرا ویزا لگ گیا ہے نا دبئی کا۔"

"واہ ننھے...... یہ تو بڑی خوشی کی خبر سنائی تم نے۔" کوکہ تھکن سے میرا انگ انگ دکھ رہا تھا اور بی ایم سی کے دیگر کرمچاریوں کی طرح مجھے گھر واپس لوٹنے کی جلدی بھی تھی مگر میں پھر بھی درمیانی روش سے ہٹ کر ایک جانب احاطے کے جنگلے کے ساتھ کھڑی ہوئی بڑی بشاشت سے بولی کہ وہ بے چارہ جو اتنی دور سے مارے خوشی کے مجھے یہ خبر سنانے کی خاطر دوڑا چلا آیا ہے وہ کہیں کچھ محسوس نہ کرے۔ پھر کھبر (خبر) تو کھوشی (خوشی) کی ہے۔

"پر ایک لفڑا آ گیا ہے نا آپا۔" وہ منہ لٹکا کر بولا۔

"خدا خیر کرے ہوا کیا۔ کچھ بتاؤ تو سہی۔" گھبراہٹ کے مارے دل کو پنکھے لگ گئے۔

"وہ حاجی صاحب روبینہ کا نکاح کر رہا ہے۔ اپنے جیسے کسی کباڑیے کے ساتھ۔"

اس کی سوئی آنکھوں میں قہر آ ٹھہرا۔

"اچھا...... تو یہ معاملہ ہے۔" میں نے کچھ سمجھتے کچھ نا سمجھتے ہو سر ہلایا۔

"ہاں آپا!! اور تم جانتی ہو کہ روبینہ تو صرف میری ہے اس لیے میں یہ ہونے نہیں دوں گا۔" اس نے عادتاً دایاں مکا بائیں ہتھیلی پر بڑے فلمی انداز سے مارا مگر اس بار مجھے ہنسی نہ آسکی۔

"پر تو کرے گا کیا؟" مجھے پریشانی سی ہوئی۔

"لے کر جاؤں گا نا انہیں۔" وہ پراسراریت سے مسکرایا۔ "اپنے سسرال والوں کو منانے۔"

"میں ہرگز نہیں جاؤں گی ننھے۔" میں نے فی الفور انکار میں سر ہلایا۔

"بڑی ماں کے ہوتے ہوئے تمہارا مقدمہ لڑنے میرا وہاں جانا بے حد نامناسب بات ہے۔"

"ماں کو کیسے لے کر جاؤں وہاں...... میرے کو کیا باؤلا کتا کاٹ گیا ہے؟" وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا۔ "ماں سے تو وہ لوگ ویسے ہی بڑی کھار (خار) کھاتے ہیں۔"

"مگر ننھے...... اصولاً جانا تو انہیں چاہیے۔" میں نے بڑی بہن ہونے کے ناتے اسے سمجھانے کی غرض سے کہا۔

"ابے ہاں نا آپا...... رشتہ کرنے تو وہی جائیں گی۔" وہ بڑی ماں کے ذکر پر از حد بے زاری سے

بولا۔ ''پر پہلے تم تو جا کر انہیں اپنی ''وکیل صاحب'' والی باتوں سے چاروں کھانے (خانے) چت کر آؤ۔''

''پر ننھے ..... میں یہ نہیں کر سکوں گی۔'' مجھے اس کی ضد مشکل میں ڈال رہی تھی۔

''کیسے نہ کر سکوں گی یار......'' وہ دایاں ہاتھ نچا کر بولا۔

''سب یاد ہے مجھے کہ کیسے تم اپنی مشکل اردو میں کی جانے والی باتوں سے بابو جی کو یوں پٹا لیا کرتی تھیں۔'' اس نے داہاں ہاتھ پہلو میں رکھ کر بائیں ہاتھ سے چٹکی بجائی بالکل...... بالکل بابو جی کی طرح!

''کیا اپنے ننھے کے لیے اتنا بھی نہ کر سکو گی؟'' اس نے مجھے ہونقوں کی کیفیت میں دیکھ کر آخری وار کیا۔ اور یوں میری مزاحمت جو پہلے ہی بے دم تھی، مکمل بے جان ہو گئی۔

☆☆☆

''تو مان جاؤ گوری آپا! تمہاری منہ زور لڑکی نے یہ حرکت کر کے ہمارے بھیا کی عزت کو بٹا لگا دیا۔'' کھٹی شلوار اور قمیص میں ملبوس سفید دوپٹے کی بکل مارے، کانوں میں بڑے بڑے سونے کے بھاری بالے پہنے، ہماری کھولی میں ناک بھوں چڑھائے بیٹھی یہ رضیہ خاتون تھیں۔

بابو جی کی چچا زاد اور بڑی ماں کی خالہ زاد جنہیں اتنے برس تو کبھی ہماری اور پلٹ کر دیکھنے کی توفیق نہ ہوئی کہ ہم جیتے ہیں یا کہانی کبھی کی ختم ہو گئی لیکن آج وہ ادھر بیٹھ کر مجھے بڑے غصے اور حق سے باتیں سنا رہی تھیں کہ انہیں دراصل یہاں بھجوایا ہی اسی کام کے لیے گیا تھا اور ان ہی پر کیا موقوف...... ان دنوں تو لگتا تھا جیسے بمبئی میں موجود بڑی ماں کے سارے سگوں کو بس یہی ایک کام رہ گیا ہے۔ غلطی شاید میری ہی تھی بلکہ غلطی نہیں، بھیانک جرم جو اس روز میں ننھے کی باتوں میں آ کر کر گئی۔ روبینہ کے والد کو تو میں نے اپنا مدلل گفتگو سے ننھے کے لیے قائل کر لیا تھا اور اب سر پکڑے بیٹھی اسی سوچ میں گھری تھی کہ اس طوفان کو رخ بدلنے پر کیسے قائل کروں کہ جس کا رخ بڑی ماں نے دیدہ و دانستہ میری جانب موڑا تھا۔

''اور جو ننھا بھگا لے جاتا حاجی صاحب کی لڑکی کو...... تب تو آپ کے بھیا کی عزت کو چار چاند لگ جاتے۔'' اتنی دیر سے چپ چاپ ان کی بجھتی بری سنتے سنتے بالآخر میرے ضبط کا پیمانہ چھلک ہی پڑا۔

''دیکھو...... ! دیکھو کیسے کتر کتر زبان چلا رہی ہے میرے آگے۔'' سونے، چاندی میں لدی پھپھو کو بھتیجی کی آئینہ دکھانا آگ بگولا کر گیا۔

''میں کہے دیتی ہوں گوری آپا! کب تک اپنی لڑکی کی روٹیاں کھاؤ گی، بیاہ دو اسے...... کل کلاں کوئی چاند چڑھا دیا تو پھر جانا حاجی علی منتیں مانگنے۔'' پھپھو اپنی دو دھاری زبان کے جوہر دکھا کر بنا لڑے والی چائے پیے کبھی کی یہاں سے جا چکی تھیں۔ میں سر جھکائے سہمے ہوئے منو اور گڈو کو سینے سے لگائے سسک رہی تھی اور مسلسل اور بے تحاشا روتی ماں کی سوئی بس ایک ہی بات پر اٹک کر رہ گئی تھی۔

''ہاں ..... آخر میں کب تک اپنی لڑکی کی روٹیاں کھاؤں گی نا۔ ہاں میں کب تک۔''

☆☆☆

''غلطی برابر تمہاری ہے باوا!''

اب ماسٹر صاحب جلدی جلدی اعظم گڑھ جاتے تھے اور دو چار دن لگا کر واپس لوٹتے۔ اس روز جوں ہی واپس لوٹے، معمول کے مطابق چھٹی کے وقت مجھے لینے آن پہنچے۔ میں نے دیکھا مخصوص وردی میں ملبوس وہ پہلے سے کمزور ہو گئے تھے۔ آنکھوں کے گرد حلقے اور داڑھی ذرا بڑھی ہوئی تھی۔

میں اس منتشر الحالی کا سبب دریافت کرنا چاہتی تھی پر مجھ سے پہلے وہ میرے ستے ہوئے چہرے کا احوال پوچھ بیٹھے اور میں تو ان دنوں جیسے مجسم آنسو بنی ہوئی تھی، بس چھلک پڑی۔ وہ میری بکھری حالت دیکھ کر مجھے ساتھ لیے کھینچے چلے آئے۔ جب میں کتھارسس کر چکی تو اپنے ازلی مہربان ناصحانہ انداز

سے مجھے سمجھانے لگے۔
"تم میرے سمجھانے کے باوجود جذبات کی رو میں بہہ کر اس احمقانہ حرکت سے باز نہ رہ سکیں، اپنی بڑی ماں کے مزاج کی سختی اور حاکمانہ شخصیت سے تم واقف ہی تھیں۔ تب تم ان حالات میں ان سے اور کیا امید کر سکتی ہو۔"
"ان سے تو مجھے خیر کی کوئی امید پہلے تھی نہ اب ہے۔ مگر بات کچھ یوں ہے کہ ان مشکل حالات میں میرے لیے اصل امتحان تو میری اپنی ماں ثابت ہو رہی ہیں۔" میں نے ندامت، بے چارگی، کم مائیگی اور نجانے کون کون سے جذبے میں گھر کر اچھی طرح رو چکنے کے بعد اپنا منہ میلی سوتی ساڑی کے پلو سے رگڑتے ہوئے جھلاہٹ آمیز پریشانی سے کہا تو وہ جو بغور میری جانب دیکھ رہے تھے، دھیرے سے مسکرا دیے۔
"کیوں؟ اب انہیں کیا ہوا؟" اور ان کے اس سوال کا جواب میرے پاس موجود تھا۔ جو تیزی سے تاریک ہوتی شام کی ساری وحشت ناک سیاہی ان کی تابندہ آنکھوں میں بھر گیا تھا۔
☆☆☆
"ٹھیک ہی تو کہہ گئی ہے رضیہ...... میرے کو پیٹ بھر روٹی ملنے لگی تو میں بھول ہی گئی کہ لڑکی جوان ہو جائے تو اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی بھکر (فکر) کرتے ہیں۔ بے غیرتوں کے مانگ بیٹھ کر اس کی لائی نہیں کھاتے۔" ماں بڑے دل گرفتہ سے انداز میں ماسٹر صاحب سے مخاطب تھیں۔
وہ میری بات سن کر اس درجہ بوکھلائے کہ بڑتی رات کا لحاظ بھی نہ کیا اور فی الفور چائے خانے سے اٹھ کر سیدھا میرے ساتھ اماں کو سمجھانے کی خاطر ادھر چلے آئے۔ گدو تختے پر دھرے مٹی کے تیل کے ہنڈے کے عین نیچے کھردرے فرش پر اپنے اسکول کی کتابیں کھولے بیٹھا تھا۔ منو اس کی انگریزی نظموں کی باتصویر کتاب کھولے بڑے اشتیاق سے تصاویر دیکھنے میں محو تھا اور میں کبھی اماں کی جانب دیکھتی تھی، کبھی ان دونوں کی طرف......
"آپ کیوں ان بے تکی لوگوں کی دل خراش باتوں پر خواہ مخواہ کان دھر کر اپنا جینا دوبھر کر رہی ہیں گوری ماں! دو ماہ بعد بانو کے سالانہ پرچے ہیں۔ ایسے تو اس کے لیے بڑی مشکل کھڑی ہو جائے گی۔"
وہ اپنے من میں اٹھتے جوار بھاٹے کو بڑے کمال سے دبائے بظاہر بڑے تحمل انداز میں ماں کو سمجھانے کی سعی کرنے لگے۔
"مشکل تو اس نے کھود (خود) اپنے لیے کھڑی کی ہے، وہاں جا کر ماسٹر صاحب!" ماں ملول سے لہجے میں بولیں اور میری گردن مارے شرمندگی کے جھک گئی کہ درست ہی تو کہہ رہی تھیں وہ۔
"واقعی...... ٹھیک کہا آپ نے کہ مشکل تو خود اس نے اپنے لیے کھڑی کی ہے۔" وہ تائیداً سر ہلا کر گمبھیرتا سے بولے۔ "پر اس مشکل کا یہ واحد حل تو نہیں جو آپ سوچے بیٹھی ہیں۔"
"پھر اور کیا حل ہے اس کا ماسٹر صاحب! یہ آپ ہی میرے کو بتا دو۔" ماں یقیناً ان کی کج بحثی سے چڑ گئی تھیں۔
"پڑھنے دیں اسے۔" وہ ماں کا انداز محسوس کر کے چند ثانیے توقف کے بعد گویا ہوئے۔ "اور یہ موضوع ابھی نہ ہی چھیڑیں تو بہتر ہے۔"
"نہیں ماسٹر صاحب! نہیں......" ماں تڑپ کر بولیں۔ "میرے کو الٹی صلاح مت دو۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں۔ میرے سے لوگوں کے طعنے برداشت نہیں ہوتے۔ سمجھانا ہے تو اس کو سمجھاؤ کہ ماں کے حال پر رحم کھائے۔" ماں نے دونوں ہاتھ ماسٹر صاحب کے سامنے جوڑ دیے تو وہ بے بسی سے پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ مجھے ماں کی ہالک ہٹ پر بڑی زور کا غصہ آیا تھا۔ تب ہی سلگ کر بولی۔
"ہاں ٹھیک ہے۔ دیکھ لو میرے لیے رشتہ...... بیاہ کے لیے تیار ہوں میں۔ پر اتنا تو بتا دو کہ میرے بعد تم لوگ کرو گے کیا؟"
"اپن کی سر پر چھت ہے اور ہاتھ پیر

سلامت۔" ماں نے یقیناً میرے انداز پر غور کرنے کی ضرورت محسوس کیے بغیر محض الفاظ سننے پر اکتفا کیا تھا تب ہی قدرے پرسکون ہو کر نرم لہجے میں "میرے جد" کا لائحہ عمل بتانے لگیں۔

"کر لوں گی بخت بحدوری۔ پر تجھے اب اس گھر میں اور بٹھا کر نہیں رکھوں گی۔" ان کا لہجہ کٹیلا تھا۔ میں شدت سے پریشان ہوئی کہ تب ہی ماسٹر صاحب نے عجیب سے لہجے میں مخاطب ہو کر ایک عجیب بات کی۔

"آپ کا فیصلہ اٹل ہے تو پھر ٹھیک ہے گوری ماں! آپ مجھے اپنی فرزندی میں لیجیے۔"

☆☆☆

قلبی کہ پیدا شدہ است (دل جس سے مل گیا ہے)

[illegible] (تقدیر [illegible])

آج میرا [illegible] کا [illegible] پرچا تھا۔ جو حسب معمول اچھا ہو گیا تھا [illegible] میں [illegible] طلسم اداسی و [illegible] تھکے تھکے سے قدم اٹھاتی [illegible] سے باہر [illegible] صاحب کو اپنا منتظر پایا۔ میں ٹھٹک کر اپنی جگہ [illegible] نہ جانے کتنے روز بعد وہ آج یوں میرے [illegible] آئے تھے۔ بظاہر حلیہ درست تھا پر ہمیشہ جگمگانے والی زندہ دل آنکھیں آج بجھی ہوئی تھیں۔

خدا گواہ ہے کہ ان آنکھوں کا طلسم مجھ پر کبھی اثر انداز نہ ہوا تھا پر نہ جانے کیا بات تھی کہ میرا دل رک رک کر دھڑکنے لگا۔ ماں کے تازہ بہ تازہ پڑھائے گئے سارے اسباق یوں کہ مجھے ازبر تھے سو میں نے ان سے آنکھیں چرا کر آگے بڑھ جانا چاہا۔ پر بہت بے قرار سے لہجے میں عقب سے انہوں نے مجھے پکار لیا اور یہ جو اس بے نام سے تعلق کا جو ہمارے درمیان تھا۔ اسی بدبخت کی بنا پر میں ان کی پکار پر ٹھہر گئی۔

اور اب ان کے ساتھ ایرانی ہوٹل میں بیٹھی پس منظر میں سنائی دیتی اس غزل کے شعروں میں الجھی ہوئی تھی۔ وہ جو کافی دیر سے خاموش بیٹھے اداس نظروں سے میری جانب یک ٹک تکے جا رہے تھے، ایک دم بول پڑے۔

"کیا تم سے محبت میرا جرم ہے بانو؟"

"نہیں...... پر لوگ بنا دیں گے۔" میں ایسے کسی سوال کے لیے غالباً ذہنی طور پر تیار تھی چنانچہ بنا ہیجان میں مبتلا ہوئے تحمل سے بولی۔

"تمہیں لوگوں کی پروا کب سے ہونے لگی بانو!"

"جب سے ان کی زبانوں کا زہر چکھا ہے، تب سے۔"

"لوگوں کی فکر چھوڑ دو بانو! وہ کچھ دن بعد سب بھول بھال جائیں گے۔"

یہ کم بخت محبت...... کیسے اچھے خاصے انسان کی مت مار دیتی ہے۔ یہ سامنے بیٹھے شخص کو دیکھ کر آج مجھے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔

"ہاں، لوگ تو شاید بھول جائیں گے پر آپ کی منظر نظر میں موجود بیوی اور دو لڑکوں کے دل میں، میں ہمیشہ پھانس بن کر گڑی رہوں گی۔ نہ وہ کچھ بھولیں گے...... نہ بھولنے دیں گے۔" وہ تلخ ہونا تو نہ چاہتی تھی پر ہونا ضروری تھا کہ سارا مسئلہ اسی [illegible] کا تو تھا۔ ورنہ ماں کے نزدیک میرے لیے [illegible] تھا [illegible] سے ان کی جانب [illegible] اتنا شاف [illegible] تھا [illegible] سے چاہ [illegible] نہ تھا۔

سو ماں نے یہ جان کر کہ وہ [illegible] آج کے مطابق بچپن ہی سے ایک ناپسندیدہ بندھن میں بندھے ہوئے ہیں۔ انہیں میرا رشتہ دینے سے صاف انکار کر دیا تھا انہیں اپنی کہانی کا دہرائے جانا منظور نہ تھا۔ یہ اور بات کہ اس روز وہ ماسٹر صاحب کو انکار کر کے خود ساری رات سسکیاں لیتی رہی تھیں اور میں خود اپنی بے خبری پر حیران تھی، شاید خود سے وابستہ اتنی بڑی اور اہم بات چھپا کر رکھنے پر ان سے خفا بھی ہو جاتی مگر حالات ایک دم سے بہت مختلف ہو گئے تھے۔

اب میں ان سے خفا نہیں [illegible] ان کا ساتھ یوں اس طرح چھوٹ جانے پر رنجیدہ تھی۔ انہوں نے

ماں کو ہر طرح راضی کرنے کی کوشش کی مگر ماں کی نہ ہاں میں نہ بدلی۔ تب انہوں نے خود اپنا راستہ بدل لیا تھا۔ شاید دل کو نہ بدل سکے تب ہی تو آج یوں میرے مقابل موجود تھے۔

''ہاں تو میں کیوں انہیں بھلانے لگا۔ وہ میری ذمہ داری ہیں۔ لیکن میرے دل کی چاہت تم ہو بانو! میں نے جب قمر بلڈنگ کے صحن میں پہلی بار تمہیں دیکھا تو مجھے ایک پل کو یوں محسوس ہوا تھا کہ جیسے تم میرے ہی وجود کا کوئی گمشدہ حصہ ہو۔ کیا تمہیں میرے لیے بھی ایسا کوئی جذبہ محسوس نہیں ہوا؟''

ان کا بے خود لہجہ اور دیوانگی میرے لیے قطعاً انوکھی تھی۔ سو میں جو گنگ سی ہو کر انہیں سن رہی تھی' ان کے استفسار پر عالم خرد میں واپس پلٹی اور سنبھل کر گویا ہوئی۔

''میں جو جذبات اپنے دل میں آپ کے لیے محسوس کرتی ہوں ماسٹر صاحب! وہ بہت اعلا و ارفع ہیں۔ میں آپ کی مشکور ہوں۔ زیر بار ہوں۔ آپ کا احترام کرتی ہوں۔ قدر کرتی ہوں۔''

''اور محبت؟'' اپنی عادت کے برخلاف آج وہ میری بات کے اختتام سے قبل درمیان ہی میں بے قراری سے بول پڑے۔

''محبت میں صرف اپنی ماں اور بھائیوں سے کرتی ہوں ماسٹر صاحب! سو اگر آپ مجھ سے کسی بھی قسم کی کوئی امید لگائے بیٹھے ہیں تو معذرت۔''

میں نے ٹھنڈی ہوچکی چائے کی پیالی کے کنارے پر اضطراری انداز سے انگشت شہادت پھیرتے ہوئے خاصی شرمندگی سے سچائی بیان کی تو وہ جاں بلب شخص کی سی ہنسی ہنس دیے۔

''مجھے تم سے کوئی امید بھی تھی ہی نہیں بانو! ہاں، مگر خود ریزہ ریزہ بکھرا سا تھا۔ سو تقدیر نے آج یہ خوش فہمی بھی رفع کی۔''

''آپ ہی نے تو سکھایا تھا ماسٹر صاحب کہ زندگی گزارنے کا اصول بہت سادہ ہونا چاہیے۔ یہ جو دے اسے خوشی سے لے لو اور جس سے دور کرے

اس کے پیچھے نہ بھاگو۔''

مجھ سے ان کی خستہ حالی دیکھی نہ جاتی تھی، اسی لیے میں نے ان کی ڈھارس کی خاطر بروقت یاد آجانے والا ان ہی کا فلسفہ انہی کو کہہ سنایا اور ایک آخری بار دل کڑا کر کے ان کے خزاں رسیدہ چہرے کی جانب دیکھا اور بنا الوداع کہے وہاں سے اٹھ آئی۔ پیچھے مڑ کر نہ دیکھا کہ مجھے اپنے بکھرنے کا ڈر تھا۔ اس ٹوٹے ہوئے شخص کے بکھر جانے کا اندیشہ تھا۔

☆☆☆

آج بمبئی کی نم آلود فضا پر حبس طاری تھا اور میرے وجود پر بھی۔ رات کا نجانے کون سا پہر تھا۔ نیند آج بہت دن بعد میری نمناک آنکھوں سے روٹھی دور کھڑی مسلسل مجھے بڑی طنز آمیز نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

میں اپنی کھولی میں، دری پر چت لیٹی، آنکھوں پر بازو دھرے سوچ رہی تھی کہ کتاب زندگی کے اوراق پر رشتوں کے نام پر پہلے ہی خسارے درج تھے۔ آج اک اور کا اضافہ ہوا۔ تعلق بڑھتے ہیں تو خوشی لاتے ہیں اور جب ٹوٹ جائیں تو دل غم کی آماجگاہ بن جاتے ہیں اور میرا دل تو خیر پہلے ہی غم آشنا تھا۔ آج کے اس حبس زدہ دن تو لگتا ہے جیسے شدت رنج سے پھٹ ہی پڑے گا اور کیوں نہ پھٹتا۔ آج میں نے اپنا محسن، اپنا درد شریک، اپنا پیارا دوست اور ساتھی کھو دیا تھا۔

ہاں! جس سے میں چائے خانے سے ہو کر آئی میں جان گئی تھی کہ آج کے بعد وہ مجھے نہ ملیں گے کہ سودائی دل کے تقاضے اپنی جگہ پر وہ ایک وضع دار شخص تھے۔ اے کاش کہ ہمارا تعلق اس موڑ پر نہ آتا۔ اے کاش کہ آپ کو مجھ سے محبت نہ ہوئی ہوتی۔ اے کاش کہ......

اب تو ہزاروں کاش تھے اور میری آنکھ میں سینکڑوں آنسو...... باہر بمبئی بھیگنے لگا تھا اور اندر ہی اندر میں بھی۔

☆☆☆

''روبینہ بتائی میرے کو، کہا ماں لوگ نے تمہارے گھر پھپھی کو بھجوا کر بڑا الٹا کروا دیا۔ قسم سے آپا! بہت شرمندہ ہوں تم سے۔ ادھر ہوتا تو اماں کو سیدھا کر دیتا۔ اب ادھر بیٹھ کر کیا کروں۔ چٹھی لکھوں گا تو وہ ادھر اور بجھر کیں گی۔ ہو سکے تو اپنے ننھے کو معاف کر دینا۔ خالی پیلی میں میری وجہ سے تم تو آپ شتاب سے بول گئیں۔ تمہارا ننھا!''

دبئی سے میرے دفتر کے پتے پر ننھے کا خط آیا تھا۔ جو میں نے بے تاثر نگاہوں سے پڑھ کر ایک طرف ڈال دیا کہ اس کی معذرت بگڑی کو سنوار نہیں سکتی تھی اور قلم اٹھا کر اپنا کام کم اور غلطیاں زیادہ کرنے لگی۔ میں بھی کیا کرتی، دھیان کہیں مرکوز ہی نہیں ہو رہا تھا۔

''کل رات کیا ہوا؟'' ساتھ میز پر موجود رما نے جو مجھے رجسٹر چیک کر کے پلٹاتے دیکھ رہی تھی فکر مندی سے مخاطب ہوئی۔

''ساری رات کھولی کی چھت ٹپکتی رہی۔ ٹھیک سے سو نہیں سکی میں، بس اسی لیے تھکاوٹ ہو رہی ہے۔'' میں اسے اور کیا بتاتی سو اسی لیے بات بنادی۔

''بی ایم سی کے بہت سے کرم چاری گونڈی کے ایریا میں فلیٹ بک کروا رہے ہیں۔ تو بھی کروا لے۔ اچھا ہے، جان چھوٹ جائے گی تیری اس ایریا سے۔'' رما نے صلاح دی۔

''تیرا مشورہ مخلصانہ ہے پر میری آمدنی محدود ہے اور خرچے زیادہ...... کپڑے کا کام تو تو جانتی ہی ہے، کبھی چلتا ہے، کبھی نہیں۔'' میں اپنی دل گیر سوچوں کو ذہن سے جھٹک کر پوری سنجیدگی سے بولی۔

''تو اتنا بیوٹی فل ہے، پکچر میں کام کرنا کیوں نہیں مانگتا۔ ایگری کر تو اپن امار ابرار اور جونی سے بات کرلے؟'' ڈیزی بولی تو میں نے منہ بنا کر کہا۔

''تو پھر شروع ہو گئی؟'' ہفتے میں ایک بار اسے اس بات کا دورہ ضرور پڑتا تھا۔

''ویسے ایک بات تو بتا...... کیا پکچر میں کام ملنا اتنا ہی آسان ہے؟''

''امار ابرار اور جونی ٹیلنٹ ہنٹر ہے بے بی! اس کا بڑا سورس ہے، اپنی ہندی فلم انڈسٹری میں۔'' اپنے شرٹ کے کالر اکڑا کر بڑ بولے سے انداز میں بولی تو میں ڈھیر سے ہنس پڑی۔

''ضرور ہو گی، میں نے کب انکار کیا۔ پر مجھے اس لائن سے کوئی دل چسپی نہیں اور ویسے بھی میری ماں تو ان دنوں میرے لیے بر تلاش کر رہی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ بس میں کسی طرح ٹھکانے لگ جاؤں۔''

''چل یہ بھی اچھا ہی ہے پر تیرے بعد وہ کیا کریں گی؟'' رما نے پوچھا۔

میں چپ کی چپ رہ گئی کہ ماں سے یہی سوال تو میرا بھی تھا۔

☆☆☆

''اماں! آپ سمجھتی کیوں نہیں...... نہیں کرنا مجھے کوئی بیاہ ویاہ۔''

ماں کی پڑوسن نیکی رفعت آرا کے توسط سے آج رات گھر کچھ لوگ میرے لیے آرہے تھے۔ اس سے قبل ہی میں انواع و اقسام کے چار پانچ ''پیغاموں'' کو بھگتا کر بے حد عاجز آ چکی ہوئی تھی اور ماں تھیں کہ ہاتھ دھو کے پیچھے پڑی ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا، جیسے ان پر کسی نے لڑکی بیاہنے کا سحر پھونکا ہے (جادو کر دیا ہے)۔

''بی اے کر لیا۔ اب بھی بیاہ نہیں کرے گی...... تو کیا ساری جندگی یوں ہی لنڈوری پھرے گی۔'' ماں نے آنے والوں کی خاطر مدارت کے لیے سوجی کا حلوہ بھونتے ہوئے جلبلا کر مجھے لتاڑا۔

''پر بیاہ کرنے کی پڑی ہی کیا ہے مجھے۔'' میں نے ماں کی چارپائی پر پھیلے سلائی کے کپڑے سمیٹتے ہوئے جھنجلاہٹ آمیز غیض سے کہا تو ماں کڑاہی میں چمچ رکھ کر بغور میری جانب دیکھ کر اندیشوں سے پُر آواز میں بولیں۔

''میری طرف دیکھ بانو! کہیں تو نے ماسٹر صاحب کا کھیل دل سے تو نہیں لگالیا؟'' ماسٹر

صاحب کے ذکر پر میرے تیزی سے کھولی سمیٹتے ہاتھ یک لخت ٹھہر گئے۔

دل میں کہیں خالی پن کا احساس بھی جاگا پر دوسرے ہی پل میں خود کو سنبھال کر ماں کا اندیشہ زائل کرنے کے خیال سے بولی۔

''میرے انکار کی وجہ وہ نہیں ہیں۔ اگر ہوتے تو نوبت یہاں تک آتی ہی نہیں۔'' میرا اشارہ بلا مبالغہ ایک دن چھوڑ کر متواتر آنے والے بھانت بھانت کے لوگوں کی جانب تھا۔

''پھر کیا وجہ ہے تیرے انکار کی۔ میرے کو وہ بتا دے۔'' وہ کاٹ دار لہجے میں سوال کر کے میری جانب سے رخ موڑ کر تیزی سے ہاتھ چلا کر سوجی بھونے میں مصروف ہو گئیں۔

''ماں... جانتی ہیں باؤجی نے مجھ سے آخری بار کیا کہا تھا؟'' میں نے شدید رنگ برنگے کپڑوں کے ڈھیر کو سلیقے سے چارپائی کی پائنتی کے ساتھ دھرے صندوقچے پر رکھتی ہوئی بڑے دل گیر لہجے میں گویا ہوئی۔

ماں کی توجہ ہنوز سوجی بھونے کی جانب تھی پر انداز بتاتا تھا، اسی جانب متوجہ ہیں۔

''میں اس روز آپ لوگوں کے ساتھ پکچر دیکھنے جانا نہیں چاہتی تھی، پر باؤجی نے مجھے کہا کہ جاؤ بانو! اپنی ماں کے ساتھ جاؤ۔ وہ بے چاری تن تنہا تمہارے دونوں چھوٹے بھائیوں کو کیسے سنبھالے گی۔ میں کیا جانوں کہ انہوں نے یہ الفاظ کس احساس کے تحت کہے ماں۔ پر اتنا ضرور جانتی ہوں کہ وہ لفظ نہیں زنجیر ہیں، جو آج تک مجھے جکڑے ہوئے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں، میں آپ لوگوں کو چھوڑ کر جاؤں بھی تو کیسے جاؤں؟''

''بولا تو ہے کہ مت کر ہماری فکر۔'' روتی ہوئی ماں نے کڑاہی چولہے پر پٹخ کر ڈھکن ڈھکتے ہوئے چلا کر کہا۔ ''کر لیں گے اپن کچھ نہ کچھ۔ اب ساڑھی بدل اور رفعت کے ہاں سے بلا کر لا منو اور گڈو کو۔ تو میں ان کے بھی کپڑے بدلوا دوں۔ دھوپ ڈھل رہی ہے، آتے ہی ہوں گے، وہ لوگ۔''

یعنی میرا کچھ بھی کہنا سننا رائیگاں ہی گیا تھا۔ میں نے ایک شکستہ سانس لی اور کھولی کی شرقی دیوار کے ساتھ ڈوری سے باندھے گئے پردے کے پیچھے ساڑھی بدلنے چل دی۔

☆☆☆

''مکن لیوں کھولو کر اللہ میاں کی گائے ہے میرا لڑکا۔ یہ آج کل کے چھوکروں جیسی چالاکی اور تیزی اس میں نام کو بھی نہیں۔''

میرے ہونے والے سسر صاحب نے بطور خاص ان کے لیے تیکھے مسالے لگا کر تلی گئی مچھلی سے بھرپور انصاف کرنے کے دوران اپنے لڑکے کے بارے میں ایک مرتبہ پھر وہی بات بتائی جو وہ ہر ملاقات میں بتانا غالباً اپنا فرض تصور کرتے تھے۔ پیشے کے اعتبار سے ''ناکام شاعر'' تھے۔ اپنی ایک ناکامی جبکہ دو کنواری لڑکیوں کی ذمہ داری بڑے بیٹے یعنی وہ موصوف کہ جن کے لیے وہ اس روز آ کر مجھے سند قبولیت بخش گئے تھے، پر ڈال کر خود اپنی دوسری زوجہ اور تین چھوٹے بچوں کے ہمراہ علیحدہ گھر میں رہتے تھے۔

بیٹا ان کا کتابوں کی کسی دکان پر ملازم تھا۔ ماں کو انہوں نے تصویر دکھا دی تھی۔ رفعت آپا کے شوہر جا کر اس سے مل بھی آئے تھے۔ سو رشتہ پکا کر دیا گیا اور سسر صاحب کی ہر ہفتے ہمارے ہاں آرک جارک (آنا جانا) شروع ہو گئی۔ ان کی مدارت پر اچھی خاصی رقم اٹھ جاتی۔ میں نے ماں کے سامنے احتجاج کیا مگر بے سود۔

آج بھی میں رہا سے کچھ روپے ادھار لے کر ان کی خاطر یہ رہو مچھلی لے کر آئی تھی کہ موصوف گزشتہ ہفتے فرمائش کر گئے تھے۔

''یہ تو برابر بولے بھائی صاحب! آپ۔'' نماز کے انداز سے سفید دوپٹا لپیٹے سسر صاحب کے مقابل نیچے دری پر بیٹھی ماں جیسے داماد کے گن جان کر بے اندازہ مسرور ہوتے ہوئے بولیں۔

"میرے کو بتایا تھا شمشاد (رفعت آپا کے میاں) نے کہ لڑکا بہت شرمیلا اور سادہ سا ہے۔ اب دیکھونا۔ میری بانو بھی تو ایسی ہی ہے۔"

ماں کے بیان پر میں جو چولہے کے سامنے پیڑھی پر بیٹھی تھی، پہلو بدل کر رہ گئی۔

"سادہ ہے تب ہی تو باپ کی پسند پر سر جھکا دیا۔ ہوتا کوئی اور تو لڑکی دیکھنے کی ضد کرتا۔ بھلا آج کے دور میں ملے گا کوئی آپ کو اتنا سیدھا سادا کہ بہنیں جو پہننے کو دیتی ہیں، وہی پہن لیتا ہے۔ جو کھلاتی ہیں، راضی خوشی کھا لیتا ہے۔ ایسا ہی درویش صفت ہے میرا منو۔"

انگلیاں چاٹتے ہوئے ان کی زبان ایک مرتبہ پھر اپنے منو کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے میں مصروف ہو چکی تھی کہ جسے سن کر میرے من کی بے چینی حد سے سوا ہوئی جاتی تھی، تب ہی اچانک بلاارادہ میں ایک دم بول پڑی۔

"میں بیاہ کے بعد نوکری نہیں چھوڑ سکوں گی۔"

ماں جو کپڑے کے لال چیک دار دستر خوان سے خالی برتن سمیٹ رہی تھیں۔ میری غیر متوقع بات پر بوکھلا کر مجھے دیکھا۔

"اے...... یہ کیا بول رہی ہے تو......" انہوں نے متوحش ہو کر مجھے ٹوکا۔ سسر صاحب مسالے سے سنے ہوئے ہاتھ دستر خوان سے پونچھتے ہوئے سر ہلا کر خاصے اطمینان سے گویا ہوئے۔

"ہاں تو بیٹی مت چھوڑیو نوکری...... یوں بھی تجھے کہہ کون رہا ہے؟"

ان کے حوصلہ افزا رویے نے میرے بے قرار دل کو قدرے مطمئن کر دیا تھا۔

تب ہی میں اس عرصے میں پہلی بار مسکرا کر ان کے لیے گڑ والی چائے چڑھانے لگی۔ ماں کی بھی جیسے جان میں جان آئی تو وہ پھرتی سے دستر خوان سمیٹنے لگیں اور سسر صاحب...... وہ اب تولتی نگاہوں سے کھولی کے درودیوار دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

"شادی کر کے ملاڈ جا رہی ہے۔ وہاں سے ہر روز آفس کیسے آئے گی؟"

میں نے چائے کے وقفے میں اپنی سہیلیوں کو شادی کی دعوت دی تو رما یہ سن کر کہ میرا سسرال ملاڈ میں ہے، تعجب آمیز فکر مندی سے بولی۔

دراصل ملاڈ بمبئی کا دور دراز مضافاتی علاقہ تھا، جہاں پہنچنے کے لیے لوکل ٹرین میں بیٹھ کر دو گھنٹے سفر کرنا پڑتا تھا۔

"فی الحال تو دفتر سے ایک ہفتے کی رخصت لی ہے۔ اس کے بعد دیکھوں گی، کیا کر سکتی ہوں۔" میں نے رما کے گھر سے لائے آلو کے سینڈوچ ہری چٹنی میں ڈبو کر نوالہ لیتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

اس جمعہ میری بارات تھی اور سچ تو یہ ہے کہ میں یہ شادی ماں کے بے حد بلکہ دیوانہ وار اصرار پر کر تو رہی تھی پر میں ذہنی طور پر خاصی منتشر تھی۔ دل بھی آمادہ نہ تھا اور یہی وہ نکتہ تھا کہ جو میں ماں کو شاید درست طریقے سے سمجھا نہیں پائی تھی۔ اب تو خیر مجھے سمجھانے کا مرحلہ بھی کہیں بہت پیچھے رہ گیا تھا۔

"اوہ مائی پور سوئٹی۔" ڈیزی نے میرا جواب سن کر بے ڈھنگا سا قہقہہ لگایا۔

"اگر تم کو یہ کرنا تھا تو یہ شادی ہی نہ بناتا۔ اب کیا کریں گی تم...... خالی فوکٹ (بے وجہ) آفس آنے جانے کے چکر میں اپنا فور آورز ویسٹ کرنے کے علاوہ۔"

اس کی حقیقت بیانی سن کر میں نے آدھا کھایا سینڈوچ یوں ہی رکابی میں رکھ دیا۔ ہر شے سے جیسے ایک دم دل اچاٹ سا ہو گیا تھا۔

"میرے کو سمجھ میں نہیں آیا بانو! تیرے جیسی آج کے زمانے کی پڑھی لکھی، نوکری کرنے والی اپنی گھر بیٹھی باہر کی دنیا سے ایک دم بے گانی، ماں جی کے دباؤ میں آ کیسے گئی؟" رما نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے الجھی نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔

"دباؤ میں نہیں۔" میں نے تھکن زدہ لہجے میں کہا۔ "ان کی خوش نودی کی خاطر۔"

"واٹ؟ کس کے کھاطر؟" ڈیزی نے ہونٹ گول کر کے تعجب ـــ سے دریافت کیا۔ اس کے چہرے کے ہونق تاثرات دیکھ کر میں آخری بار بے ساختہ مسکرا دی کہ اسی مسکراہٹ نے میرے لبوں کا راستہ بھول جانا تھا۔

☆☆☆

میں تو بھول چلی بابل کا دیس
پیا کا گھر پیارا لگے......

آج میرے بیاہ کا دن تھا۔ باراتیوں کے استقبال کا انتظام بستی کے عین درمیان واقع خالی میدان میں تنبو (شامیانہ) لگا کر کیا گیا تھا۔ تنبو کی قدرے اونچی چھت کی آرائش کاغذ کی رنگ برنگ جھنڈیوں سے کی گئی تھی۔

دو بالشت کی اونچائی پر دولہا، دلہن کی خاطر مختصر مگر دیدہ زیب اسٹیج بھی بنایا گیا تھا جس پر دھری سنہری و سرخ بڑے پایوں والی کرسیوں میں سے ایک پر اس وقت میں خالی الذہنی کے عالم میں دولہے والوں کی طرف سے آئے معمولی سے شیفون کے گھیر میں بے ایک پائنچے کے سرخ غرارہ سوٹ میں دلہن بنی بیٹھی اپنے دودھیا ہاتھوں پر سجی سرخ چاند والی مہندی کو دیکھ رہی تھی۔

اسٹیج کے عین سامنے کرسیوں کی قطار لگی تھی جب کہ دائیں ہاتھ پر بچھی دری پر خوش رنگ کام دار ساڑھیوں میں ملبوس بستی کی بھابیاں، ماسیاں، چاچیاں، مامیاں وغیرہ درمیان میں ڈھولک رکھے سہاگ گیت عالم سرمستی میں گا رہی تھیں۔ جسے سن سن کر جھاگ دار بالوں والی بڑی بوڑھیاں پوپلے منہ سے چپکے چپکے مسکراتے ہوئے تالیاں پیٹ پیٹ کر ان کا ساتھ دے جاتی تھیں۔ ان سے ذرا فاصلے پر چمکیلے، بھڑکیلے فراکوں میں ملبوس بالوں میں سرخ فیتے ڈالے ننھی بچیاں اور شریر بچے ڈھولک کی تھاپ پر رقصاں تھے۔ الغرض وہ سادہ دل و مخلص زمانے کی نگاہ میں کم حیثیت لوگ محض انسانیت اور محلہ داری کی بنا پر مجھ یتیم کے بیاہ پر رونق لگائے ہوئے تھے اور جن "رشتہ داروں" کی زہر آلود باتوں پر کان دھرتے ہوئے ماں نے مجھے یہ دن دکھلایا تھا، ان میں سے کسی ایک کو بھی دعوت دینے کے باوجود کہیں آنا نہ تھا۔

"اوہ جیزز! کتنا بیوٹی فل لگتا ہے تم سب کہاں۔ کھالی چپلی شادی بنالیا۔ تم کو ناں بندی فلم انڈسٹری میں ایک دم ٹاپ کلاس کا ہیروئن بننا مانگتا۔" میں ہنوز سر نیہوڑائے اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھنے میں محو تھی کہ تب ہی انتہائی نزدیک سے آنے والی ڈیزی کی زندگی سے بھرپور شوخ آواز پر میں نے چونک کر سر اٹھایا۔

"دل رکھنا تو کوئی تم سے سیکھے ڈیزی!" میں پھیکے پن سے مسکرائی۔ "پر آج تیری تو چھب ہی نرالی ہے۔" ہمیشہ مغربی لباس میں دکھائی دینے والی پر آج یہ گہری سبز و سنہری چنری کی ساڑھی بہت جچ رہی تھی۔

ڈیزی اپنی تعریف پر بڑے ـــــ انداز سے مسکرائی اور اظہار تشکر کے طور پر اپنا سر ہلکا سا خم کر کے میرے دائیں جانب براجمان ہوگئی۔

"یہ تو آج واقعی پوری سیتا پاٹیل بنی ہوئی ہے، تیرے چہرے پر کیوں پورے بارہ بجے ہیں؟" گہری نیلی اور جامنی بنارسی ساڑھی میں ملبوس رما جو ڈیزی کے ساتھ ہی وارد ہوئی تھی نے چمک دار لفافے میں ملفوف ـــ تحفہ میری گود میں دھرتے ہوئے خاصی سنجیدگی سے استفسار کیا۔

"کیا معلوم...... پر من کر رہا ہے، ادھر سے اٹھ کر کہیں دور بھاگ جاؤں۔" میں جو اتنی دیر سے ضبط کر رہی تھی، پھپھک کر رو پڑی۔

"ہش پگلی......" اس نے ملائمت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تو تو بڑی بہادر ہے، پھر کیوں ایسی اناپ شناپ باتیں سوچ سوچ کر اپنا بھیجا سنکا (خراب) رہی ہے۔"

"دل ہر شے سے اچاٹ ہو رہا ہے رما! ابھی مجھے بہت کچھ کرنا تھا اور ماں نے مجھے......" اس سے آگے مجھ سے بولا ہی نہ گیا کہ آنسو جو چلے آئے تھے میری ترجمانی کو......

"ماں کے واسطے شادی بنایا......تو بس اب اسی کو دیکھو۔" ڈیزی نے خلاف عادت معقولیت سے کہا تو رما اس کی تائید کرتے ہوئے بولی۔
"ہاں بانو! دیکھو تو اپنی ماں کی اور... کیسی کھش (خوش) دکھائی دے رہی ہیں۔"
اس کے متوجہ کرنے پر میں نے اسٹیج کے عین سامنے لگی کرسیوں پر سے ایک پر براجمان اپنی ماں کی اور دیکھا۔ سفید دسر کی چاندنا سلک کے شلوار قمیص میں ملبوس دوپٹے کو نماز کے سے انداز میں باندھے۔ میری ماں، برابر میں بیٹھی رفعت آپا کی کسی بات پر مسکرائی تھیں۔ بالکل اسی انداز سے جیسے وہ بابو جی کے زمانے میں مسکرایا کرتی تھیں۔ تو یہ ثابت ہوا کہ آج واقعی ماں پورے دل سے خوش تھیں، تب پھر میں اس قدر مضطرب کیوں تھی؟ حالانکہ بیاہ کا سارا انتظام ماسٹر صاحب کے نہ ہوتے ہوئے بھی بہ احسن طریقے سے ہو ہی گیا تھا تنبو کا سارا خرچ تو بصد اصرار رفعت آپا نے اٹھالیا تھا۔
بریانی اور زردے کی دیگوں کے علاوہ دہاج (جہیز) کے پلنگ اور صندوق اور لینے دینے کے کپڑوں کا سارا انتظام میں نے دفتر میں ڈالی گئی اس کمیٹی سے کرلیا تھا جو میں نے کھولی بکی کروانے کی نیت سے ڈال رکھی تھی۔
اور جو میری باری نہ ہوتے ہوئے بھی ہیڈ کلرک قریشی صاحب کی مہربانی سے میری ضرورت اور پریشانی کو مدنظر رکھتے ہوئے مہیا کردی گئی تھی۔ یوں ہر کام اتنے سہل طریقے سے ہوتا چلا گیا گویا نوشتہ تقدیر ہی تھا۔
تو پھر میرا من اس قدر بے کل اور اداس کیوں تھا؟
میری تسلی اور دلاسے کی خاطر رما اور ڈیزی جو کچھ بھی اس وقت کہے جاتی تھیں وہ سارے الفاظ میری سماعت تک پہنچ تو ضرور رہے تھے پر میرا دماغ فی الوقت انہیں سمجھنے سے قاصر تھا اور میں کبھی ماں کی اور دیکھتی تھی، کبھی نیکر بشرٹ میں بابو بے بستی کے دیگر بچوں کے ساتھ چنڈال میں کدکڑے لگاتے منو اور گڈو کو۔
آج میرا اور ان کا ساتھ چھوٹنے والا تھا اور میرے لیے یہ خیال ہی سوہان روح تھا، پر ماں واقعی خوش تھیں۔ تو پھر اور مجھے کیا چاہیے تھا۔
ہاں واقعی......اور مجھے چاہیے ہی کیا تھا؟

☆☆☆

"آہ......میری ماں۔"
پونے تین گھنٹے کے مسلسل سفر نے میری کمر کو تختہ کردیا تھا۔ اب جو مسہری کی پشت سے کمر لگاکی تو لبوں سے بے ساختہ ماں کا نام کراہ کی صورت میں برآمد ہوا۔
یہ ایک نیچی چھت والا کمرہ تھا جس کی دیواروں پر پھیری گئی سفیدی تازہ تھی۔ نیچے سیمنٹ کا پکا فرش بچھا تھا۔ کمرے کی دائیں دیوار کے عین درمیان سال خوردہ لکڑی کے دو پٹ والی کھڑکی نصب تھی جس کے دونوں پٹ اس وقت مضبوطی سے بند تھے، پر دوسری جانب سے مسلسل آتی بھنبھناہٹ سے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ کھڑکی کے اس پار گھر کا دوسرا کمرہ واقع ہے۔ میرا پلنگ کھڑکی کے عین سامنے والی دیوار کے ساتھ لگایا گیا تھا۔ جس پر اس وقت ماں کے ہاتھ کی بنی سرخ پھولوں والی گلابی چادر بچھی تھی۔
تیسری دیوار کے ساتھ چھوٹا سا جستی صندوق دھرا تھا اور صندوق پر پیرا گون کا وہ کتھئی اٹیچی کیس رکھا تھا جو جہیز کے کپڑے لتے لانے کے واسطے میں نے رما سے مستعار لیا تھا۔ صندوق کے برابر ایک اسٹیل کی الماری ایستادہ تھی جس میں نصب آئینے میں اس وقت میں اپنا تھکا ماندہ وجود دیکھ کر بس اسی سوچ میں گم تھی کہ آئندہ زندگی کا نقشہ کیا ہوگا؟
اور پھر سوچ کے گھنیرے بن میں برہنہ پا دوڑتے دوڑتے میں کب نیند کی دل کش وادی میں جا پہنچی، مجھے کچھ خبر ہی نہ ہوئی۔

☆☆☆

"ہم تو یہ سوچ بیٹھے تھے کہ ہماری دلہنیا

سرکاری نوکر ہیں یقیناً دیج سے ہمارا گھر بھر دیں گی مگر تمہارے گھر سے آئے اس پلنگ اور صندوق کو دیکھ کر تو ہم سخت مایوس ہوئے ہیں۔"

یہ شادی کی اولین صبح ابا اور بھائی کے "منو" کا مجھ سے پہلا مکالمہ تھا۔ گزشتہ تمام شب تو موصوف دوسرے کمرے میں مایوں بیٹھی اپنی چھوٹی بہن کی دل جوئی میں مصروف رہے کہ "بھابھی" کے گھر آتے ہی بے چاری کا ننھا سا جی وسوسوں میں گھر گیا تھا۔ وسوسے ختم ہوئے تو سنگیت شروع ہوگیا۔

مجھے ان ساری باتوں کا علم یوں ہوا کہ نئی جگہ کی بدولت نیند کی سبک خرامی سے بہتی ندی میں بار بار رکاوٹ آنے سے گھبرا کر آنکھ ایک جھٹکے سے کھلتی رہی۔ پہلے پہل تو میں اپنے دولہا کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے ہی سو گئی تھی۔ دوبارہ آنکھ کھلنے پر نیم دراز ہوگئی۔ سہ بارہ مکمل دراز ہوگئی اور رات آ کر جو موصوف نے جگایا تو نیند سے مغلوب دماغ ایک لمحے کو تو کچھ سمجھ ہی نہ پایا کہ آخر جناب کہہ کیا رہے ہیں؟

"کیا ہوا؟" میں نے مندی مندی سی آنکھیں کھول کر ململ کے سفید کرتے پاجامے میں ملبوس ایک پانچ فٹ تو انچ کے واجبی صورت، سانولے سے شخص کو دیکھا جسے میرے مجازی خدا کا عہدہ تفویض کیا گیا تھا۔

"کچھ نہیں۔" میری کج فہمی پر وہ بھنا کر تیزی سے بولے۔

"لگتا ہے بجلی کے پنکھے تلے پہلی مرتبہ سونا نصیب ہوا ہے۔ ہاں بھئی ظاہر ہے تمہیں کہاں میسر ہوگا اپنی کھولی میں یہ چھت کا پنکھا۔"

یہ انہوں نے کیسی بات کی تھی؟ ابھی میں یہ سمجھنے کی کوشش کر ہی رہی تھی کہ دفعتاً کمرے کا دروازہ بنا دستک کے دھڑ سے کھلا اور میری دوسرے نمبر والی نند فاطمہ بکا سامنہ بنا کر کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اعلان کرنے کے انداز میں گویا ہوئی۔

"ابا آ گئے ہیں بھابھی! کپڑے بدل کر باہر چلی آؤ۔ سب کے ساتھ ناشتا کرلو اور منو بھیا! تم تو ساتھ ہی چلے چلو، تمہیں ابا بلاتے ہیں۔"

وہ جو اپنی لال لال آنکھوں سے گھورنے کا فریضہ بڑی تندہی سے سرانجام دے رہے تھے۔ یہ اطلاع پا کر فوراً ہی بہن کے پیچھے پیچھے باہر کو چل دیئے۔

اور میں جو اپنے بابو جی کی ذہین وفطین بیٹی تھی یہ سمجھ نہ پائی کہ ساری رات اپنے مستقبل کے حوالے سے سوچے جانے والے سارے الجھن بھرے سوالوں کا جواب تو دراصل مجھے اسی صبح مل چکا تھا۔

☆☆☆

"ابا نے کہلوایا ہے کہ دو چار روز مزید یہیں رہ لو۔ ہمارے کمرے میں ابھی رقیہ اور شکیل بھائی ٹھہرے ہوئے ہیں۔" بیاہ کی اگلی سہ پہر دو چار قریبی رشتے داروں کو گھر ہی پر جمع کر کے رقیہ کی رخصتی کردی گئی تھی۔ بعد ازاں مجھے یہ پتا چلا کہ وہ ہمارا ولیمہ بھی تھا اور میں گزشتہ شب سے تا حال اتنی مرتبہ حیران ہو چکی تھی کہ اس دفعہ حیران ہوئے بغیر میں نے بس مسکا کی انداز سے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ کوئی شکوہ یا شکایت لبوں پر لاتی بھی تو کیسے کہ فی الحال ہمارے درمیان ایسا کوئی تعلق استوار ہی نہ ہوا تھا۔

ولیمے کے بعد رواج کے مطابق وہ مجھے میکے چھوڑ گئے۔ جہاں میرا استقبال تنہائی کے ہاتھوں ایک ہی رات میں بوکھلا جانے والی ماں اور بے تحاشا جلتے کڑھونے کیا۔ میرا جی جو پہلے ہی بوجھل تھا، ہر شے سے مزید اچاٹ سا ہوگیا۔ مگر پھر بھی میں نے ماں کے روایتی سوالات کا جواب جبراً مسکرا کر دیا تاکہ انہیں تسلی رہے کہ سب کچھ اچھا ہے۔

گو ذہن تفکرات میں گھرا تھا، پرانی جگہ کی خاصیت یہی تو ہے کہ یہ کسی مہربان کی طرح اپنی آغوش میں لے کر تھپک تھپک کر میٹھی نیند سلا ہی دیتی ہے میں بھی رات خوب اچھی طرح سوئی۔

صبح بے دار ہوئی تو ماں کو بیٹی داماد کی خاطر داری کے سلسلے میں متفکر پا کر پہلے انہیں ان کا مطلوبہ سامان، نزدیکی بازار سے لا کر دیا پھر ان کی ہدایت

کے عین مطابق منقش کے گل بوٹوں سے آراستہ ہلکی
نیلی سلک کی ساڑھی باندھ کر بالوں میں گیندے کا
گجرا پرو، بج سنور کر بیٹھ گئی اور جب ڈھلتی دوپہر کو
جناب تشریف لائے تو ہمراہ باجی کا بھی پیغام تھا۔

جسے سن کر مارے تعجب کے ماں سے تو خیر کچھ
بولا ہی نہ گیا اور میں چاہ کر بھی کچھ بولنے کی حیثیت نہ
رکھتی تھی۔ البتہ بھائی راجہ سے ملنے کے اشتیاق میں
آئی بیٹھی رفعت آپا اور بڑو ضرور باجی نے آنکھوں
ہی آنکھوں میں ایک دوجے کو کچھ اشارے کیے پھر
رفعت آپا ہی لہجے کو ذرا روکھا کر کے بولیں۔

"اے بھائی بابو! یہ تمہارے ابا نے خوب ہی
کہی، وہیں رہ لیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ یہ بانو
ابھی تو بیاہتا ہے۔ کیا تمہارا من راضی ہو جائے گا اپنی
دلہن کو یوں مائیکے چھوڑ جانے کو۔" چونکہ رفعت آپا
ان کے ابا جی کی دور پرے کی رشتہ دار بھی لگتی تھیں اور
ہمارا رشتہ بھی ان ہی کے توسط سے ہوا تھا تو غالباً اسی
رعایت سے موصوف سے مخاطب ہوئیں۔

"من تو راضی نہیں ہوگا پر مجبوری ہی کچھ ایسی
آپا۔" جناب جو بڑے گوشت کا پلاؤ بڑی رغبت سے
تناول کر رہے تھے، رفعت آپا کی سرزنش کا برا منائے
بغیر منمناتی آواز میں بڑی بے چارگی سے بولے۔

"چلو بھئی۔" رفعت آپا تنک کر بولیں۔

"پر اتنا تو بتا دو کہ بری میں الگ رنگ کی ایک
جیسی دو ساڑھیاں بانو کو چڑھانے کے پیچھے تم لوگوں
کی کیا مجبوری ٹھہری؟ غریب کو منہ دکھائی میں جو تھا
چھلہ تک نہ دیا اور تو اور ولیمہ بھی چپ چپاتے ہمیں
بلائے بغیر ہی کر لیا۔"

رفعت آپا مجھ سے ماجرا جان کر حقیقتاً خفا ہوئی
بیٹھی تھیں۔ غالباً موصوف کو اپنی کھنچائی کی امید نہ تھی
سو پہلے تو بڑا اپٹپائے پھر ذرا اکڑ کر بولے۔

"ابا کہتے ہیں کہ شریف بیٹیوں کے یہ لچھن
نہیں ہوتے کہ سسرال کی باتیں آ کر مائیکے والوں کو
لگائیں اور یوں بھی ان معاملات کے بارے میں،
میں کیا جانوں۔ آپ کو جو بات کرنی ہے، ابا جان
سے کیجیے گا۔ میں چلتا ہوں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔" وہ
کہہ کر بھری پلیٹ یوں ہی چھوڑ کر اٹھنے لگے تو ماں جو
داماد کے تیور دیکھ کر پہلے ہی ہراساں تھیں، بوکھلا کر
ایک دم بول اٹھیں۔

"ارے ایسے کیسے...... کھانا تو کھا کر جاؤ نا تم
اور رفعت، بہن! اب تم بھی چپ ہو جاؤ۔ جو میری بانو
کا مقدر تھا وہ اس کو مل گیا۔ اب اپن لوگ کو کچ کچ
کر کے کیا مل جائے گا۔" یوں اس وقت ماں نے
مداخلت کر کے بات سنبھال لی اور جناب نے دوبارہ
اپنی نشست......

رات جب میں سونے کے لیے لیٹی تب ماں
نے خدشات سے پر لرزیدہ آواز میں مجھ سے پوچھا۔

"بانو! تو کھش (خوش) ہے؟"

اور میں اس وقت جاگ تو رہی تھی پر یوں سوتی
بن گئی کہ ماں کے اس پیچیدہ سوال کا جواب فی الوقت
میرے پاس موجود نہ تھا۔

☆☆☆

"زندگی اس قدر بوجھل اور بے کیف پہلے تو نہ
کبھی لگی ہو یار۔ پر اب تو ایسا لگ رہا ہے جیسے کہ میں ضبط
کھو دوں گی کسی روز۔"

میں کہ جسے اپنے عزم و حوصلے پر بڑا ناز تھا، ماں
کی خوشی کی خاطر بڑے جوکھم میں پڑ گئی تھی۔

ملاڈ سے روزانہ دفتر آنے جانے نے میرا جوڑ
جوڑ تھکن سے بے حال کر دیا تھا۔ شہزادہ حنیف اختر
نامی بے حس مٹی کا مادھو چابی کا گڈا، جس کی نہ تو اپنی
کوئی ذاتی سوچ تھی نہ شخصیت، دو روپلی وہ کماتا تھا، وہ
بھی گھر آتے کے ساتھ اپنی بہن کو تھما دیتا اور اب مجھ
سے بھی یہی مطالبہ کیا جا رہا تھا۔

رسوئی کا سارا خرچ تو خیر پہلے ہی میرے ذمہ
لگا دیا گیا تھا اور جو خدا گواہ بنا کر کہوں تو اس شخص کی
"خوشنودی" کی خاطر میں اگر ایسا کر بھی گزرتی جب
— میں اپنی ماں اور بھائیوں کا کیا کرتی؟ بگڑتے
معاشی حالات کے سبب گڈو کا اسکول تو اس ماہ سے
چھوٹ ہی گیا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ اس بات کا مجھے

شدید ترین قلق تھا۔ ماں کی آنکھوں میں چوں کہ اب مستقل درد رہنے لگا تھا تو سلائی، کڑھائی اب ان سے متواتر ہوتی نہ تھی۔ منو الگ بیمار رہنے لگا تھا یعنی چاروں اور مسائل ہی مسائل اور درمیان میں میری ذات۔

اس روز بڑے دن بعد ماسٹر صاحب کی یاد نے بڑی شدت سے ستایا تھا۔ اگر وہ موجود ہوتے تو میرے سارے مسائل کا حل چٹکیاں بجاتے ہی نکال لیتے۔ پر کیا معلوم اب وہ کہاں ہوتے ہوں گے۔ وہ موجود نہ تھے اور میرا سارا وجود پکتا ہوا پھوڑا بن چکا تھا۔ سو اس روز میں رما کے سامنے پھٹ پڑی۔

"رما تو تو جانے کی پر سچ کہوں تو ساری غلطی تیری ہی ہے۔ تجھے ماں جی کو سمجھانا چاہیے تھا۔ اس طرح ان کی ہٹ کو مان نہیں لینا چاہیے تھا۔"

رما نے ترحم آمیز نگاہوں سے میری خستہ حالی دیکھ کر پریشانی سے کہا۔ وہ شاید اپنی جگہ درست تھی پر ماں کی بات پر سر تسلیم خم کرنا بھی تو عین عبادت ہے۔ تب پھر میں نے اس میں غلط کیا کیا؟ ذہن تاریک ہونے سے پیش تر جو آخری سوچ میرے دماغ میں دبے پاؤں داخل ہوئی، وہ یہی تھی۔

☆☆☆

"بانو کو بیاہنے میں اس قدر عجلت پسندی سے کام کیوں لیا تم نے گوری! میں نے تو سوچا تھا کہ اس بار خط لکھ کر اپنے صدیق کا رشتہ تمہیں بانو کے لیے دوں گا مگر تمہاری جلد بازی نے سارا معاملہ بگاڑ کر رکھ دیا۔

پھر لوگ اگر تم نے اچھے لوگ چنے ہوتے تو چلو کوئی بات بھی تھی۔ اب ایسے لالچی، بدفطرت اور کنجوس لوگوں میں بیٹی دینے کا مژدہ سنا رہی ہے تو۔ خوشی کس کافر کو ہوگی؟ اب تو ایک نئی روح بھی دنیا میں آنکھ کھولنے والی ہے، پہلے ہی تم لوگوں کے مالی حالات انا للہ ہیں، اب ایسے میں تم لوگ کرو گے کیا؟ جس قدر سوچ رہا ہوں اسی قدر ہول اٹھ رہے ہیں۔ بس خدا سے دعاگو ہوں کہ جلد دونوں ممالک کے حالات معمول پر آئیں، تو تم لوگوں کے یہاں آنے کی کوئی سبیل پیدا ہو۔ تمہارا خیر اندیش۔"

کراچی سے آیا ماموں کا خط میں نے جو ماں کو حرف بہ حرف پڑھ کر سنایا تو ماں کے آنسو بھل بھل بہنے لگے۔

"میرے کو پتا ہوتا اگر کہ بھیا تیرے واسطے یہ سوچے بیٹھے ہیں تو میں کاہے کو تیرا ماتھا ادھر پھوڑتی۔" ماں ان دنوں پُر ملال لہجے میں بس یہی ایک بات مختلف پیرائے میں دہراتی جاتی لیکن کیا ان کے پچھتانے سے اب سب کچھ پہلے کی طرح ہو جانا ممکن تھا۔

"مس خان! تیرے کو کوئی بھی ہیلپ کی ضرورت ہے تو بنداس (بلا جھجک) اپن سے بولنا مانگتا او کے؟" ڈیزی کی ملائمت سے میری پیٹھ تھپک کر بولی تو میری آنکھیں بے ساختہ بھر آئیں۔

حمل کے ابتدائی تین ماہ میرے لیے کسی آزمائش سے کم ثابت نہ ہوئے تھے۔ مسلسل متلی، قے، چکر نے مل کر میرا وہ حال کر دیا تھا کہ میں ان دنوں بس بستر تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ان حالات میں ظاہر ہے دفتر آنا جانا ممکن نہیں رہا تھا، سو چھٹیاں لے کر اپنے گھر پر پڑی رہی اور ان ہی دنوں میں نے حنیف اختر کا وہ چہرہ دیکھا کہ میں اس بے حس آدمی سے سخت بددل ہوگئی۔

عجیب خسیس اور لاپروا شخص تھا کہ جسے اپنی حال سے بے حال بیوی اور ہونے والے بچے کی کوئی پروا تھی نہ مالی معاونت کی فکر۔ بس جمعے کے جمعے غیروں کی مانند میرا حال احوال دریافت کر کے اپنی راہ لیتا۔ یوں ہی تین ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ میری طبیعت ذرا سنبھلی تو میں نے دوبارہ دفتر آنا شروع کر دیا۔ میں جو خود کو بہت مضبوط، بہادر اور آہنی اعصاب کا سمجھتی رہی تھی تو ان دنوں قدم قدم پر اپنے بارے میں میری یہ خوش فہمی غلط ثابت ہو رہی تھی...... سراسر غلط۔

"تم لوگوں کے خلوص اور محبت نے پہلے ہی خاصا زیر بار کر رکھا ہے ڈیزی۔"

میں نے بھرائی ہوئی آواز میں ڈیزی کا شکریہ ادا کرنے کی کوشش کی۔ واقعی ان دنوں میرے حصے کے زیادہ تر دفتری امور وہ دونوں ہی سرانجام دے رہی تھیں۔ کھانے پینے کا بھی خاطر خواہ خیال رکھتیں اور دل بستگی کا سامان بھی کیے رہتیں۔ ایسے میں اگر میں ان دونوں کی شکر گزار نہ ہوتی تو اور کیا ہوتی؟

"واؤ مس کھان...... ایک اور جوردار انٹرسٹنگ ورڈز زیر بار...... اپن کا آفری ادھن ہے ہاں...... تم کہو تو اپن جونی سے بات کر کے تیرے کو "بابوجی" (گلزار) سے ملوا دے؟"

☆☆☆

"یہ سارا سامان تم رقیہ کے لیے دے دو۔ تمہارا کیا ہے، اپنا کماتی ہو اور بنالو گی۔" ڈاکٹر نے مجھے دو ماہ بعد کی پانچ تاریخ دے دی تھی۔

حالات چاہے جیسے بھی ہوں لیکن ایک نئی روح میرے توسط سے دنیا میں آرہی تھی سو اس کے استقبال کی تیاری میں اپنے طور پر کر چکی تھی۔ میں نے "وومن ہاسٹل" میں اپنا نام لکھوا دیا تھا۔ رما کے ساتھ جا کر کرافٹ مارکیٹ سے بچے کے کپڑے اور دیگر ضروری اشیا بڑے چاؤ سے خرید لائی تھی۔ زندگی کے تمام تر سفاک حقائق اپنی جگہ پر اپنے بطن میں کروٹیں لیتے نئے وجود کا احساس مجھے ناقابل بیان مسرت سے ہم کنار کر رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہر گزرتے دن کے ساتھ مجھ پر بے پایاں خوشیوں کے نت نئے جہاں آشکار ہو رہے ہوں۔ ایسی ہی کسی کیفیت کے زیر اثر میں بچے کے لیے بڑے ارمانوں سے لایا ہوا سامان بچے کے باپ کو دکھا بیٹھی اور جواباً اس نے جو کچھ کہا...... اسے سن کر میں صدمے سے اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔

"ایسا کیا کہہ دیا میں نے جو تم یوں منہ پھلا کر بیٹھ گئی ہو۔"

میری جانب سے اپنے مطلب کا جواب نہ پا کر اس نے تیور بگاڑ لیے۔

"یعنی آپ کو ادراک ہی نہیں کہ آپ نے کیا کہہ دیا ہے؟"

"ایک تو جب دیکھو تمہارا ناٹک شروع ہو جاتا ہے۔ اسی لیے تو میں نوکری پیشہ سے بیاہ رچانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ یہ تو اباجان نے کہا کہ کرلو، تمہارا ساتھ دے گی اور دیکھو...... یہ دے رہی ہو تم ساتھ۔ ذرا سی مدد کیا مانگ لی، تمہیں موت آنے لگی۔ چار پانسو (پانچ سو) تو تم نے خرچ کر ہی ڈالے ہوں گے ان کپڑوں لتوں پر۔ اب بتاؤ...... میں یہ سب رقیہ کو کیسے منا کر دوں؟"

"شوہر دے نا رے اس کا۔" یوں تو ماں ہمارے درمیان ہمیشہ خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتی تھیں۔ اس روز میرے بے آواز بہتے آنسوؤں کو دیکھ کر غالباً ضبط نہ کر سکیں۔ اس شخص کو تو گویا ناراضی کا کوئی معمولی بہانا ہی درکار تھا۔ سو مزید کچھ بھی کہے سنے بغیر اٹھ کر چلتا بنا۔ اور اس کے اس طرح کشیدگی بھرے ماحول میں کھولی سے اٹھ کر جاتے ہی میرے وجود میں رگ جاں کو چیرتی درد کی ایک شدید لہر اٹھی تھی۔

☆☆☆

"رقیہ کا بیاہ بھی تو ہمارے ساتھ ساتھ ہوا تھا، پھر تمہیں بچہ دو ماہ پہلے کیسے ہو گیا؟" وہ جو تخلیق کے کسی بھی جاں گسل لمحے میں میرا ساتھ دینے کا خطاوار نہ ہوا تھا، تیسرے روز بچے کو دیکھنے آیا تو ہمراہ سوال کی صورت ایک ایسا نشتر لایا۔ جو سیدھا میرے دل میں پیوست ہو کر مجھے نیم جاں کر گیا۔

"مطلب کیا ہے آپ کا؟" دونوں ہاتھ پشت پر باندھے اپنی سرخ آنکھوں میں ڈھیروں اجنبیت لیے، میرے بستر کے ساتھ رکھے جھولے میں سوئے ہوئے اس ننھے فرشتے کو گھور رہا تھا۔ میں جو نیم دراز تھی اس کا یہ بے مہر انداز محسوس کر کے اس قدر سہم گئی کہ بمشکل تمام گر گھبرا کر ایک دم اٹھ بیٹھی۔

"مطلب صاف ہے بانو بیگم! میرے بچے کو تو دو ماہ بعد دنیا میں آنا تھا پھر یہ دو ماہ پہلے دنیا میں کیسے آ گیا؟" وہ لفظ تھے یا کٹاری؟ میرا وجود کٹ کٹ کر

ادھر اُدھر گرنے لگا۔

"ست وانسوا ہے یہ...... کیا اتنا بھی نہیں جانتے؟" دل تو چاہتا تھا کہ یوں وضاحت دینے کے بجائے اس کشور کا منہ نوچ لوں مگر وضاحت ضروری تھی۔ بہت ضروری تھی سو میں نے دی مگر بے سود......

کہ جس طوفان کو آنا تھا وہ آ کر ہی رہا اور وہ ایک تعلق جو سوائے بوجھ کے اور کچھ نہ تھا اسی روز اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا۔

☆☆☆

"قسم حاجی علی کی گوری آپا۔ میں یہ رشتہ جُڑوانے پر تم سے بہت شرمندہ ہوں۔"

رفعت آپا مستقل نیر بھائی ماں کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھی تھیں۔ منو، ماں کی چار پائی کے ساتھ دھرے لوہے کے چمچماتے چھوٹے سے پالنے میں سوئے ہوئے اس من موہنے گڈے کو دلچسپی سے دیکھ کر چپکے چپکے مسکرا رہا تھا۔ میں چار پائی پر تھرائی ہوئی بیٹھی تھی۔ خالی خالی نگاہوں سے کبھی پالنے میں پڑے اپنے لختِ جگر کو تو کبھی بے نقط روتی ماں کو دیکھ دیکھ کر بس یہی سوچے جاتی تھی کہ آیا اس موقع پر مجھے مسرور ہونا چاہیے یا مغموم؟

"تو کاہے کو شرمندہ ہوتی ہے رفعت۔" ماں نے رفعت آپا کے بندھے ہوئے ہاتھوں کو بڑی بے چارگی سے تھامتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"شاید بانو کی قسمت میں یہی لکھا تھا۔"

(نہیں امی! نہیں...... آپ کی قسمت میں یہ نہیں لکھا تھا۔ نانی کی ضد نے زبردستی لکھوا دیا)

دو مختلف آوازیں مدغم ہو رہی تھیں۔

یادوں کا بوسیدہ البم بڑی فرصت سے کھولے بیٹھا وہ بے رنگ وجود دفعتاً چونک کر ماضی سے نکل کر حال کی جانب لوٹا تو دیکھا۔ رات بھر تابڑ توڑ برستی بارش بھی کی تھم چکی تھی اور اب چہار سو مدھم سا سویرا پھیلنے کی تیاری کر رہا تھا۔ بڑی پیاری سی ہوا سبک خرامی سے چل پڑی تھی اور دور کہیں سے طائرانِ خوش الحان کی حمد و ثنا کی آوازیں کانوں میں پڑ رہی تھیں۔

یہ وقت رب کے حضور حاضری کا تھا پر آج وہ موجود ہی کب تھی جو حاضری کو جاتی۔ اس کی بے قرار لیرو دلیر روح تو اپنی جنم بھومی میں کہیں بھٹکتی پھر رہی تھی۔ تب ہی تو اس کی گم ناک نگاہیں ایک مرتبہ پھر ماضی کے کسی منظر پر جا ٹھہری تھیں۔

☆☆☆

تعجب اس بات پر نہیں کہ وہ جس کا ماد ہو کسی کے بہکاوے میں آ کر لمحے بھر میں تعلق توڑ گیا تھا جیسے کہ کبھی جڑا ہی نہ ہو، مجھے اصل غم تو یہ لگا تھا کہ اس بے رحم نے اپنے وجود کے حصے پر ایک [illegible] محبت تک نہ ڈالی تھی۔ میں دنوں اسی صدمے سے بیمار پڑی رہی مگر کب تک؟ اب مجھ پر تین نہیں، چار چار جانوں کی ذمہ داری آ پڑی تھی اور تقدیر کا لکھا یہی تھا کہ بہر طور یہ ذمہ داری مجھ ہی کو ادا کرنی تھی۔ یوں ایک بار پھر میں نے ان چاروں کی اتری دھبی صورتیں دیکھ کر ہمت جتائی اور زندگی کی دوڑ میں شامل ہو گئی۔

☆☆☆

"برکھا رت کی آمد آمد ہے اور میری کھولی کی خستہ حالت تیرے سامنے ہے۔ پانی برسا تو چھوٹو بیمار پڑ جائے گا۔" چائے کے وقفے میں، میں روہانسے لہجے میں رما سے مخاطب تھی۔ ساتھ بیٹھی ڈیزی دال سیو چابتے ہوئے خلافِ عادت بڑی سنجیدہ دکھائی دے رہی تھی۔

"کھولی پکی کروا لے۔" رما نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے مشورتاً کہا تو میں جو تیزتر ہوئے حالات کے سبب جھنجلائی ہوئی سی بیٹھی تھی، تپ کے بولی۔

"کروا لوں...... پر پیسہ کدھر سے لاؤں؟"

"ادھار لے لے اپن سے۔" رما تو سوچ میں پڑ گئی تھی پر ڈیزی ایک دم بولی۔

"کس کس شے کے لیے اور کتنا ادھار لوں ڈیزی؟" تجویز اس کی معقول پر ناقابلِ عمل یوں تھی کہ مجھ پر پہلے ہی خاصا قرض چڑھ چکا تھا۔ جسے اتارنے کی فی الوقت کوئی صورت نہ تھی تب ایسے میں مزید

قرض لینا کسی طور مناسب نہ تھا۔

"پگار تیری تین سو پچاس روپے ہے اور کمرے پے تیرے ایک ہزار۔" رما گمبیرتا سے بولی۔

"خدا کی قسم...... کبھی کبھی تو من میں آتا ہے کہ بائی کلہ کی پٹڑی پر لیٹ کر جان دے دوں۔" میں نے آنسوؤں کو تو بہنے سے روک لیا تھا پر لہجہ...... وہ آپوں آپ ہی مجسم آنسو بن گیا۔

"اوہ نہ نہ مس کھان۔" ڈیزی جو کرسی پر جھولے لے رہی تھی، میری بات کی سنجیدگی محسوس کر کے ایک دم رک گئی اور میز پر دھرے میرے ذہنی دباؤ کے سبب ہولے ہولے کپکپاتے ہاتھ پر اپنا زندگی کی حرارت سے بھرپور ہاتھ رکھتے ہوئے پورے خلوص سے بولی۔

"تم [illegible] جان دینا کیں، جونی کے ساتھ جا کر آڈیشن دینا مانگتا۔"

"آڈیشن؟" میں نے عجب طرح چونک کر اس کا سانولا مگر پرکشش چہرہ دیکھا تھا۔

"کیسا آڈیشن؟"

☆☆☆

"یہ جہان رنگ و بو، وادیٔ طرب...... جگمگاتی کہکشاں یہی ہندی فلم نگری ہے مس خان۔ میرے دفتر کے باہر روزانہ ہزاروں لوگ اپنی خوابوں سے بھری آنکھیں لیے اسی امید پر آ کھڑے ہوتے ہیں کہ بس ایک...... ایک موقع انہیں دے دیا جائے تو وہ کمال کر دکھائیں گے مگر میں آپ کو سچ بتاؤں مس خان! کہ یہ موقع بڑی کمینی شے ہے۔ آسانی سے ہاتھ ہی کب آتا ہے کسی کے۔ کیوں مس خان! درست کہا نا میں نے؟"

یہ چیمبر میں واقع مشہور زمانہ فلم ساز کمپنی "راج شری" والوں کا دفتر تھا اور میں اس وقت ڈیزی کے بھائی جونی کی معیت میں یہاں کے کاسٹنگ منیجر ساگر جعفری سے ملنے آئی تھی اور جو اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو سگار پر سگار پھونکتے ہوئے برابر بولنے میں مصروف تھا۔

"کیا ساگر باؤ! آپ بھی...... کبھی غلط اچ بولے ہیں جو ابھی بولیں گے۔" ساگر صاحب نے سوال مجھ سے کیا تھا پر جواب خوشامدی انداز سے لہک کر جونی نے دیا۔

"یہ گونگی ہیں؟" ساگر صاحب نے چتون تیکھے کر کے خاصے ناگوار انداز سے جونی کو دیکھا تو وہ فوراً کھسیا سا گیا۔

"کیا باؤ! آپ بھی مجاق کرتے ہو۔ گونگی ہوتی تو کیا ادھراچ لے کر آتا۔"

"بس تو پھر انہیں بولنے دو۔ ہاں تو مس خان۔" وہ جونی کو جھڑک کر ایک مرتبہ پھر میری جانب متوجہ ہو کر خاصی دلچسپی سے مجھے دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔

"بات یہ ہے کہ مجھے کسی بھی قسم کی آلائش سے پاک صاف ستھرا لب و لہجہ درکار ہے۔"

"بڑی مست اردو بولتی ہے سسٹر، آپ کچھ بلوا کر دیکھ لو نا صاحب۔" بے چین جونی نے پھر مداخلت کی پر اس بار صاحب نے برا مانے بغیر سر ہلا دیا۔

"جی تو مس خان! کچھ ارشاد فرمانا پسند کریں گی آپ۔"

"کک...... کیا بولوں؟" میں جو اتنی دیر سے لب بستہ کچھ حیران و پریشان سی بیٹھی تھی، ان کی اس فرمائش پر دفعتاً بوکھلا سی گئی۔

"شاعری اچ سنا دو سسٹر! اپن کی عجت کا سوال ہے۔" جونی نے ملتجیانہ انداز سے میری جانب دیکھا۔ میں یک لخت سوچ میں ڈوبی تھی کہ جو میں کرنے چلی ہوں کیا وہ درست اقدام تھا؟

پر یہاں تک پہنچ کر آخر اس سوال کے جال میں خود کو الجھانے کا فائدہ بھی کیا تھا کہ پیچھے مسائل کا انبار تھا اور آگے......

قید حیات و بند غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی، غم سے نجات پائے کیوں

☆☆☆

"دیوا رے دیوا! کیا بات ہے رے تیری بانو...... تو تو ایک دم حلیہ اچ بدل ڈالی کھولی کا۔" آج بڑے عرصے بعد نرملا کی آمد ہوئی تھی اور اس عرصے میں واقعی ہماری ظاہری حالت میں زمین و آسمان کا نہ سہی پر قابل دید انقلاب ضرور آچکا تھا۔

کھولی میں نے پکی کروا کر چھت بھی ڈلوالی تھی۔ چھت کا پنکھا، بتی کے علاوہ گیس کا چولہا، نئے بستر، چارپائی، کرسیاں...... الماری اور بکس (صندوق) البتہ وہی تھے جو حنیف کے ہاں سے رلعت آپا لڑ جھگڑ کر واپس اٹھوا لائی تھیں۔

گڈو کو اس بار میں نے قریب ہی کے حیدر علی پرائمری اسکول میں داخل کروادیا تھا۔ منو کوٹی۔ بی تشخیص ہوئی تھی، اس کا علاج معالجہ بھی چالو تھا۔ ماں کو میں نے اب سلائی، کڑھائی سے بالکل منع کردیا تھا کہ وہ پہلے ہی سارا وقت چھوٹو کی دیکھ بھال میں خاصی بے آرام رہتی تھیں۔

غرض پٹڑی سے اتر جانے والی زندگی کی ریل گاڑی کو میں ایک مشکل فیصلہ کر کے بڑی محنت اور مشقت سے ایک بار پھر راہ پر لے آنے میں کسی نہ کسی حد تک کامیاب ہو چکی تھی۔ سو روپے روز کے حساب سے فلم کی عکس بندی کا معاوضہ طے ہوا تھا۔ اور ایک ماہ میں دس سے پندرہ دن تو عکس بندی کے نکل ہی آیا کرتے تھے۔ جہاں میں دفتر سے چھٹی لے کر جایا کرتی تھی۔ دفتر سے چھٹی کرنے پر تنخواہ میں جو کٹوتی ہوتی وہ وہاں سے پوری ہو جاتی۔ فی الحال مجھے معمولی نوعیت کے توجہ حاصل نہ کرنے والے کردار ہی میسر آئے تھے اور میں اسی میں خوش تھی کہ پیسے تو مل رہے تھے اور پھر یہ بھی تھا کہ اس طرح یہ بات اب تک ماں کے علم میں نہ آسکی تھی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار ماں سے چھپ کر کوئی قدم اٹھایا تھا۔ سو اس حوالے سے ضمیر پر بوجھ تھا اور جی کو دھڑکا بھی...... مگر میں بھی کیا کرتی؟

"شکر اللہ کا۔" ماں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کھولی کی پکی چھت کی جانب دیکھا۔

"کہ اس نے دن پھیرے...... تو بس دعا کیا کر میری بانو کے لیے۔"

"دعا تو میں کرتی ہے رے گوری ماں۔" وہ گود میں چھوٹو کو مزے سے جھلاتے ہوئے بولی۔

"پر سچ کہے گی، تیرے کو ضرورت ہی کیا پڑی تھی اس کا نکاح بنانے کی۔"

اور یہ سوال نہیں جیسے ماں کو احساس ندامت، پچھتاوا، تاسف اور نجانے کیا کیا کچھ تھا۔ تب ہی وہ پست لہجے میں آہ بھرتے ہوئے بولیں۔

"میں نے تو بھلا ہی سوچا تھا، میری بانو نے بھی بناہ کی بہتیری کوشش کی، پر وہ تھا ہی مردود۔"

اور یوں بھی مجھے اب اپنے گزرے کل میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سو میں نے دیوار میں نصب چھوٹے سے آئینے میں اپنا نک سک سے درست عکس دیکھا اور ماں کو خدا حافظ کہتی ہوئی چھوٹو کو پیار کر کے کھولی سے نکل آئی کہ مجھے دفتر سے دیر ہو رہی تھی۔

☆☆☆

"اس روز تو دفتر میں نہیں تو اور کہاں تھی بانو؟"

اس دن میں دفتر سے رخصت لے کر "راج کمل اسٹوڈیو" میں موجود تھی۔ ہیروئن رنجیتا کے ساتھ مجھے ایک منظر عکس بند کروانا تھا جو تا حال سیٹ پر نہیں پہنچی تھی۔

ہدایت کار غصے کو قابو میں کرنے کی خاطر استاد مہدی حسن کی غزلوں سے اپنا دھیان بٹانے کی کوشش میں سرگرداں تھے اور میں کاسٹیوم پہنے بڑی بے قراری سے انتظار کی کوفت جھیل رہی تھی تب دفتر سے مجھے ڈیزی کا فون اسٹوڈیو کے نمبر پر موصول ہوا۔ منو کی حالت بگڑنے کے سبب اسے اسپتال لے جایا گیا تھا اور میری وہاں اشد ضرورت تھی، پر اسی وقت رنجیتا آن وارد ہوئی۔ اب کسی صورت وہاں سے نکلنا ممکن ہی نہ تھا کہ میں پابند تھی۔ اپنا کام مکمل کروا کر میں بھاگم بھاگ ہندو جا اسپتال پہنچی پر تب تک خاصی دیر ہو چکی تھی۔ منو ہم سے روٹھ کر بہت دور جا چکا تھا۔

یہ ہوئی میرے لیے اسی قدر اچانک اور غیر متوقع تھی کہ میں ششدر رہ گئی۔ منو ماں ہی کا پیارا نہیں میرا بھی تو بیٹا تھا۔ بابو جی کے بعد میں نے حسب استطاعت اس معصوم روح کو بڑے دلار سے پالا تھا اور اب مجھے یوں لگتا تھا جیسے کسی نے میرے کلیجے کا ایک حصہ کھسوٹ کر کہیں دور پھینک دیا ہے۔
ہم دونوں عالم سوگ میں رہے، جب ماں ذرا سنبھلیں تو پہلا سوال یہی داغا۔

"پکچر کی شوٹنگ تھی ماں۔" میں جو چھوٹو کو ساتھ لٹائے تھپک رہی تھی، ماں کا سوال سن کر یک لخت خاموش رہی پر دوسرے ہی پل میں نے انہیں سچ بتانے کا فیصلہ کرلیا تھا کہ جب تک بات پوشیدہ تھی سو تھی پر اب۔

"کاہے کی شوٹنگ رے؟" یہ ماں کا الجھن زدہ لہجے میں مجھ سے کیا جانے والا ایک اور مشکل سوال تھا۔ میں نے بے بسی کے عالم میں ایک سرد سی طویل سانس لی اور اٹھ بیٹھی کہ میں اب ان کے ہر سوال کا جواب دینے کے لیے خود کو مکمل تیار کر چکی تھی۔

☆☆☆

"زوں...... زوں...... زوں......" خستہ حال پرس میں موجود موبائل نے دسویں بار تھرتھرا کر چڑائی سی بیٹھی اس کھچڑی بالوں والی کو اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی ناکام کوشش کی تھی۔

باہر طلوع فجر کو خاصا وقت گزر چکا تھا پر کمرہ تاحال نیم تاریک تھا اور نیم تاریک تو مارے نقاہت کے اس کی جھریوں زدہ سی آنکھیں بھی ہوئی جاتی تھیں۔ وہ جیسے ہر شے سے ماورا ہو کر بس سود و زیاں کا حساب کتاب کر کر کے حیران ہوئی جاتی تھی۔ یہ سارے خسارے ایک اسی کے مقدر میں درج کیوں تھے؟

موبائل ایک مرتبہ پھر تھرتھرایا تھا پر وہ نیم جاں اس بار بھی متوجہ نہ ہوئی۔

☆☆☆

"بھیا نے چٹھی میں لکھا ہے کہ وہ بیجے (ویزے) کھل گئے ہیں۔ میرے کو پاکستان جانا ہے بانو!"

آج بڑے دنوں بعد ماں نے پہلے کی طرح صبح میرے آگے چائے کی پیالی دھرتے وقت ازخود کوئی بات نکالی تھی ورنہ تو میرے فلموں میں کام کرنے والی بات جان کر وہ چپ کی چپ رہ گئی تھیں۔ میری توقع کے برخلاف نہ وہ مجھ پر خفا ہوئیں نہ ناصح بنیں۔ مجھے کوسا بھی نہیں اور نہ ہی اپنا ماتھا پیٹا، بلکہ خاموش سی ہوگئیں۔ بالکل خاموش۔ فلموں میں کام کرنے والی بات کا علم اب رفتہ رفتہ سب لوگوں کو ہو رہا تھا۔ کچھ بڑے حیران تھے، کچھ بہت خوش۔ چند ایک ناقد۔

وہاں کا ماحول کچھ ایسا ہے کہ اکثریت ایسی باتوں کو نہ معیوب سمجھتی ہے، نہ ناپسندیدہ۔ سو اگر میں پکچر میں کام کرنے بھی لگی تھی تو ان لوگوں کا کیا وقت لے سکتی تھی اور جہاں تک رہی قمر بلڈنگ والوں کی بات تو کافی عرصے سے اب ادھر خاموشی تھی۔ ادھر کی خبر رکھنے والوں سے سنا تھا کہ بڑی ماں خاصی بیمار رہنے لگی ہیں۔

"ہاں سنا تو میں نے بھی ہے۔ پر ماں! اب پاکستان جا کر کیا کرنا ہے؟" میں نے چائے کی پیالی لبوں سے لگاتے ہوئے بے دلی سے سر جھٹکا۔

"تو مت جا۔ پر میرے کو بھجوا دے۔" ماں کا اجنبیت بھرا لہجہ مجھے بہت محسوس ہوا تھا۔

"پر یہ کیسے ممکن ہے۔ میں تنہا آپ کے بغیر کیا کروں گی؟"

"تنہا فیصلے کر سکتی ہے، تو تنہا رہ بھی سکتی ہے۔" ماں کا لہجہ شاکی تھا۔

"بعض فیصلے انسان خود نہیں کرتا ماں! مجبوری کرواتی ہے۔ لیکن رہنے دیں، آپ نہیں سمجھ سکیں گی۔" ماں کے بے رحم لہجے نے میرا دل توڑ کر رکھ دیا تھا۔ سو میں چائے کی بھری پیالی یوں ہی چھوڑ کر کھولی سے باہر نکل آئی۔

عقب میں ماں اور چھوٹو دونوں بیک وقت رو دیئے تھے اور کیا خوش نصیبی تھی کہ وہ دونوں رو سکتے تھے۔

☆☆☆

"رامی کے بالمقابل سیکنڈ لیڈ رول رکھا ہے میں نے تمہارے لیے، یہ رہا معاہدہ۔ دستخط کرو۔ اور اگلے برس اس فلم نگری کے جگمگاتے آسمان پر چاند بن کر ابھر آؤ۔" ساگر جعفری ولایتی سگار کا ایک گہرا کش لینے کے بعد، بائیں ہاتھ سے راج شری کے مخصوص نشان والا معاہدے کا کاغذ میرے سامنے اپنے مخصوص انداز سے رکھتے ہوئے بولے تو میں جو آج اپنا حساب کتاب چکتا کرنے کی سوچ لے —— آئی تھی ان کی اس پیش کش پر دم بخود رہ گئی۔

"ہیلو مس خان! میرا وقت بڑا قیمتی ہے۔ چپ رہ کر برباد مت کرو۔"

انہوں نے چٹکی بجا کر کوفت زدہ سے انداز میں کہا تو میں چونک کر سنبھلی۔

"پر سر! رامی کہاں...... اور میں کہاں؟"

ہاں یہ بات اپنی جگہ درست تھی کہ ان دنوں میرا ایک کردار معمولی ہونے کے باوجود لوگوں پر گہری چھاپ چھوڑ گیا تھا۔ واقعی کہاں رامی اور کہاں میں...... ایک ایکسٹرا......

"کہاں ہو، یہ اہم نہیں۔ کہاں جا سکتی ہو، یہ میں دیکھ چکا ہوں۔ اب کیا یہ تم مجھے بتاؤ گی کہ کس کو کہاں کاسٹ کرنا چاہیے؟" ان کی نازک مزاجی عود آئی تھی۔

میں شرمندہ سی ہو گئی۔

"سیکنڈ لیڈ رول ہے۔ معاوضہ چھ ہزار۔ جس میں سے ایک ڈیڑھ ہزار میں تمہیں بطور بیعانہ ابھی دلوا سکتا ہوں۔ کیا قباحت ہے، لو...... دستخط کرو۔"

انہوں نے اس بار گویا اپنی جانب سے حجت تمام کر کے قلم میرے سامنے پھینکا۔

اور سچ تو یہ ہے کہ چھ ہزار میرے جیسی معمولی حیثیت کی لڑکی کے لیے ہرگز نظر انداز کیے جانے لائق رقم نہ تھی۔ میں نے جو کونڈی میں فلیٹ بک کروا رکھا تھا......؟ یک مشت یہ رقم ادا کر کے وہاں فوراً شفٹ ہو سکتا تھا۔ وہاں چلے جاتے تو کسی سیٹھ کی چال سے جان خلاصی ہو جاتی۔ علاقہ بدلتا تو گڈو، جوان دنوں مالی موالیوں میں بیٹھ بیٹھ کر پتے کھیلنا سیکھ چکا تھا، اس کی صحبت بھی بدل جاتی۔ اتنے سارے فوائد پر حاوی بس ایک سوچ تھی کہ میری ماں...... وہ میرے اس کام سے ناراض ہو گئی ہیں۔

"مس خان......!" ساگر جعفری نے مجھے مسلسل کسی سوچ میں غلطاں —— دیکھ کر جلالی انداز سے میز پر ہاتھ مارا۔

"جانتی ہو کہ میں اتنی دیر اپنے سامنے صرف ہیمامالنی (ہیما مالنی) کو برداشت کر سکتا ہوں پھر یوں میرا وقت خراب کرنے کا کیا جواز ہے؟"

"معذرت خواہ ہوں سر! پر مجھے کچھ وقت درکار ہے۔" میں نے الجھے ہوئے سے لہجے میں کہا تو دفعتاً وہ لطف لینے والے انداز میں بڑے زور سے ہنس پڑے۔ پھر سگار کا ایک گہرا کش لے کر گہری نظروں سے مجھے دیکھ کر گمبھیرتا سے بولے۔

"ہوں...... کسی کو رضا مند کرنا چاہتی ہو تو جاؤ...... ایک ہفتہ دے رہا ہوں تمہیں۔ اپنی الجھن رفع کر آؤ۔ آؤ گی ضرور، اتنا میں جانتا ہوں۔ لہٰذا یہ معاہدہ میں اپنی دراز میں رکھ چھوڑتا ہوں۔"

ان کے اطمینان کا عالم ہی عجیب تھا۔ دیکھ کر مجھے اس قدر گھبراہٹ ہوئی کہ فی الفور کام کا بہانہ کر کے ان کے دفتر سے نکل آئی۔

باہر حسب معمول چہرے پر شوق کا ایک جہاں اور آنکھوں میں ہزاروں رو پہلے سپنے لیے، آڈیشن دینے کے لیے آنے والوں کا جم غفیر موجود تھا۔ ان میں سے اکثریت نے ناکام ہو جانا تھا اور چند ایک نے کامیاب اور میری قسمت کہ ایسے کسی بھی مرحلے سے گزرے بغیر، چاہے بغیر، سوچے سمجھے بغیر میری تقدیر مجھے کامیابی کے اگلے قدم پر دھکیلنے کو تیار تھی اور میں خود؟

☆☆☆

"باپ نہ سہی...... سر پر کسی ماما، تایا، چاچا ہی کا سایہ ہو تو گڈو کا ہے کو بگڑے۔ آج پتے کھیلتے

ہوئے کوتوال کے ہاتھ لگنے سے بال بال بچا ہے۔ اے گوری ماں! میں تو کہتی ہوں تم اپنے لڑکے کو لے کر اپنے بھیا ہی کے پاس چلی جاؤ۔ یوں بھی ادھر تمہارا کون ہوتا سوتا بیٹھا ہے، یہاں سب لاکھ دکھ سکھ کے ساتھی ہیں، پر اپنے خون کی تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ پرائے بہن تو بات میرے منہ پر مار دیتا۔"

ہمسائی رضیہ سخت متفکر بیٹھی ماں سے مخاطب تھیں۔ دراصل ان ہی کا بڑا لڑکا ایاز، گڈو کو ان جواریوں کے درمیان سے کان پکڑ کر اٹھا لایا تھا۔

اتفاقاً اسی وقت وہاں پولیس کے دو کانسٹیبل آ کر انہیں دبوچ کر لے گئے۔ معاملہ واقعی حد درجہ سنجیدہ اور پریشان کن تھا۔ زندگی میں پہلی بار میں نے گڈو کو بے اختیار دونوں ہاتھوں سے پیٹا تھا اور اب بطور سزا کان پکڑوا کر کھولی میں دیوار کے ساتھ کھڑا کر رکھا تھا۔

ہم جس علاقے میں رہائش پذیر تھے، وہاں زیادہ دیر تک بچوں کا بچپنا قائم رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ ایک ظالم اور سفاک حقیقت تھی اور اس حقیقت سے ـــ نظر پھیرنا ناممکن تھا تو پھر ممکن کیا تھا؟

"کہہ تو رہی ہوں میں بانو سے کہ لکھوا دے ویجہ (ویزا)۔ ادھر سے بھیا مسلسل بلاتے ہیں کہ پاس آ کر رہو۔ مگر یہ پیاہ کے بعد اب اپنی چلانے لگی ہے۔ تم ہی بتاؤ میں کدھر جا کر ماتھا پھوڑوں۔"

"کسی کے آگے ماتھا پھوڑنے کی ضرورت نہیں۔" میں جو اتنے دن سے بے نام سی الجھن کا شکار تھی جیسے ایک دم کسی فیصلے پر پہنچ کر ٹھنڈے لہجے میں بولی۔

"جانا چاہتی ہیں نا آپ کراچی۔ بس اب شانت ہو جائیں۔ بھیج رہی ہوں میں ویزے کی درخواست دلی۔"

☆☆☆

میری رہائش یہیں تھی، نوکری یہیں تھی، مستقبل یہیں تھا۔ اب اگر درمیان میں ذرا دیر کے لیے پاکستان آ بھی رہا تھا تو یہ کوئی ایسی پریشان کن بات نہ تھی۔ حالانکہ خط میں ماموں نے لکھا تھا کہ ماں کو وہاں سے ریل میں بٹھا دو، وہ ادھر سے آ کر بحفاظت انہیں گھر لے جائیں گے مگر ان کی یہ تجویز میرے لیے ناقابل عمل یوں تھی کہ ماں کو تو حقیقتاً بائی کلہ سے بھنڈی بازار تک کا راستہ معلوم نہ تھا۔

اب تو پہلے دلی سے ویزا لے کر پھر پاکستان جانا تھا کہ حالات بگڑتے ہی ادھر کا سفارت خانہ بند کر دیا گیا تھا۔ سو میں نے دفتر سے اپنی جمع شدہ چھٹیاں لے کر ماں کو پاکستان لے جانے کی تیاری شروع کر دی۔

ظاہر ہے ہمیشہ تو وہاں رہنا نہیں تھا اور واپس آ کر اب میں دوبارہ عیسیٰ سیٹھ کی چال میں رہنا نہیں چاہتی تھی۔ سو بس ایک آخری بار کے خیال سے میرے قدم آپ ہی آپ ساگر جعفری کے دفتر کی جانب بڑھ گئے۔ مجھے اپنے روبرو پا کر ان کے سگار کے دھوئیں سے سیاہ پڑتے لبوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ چمکی تھی۔ میں نے معاہدے پر دستخط کر کے معاوضہ لے لیا۔ پکچر کی عکس بندی چار ماہ بعد شروع ہونا تھی اور مجھے ڈیڑھ ماہ بعد پاکستان سے واپس لوٹ آنا تھا۔

ماموں نے چونکہ وہاں سے اپنی بیماری کا خط لکھ دیا تھا، سو ہمیں ویزے کے حصول میں ذرا آسانی ہو گئی تھی۔ اس روز دفتر سے واپسی پر میرا ارادہ مارکیٹ جا کر کچھ تحائف کی خریداری کا تھا۔ اسی ادھیڑبن میں بعجلت دفتر سے باہر نکلی تو سامنے کھڑے اس منحوس اجنبی کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"آپ؟" میرے لبوں سے سرسراتی آواز برآمد ہوئی تھی۔

"ہم ارادہ باندھا تھا کہ اب تمہارا سامنا نہ کروں گا مگر پچھلے دنوں کسی پکچر میں تم سے مشابہ ایک چہرا دیکھا تو خود پر اختیار ہی نہ رہا۔ من میں سمائی کہ تم سے جا کر ایک بار پوچھوں تو سہی کہ کہیں وہ تم تو نہیں ہوتا با تو؟"

دفتر سے نزدیک ترین ایرانی کیفے کا ماحول ان

گزرے دو سالوں میں بالکل نہ بدلا تھا۔ سجاوٹ کا وہی انداز۔ وہی میز کرسیاں۔ دیواروں پر آویزاں ایرانی حسن کی قاتل تصاویر اور پس منظر میں گونجتا وہی نغمہ۔

ہاں مگر بہت کچھ ایسا بھی تھا جو یکسر بدل گیا تھا جیسے کہ سامنے بیٹھے ماسٹر صاحب۔ اب اپنی بے انتہا گری ہوئی صحت اور زندگی کی چمک سے عاری آنکھوں کے باعث آپ اپنا سایا معلوم ہوتے تھے اور ان کے بالمقابل براجمان میں خود......

"میں ہی تھی۔" میرے سچے جواب نے ان کی بے رونق آنکھوں کی ویرانی حد سے سوا کر دی۔

"بانو......" وہ جیسے کچھ دیر ہمت مجتمع کرنے کے بعد بڑے دکھ سے بولے۔ "یہ تمہاری راہ تو نہیں تھی؟"

"تب پھر تقدیر نے میرے قدموں تلے کیوں لا بچھائی؟" میرا لہجہ نا معلوم کیوں احتجاجی سا ہو گیا۔ "جو راستہ خود میں نے اپنے لیے منتخب کیا تھا، اس پر مجھے جینے کیوں نہ دیا؟"

"مگر تم راستوں کی محتاج کب تھیں بانو! تم تو بہتی ندیا تھیں۔ اپنا راستہ خود بنانے والی۔"

"نہیں رہی تھی میں بہتی ندی...... ٹھہرے ہوئے پانی کا بدبودار جوہڑ بن چکی تھی۔ آپ تو چلے گئے تھے چھوڑ کر...... آپ کو کیا معلوم؟"

"چہ خوب......" وہ بے بسی سے ہنستے ہوئے بڑے رنجور لگے۔ "چھوڑ کر میں گیا تھا یا تم خود؟ ہماری آخری ملاقات ذرا یاد تو کرو بانو!"

"جو آپ چاہتے تھے...... وہ ممکن نہ تھا۔" میں نے نظریں چرا کر کہا۔

"کہ ہم اچھے دوست تو بن کر رہ سکتے تھے، یہ تو ممکن تھا مگر تمہارے اس روز کے رویے نے تو اسے بھی ناممکن بنا دیا اور دیکھ لو، میرے بغیر کھو دیا نا تم نے خود کو۔" کیا کلیجہ شق کرنے والا جملہ بول گئے تھے وہ۔ میں بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ سچ ہی تو کہتے تھے وہ، کرتا کیا تھا مجھے اور کر کیا گئی تھی میں۔

"اس طرح مت روؤ بانو!" وہ سراپا اضطراب بن گئے۔

"روؤں نہیں تو پھر اور کیا کروں۔ میری زندگی پہلے ہی خاصی دشوار ہے۔ آپ اس طرح کی باتیں کر کے اسے مزید مشکل مت بنائیں۔" میں نے ذرا تھمتے ہوئے کہا۔

"چلو...... نہیں بناتا۔" وہ سر جھٹک کر یوں مسکرائے جیسے کوئی نادان بچے کی بات پر مسکراتا ہے۔ "یہ بتاؤ، تمہارے گھر میں سب کیسے ہیں؟"

"منو گزر گیا...... باقی ماں اور گڈو خیریت سے ہیں۔" میں چھوٹو کا تذکرہ ان کے سامنے کرتے کچھ لجا سی گئی۔

"منو گزر گیا؟" وہ بے تحاشا چونک کر ہولے سے بولے۔ "کیسے گزر گیا؟" میں نے بتایا تو وہ چند ثانیے گہرے رنج کے زیر اثر رہنے کے بعد نسبتاً پست آواز میں گویا ہوئے۔

"میں نے تو سنا تھا کہ تمہاری شادی ہو گئی۔" یعنی "میرے گھر والوں" سے ان کی مراد یہ تھی۔ میں زہر خند سا مسکرا دی۔

"اب میں طلاق یافتہ ہوں۔"

"میرے خدا۔" انہوں نے بے اختیار اپنا سر تھام لیا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"یہ سچ ہے۔" میں خود اذیتی سے بولی۔ "خیر، میری جانے دیجیے۔ اپنی بھی تو کچھ سنائیے۔"

"کچھ نہیں سنانے کو، سوائے اس کے کہ دن گن رہا ہوں۔" وہ بے اختیاری میں کہہ کر جیسے کچھ احساس ہو جانے پر ایک دم خاموش سے ہو گئے۔

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر الجھن زدہ نظروں سے ان کا ماند پڑتا چہرہ دیکھا۔

"کوئی مطلب نہیں۔" وہ اس بار سنبھل کر خاصے محتاط لہجے میں بولے تھے۔ "یہ بتاؤ، کیا میں

گوری ماں سے ملنے گھر آ سکتا ہوں؟"

"آپ کو اجازت کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟"
میں نے خفگی سے انہیں دیکھا۔

"بصد شوق آئیں۔ یوں بھی اس ماہ کی انیس کو ہماری پاکستانی روانگی ہے۔"

☆☆☆

"دھڑ ...... دھڑ ...... دھڑ ......" کسی نے پوری قوت سے زنگ آلود داخلی دروازہ پیٹا تھا۔ پر وہ جو ماں نصیب جو اس حبس زدہ کمرے میں ارد گرد بکھرے سامان کے درمیان گٹھڑی بنی ہوئی، پیاسی جیسے ہر احساس سے ماورا ۔۔۔ تھی، یہ آواز سن کر بھی رتی بھر تغیر رونما نہیں ہو سکا۔

"الوداع ...... الوداع ......" اس کے پپڑی زدہ آبنوسی لب نجانے کب سے بس اسی ایک لفظ کی گردان کیے جا رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اس کا لمحہ بہ لمحہ تاریک ہوتا ذہن عالم ماضی کے کسی مقام پر جا کر کہیں اٹک گیا ہے۔

"کاکے! کچھ گڑ بڑ لگتی ہے۔ ایسا کر تو دیوار پھلانگ کر اندر کود جا۔" وہ انیس بیس برس کی حلیے سے محنت کش دکھائی دینے والی لڑکی، اپنے ساتھ کھڑے دس گیارہ سال کے بھائی کی جانب دیکھ کر بے پناہ تشویش سے بولی تھی۔

اس کے ارد گرد رفتہ رفتہ پورا محلہ اکٹھا ہو رہا تھا اور باہر کے شور سے بے نیاز اندر پڑی وہ تجہارو نے کمن سے آتی آوازوں کو سن کر ادھ موئی ہوئی جا رہی تھی۔

"الوداع ...... الوداع ......"

☆☆☆

"اماں نے بہت ظلم کیا تم لوگوں کے ساتھ. اب محتاج پڑی ہیں۔ ہو سکے تو انہیں معاف کر دینا بانو! اور اپنی لوگ کو بھی۔"

ریل ہماری سہ پہر کی تھی، پر ماں نے مارے جوش و خروش کے سارا سامان علی الصبح ہی باندھ کر ایک جانب رکھ دیا تھا۔ سارا دن الوداعی ملاقات کی غرض سے لوگوں کی آمد و رفت جاری رہی اور اس وقت ہم اسٹیشن کی اور بس نکلنے ہی والے تھے کہ تب ہی اچانک راشدہ آپا آ گئیں۔

گزرتے دس برسوں نے ان کے ظاہر پر اثر تو ضرور ڈالا تھا پر ایسا بھی نہیں کہ میں انہیں پہچان ہی نہ پاتی۔ سو میں انہیں گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر ساکت رہ گئی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آیا کس طرح کا ردعمل ظاہر کروں؟

اسی اثناء میں وہ خود آگے بڑھیں اور ایک دم میرے سینے سے لگ کر سسک پڑیں اور مجھ پر یہ ظالم انکشاف ہوا کہ میں نے ان سے نفرت کی ہی کب تھی؟ سو میرا دل جو پہلے ہی رقیق ہو رہا تھا، آنکھوں کے رستے بہنے لگا۔ سیاہ برقعے میں لپٹی اشک بار ماں نے شفقت سے جوان کا کندھا سہلایا تو وہ بلا مبالغہ زندگی میں پہلی بار ان کے سینے سے لگ کر شرمساری سے معافی تلافی کرنے لگیں۔

"چھوڑ نا راشدہ! وقت تھا بیت گیا ...... تیرے کو اگر آنا ہی تھا تو جلدی آ جاتی نا تو میں مل آتی بڑی آپا سے۔ میرے کو تو پتا ہی نہیں تھا کہ وہ اتنی بیمار ہو گئی ہیں۔"

ماں اپنائیت بھرے لہجے میں سادگی سے یوں بولیں، جیسے ہمارے درمیان کبھی کوئی کڑواہٹ، کوئی تلخی آئی ہی نہ ہو۔ میں نے اس سمے بڑی حیرت سے ماں کی اور دیکھا تھا کہ وہ آخر کیسے اتنی آسانی سے محض لمحہ بھر میں وہ ساری تکلیف دہ یادیں بھول سکتی ہیں؟ آخر کس مٹی سے بنی ہیں وہ ...... شاید اسی مٹی سے کہ جس سے خود میرا خمیر اٹھایا گیا تھا پر اس کا ادراک مجھے بڑی دیر بعد جا کر ہوا۔

"ڈر تھا کہ کہیں تم لوگ میرے کو دھکے دے کر یہاں سے باہر نہ نکال دو۔" ماں سے علیحدہ ہو کر وہ شرمندگی سے وضاحت کرنے لگیں۔

"ابھی تو ایسے ہمت جتائی کہ سنا سفر پر جا رہے ہو ...... بچھڑنے کا سمے ہے تو شاید رعایت دے دو۔" ان کی منطق کمال تھی۔ بچھڑ تو خیر ہم کئی برس پہلے ہی گئے تھے۔ بہر کیف وہ مل ملا کر خط لکھنے کا وعدہ لے کر

لوٹ گئیں۔
تب ماسٹر صاحب جو ہمیں ریل گاڑی میں بٹھانے کی غرض سے آئے ہوئے تھے، نے ہمارا بندھا ہوا سامان ایک ایک کر کے کھولی کے باہر رکھا اور خود دو سالہ چھوٹو کی انگلی تھامے، ماں اور گڈو کے ہمراہ باہر نکل گئے۔ تب میں نے کھولی کے در و دیوار پر ایک نم آلود الوداعی نگاہ ڈالی اور باہر نکل کر دروازے پر تالا ڈال کر چابی ماسٹر صاحب کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔
''ہمارے پیچھے گھر کا خیال رکھیے گا ماسٹر صاحب۔''
''جب تک ہوں... خیال رکھوں گا۔'' یک لخت توقف کے بعد انہوں نے چابی تھام لی گی۔ چوں کہ دیر ہو رہی تھی سو میں ان کے الفاظ پر زیادہ غور کیے بغیر ہی ان کے ہمراہ پرانی ٹیکسی میں آ بیٹھی، جس میں پہلے ہی سے سامان، گڈو اور چھوٹو خاصی بے تابی سے میرے منتظر تھے۔ میرے اور ماسٹر صاحب کے اندر بیٹھتے ہی ٹیکسی چل پڑی۔
میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا اس روز بھی اودے اودے بادلوں نے بمبئی کے آسمان کو ڈھانپ رکھا تھا۔
کس قدر بے تکلف باتیں ہوا کرتی تھیں، ماسٹر صاحب اور ہم لوگوں کے درمیان۔ مگر مقام حیرت کہ اس روز راستے بھر ہم سب اپنی اپنی ہی سوچوں میں کھوئے رہے۔ جانے پہچانے منظر، رستے، گلیاں، چوبارے اور چہرے...... رفتہ رفتہ سب ہی کچھ پیچھے رہ گیا اور ''بمبئی سینٹرل اسٹیشن'' آ گیا۔ ریل نے بڑی وحشت ناک سیٹی بجائی تھی، جسے سن کر میرے جی میں آئی کہ بس..... اب میں یہیں سے واپس لوٹ جاؤں گر......
''لوٹ کر ضرور آنا بانو!'' وقت رخصت بوگی کی کھڑکی سے جڑے کھڑے ماسٹر صاحب نے اپنی خاموشی توڑی تھی۔
''کیوں نہیں آؤں گی؟'' میں نے کھڑکی کے اس پار کھڑے ماسٹر صاحب کو تعجب آمیز یاسیت سے مسکرا کر دیکھا۔
''ہاں بھلا..... کیوں نہیں آؤ گی؟'' وہ اداس نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے، نوحہ گروں کے سے انداز میں مسکرا کر غالباً خود کو تسلی دے رہے تھے۔
تب ہی ریل نے آخری سیٹی بجائی تو گڈو خوشی سے اچھل پڑا۔ شادی مرگ کی کیفیت میں گھری ماں نے گود میں بیٹھے چھوٹو کو تھپکتے ہوئے آیت الکرسی کا ورد شروع کر دیا۔
ریل چل پڑی۔ کھڑکی کے اس پار کھڑے ماسٹر صاحب لمحہ بہ لمحہ دور ہوتے چلے گئے اور میں نے دیکھا کہ ٹھیک اسی لمحے بمبئی کا غبار آلود آسمان رو پڑا تھا۔

☆☆☆

''پھر دن، ہفتوں میں بدلے...... ہفتوں نے مہینوں کی صورت اختیار کی اور مہینے سال، دو سال بیتتے چلے گئے پر آپ واپس نہیں گئیں۔'' سترہ برس کی سن موہنی کرن نے پہلی بار میری کہانی سن کر بہت تاسف سے میری جانب دیکھا تھا۔
''ہاں..... پھر نہیں گئی۔'' میری مسکراہٹ پھیکی اور شکست خوردہ تھی۔
''پر کیوں امی!'' وہ بہت حیرت سے پوچھ رہی تھی۔
''بس قسمت میں یہی لکھا تھا شاید۔'' اور میں نے آج بھی اس کم بخت کو مورد الزام ٹھہراتے ہوئے کہا۔
''اور پھر تمہیں بھی تو میرے توسط سے یہیں دنیا میں آنا تھا نا۔'' میں نے اسے ٹالنے کی خاطر کہا، پر وہ برا مان گئی۔
''یہ میرے سوال کا منطقی جواب تو نہ ہوا۔''
''جواب میرے پاس شاید ہے ہی نہیں۔'' میں نے تھک کر رنجیدگی سے کہا۔ ''بس کچھ بہلاوے ہیں اور جھوٹی سچی تاویلیں جو میں خود کو دیتی ہوں۔''
''پر واپس نہ جانے کی کوئی تو ٹھوس وجہ ہو گی

آپ کے پاس، جو آپ نے اس قدر آسانی سے اپنی اسٹیبلشڈ زندگی کو خیرباد کہہ دیا؟" اس کے لہجے میں بڑا تعجب اور حیرانی تھی۔

"ہاں...... وجہ تو بہرحال تھی نا میرے پاس۔" اس بار بھی خفیف سا مسکرائی تھی۔

"اور وہ وجہ کیا تھی؟"

"ماں کا بھتیجا...... مسیح اللہ......"

☆☆☆

"سنا ہے وہاں مرد اور عورت بس میں ساتھ ساتھ بیٹھ کر سفر کرتے ہیں۔"

ماں کو بچھڑے ہوؤں سے مل کر گویا ہفت اقلیم کی دولت مل گئی تھی۔ آج سے پہلے میں نے ماں کو کبھی اس قدر شاداں و فرحاں نہ دیکھا تھا۔ بابوجی کے دور میں بھی نہیں۔ وہ اپنے خونی رشتوں کے درمیان پہنچ کر خود کو بہت آسودہ محسوس کر رہی تھیں۔

ہمیں شہاب ماموں کینٹ اسٹیشن سے سیدھا ناظم آباد میں واقع اپنے گھر لے آئے۔ ایک سو بیس گز پر مشتمل یہ سادہ سا گھر ماں کے علاوہ مجھے بھی بہت بھایا تھا۔ ہر وقت سر پر دوپٹا اوڑھے رکھنے اور دھیمے سروں میں بات کرنے والی محبت ممانی آداب میزبانی خندہ پیشانی سے ادا کر رہی تھیں۔ اس روز چھوٹے ماموں آفتاب کا گھرانا ہم سے ملاقات کرنے کی غرض سے آیا ہوا تھا۔

ظہرانے کے بعد میں نے۔ ماں کے کہنے پر ان سب کے لیے بہت خلوص و محبت سے خریدے گئے تحائف "ہرے بکسے" سے نکال کر بانٹ دیے تھے۔ بعدازاں ماں تو بڑوں کے ساتھ جا بیٹھیں اور میرے ہم عمر بڑے کمرے میں مجھے گھیر کر بیٹھ گئے۔

چوں کہ مجھے زندگی میں پہلی بار ان خوب صورت رشتوں کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا تھا سو قدرتی طور پر مجھے بڑا بھلا سا احساس ہو رہا تھا کہ یہ سوال اچانک ہی شہاب ماموں کے بڑے لڑکے صدیق کی جانب سے آیا تھا۔ جس کی معنی خیزی پر غور کیے بغیر میں فوراً ہی اپنی ازلی سادگی بھرے لہجے میں جواباً بولی۔

"ہاں کرتے ہیں...... تو کیا یہاں ایسا نہیں ہوتا؟"

"ایسی بے حیائی کے مظاہرے تو وہیں ہوتے ہوں گے۔ ہم تو بڑی سہولت اور ٹھاٹ سے علیحدہ بیٹھ کر سفر کرتی ہیں۔" صدیق سے چھوٹی نغمہ جو خاصی تنقیدی نگاہوں سے میرا جائزہ لینے میں مصروف تھی، تنک کر بولی تو میں ذرا خفیف سی ہو گئی۔

"انڈیا میں رہتی ہو۔ تاج محل تو ضرور دیکھا ہوگا۔" چھوٹی عاقلہ نے بچگانہ معصومیت سے استفسار کیا تو اس بار میں مسکرا دی۔

"تاج محل کوئی بمبئی میں تھوڑا ہے۔"

"تو پھر وہاں کیا ہے؟"

"وہاں تو انڈیا گیٹ ہے۔ حاجی علی کا مزار ہے۔ چوپاٹی ہے۔ میرین ڈرائیو اور یہاں سے ملتا جلتا موسم۔" میری جنم بھومی کا ذکر تھا سو میرا لہجہ خود بخود تفاخر آمیز ہو گیا۔ میں یک دم افسردہ سی ہو گئی کہ اس لیے مجھے اپنا گھر یاد آ گیا تھا۔

"سارے فلمی ستارے بھی تو وہیں رہتے ہیں نا آپا۔ آپ نے بھی کسی کا گھر دیکھا؟" شہاب ماموں کے سب سے چھوٹے فاروق کو یقیناً فلموں سے گہرا شغف تھا۔

"ہاں...... دلیپ کمار کا گھر دیکھا ہے اندر سے۔" میں نے اسے مسکراتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بتایا۔

"دراصل ہمارے چچا "جوہو" میں ان کے ہمسائے تھے، جو بعد میں لندن چلے گئے تھے۔"

"واقعی؟" جملہ حاضرین کی اکثریت یہ جان کر خوش گوار حیرت میں گھر گئی مگر نغمہ ناک بھوں چڑھا کر ایک مرتبہ پھر کرخت لہجے میں بولی۔

"تم لوگ اس قدر حیران کس لیے ہوئے جاتے ہو یہ جان کر...... کیا دلیپ کمار کا گھر دیکھ لینا کوئی اتنی بڑی بات ہے؟"

"اور کیا...... کوئی بڑی بات نہیں۔" اس عرصے

میں مستقل خاموش بیٹھ کر ہماری گفتگو سنتے چھوٹے ماموں آفتاب کا سب سے بڑا بیٹا مسیح اللہ پہلی بار بڑے شگفتہ سے انداز میں لب کشا ہوا۔

"یہ اپنی نغمہ تو روز دیکھتی ہے گھر...... خواب میں۔" وہ اس انداز سے گویا ہوا تھا کہ سب کے ساتھ میں بھی بے اختیار بڑے دن بعد پورے من سے ہنس پڑی اور ٹھیک اسی لیے اس نے جیسے کسی سحر کے زیر اثر بہت چونک کر میری جانب دیکھا تھا۔

☆☆☆

"اماں...... اماں...... ہوش کرو اماں!" کاکے نے نوری کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دیوار پھلانگ کر اندر سے لگی کنڈی کھول دی تھی۔ یوں حواس باختہ سی نوری بڑی تیزی سے سنسان پڑے صحن میں داخل ہوئی اور پھرتی سے صحن عبور کرتے ہوئے اس اجاڑ بیابان سے کمرے میں آئی تھی جہاں زندگی سے شکست کھائی ہوئی وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑی تھی۔

کچھ ایسا دردناک منظر تھا کہ نوری کا دل دھل کر رہ گیا۔ وہ ایک ہی جست میں اس تک پہنچی اور اب اس کا کھچڑی بالوں والا سر اپنی گود میں رکھے اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کر رہی تھی۔

"آنکھیں کھولو نا اماں! ہوش کرو۔" اس نے کاکے کا لایا ٹھنڈا پانی چھینٹوں کی صورت اس کے جھریوں زدہ چہرے پر چھڑکتے ہوئے ازحد پریشانی سے کہا۔

"مجھے تو ان کی حالت ٹھیک نہیں لگتی باجی! اسپتال لے چلو۔" کاکے نے تشویش سے کہا تو نوری بگڑ گئی۔

"میرے پاس روپیہ نہ کوڑی...... ایسے کیسے اسپتال لے چلوں۔"

"تو پھر اب کرو گی کیا...... یہ تو ہوش میں آ ہی نہیں رہی ہیں۔" کاکے کا سوال جائز تھا۔

نوری کے چہرے پر سخت تشویش پھیل گئی...... [illegible]

بے آسرا کی سانس بھی خاصی مدھم محسوس ہو رہی تھی۔ معاً نزدیک ہی کہیں سے ایک مرتبہ پھر فون کی "زون زون" سنائی دی اور نوری نے لمحہ کی تاخیر کیے بنا سرہانے پڑے کھیس کو کھسیٹ کر اپنے نزدیک کرتے ہوئے اس کے اندر پڑا مسلسل تھرتھراتا فون برآمد کرتے ہوئے لپک کر موصول کر لیا۔

"ہیلو امی...... کہاں ہیں آپ؟" دوسری جانب کوئی بڑی بے قراری سے بولا تھا۔

☆☆☆

تیری جھیل سی گہری آنکھوں کا
تیری ریشم جیسی زلفوں کا میں دیوانہ

چھوٹے ماموں آفتاب تو خیر گزرے برس جنت مکانی ہو چکے تھے پر کنبہ تو ان کا موجود تھا سو آج کی ہماری یہ دعوت واجدہ ممانی کے گھر تھی۔ چوں کہ آپس میں چھوٹے ماموں اور بڑے ماموں کے بچوں کی خاصی دوستی تھی، سو اس وقت بھی خوب میلے ٹھیلے کا ماحول بنا ہوا تھا۔ یہ بات بھی اسی روز میرے علم میں آئی تھی کہ مسیح اللہ شوقیہ گلوکار تھا۔ اور خاندان کی کوئی بھی تقریب ایسی نہ تھی جس میں اس سے گانا سنانے کی فرمائش نہ کی جاتی ہو سو اس وقت بھی وہ نغمہ کی فرمائش پر یہ گیت میری جانب دیکھ کر بڑی لے میں سنا رہا تھا۔ اس کے انداز میں اتنی محویت تھی کہ مجھے الجھن سی محسوس ہونے لگی۔ آخر وہ اس طرح کا برتاؤ کیوں کر رہا تھا؟

اور جس روز جانا...... میں ششدر رہ گئی۔

☆☆☆

"اماں! اس کے گھٹاؤں جیسے سنہری بال گھٹنوں کو چھوتے ہیں۔"

آج مسیح اللہ بڑے دن بعد یوں ماں کے گھٹنوں سے لگ کر بیٹھا تھا اور کیوں بیٹھا تھا؟

کچھ دن سے اس کے بدلے بدلے سے رنگ ڈھنگ دیکھ کر ماں ہونے کے ناتے اتنا تو واجدہ ممانی سمجھ ہی گئی تھیں، تب ہی انہوں نے تجاہل عارفانہ سے [illegible]

لگاتے ہوئے نخوت سے کہا۔

"تو؟"

"تو یہ کہ اس کی آنکھ کا رنگ بھی شربتی ہے اور ساڑھی اس پر ایسے جچتی ہے جیسے بنائی ہی اس کے لیے گئی ہو۔" وہ سحر زدہ سے لہجے میں بولتا چلا گیا۔

"ستیاناس۔" واجدہ ممانی کلّے میں پان دبائی ہوئی بھڑک کر بولیں۔ "تو کیا اس ناس پیٹی پر تحقیق کر رہا ہے۔"

"تحقیق نہیں...... محبت......" وہ اپنی بے ریا آنکھوں میں دیوانگی کا ہر رنگ لیے بولا۔

"محبت ہو گئی ہے مجھے اس سے۔"

"بے غیرت۔" وہ تلملا گئیں۔ "ماں کے سامنے بیٹھ کر کس ڈھٹائی سے عشق و عاشقی کی باتیں کر رہا ہے۔"

"رشتہ لے کر آپ جائیں گی تو آپ ہی سے ایسی باتیں کروں گا نا اماں۔" ادھر اطمینان کا عالم دیدنی تھا۔

"پاگل ہوں جو تیرا رشتہ لے کر جاؤں گی وہاں۔" وہ چلائیں۔

"ارے بے حیا شہر کی پروردہ ہے وہ۔ اوپر سے نوکری پیشہ۔ ایک بچے کی ماں۔"

"محبوب کی گلی کا تو خار بھی گلاب لگتا ہے اماں!" وہ مجنونانہ لہجے میں بولا۔ "وہ تو پھر اس کے وجود کا حصہ ہے، مجھے اس پر کیا اعتراض۔"

"ارے سبحان اللہ۔ کم بخت۔ تو تو بالکل ہی پاگل ہو گیا۔ ارے کوئی دیکھو تو سہی اس بمبئی کی بانو نے دو ہی دن میں میرے بچے پر کیسا جادو کر ڈالا۔" وہ چلّا چلّا کر واویلا مچانے لگی تھیں۔ پر سبحان اللہ ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا کہ جادو تو اس پر واقعی چل چکا تھا۔

☆☆☆

"اللہ میری توبہ۔ صورت کی بھولی، گنوں کی پوری...... میں نے تو اس بانو کے نرالے رنگ ڈھنگ دیکھ کر پہلے ہی دن صدیق کے ابا سے کہہ دیا تھا کہ تحریر لکھوا لو میری بات کہ آپ کی یہ بمبئی والی بھانجی ضرور کوئی چاند چڑھا کر دم لے گی اور دیکھ لو...... وہی ہوا نا۔"

آج مدھم آہنگ و نرم گفتار نگہت ممانی کی آواز سے ساری ملائمت مفقود تھی اور وہ بڑے تلخ و حقارت آمیز لہجے میں مسلسل بول رہی تھیں۔

کیوں بول رہی تھیں؟ میں بس یہی جاننے کی خاطر بنا سوچے سمجھے ہمارے لیے مخصوص کیے گئے کمرے سے بلا ارادہ باہر نکل کر آواز کی سمت بڑھتی چلی گئی اور اب یہ جان کر کہ وہ کیا کیا کچھ بول رہی ہیں، اپنی جگہ منجمد سی ہو گئی تھی۔

یہ دن کا پہلا پہر تھا۔ شہاب ماموں اس وقت تک اپنے کام کاج پر چلے جاتے تھے۔ اور واجدہ ممانی کو، نگہت ممانی سے اس متعلق صلاح مشورہ ان کی غیر موجودگی ہی میں کرنا تھا۔ انہیں نگہت ممانی کی فہم و فراست پر پورا بھروسا تھا۔ اس سے قبل بھی کئی ایک الجھنوں سے نگہت ممانی ہی نے ان کی گلو خلاصی کروائی تھی سو آج بھی وہ بڑی امید لے کر ان کے در پر حاضر ہوئی تھیں۔

"ٹھیک کہا آپ نے بڑی بھابھی؟"

واجدہ ممانی جو صحن میں بچھے تخت پر نگہت ممانی کے برابر براجمان تھیں۔ اپنے بٹوے سے پان کی گلوری برآمد کر کے نگہت ممانی کو تھماتے ہوئے زور و شور سے گردن اثبات میں ہلاتے ہوئے گویا ہوئیں۔

"اچھال چھکا نے اپنے لمبے بال دکھا دکھا کر اس طرح میرا بیٹا قابو کیا ہے کہ نہ پوچھو...... دن رات ایک ہی رٹ ہے کہ جان دے دوں گا، اگر گوری پھپھی کے پاس رشتہ لے کر نہ گئیں تو...... اب آپ ہی بتائیں بھابھی! میں ایسے کیسے ایک بچے کی ماں سے اپنے جوان رعنا کنوارے کو بیاہ دوں؟"

"پہلے ہی کسی مضبوط کھونٹے سے باندھ دیا ہوتا بہن تو یہ نوبت ہی کیوں آتی؟"

نگہت ممانی نے لوہا گرم دیکھ کر مزید چوٹ لگائی۔

"یہ خوب کہی آپ نے بڑی بھابھی۔" واجدہ ممانی چڑے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"سب جانتی تو ہیں آپ۔ وہ شروع ہی سے آزاد منش ہے۔ اوپر سے رہی سہی مت اس گلوکاری کے شوق نے مار رکھی ہے۔ دونوں چھوٹوں کو تو میں نے ملازم ہوتے ہی نتھی، فرحی (بھانجیوں) سے بیاہ دیا تھا پر یہ کمینہ جانے کب آتا تھا میرے... قسمیں تو اس کے لیے تو میں کب سے آپ کی فکر و سوچ بیٹھی ہوں۔"

واجدہ ممانی نے بغور جیٹھانی کی صورت تکتے ہوئے ایک ایسی بات کی جو یقیناً ان کے ہی دل کی آواز تھی تب ہی تو یک لخت ان کی آنکھوں میں چمک سی لہرا کر معدوم ہوئی تھی۔ وہ ایسی ہلکی نہ تھیں کہ فوراً ہی اپنے دل کا راز انہیں دے دیتیں سو اسی لیے ذرا بن کر بولیں۔

"خیال تو تمہارا ٹھیک ہے۔ اور میرا اندازہ ہے کہ شائد تمہارے جیٹھ بھی یہی چاہتے ہیں پر اب تم اس بانو کا کیا کرو گی؟"

"میں کچھ کرنے کے قابل ہوتی تو یوں آپ کے پاس سویرے سویرے ہی دوڑی کیوں آتی۔" واجدہ ممانی کا لہجہ بڑا مایوس سا تھا۔

"دیکھو! اب تم سے کیا چھپانا بانو کے لیے تو میرا صدیق بھی بڑا مچل رہا ہے۔ یہ تو میں ہی ہوں جو اسے حیلے بہانوں سے اب تک روک رکھا ہے۔ ورنہ تمہارے جیٹھ صاحب تو دونوں کا نکاح پڑھوانے میں پل نہ لگائیں کہ ان کی تو یہ دیرینہ خواہش تھی۔ بہرحال اب تمہارا ساتھ دینا بھی تو ضروری ہے۔ تو اب یوں کرتی ہوں کہ شہاب صاحب کو کوری کے آگے کر کے صدیق اور بانو کی بات پکی کروا دیتی ہوں مصلحتاً...... اس اثناء میں تم نغمہ اور سمیع اللہ کا عقد کروا دو۔ بعد میں اس بانو سے صدیق کی جان کیسے خلاصی کروانی ہے یہ میں جانوں اور بانو... کیوں؟"

کیا یہ تھے ہمارے وہ "اپنے" جن سے من کی چاہ میں ہم نے یہاں تک کی مسافت طے کی تھی؟ اس سے مجھ پر ان معتبر رشتوں کا ایک ایسا کریہہ و بھیانک روپ عیاں ہوا تھا کہ جس کی پیڑھ (درد) مجھ سے سہی نہیں جا رہی تھی اور خدانخواستہ اگر یہ سب میری ماں پر آشکار ہو جاتا تو... رنج و غم کی شدت سے بوجھل دل و دماغ میں ابھی یہ سراسیمہ کر دینے والی سوچ وارد ہوئی ہی تھی کہ تب ہی اچانک میرے عقب میں کسی کے پورے قد سے گرنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے دہل کر پیچھے دیکھا، اور...

"ماں۔" میری وحشت زدہ سی چیخ پورے گھر میں سنائی دی تھی۔

☆☆☆

"انجائنا کا معمولی سا اٹیک ہے۔ تشویش کی کوئی ایسی بات نہیں۔ ان شاء اللہ آئندہ چند گھنٹوں میں مریضہ کی حالت میں بہتری آنا شروع ہو جائے گی۔" ڈاکٹر بڑے پیشہ ورانہ انداز سے مجھے طفل تسلی دے کر آگے بڑھ گیا تب میں اس سرکاری اسپتال کی تنگ بینچ پر ایک دم ڈھے سی گئی۔

ماں کے محبت سے لبریز دل کو اپنوں کی نفرت آمیزی نے روگی بنا ڈالا اور یہ ڈاکٹر مجھے کہہ گیا ہے کہ وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔

میری ماں، میری جنت، میرے جینے کا پہلا اور آخری سہارا... میری کل کائنات اور... اور... شدت غم اور احساس بے بسی سے میں ارد گرد کی پروا کیے بغیر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"اس طرح تو مت روئیں... ان شاء اللہ پھپھی بہتر ہو جائیں گی۔ آپ ماموں کے ساتھ گھر جائیں۔ پھپھی کی دیکھ بھال کے لیے میں یہاں موجود ہوں۔" ماموں کے برابر میں کھڑا سمیع اللہ آنکھوں میں سخت تکلیف و اضطراب لیے مجھ سے مخاطب ہوا تو میں نے بے طرح چونک کر سر اٹھایا۔

"ماں جب تک یہاں ہیں۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔" میں خود کو سنبھال کر، بائیں ہاتھ کی پشت سے اپنے رخسار رگڑتی ہوئی بے لچک لہجے میں بولی۔

"پر گھر پہ گڈو اور چھوٹو تمہاری خاطر بڑے بے

چکن ہیں بنی......! ان کا بھی تو کچھ خیال کرو۔“ ماموں نے ملائمت سے کہا تو میں جیسے کسی گہری نیند سے بیدار ہو کر سراپا بے کلی بن گئی۔

”ہاں گڈو ......اور چھوٹو...... وہ تو میرے بغیر بہت روتے ہوں گے۔“

”ہاں تو پھر بس چلو میرے ساتھ گھر...... یہاں سمیع اللہ موجود ہے۔ یہ وصیان رکھ کا کوری کار آخر اس کی بھی تو کسی چیپی ہے۔“

☆☆☆

”میں کہتی ہوں شہاب صاحب! میں باز آئی ایسی مہمان داری سے جو میرے ہی گھر کو خاندان بھر میں معتوب ٹھہرا دے۔ آپ کو کچھ خبر بھی ہے کہ نہیں؟ سارے خاندان میں چہ میگوئیاں جاری ہیں کہ بمبئی والی بانو نے واجدہ کا سمیع اللہ پھانس لیا ہے۔ میں کہتی ہوں کچھ تو خدا کا خوف کریں۔ چار، چار بیٹیاں لیے بیٹھے ہیں۔ بند کروائیں یوں رات دن ان بھتوں کا یہاں آنا جانا۔ نہیں تو اپنی بہن اور اس کی اس فلمی ہیروئن کو یہاں سے چلتا کر دیں...... اگر آپ میں ہمت نہیں تو میں خود۔“

روزانہ کی طرح دن کی شروعات کے ساتھ ہی ممانی بھی شروع ہو چکی تھیں۔ ان کے لب و لہجے میں ہمارے لیے اس قدر بے زاری، تنفر اور بے گانگی تھی کہ یقین ہی نہ آتا تھا کہ یہ وہی نرم گفتار و شیریں بیان خاتون ہیں۔ جو آج سے صرف ڈھائی ماہ قبل اپنی خوش اخلاقی و مہمان نوازی سے ہمارا دل زیر کر چکی تھیں۔

اب جوان کا دل کش نقاب اترا تھا تو میرے لیے ضبط محال تھا مگر کرنا یوں پڑ رہا تھا کہ ماں کو ڈاکٹر نے فی الحال لمبے سفر کے لیے منع کر رکھا تھا۔ دوسری بدقسمتی یہ ہوئی کہ ماں کی بگڑی حالت کے ایام میں ہماری واپسی کی مقررہ تاریخ نکل گئی۔ وگرنہ ان دنوں دل میں گھر کر لینے والی کدورتوں کے سبب گھر کا ماحول جس قدر گھٹن زدہ ہو چکا تھا، میرا تو وہاں ایک پل بھی ٹھہرنے کو من نہ کرتا تھا۔

مجھے رہ رہ کر اپنی چھوٹی سی جنت (کھولی) کے راحت بخش ماحول کی یاد ستا رہی تھی اور میں محاورتاً نہیں حقیقتاً انگلیوں پر دن گن رہی تھی کہ کب ڈاکٹر کا بتایا ڈھائی ہفتہ پورا ہو اور میں واپسی کی راہ لوں مگر......

”بانو...... تو سمیع اللہ سے نکاح کر لے رے۔“ میں جو ممانی کے کمرے سے آتی ان کی بد لحاظ آواز کے جواب میں شہاب ماموں کی پست آواز میں دی جانے والی وضاحتیں سن کر من ہی من میں پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ بستر پر آنکھیں موندے نیم دراز ماں کی نقاہت زدہ آواز میں دی جانے والی انوکھی صلاح پر برق رفتاری سے ان کی جانب پوری کی پوری گھوم گئی۔

”ابھی آپ نے کیا کہا؟“ میں نے نا سمجھی سے انہیں دیکھتے ہوئے کچھ ایسے لہجے میں سوال کیا گویا جو کچھ میں نے سنا وہ میری سماعت کا دھوکا ہی تو ہے۔

”وہی جو تو نے سنا۔“ ماں نے نم ناک آنکھیں پوری کھول کر میرے چہرے کی جانب دیکھا۔ ”بھلا لڑکا ہے یہ سمیع اللہ اور سب سے بڑھ کر میرے بھائی کا کمدن (خون) ہے۔“

”حیرت ہے ماں! لہو کا سفید پڑتا رنگ دیکھ کر بھی آپ تا حال اپنی اس منطق پر قائم ہیں۔“ میرا جی چاہا کہ اپنا ماتھا پیٹ ڈالوں۔

”کسی ایک کی برائی سے سب برے تو نہیں ہو جاتے۔“ انہوں نے نیا فلسفہ میرے سامنے لا رکھا۔ ”اور پھر ایک نہ ایک دن تو تیرے کو کسی کا ہاتھ تھامنا ہی پڑے گا تو جو سب کچھ جان کر بھی بڑی چاہ سے مانگ رہا ہے اسی کا کیوں نہیں۔“

”کیوں کہ یہ نا ممکن ہے ماں...... مجھے بس واپس جانا ہے۔“ میں نے بڑی سختی اور مضبوطی سے کہا تھا کہ میں اب پہلے والی بانو نہیں تھی۔

”واپس جا کر اکیلی تو کرے گی کیا رے بانو! جیون کا سفر یوں تو نہیں کٹتا۔“ میرے دو ٹوک انکار سے ان کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا تب بھی وہ مصر ہیں۔

"پر میں تنہا ہوں کب؟ آپ گڈو، چھوٹو سب ہیں تو میرے پاس میرا پریوار۔" میں زچ ہو کر قدرے تیز لہجے میں بولی۔

"ہاں میں آج ہوں پر جیادہ (زیادہ) دن نہیں رہوں گی۔" ماں کے الفاظ تھے یا بارود...... چشم زدن میں میرے وجود کے پرخچے اڑتے میں نے خود محسوس کیے۔

"کس نے کہا ہے کہ آپ نہیں رہیں گی؟" میں کسی خوف زدہ سے بچے کی مانند ان کے نزدیک جا بیٹھی اور ان کے یخ بستہ ہاتھ تھام لیے۔

"بس من کہتا ہے پھر میرے بعد گڈو اور چھوٹو کو کیسے سنبھالے گی میری بچی؟"

ماں کا سوال بہت مشکل تھا۔ میرے ذہن و دل میں آندھیاں سی چلنے لگیں اور عین اسی لمحے میری نگاہ کمرے کے صحن میں کھلنے والی کھڑکی پر جا ٹھہری۔ سمیع اللہ گود میں چھوٹو کو لیے گڈو کی انگلی تھامے کہیں باہر سے اندر داخل ہو رہا تھا۔

تو کیا یہ منظر ماں کے سوال کا جواب بن کر سامنے آیا تھا؟

☆☆☆

فیصلہ چاہے کتنا ہی کٹھن کیوں نہ ہو، اگر لوح تقدیر میں روز اول سے محفوظ ہے تب لمحوں میں کر لیا جاتا ہے۔ سو جس روز میرے کسی انکار سے دل برداشتہ ہو کر انتہا درجے کی جذباتیت و حماقت کا ثبوت دیتے ہوئے سمیع اللہ نے اپنی جان لینے کی کوشش کی، وہ دن میرے لیے پہلے ہی سے طے شدہ فیصلے کی گھڑی ثابت ہوا۔

واجدہ ممانی کی ساری مزاحمت دم توڑ گئی اور وہ بادل نخواستہ ہی سہی پر ماں کے سامنے سوالی بن کر آ کھڑی ہوئیں۔ ماں کی تو دلی مراد بر آئی تھی اور اب شہاب ماموں بھی یہی چاہتے تھے۔ سب نے مل کر مجھ پر اس قدر دباؤ ڈالا کہ میں ناچار اس بھاری لمحے کے زیر اثر چاروں خانے چت ہو گئی۔ یہ جیون کا بہتا منہ زور دھارا مجھے اپنے ساتھ بہا کر کہاں سے کہاں لے آیا تھا۔ پلٹ کر جو دیکھا تو خود پر بڑی حیرت سی ہوئی۔

سخت محنت سے پکی کروائی گئی کھولی، سرکاری نوکری، لیکچر کا معاہدہ، بس چند ہی ماہ بعد میرے نام ہو جانے والا فلیٹ...... میرے سارے دوست، سہیلیاں، وہ سارے ناتے جو خون کے نہ سہی پر تھے بڑے اپنے، میرا بھیگا بھیگا سا بمبئی اور...... اور ماسٹر صاحب اور ان کی وہ آخری التجا۔

سب ہی کچھ تو بہت دور کہیں بہت پیچھے رہ گیا تھا اور میں خود کہاں کھڑی تھی؟

☆☆☆

"میں نوری ہوں، آپ کے بھائی کے برابر والے فلیٹ میں جو بڑی بی رہتی ہیں نا...... ان کی افسر بہو نے مجھے بڑی بی کی دیکھ بھال کے لیے رکھا ہے۔ وہیں تنہائی کی ماری آپ کی اماں جی آ کر بیٹھ جاتی تھیں۔ میری ان سے دوستی وہیں ہوئی۔ ویسے تو انہوں نے مجھے اپنی بیٹی بنایا ہوا تھا لیکن اپنے دکھ درد ہمیشہ ہی مجھ سے سات پردوں میں چھپا کر رکھے [illegible] رات اچانک ہی ان کا فون آیا۔ بے تحاشا روتے ہوئے بڑی لجاجت سے بولیں کہ نوری! کیا آج کی رات [illegible] صبح کا [illegible] ہوتے ہی [illegible]۔"

سندھ سرکار کے ایک [illegible] اسپتال کی ایک پرہجوم راہداری میں کھڑی نوری، اپنے [illegible] حلیے سے متمول دکھائی دینے والی لڑکی کو جلدی جلدی بتا رہی تھی۔ جو اندر ایمرجنسی میں اس نیم جاں عورت ماں نصیب کی خاطر رو رو کر بے حال ہوئی جاتی تھی۔

"دارالامان؟" نوری کے بیان پر وہ صبیح صورت سرتاپا لرز گئی۔

"کیا کیا ہے آخر آپ نے اس بار اپنے ساتھ جو ان حالوں تک پہنچ گئیں؟" احساس بے بسی سے سوچتے سوچتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

"اماں کی حالت دیکھ کر کلیجہ تو میرا بھی پھٹا جا رہا ہے باجی! مگر آپ اس طرح تو مت روئیں دیکھیے گا

ان شاء اللہ رب سوہنا کرم کرے گا۔ بھلی چنگی ہوجائیں گی۔" حالانکہ خود نوری کا دل اس وقت انجانے خدشات سے بار بار سکڑا جاتا تھا کہ اس کا کچھ ایسا ہی جذباتی تعلق جڑ چکا تھا اندر پڑی اس لب دم روح سے، مگر پھر بھی اس نے اس مسلسل اشک بہاتی، حال سے بے حال لڑکی سے تسلی کے دو لفظ بولنا ضروری سمجھا اور اس سے پیشتر کہ جواباً وہ لڑکی نوری کو کچھ کہہ پاتی ایمرجنسی وارڈ سے برآمد ہوتی ایک نرس نے بڑی دل دہلا دینے والی آواز سے پکارا تھا۔

"بیڈ نمبر بارہ کی پیشنٹ کے ساتھ کون ہے۔"

☆☆☆

"وقت رخصت، من میں کہیں دھڑکا تھا دل کی جگہ یہ خدشہ کہ یہ جدائی جو بظاہر عارضی ہے کہیں مستقل نہ ہو جائے اور لو دیکھ لو...... وہی ہوا نا۔"

راشدہ سے سنا کہ تم وہاں نئی دنیا بسانے چلی ہو تو دل ناداں کو ایک سوال سوجھا تو کیا تمہارے لیے یہاں موجود سب ہی کچھ یوں ایک پل میں تیاگ دینا کیا اسی قدر سہل تھا بانو؟

جانے اس سوال کا تم کیا جواب دو گی؟ اور جانے اس جواب کو پانے کے لیے میں موجود بھی رہوں گا یا......

خیر تمہارا ساتھ تو دیوانے کی خواہش ثابت ہوا یہ بھی تو کبھی گماں نہ گزرا تھا کہ یہ آنکھیں اب تمہیں دیکھے بنا ہی بند کرنی پڑیں گی کہ حکم بھی آیا ہے وہاں سے میرے لیے۔

چلو، میں تو اب راہی ملک عدم ہو رہا ہوں پر بانو...... زندگی نے اگر تمہیں موقع دے ہی دیا ہے تو اس بار تم وہ ساری خوشیاں چن لینا کہ جن کی تلاش میں تم نے ہجرت کی ہے...... چلتا ہوں اب، اس آرزو کے ہمراہ کہ ملیں گے اگلے جہاں میں اگر جو میری صورت تمہارے حافظے میں کہیں محفوظ رہ سکی تو۔

خدا تمہارا حامی و ناصر......

فقط، ذوالفقار علی، مدن پورہ، بمبئی ہندوستان......

بتاریخ۔ ۳۱ جنوری ۷۸ء۔"

برق کہیں کڑا کے سے گری تھی میرے لرزیدہ خالی ہاتھ میں موجود پرچہ چھوٹ کر نیچے جا گرا...... حبس تھا کہ بڑھتا ہی چلا جاتا تھا اور گھٹا تھی کہ مہربان ہونے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔

یہ کیا لکھ دیا تھا انہوں نے چٹھی میں کہ میرے سارے وجود میں لہو کی جگہ بے قراری گرداں ہو گئی تھی۔

"خیر تو ہے بانو...... کس کا خط آیا ہے بمبئی سے؟" محض چار روز قبل ہی تو میں رخصت ہو کر اس کے گھر آئی تھی اور یہ خط جو شہاب ماموں کے پتے پر آیا تھا اسی نے تو لا کر دیا تھا وہاں سے۔

"مجھے بمبئی فون کرنا ہے مسیح صاحب۔" میں نے بے تابی سے کہا۔

"آں...... اچھا، اچھا تو چلو صوفی کے ہاں سے کروا لاتا ہوں۔" اس زمانے میں ٹیلی فون کی سہولت ہر گھر میں تو موجود ہوتی نہیں تھی۔ سو وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے ایک دوست کے ہاں لے آیا اور کال بک کروا کر دے دی۔

"ماسٹر صاحب نے تیری کھولی بھی اچھے روپوں میں بکوا دی اور بی ایم سی سے تیری ساری بقایا پگار بھی نکلوا کر میرے حوالے کر گئے۔ تو تقاضا مت کر۔ پہلی فرصت میں تیرے کو بھجواتی ہوں۔" راشدہ آپا جلدی جلدی بول رہی تھیں۔

"اور وہ خود...... خود کیسے ہیں؟" میں نے ان کی ساری تفصیل پر دھیان دیے بغیر لکنت زدہ زبان سے وہ سوال کیا جس کے لیے میں نے ان سے اس سے رابطہ کیا تھا۔

"حق ہا۔" جواباً راشدہ آپا نے اپنے لبوں سے ایک سرد سی سانس خارج کی اور میرے رگ و پے میں بے تحاشا دوڑتی بے قراری کو گویا پر لگ گئے۔

"جلدی بتا نا راشدہ آپا...... کال کٹنے ہی والی ہو گی۔" میں ان کی معنی خیز خاموشی سے گھبرا کر جلدی سے بولی تو اس بار وہ بڑے دکھ بھرے لہجے میں گویا

ہوئی تھیں۔
"کیا تیرے کو نہیں معلوم کہ انہیں سرطان تھا۔ بے چارے تیرے نکاح والے روز گزر گئے۔"

☆☆☆

زندگی کا حسن و بدصورتی بیک وقت اس میں مضمر ہے کہ ساتھ اگر چھوٹ بھی جائیں تب بھی ناچار آگے کی سمت سفر کرنا ہی پڑتا ہے۔ سو میں نے بھی یہی کیا۔ ماسٹر صاحب جیسے مخلص ساتھی اور محترم راہبر کا یوں بچھڑ جانا کہ دوبارہ ملاقات کی کوئی صورت ہی باقی نہ رہے، یہ معمولی واقعہ بھی نہ تھا کہ جس مقام سے میں سرسری گزر جاتی۔ سو کچھ وقت لگا کر پھر میں ان کا غم اپنے سینے میں دفن کیے۔ سامنے تاحد نگاہ پھیلے زندگی کے پر پیچ راستوں کی مسافر ہوگئی اور کبھی دوبارہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا...... پھر مجھ سے غلطی کہاں سرزد ہوئی تھی؟

"آپ کو دیکھوں تو حیرت ہوتی ہے کہ کس قدر ظلم کیا ہے آپ نے اپنے ساتھ۔" راستوں کی سرخی سے چلتی ہوئی زندگی اب بہت دور نکل آئی تھی اور میں مطمئن تھی۔ شاید مطمئن ہی رہتی اگر جو اس روز رستے میں میری ہی پرچھائی مجھے روک کر ایک نئے احساس کو من میں نہ جگا دیتی تو......

"کیوں ایسا کیا کر دیا میں نے؟" میں جو اس کے جہیز کے سلے کپڑے ترتیب سے ایک جانب رکھ رہی تھی چونک کر اس کی من موہنی سی صورت دیکھے گئی۔

"کیا کیا کچھ کس قدر آسانی سے پیچھے چھوڑ کر اپنے لیے ایک مشکل زندگی کا انتخاب کیا اور پوچھ رہی ہیں کہ ایسا کیا کر دیا میں نے؟" وہ اپنی ذہانت سے بھرپور چمکتی آنکھوں میں عجیب سا یاسیت آمیز احساس لیے میرے چہرے کو تک رہی تھی۔ اور میں تک کر متحیر رہ گئی۔ تاعمر من میں چٹکیاں لینے والے جس سوال سے میں دانستہ نگاہیں چرائی آئی تھی وہ آج اس کے لبوں پر کیسے آ گیا؟

"تو اور کرتی بھی کیا؟" میں نے چند ثانیے بعد خود کو بولتے سنا۔ "یوں بھی پیچھے مڑ کر دیکھنا صریح حماقت ہے اور کچھ بھی تو نہیں۔"

"تو کیا دل میں کبھی کسی رائیگانی کا احساس بھی نہ جاگا؟" اس کی گہری نگاہیں میرے اندر تک اترنے لگیں تو میں ذرا کی ذرا گڑبڑا سی گئی۔

"بہت محبت، مان اور عزت دی تھی مجھے اور مجھ سے جڑے رشتوں کو تمہارے ابو نے، تو بس...... ان کی بے اندازہ چاہت نے من میں ایسا کوئی احساس بھی بے دار ہونے ہی نہ دیا۔" میں نے جلدی سے وضاحتی بیان دیا۔

"کیا زندگی کا کوئی فیصلہ آپ نے خالصتاً اپنی خوشی کی خاطر بھی کیا؟"

اس سے کیا پا گئی تھی وہ میرے بیتے سے جو اس کی آنکھ نم ہوگئی۔

"ہاں کیا تو تھا، وہ پکچر میں کام کرنے کا فیصلہ۔" میں نے گویا بہت یاد کرتے ہوئے اس کی چشم نم سے نگاہ چرا کر کہا۔

"اپنے خاطر کیا ہوتا تو فلم مکمل کرنے واپس ضرور جاتیں۔" اس نے ان سنی کرتے ہوئے میرا جواب رد کر دیا تھا میں تعجب میں پڑ گئی۔ کیا سچا تبصرہ کیا تھا اس نے۔

آج پہلی بار مجھے اس کی ذہانت سے خوف محسوس ہو رہا تھا اور شاید خود سے بھی۔

"تمہارے ابو سے شادی کا فیصلہ" اس جواب سے میں نے اسے لاجواب کرنے کی کوشش کی۔

"وہ تو آپ نے اپنے گھر والوں خصوصاً بھائی کے لیے کیا تھا امی...... کیوں کہ آپ بخوبی واقف تھیں کہ آپ جیسی حسین و کم عمر ڈائیورسی (مطلقہ) کو شوہر تو بے شک مل ہی جاتا پر بھائی کو کوئی باپ نہ مل پاتا۔"

یہ کیا کہہ گئی تھی وہ...... میں ساکت رہ گئی کچھ دیر بعد جب بولنے کے قابل ہوئی تو میرا کھوکھلا لہجہ میرے اندر کی چغل خوری کر رہا تھا۔

"ایسی بات نہیں کرن...... میں نے تو پہلے ان

کے لیے انکار ہی کیا تھا پر چشم زدن میں حالات بگڑ کر کچھ ایسا رخ اختیار کر گئے کہ مجھے پسپا ہونا پڑا۔"

"حالانکہ جب آپ پر ابو کے گھر والوں کی انتہا درجے کی منافقت اور گندی، تعفن زدہ خاندانی سیاست آشکار ہو ہی گئی تھی۔ تب آپ کو وہاں سے واپس لوٹ جانا چاہیے تھا۔" اس کا طرز فکر، خیالات نظریات ہمیشہ ہی مجھ سے بہت مختلف رہے پر ان میں اس قدر تفاوت ہوگی یہ آج مجھ پر آشکار ہو رہا تھا۔

"جان دینے چلے تھے۔ وہ میرے لیے واپس لوٹ جانا اس قدر آسان بھی تو نہ تھا۔" میں نے اس لمحے جیسے یہ تاویل دے کر اس سے زیادہ خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی۔

"اور وہ سب حالات جو آپ نے ان سے شادی کر کے فیس کیے [illegible] وہ دادی کے طعنے تشنے ان [illegible] کی [illegible] چاچیوں کی ہمہ وقت مقابلے بازی مختلف المزاج ہونے کی بنا پر [illegible] ان کی شخصیت پر تنقید دو سو کالڈ "اپنوں" کے درمیان اجنبیت بھری زندگی، وہ سب تو شاید بہت آسان تھا آپ کے لیے۔"

وہ ان سارے حالات کی چشم دید گواہ رہی تھی۔ اور آج تک وہ ساری تکلیف دہ باتیں فراموش نہ کر پائی تھی۔

"جانے بھی دو نا کرن ...... اب یہ دل خراش یادیں کیوں دہرا رہی ہے؟" میں بہت پست آواز میں نہایت دکھی دل سے اسے ٹوکتے ہوئے بولی تھی کہ اس کی باتوں نے ماضی کے زخم پھر سے تازہ کر دیے تھے۔ واقعی کیسا کڑا اور اذیت ناک وقت لگتا تھا جیسے ساری کائنات "بمبئی کی بانو" کی بے جا مخالفت میں کمر جوڑ کر کے بیٹھ گئی ہے۔

"کیوں کہ آج میں آپ کو اس بات کا احساس دلانا چاہتی ہوں امی! کہ آپ تا عمر خود سے جڑے رشتوں کے ہاتھوں بری طرح ایکسپلائیٹ ہو کر غلط فیصلے کرتی آئی ہیں۔" اس نے بہت غم و غصے سے بولتے ہوئے مجھے حقیقت کا ایک ایسا داغ دار آئینہ دکھانے کی کوشش کی کہ جس میں، میں اپنی صورت بھی دیکھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

"غلط فیصلے؟" میں نے خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"ہاں غلط فیصلے ...... سراسر غلط فیصلے۔" وہ اپنی بات پر زور دے کر بولی۔

"اور اب بھائی کے ہاتھوں ایکسپلائیٹ ہو کر ایک اور غلط فیصلہ کرنے چلی ہیں۔ وہ ماہا جیسی خود غرض لڑکی سے شادی کے لیے آپ کو ایموشنلی بلیک میل کر رہے ہیں اور بری خبر یہ ہے کہ آپ ایموشنلی بلیک میل ہو رہی ہیں...... امی۔"

اوہ ...... تو اتنی لمبی چوڑی تمہید اس نے یہ موضوع نکالنے کی خاطر باندھی تھی۔ میں نے ایک سرد و بے بس سی آہ اپنے لبوں سے خارج کی۔

"بات اس کے ہاتھوں جذباتی طور پر یرغمال بننے کی نہیں۔ [illegible] اس کے دل کی خوشی کی ہے کرن۔"

"پر وہ دل کی خوشی نہیں، بس ضد ہے ان کی ایک ایسی ضد جو آپ پوری کر کے خود کو مشکل میں ڈال رہی ہیں امی [illegible] میں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

"[illegible] بار [illegible] بھی [illegible] ضد [illegible] کرن۔" میں نے اسے [illegible] اپنا نقطہ نظر سمجھانے کی کوشش کی تھی [illegible] ایک [illegible] ہوگی۔

"وہ ضد نہیں تھی امی۔" اس نے بھرائی ہوئی سی آواز میں کہا۔ "چچا ابو کے گزر جانے کے بعد آپ کو اپنے کردہ ناکردہ احسانات کی فہرست گنوا کر اپنے تندخو و بدقماش سالے سے میرا رشتہ جوڑ دینے کے لیے خاندان بھر سے آپ پر دباؤ ڈلوا رہے تھے، وہ اس دباؤ کو بے اثر کرنے کی تدبیر تھی۔ ایک ویل ایجوکیٹڈ اور ڈیسنٹ لائف پارٹنر کا اپنی مرضی سے انتخاب کرنا میرا حق تھا جو میں نے بروقت استعمال کیا تو یہ کوئی ضد تو نہ ہوئی۔"

وہ بظاہر میرے جیسی دکھائی ضرور دیتی تھی پر میری طرح کی نہیں۔ یہ اس نے زندگی کے ہر فیصلہ کن موڑ پر ثابت کیا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے جو حق تمہارا تھا تم نے بیٹی ہوتے ہوئے استعمال کرلیا تو پھر اب میں اپنے بیٹے کو یہ حق استعمال کرنے سے کیسے روک سکتی ہوں۔" میں نے شکستہ لہجے میں دھیرے سے کہا تو وہ ایک دم اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آپ ہی تو روک سکتی ہیں امی۔" وہ بہت جتا کر بولی۔ "آپ بھائی کو یہ غلط فیصلہ کرنے سے بالکل روک سکتی ہیں مگر میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ پیچھے آپ نے اپنی ذات سے متعلق قطعی غلط فیصلے کرنے پر بھی نانی کی مخالفت نہیں کی۔ ایام بیوگی میں آپ کو تنہا چھوڑ کر اجنبیوں کی طرح دیار غیر جا بسنے والے گڈو ماما کو بھی ان کی غلطیوں کا احساس نہیں دلایا۔ تب پھر آج آپ بھائی کو ان کی بے وقوفانہ من مانی کرنے سے کیسے روک سکتی ہیں۔ آپ کی تو ہمیشہ سے عادت ہے دوسروں کی خوشی کی خاطر اپنے آپ کو مشکل میں ڈال لینے کی۔"

☆☆☆

"ٹھیک کہا تھا تم نے کرن! کہ میری تو عادت ہے "اپنوں" کی خوشی کی خاطر غلط فیصلے کرکے خود کو مشکل میں ڈال لینے کی۔ پر کیا معلوم تھا کہ اس بار یوں بری طرح بکھروں گی کہ خود کو سمیٹنا ناممکن ہو جائے گا۔" صدمے و ناتوانی کے سبب موت کے دہانے کو چھو کر کسی معجزاتی لمحے میں واپس پلٹ آنے والے اس خزاں رسیدہ وجود کے پپڑی زدہ آبنوسی لبوں سے لفظ جیسے بین کرتے ہوئے برآمد ہوئے تھے۔

اسے انتہائی نگہداشت سے جنرل وارڈ میں منتقل ہوئے نصف سے زائد دن گزر چکا تھا پر کرن تاحال اس کا ڈرپ لگا جھریوں بھرا یخ بستہ ہاتھ کسی قیمتی متاع کی طرح اپنے پرحرارت ہاتھ میں لیے، اس کے رنگ اڑے چہرے سے لگی بیٹھی تھی۔ کرن کی کشادہ آنکھوں میں بہت سے آنسو تھے اور لبوں پر کئی سوال جو پوچھنے کی نوبت یوں نہ آسکی کہ وہ خودکلامی کے سے انداز میں بہت سے رازوں کو طشت ازبام کرنے پر آمادہ نظر آرہی تھی۔

"روزِ اول اس نے مجھ سے ایک نامحسوس سا بیر باندھ رکھا تھا۔" وہ آواز اب سراپا اشک بنی کرن کی سماعت سے ٹکرائی، چوں کہ کرن بخوبی واقف تھی کہ ذکر کس ہستی کا ہے سو اس بار بھی کوئی سوال کیے بنا خاموشی سے ماں کو سنے گئی۔

"کبھی میری "بے کاری" پر سوال اٹھا کر میرے نوالے گننے لگتی تو کبھی کوئی نہ کوئی الزام میرے سر رکھ کر مجھے بھلی بری سنا کر خوشی محسوس کرتی...... آدھی رات کو اٹھ کر چھوٹو سے کہتی کہ مجھے بھوک لگی ہے اپنی ماں سے میرے لیے پراٹھا پکوا لاؤ اور وہ بجائے اس سے لڑنے کے مجھ سے اس کی "حالت" کا ذکر کرکے مجھے بے بس کر دیتا۔ میں اس کی صورت دیکھ کر بہو رانی کی فرمائشیں پوری کرتی گئی۔ اس روز کہ جب مجھے بخار تھا تو میں اس کے لیے آلو کا بھرتا نہ بنا سکی اور وہ تو جیسے ایسے ہی کسی موقع کی تلاش میں تھی۔ بس میرے انکار کو انا کا مسئلہ بنا کر مجھے گھر بدری کا حکم بڑے طمطراق سے سنا دیا اور میں منتظر ہی رہ گئی کہ میرا چھوٹو یقیناً اس بار تو میرا ساتھ دے گا مگر ہوا کیا؟" غالباً وہ دل شکن منظر آنکھوں میں بھر گیا تھا تب ہی تو آنکھوں کی بے رونقی از سر نو تازہ ہو گئی تھی۔

کرن کی آنکھوں سے متواتر گرنے والے آنسوؤں کی رفتار میں تیزی آگئی۔

"چھوٹو میرے پاس آکر بولا۔" وہ کچھ دیر توقف کے بعد سسکتے لہجے میں بولی۔ "امی......! یہ گھر اگر ابو کا ہوتا تو ظاہر ہے کہ اس وقت یہاں سے میں خود ماہا کو لے جاتا مگر چوں کہ یہ گھر میرا ہے تو...... فی الحال آپ کا یہاں سے چلے جانا بہتر ہے۔ جوں ہی حالات بہتر ہوئے میں آپ کو واپس لے آؤں گا۔" جن الفاظ کو سن کر کرن پہ قیامت گزر گئی تھی وہ

سہہ کر ان پر کیا کچھ بیتی ہوگی؟

"کیوں امی کیوں؟" روتے روتے کرن کی ہچکی بندھ گئی۔ "آپ نے کیوں برداشت کیا یہ سب...... آخر کس مٹی سے بنی ہیں آپ؟"

"ہاں کرن۔" خشک آنکھوں والا یاس زدہ سا چہرہ کرن کی جانب گھوما تھا۔ "رات کے دوسرے پہر پھوپو کے گھر سے بے دخل ہوتے وقت یہی ایک بات تو میرے ذہن میں بھی آئی تھی کہ آخر کس مٹی سے بنی ہوں میں کہ اس قدر تذلیل سہنے کے بعد بھی زندہ ہوں۔" لہجہ اس بار ہر طرح کے تاثر سے قطعی طور پر عاری تھا ہاں وہ آنکھیں۔ اف، کرب کے کتنے ہی نئے معنی وہاں پنہاں تھے جنہیں دیکھ کر کرن کا کلیجہ شق ہونے لگا۔

"بے غرض سنہری مٹی سے آپ کا خمیر اٹھایا تھا خالق نے پھر خلوص و محبت کی آنچ میں تپا کر کندن بنا کر بھیجا، پر وائے افسوس آپ نے خود کو "ناقدروں" کے حوالے کر دیا امی! اور ناقدرے کے ہاتھ اگر جوہر لگ جائے تب وہ اسے اپنے ناشکرے پن سے ضائع کر دیا کرتا ہے۔" اس نے بے رنگ پریشان بالوں میں نرمی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے مرہم لفظوں سے ماں کے زخم زخم دل کی سکائی کی کوشش کی۔

"ہائے بانو......! تو نے خود کو ضائع کر دیا ان رشتوں کے پیچھے۔"

اور بانو نے زندگی میں پہلی بار کرن کی کسی بات سے اتفاق کرتے ہوئے جیسے خود پر افسوس کیا تھا۔ کرن کا دل دکھ سے پھٹنے لگا۔

"چھوڑیں بس اب جو ہوا سو ہو گیا۔" وہ اس کے دل سے احساس زیاں زائل کرنے کی خاطر نرمی سے بولی۔ "سب بھول جائیں اور چل کر میرے ساتھ میرے گھر پہ رہیں مکمل آزادی اور اپنی مرضی سے۔"

وہ اپنی دانست میں اسے بہلا رہی تھی پر تنہائی کی ایک رات جو وہ گزار آئی تھی۔ اس نے بانو پر بہت کچھ آشکار کر دیا تھا وہ سب کچھ جو ظاہر ہو جائے تو کسی کی حاجت باقی نہیں رہ جاتی۔

چنانچہ جب وہ اس بار گویا ہوئی تو آواز بے شک نحیف تھی پر لہجہ اٹل تھا۔

"نہیں کرن! میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"

"میرے ساتھ نہیں تو پھر اور کہاں جائیں گی۔" اس نے بے طرح چونک کر پریشانی سے ماں کا چہرہ دیکھا تھا۔

"اس مرتبہ اس راہ پر جو خود میں نے اپنے لیے منتخب کی ہے۔"

☆☆☆

"اپنے فیصلے پر ایک مرتبہ پھر نظر ثانی کر لیں امی۔ یہاں یوں تن تنہا رہنا آپ کے لیے آسان نہیں ہوگا۔ میرا دل آپ ہی میں اٹکا رہے گا۔"

کراچی کی اس مضافاتی بستی میں واقع وہ گھر جس کے پڑوس ہی میں نوری اپنے کنبے کے ساتھ رہائش پذیر تھی اور یہ خالی ہونے کے سبب نوری نے اپنی خالہ سے بانو کی خاطر محض چند دن کے لیے مستعار لیا تھا۔ اب کرن نے اسے باقاعدہ کرائے پر حاصل کرنے کے بعد اس کا حلیہ تو بدل کر اسے قابل رہائش تو ضرور بنا ڈالا تھا لیکن وہ غیر مطمئن تھی کہ رہنا بہر حال بانو نے اکیلے ہی تھا۔

"ہاں جانتی ہوں۔"

وہ جو لان کے صاف ستھرے نفیس سے بلکے فیروزی جوڑے میں ملبوس، سفید و گلابی پھول دار چادر والے سنگل پلنگ پر قدرے آسودگی سے براجمان، لمبے سرمئی بالوں کے درمیان سے دو حصے کیے ان میں کنگھی پھیر رہی تھی، بڑے مگن سے انداز میں بولی۔

"اس عمر میں آ کر تو دل نے من مانی کی ٹھانی ہے۔ کچھ دن کر لینے دو۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" کرن ذرا کچھ سے جھنجلا کر بولی۔

"اگر آپ کو اکیلے ہی رہنا ہے تو آپ میرے گھر کے قریب بھی تو کوئی چھوٹا سا گھر لے کر رہ سکتی ہیں نا، پھر اسی جگہ پر کیوں؟"

"کیوں کہ بھئی ________ والی کھولی کے بعد، یہی تو وہ پہلا گھر ہے جہاں کسی نے مجھے طنزیہ آواز میں ''بمبئی کی بانو'' نہیں پکارا۔ سو مجھے یہاں چندروز خود اپنے ساتھ گزار لینے دو کرن۔ جانتی ہوں یہاں زیادہ دن اکیلے رہ نہیں پاؤں گی۔ مگر بس چندروز کھوج لینے دو مجھے، وہ بانو جو خود میں نے اپنے ہاتھ سے اندر دفن کر دی تھی۔" یہ بڑی معصوم سی خواہش تھی کرن اداسی سے مسکرا دی۔

"ٹھیک ہے۔" وہ اثبات میں سر ہلا کر بادل نخواستہ بولی۔ "مجھے آپ کے فیصلے کا احترام ہے مگر بدلے میں آپ کو جلد میرے ساتھ چلنے کا وعدہ کرنا ہو گا۔"

"نہیں کرن!" وہ بال سنوار کر انہیں جوڑے کی شکل میں لپیٹتے ہوئے بہت سکون و اطمینان و رسانیت سے بولی۔ "میں اب کوئی وعدہ کر نہیں سکوں گی۔ پر تم ناامید مت ہو۔ اگر لوٹی تو تمہارے ہی پاس تو آؤں گی۔

اور میرا رہ ہی کون گیا ہے؟"

☆☆☆

"داستان حیات بہت طویل ہے اور کتاب زیست کے یہ صفحات محدود...... سو اب قلم تھامے اس سوچ میں گم ہوں کہ کیا لکھوں اور کیا رہنے دوں؟ اور یہ بھی کہ شروعات کہاں سے کروں اور اختتام کی بابت کیا درج کروں کہ سفر حیات تو ابھی جاری ہے، ہاں۔ یہ ضرور ہے کہ اب اس مسافر کی ذات میں وہ تغیر رونما ہو چکا کہ جس پر وہ خود بھی محو حیرت ہے، اور وہ سیکھنے لگا ہے وہ سب جو کبھی سیکھنا چاہا ہی نہ تھا پر اتنا تو اسے سیکھ ہی لینا چاہیے تھا کہ اپنی ذات پر پہلا حق خود ہمارا ہی ہوتا ہے۔ بے غرضی و اخلاص اعلا صفات ضرور ہیں پر حد سے تجاوز کر جائیں تو خود کے لیے آزار بن جاتی ہیں۔"

یہ کاغذ، قلم، کتابیں...... کیا حسین سنگی ساتھی تھے کہ جو زندگی کے کسی مقام پر بچھڑ جانے کے بعد خوش قسمتی سے دوبارہ یوں آن ملے تھے کہ اس کے کتھارسس کا ذریعہ بن گئے۔

اس وقت بھی وہ قلم ہاتھ میں تھامے اپنے سامنے کھلی سیاہ جلد والی فائل کے ایک کورے صفحے کو بغور تکتے ہوئے ان مناسب ترین الفاظ کا چناؤ کرنے میں کوشاں تھی کہ جو اس کی ''آپ بیتی'' کا موزوں ترین ابتدائیہ ثابت ہو سکیں۔ تب ہی اس کے نتھنوں سے ایک حد درجہ شناسا سی کوئی سوندھی باس آ ٹکرائی اور اس کے ساتھ کمرے کے فرش پہ بچھی صاف ستھری سی دری پر براجمان محلے بھر سے حصول علم کی خاطر اکٹھا ہونے والے اس کے ننھے منے طالب علموں میں سخت بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔

"بانو دادی...... بارش ...... ہم جائیں۔" ان میں سے ایک بھیگتے صحن کی اور للچائی نگاہوں سے دیکھتا جوش آمیز مسرت سے بے تابانہ بولا تو وہ ان کی بے قراری بھانپ کر متانت سے مسکرا دی۔

"ہاں ...... جاؤ۔" اجازت کا پروانہ ملتے ہی آن واحد میں کمرہ خالی ہو گیا۔

تب کچھ دیر بعد وہ کاغذ، قلم کو ایک طرف رکھتے ہوئے خود دھیرے سے اٹھی اور کھلے دروازے کے چوکھٹے میں ایستادہ ہو گئی۔

"المیہ یہ نہیں کہ زندگی نے مجھے کچھ دیا نہیں۔ یہ بے رحم کسی کو با آسانی کچھ دیتی بھی کہاں ہے۔ المیہ تو دراصل یہ تھا کہ اس ظالم سے لڑ جھگڑ کر میں نے جو کچھ بھی حاصل کیا تھا وہ دوسروں کی خوشی کی خاطر بڑی آسانی سے گنوا دیا۔" وہ چھوٹے سے صاف ستھرے خالی صحن کو جل تھل ہوتے بڑی دیر سے دیکھے گئی کہ بھیگنے کا موسم تو بمبئی کے ساون کے ساتھ ہی کہیں بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ ہاں مگر یہ دو نین کم بخت انہیں کراچی کی بے مہر برکھا کا ساتھ دینے سے بھلا کون روک سکتا تھا؟

☆

شمیم رانی

"میں بانو کا ہاتھ مانگنے آئی ہوں غفورے!"

میری پھوپھو نے بابا سے کہا۔ "آج میں خالی ہاتھ نہ جاؤں گی۔ آخر تم نے اپنی بیٹیوں کے لیے کیا سوچ رکھا ہے؟ انکار کے تمہارے پاس لاکھ بہانے ہیں، ایسا کب تک چلے گا۔"

"تمہیں اس گھر میں کتنا سکھ ملا جو تم میری بیٹی کو بہو بنانا چاہتی ہو۔ ویسے بھی تمہارے بیٹے کی عمر زیادہ ہے۔"

"غفورے! بہانے مت بنایا کرو۔" پھوپھو نے بابا سے کہا۔ "شازیہ تیس سال کی ہو چکی ہے۔ میرے علاوہ اسے کوئی اور نہ اپنائے گا۔ عمر بھی گھر ہی میں رہے گی۔ تم اپنی بیٹیوں کو دولت کے لالچ میں بوڑھا کر رہے ہو۔ بیٹیوں کی کمائی کھانے کی تمہیں عادت ہو چکی ہے۔ یہ ظلم مت کرو۔ تم بیمار رہتے ہو، ان کی ماں بھی مر چکی ہے۔ تم مر گئے تو بیٹیوں کا کیا بنے گا؟"

"پھوپھو! تم اپنا کام کرو۔ یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے۔ اس میں ٹانگ مت اڑاؤ۔" ہمارے اکلوتے بھائی کا ماتھا شکنوں سے بھر گیا۔

"بہت دولت اکٹھی کر لی ہے عارف! تم نے۔ اب معاف کر دو ان بچیوں کو۔" پھوپھو غصے سے بول رہی تھیں۔

ہم پانچ بہنیں اور ہمارا ایک ہی بھائی تھا۔ بابا زمین ٹھیکے پر لے کر کھیتی باڑی کرتے تھے۔ بیج بونے سے لے کر کٹائی تک ہم ہی کام کرتیں۔ اس کام میں فصلوں کو پانی دینا، کھیت تیار کرنا، اسپرے کرنا، [illegible] دوائی ڈالنا۔ ہم پانچوں بہنیں ڈنڈے کے زور پر کام کرتیں۔ ذرا سی غلطی پر اتنی مار پڑتی کہ بیان کرنا مشکل ہے۔ ہمارے بابا اور بھائی کام کے دوران ہماری نگرانی کرتے۔

جب فصل تیار ہو جاتی تو بابا اور بھائی شور مچا دیتے کہ ہمارا تو نقصان ہو گیا۔ ہم تو مقروض ہو گئے۔ پیسہ زیادہ لگایا ہے، فائدہ کم آیا ہے۔ جو فصل ہم نے اپنے ہاتھوں سے تیار کی ہوتی، ہمیں اس کے بدلے پلاسٹک کے جوتے تک لینے کی اجازت نہ تھی۔ ہم ہر روز جلنے کی اذیت سہتی رہتیں۔ ہمارا وجود ان [illegible] میں [illegible] رہتا۔

[illegible] دم گھٹتے دنوں کا سلسلہ جو ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ بہنوں میں سے [illegible] ایک ایک کر کے [illegible] وہ بڑی ہو جاتی۔ تکلیف بڑھ جاتی۔ بابا نے [illegible] دولت تک پہنچنے کے لیے ہماری [illegible] کو سیڑھی بنا رکھا تھا۔

میری سب سے چھوٹی بہن عابدہ [illegible] میں بکریاں چرانا تھا۔ آنکھیں جذبات کی [illegible] ہوتی ہیں۔ میں کچھ دنوں سے دیکھ رہی تھی کہ بغاوت اس کے اندر سر ابھار رہی ہے۔ محبت کی منہ زور موجوں کو وہ پرسکون نہیں کر پا رہی تھی۔ بے چینی نے اس کا سکون تہس نہس کر رکھا تھا۔ وہ وسوسوں، اندیشوں اور عدم تحفظ کا شکار تھی۔

اس کو کسی نے زندگی کی نوید سنائی تھی اور اس نے بھی (میری بہن عابدہ) تھکے ہوئے مسافر کی طرح پڑاؤ ڈال دیا ہے۔ [illegible] کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہی تھی۔

"تم وہ نہیں رہیں اب جو تم پہلے تھیں عابدہ!"
ایک دن میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ہاں، میں وہ نہیں جو پہلے تھی۔"

اس کے خوب صورت لب ہلے تھے۔ میں دکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتی چلی گئی۔ مجھے معلوم تھا زندگی اس سے (میری بہن عابدہ) چھین لی جائے گی۔

"تم حسن وشباب کے زعم میں آ کر ایسے خواب دیکھ رہی ہو، جو تمہاری دسترس سے باہر ہیں۔" میں نے عابدہ کو سمجھایا۔

"جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" اس نے گہری آنکھوں پر تنی خم دار پلکوں کی جھالر اٹھا کر کہا۔

"ذہنی سکون نہ جسمانی سکون...... لنڈے کے کپڑے، تشدد، بھوک...... ایسی زندگی میں نہیں گزار سکتی۔ تم گزارنا چاہتی ہو تو گزار لو۔ تم ہیں بھینسوں کا چارہ کاٹتی ہو۔ کبھی دودھ پیا؟ نہیں ناں......؟ دودھ بیچ دیا جاتا ہے کیونکہ بابا مقروض جو ہیں۔ بابا اور بھائی کے قرضے ہم اتار نہیں سکتیں۔ بابا ہماری کمائی بینک میں رکھ لیتے ہیں۔ بابا اور بھائی کو ہر بار نقصان ہوتا ہے تو ٹریکٹر کہاں سے لیا؟ تھریشر کہاں سے آیا؟ بیٹے کی شادی کے لیے اتنا خوب صورت گھر کیسے بنالیا؟ اب بیٹے کی شادی کی تیاریاں ہیں۔ بھابھی آ جائیں گی تو ہم دربدر ہو جائیں گے۔ کچھ سوچو...... جو ظلم سہہ جاتا ہے، بغاوت نہیں کرتا، وہ بھی ظالم ہوتا ہے۔" عابدہ شعلہ بنی ہوئی تھی۔

"میں جوان ہوں، خوب صورت ہوں۔ میں صبح سے شام تک بکریاں چراتی ہوں۔ طرح طرح کے لوگ مجھے ہراساں کرتے ہیں۔ بابا کو بتاؤں تو کہہ دیتے ہیں کہ تم اپنے کام پر دھیان دیا کرو۔ بس لوگوں کی پروا مت کیا کرو۔ یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔ ایک پرسکون گھرانا ہمیں بھی چاہیے۔ ہمارے اندر پتھر کے دل نہیں۔ بابا نے تحفظ اور سکون کے احساس کو ایک دم پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ ہم پنچھی کی طرح بابا اور بھائی کے گرد گھومتی رہتی ہیں اور قطرہ قطرہ اپنی زندگی کا نذرانہ پیش کر رہی ہیں۔ کیا ملا ہمیں؟ بارش، جاڑا، تپش...... ہم بہنوں کو نہیں معلوم کہ بہار کیا شے ہے۔ ہمارا کام صرف کولہو کے بیل کی طرح کام کرنا ہے اور غلطی پر مار کھانی ہے۔ یہ کوئی زندگی ہے؟ کوئی تو شب خون مارنے والے بھائی کے منہ پر طمانچہ مارے۔"

اس کے اندر حسن علی وڈو بول رہا تھا۔ حسن علی نے عابدہ کو جینے والا انجکشن لگا دیا تھا۔ میں نے اپنے خاندان میں دراڑیں پڑتی دیکھیں تو لرز گئی۔

"ہم سے جدا ہو کر تم تنہا ہو جاؤ گی عابدہ! وقت بہت خراب ہے۔" میں نے وقت کی اونچ نیچ سمجھائی۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس کا جنون کم ہونے کے بجائے دوچند ہونے لگا۔

حسن علی وڈو ایک بااثر خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔

"رشتے داروں اور ملنے والوں نے ہمارے

دلوں کو کم اذیت نہیں پہنچائی۔ کیسی کیسی باتیں ڈنک بن کر چبھتی رہی ہیں میرے وجود میں۔ ہمارے لیے اس دنیا میں کوئی پناہ نہیں۔" اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

میرے سمجھانے کے باوجود عابدہ ایک دن گھر چھوڑ گئی۔ بابا اور بھائی کے ہاتھوں سے سونے کی چڑیا نکل گئی۔ ہم سب بہنیں خوف سے ستے ہوئے چہرے اور آنسوؤں بھری آنکھیں لیے کھڑی تھیں۔ بھائی فرط غضب سے کانپ رہا تھا۔ تلاش کرنے پر پتا چلا کہ عابدہ حسن علی ڈوٹو کے ساتھ گھر سے فرار ہوگئی ہے۔ اس نے عابدہ کو ایک خوب صورت گھر کا خواب دکھایا تھا۔

دوسرے دن بابا، بشارت علی ڈوٹو (حسن علی کا باپ) کے ڈیرے جا پہنچے اور لگے رونے دھونے کہ میں ایک غریب اور عزت دار آدمی ہوں۔ آپ کے بیٹے نے میری عزت لوٹ لی ہے۔ میری بیٹی مجھے واپس کر دی جائے۔ میں آپ کا شکر گزار رہوں گا۔"

حسن علی ڈوٹو کے والد کب چاہتے تھے کہ ایک بکریاں چرانے والی ہماری بہو بنے۔ حسن علی ڈوٹو نے عابدہ سے وعدہ کیا، "میں تمہیں تمہارے والد کے حوالے نہیں کروں گا۔ تم اس کمرے میں چھپ جاؤ۔"

عابدہ لرز رہی تھی۔ ابھی نکاح نہیں ہوا تھا۔ وہ دروازے کے سوراخ سے بابا اور بشارت علی ڈوٹو کی گفتگو سن رہی تھی۔ کمرے میں کھڑی اپنی زندگی میں آئے اس موڑ پر ساکت تھی۔ اب کیا ہوگا؟ ایک سرسراتا سوال پھن پھیلائے کھڑا تھا۔

حسن علی ڈوٹو سر جھکائے کھڑا تھا۔ حسن کے چچا، بھائی اور ماں بہنیں سب اس پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ لڑکی واپس کر دو۔ حسن علی ڈوٹو کی خاموشی عابدہ پر قیامت بن کر گزر رہی تھی۔ اگلے کہے جانے والے الفاظ نوید حیات ہوں گے یا مژدہ حیات۔

آخر فیصلہ کیا گیا کہ لڑکی غفورے کے حوالے کر دی جائے۔ ساتھ ہی بشارت علی ڈوٹو نے بابا کو دو لاکھ روپے دیے اور معافی بھی مانگی۔

عابدہ کی زندگی کا سہارا اسے چھوڑ چکا تھا۔ وہ محبت کی بساط پر بری طرح سے مات کھا چکی تھی۔ وہ زندگی اور موت کے بیچ تنہا کھڑی تھی۔

کاشت کار گھرانوں میں اسپرے، گندم میں ڈالنے والی گولیاں، کھاد وغیرہ پڑی رہتی ہیں۔ اچانک عابدہ کو کمرے میں اسپرے کی بوتل نظر آگئی۔

عابدہ کی موت کے بعد ہم نے شادی کا خیال دل سے نکال دیا اور وہی کرنے لگے جو بھائی اور بابا نے حکم دیا۔

عابدہ کی موت کے ایک سال بعد بابا نے بھائی عارف کی شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔

"میں اپنی بیٹیوں کی شادیاں ضرور کروں گا، اگر کوئی خاندانی لوگ مل گئے تو۔"

بابا لوگوں کو کہتے پھرتے تھے اور ساتھ ساتھ بھائی کی شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ بابا کو کوئی پروا نہ تھی۔

اتوار کے روز بابا اور بھائی دلہن کے زیورات اور کپڑے خریدنے لاہور کے لیے روانہ ہوئے اور پھر واپسی نصیب نہ ہوئی۔

بابا اور بھائی ٹریفک حادثے میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ہمارے وجود کے پرخچے جیسے کسی نے ہم سے اڑا دیے ہوں۔ بابا اور بھائی کی تدفین کے بعد میرے چچا اور پھوپھو نے ہمارے سروں پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔ لوگ خوف خدا سے کانپ رہے تھے۔ لوگوں کو عابدہ کی دردناک موت یاد تھی۔

چچا نے سارے مویشی، ٹریکٹر، زمینیں بیچ کر پیسے ہمارے حوالے کر دیے۔ بہت سا پیسہ بینک میں بھی تھا۔ وہ بھی ہمیں مل گیا۔

چچا نے ہم دو بہنوں کو ترس کھا کر اپنی بہو بنا لیا۔ دو بہنوں کی شادیاں بھی رشتے داروں میں ہو گئیں۔ ہم بابا کے بنائے ہوئے گھر میں رہتے ہیں۔

چچا نے کہا کہ "یہ دولت ان بچیوں کے خون پسینے کی کمائی ہے جو اس پر شب خون مارے گا برباد ہو جائے گا۔"

❁

مارچ 2021ء کے شمارے کی ایک جھلک

- "کرن" کی سالگرہ کے موقع پر قارئین سے خصوصی سروے،
- اداکارہ "حسبہ عزیز ناگی" کہتی ہیں "میری بھی سنیے"،
- اس ماہ "مسکان نور" کے "مقابل ہے آئینہ"،
- "دامنِ سحاب" مہوش افتخار کا سلسلہ وار ناول،
- "میرے ہم نفس میرے ہم نوا" آسیہ مرزا کا سلسلہ وار ناول،
- "کنارِ خواب جو" فرح بخاری کے مکمل ناول کی آخری قسط،
- "زندگی خوب صورت ہے" نگہت سیما کا مکمل ناول،
- "راج کماری" میمونہ صدف کا مکمل ناول،
- "جنہیں راستے میں خبر ہوئی" نازیہ کنول نازی کا ناولٹ،
- "اسی کلیے تیں خراب" منعم ملک کا ناولٹ،
- "کاش" اُم ہانی کا ناولٹ،
- قرۃ العین سکندر، فہمیدہ فرید خان اور عذرا فردوس کے افسانے اور مستقل سلسلے،

- **"کرن کتاب"**

سالگرہ نمبر کا خصوصی شمارہ

مارچ 2021ء کا شمارہ شائع ہوگیا

حسنہ حسین

خواب دیکھتے ہوئے جنت کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ خود کو برائیڈل ڈریس میں دیکھ کر اسے یاد آتا ہے کہ اس کی شادی فارس وجدان سے ہو چکی ہے جو "شیرازی انٹرپرائزز" کا سی ای او ہے۔ وہ جنت کمال پر واضح کر دیتا ہے کہ یہ ایک کاغذی رشتہ ہے جو اس نے اپنی ماں کی خاطر بنایا ہے۔ جب تک ماں زندہ ہیں، یہ رشتہ رہے گا۔

جنت کی فارس سے شادی سائرہ خالہ نے کروائی ہے۔ ان کا بیٹا عمار اس شادی پر ناراض ہے۔ اس کا خیال ہے، میڈیا پر فارس سے متعلق جو خبریں گردش کرتی رہی ہیں، وہ حقیقت پر مبنی ہیں۔

فارس کی والدہ مسز شیرازی ایک نیک دل عورت ہیں جو چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔ وہ ایک آرٹسٹ ہیں۔ ان کی پینٹنگ عسر یسرا جنت کو حیران کر دیتی ہے۔ دونوں اس پر بات کرتی ہیں۔ مسز شیرازی اسے ان لفظوں کے معنی تلاش کرنے کو کہتی ہیں۔

فارس کے مرحوم بھائی عماد کا یتیم بیٹا اپنے ننھیال میں رہتا ہے۔ فارس اس بچے کو وجدان ہاؤس میں لانے کو تیار نہیں۔

فارس کی تمام تر نفرتوں کے باوجود جنت اس کے دل میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرتی ہے۔

آئمہ ظہیر فارس کی منہ بولی بہن جنت کو منگنی کی تقریب میں لے جاتی ہیں جہاں کچھ لڑکیوں کے تضحیک آمیز رویے سے جنت دل برداشتہ ہو جاتی ہے۔

فارس کے آفس میں برہان لغاری کا نام سن کر جنت متوحش ہو جاتی ہے۔ اسے اپنا ماضی یاد آتا ہے۔

جنت عسر یسرا پر غور کرتی ہے اور اس کے کچھ معنی سمجھ جاتی ہے۔

مکمل ناول

جنت مسز شیرازی سے ان کے یتیم پوتے سے ملنے کی بات کرتی ہے۔ مسز شیرازی منع کر دیتی ہیں۔
اٹالین ریسٹورنٹ میں ڈنر کے دوران فارس طلاق اور ماہنی کا ذکر چھیڑ کر جنت کو پریشان کر دیتا ہے۔
جنت فارس کے ساتھ لندن جانا چاہتی ہے تاکہ وہ سائرہ خالہ کی بیٹی سدرہ کی شادی میں شرکت نہ کر سکے۔ فارس اسے ضد میں لاہور لے جاتا ہے۔
سدرہ کی شادی پر فارس کو علم ہوتا ہے کہ جنت کی پہلی شادی تایا کے اکلوتے بیٹے سے ہوئی تھی۔ پانچ سال تک رہی۔ پھر سدرہ نے پر تایا کے بیٹے نے دوسری شادی کر لی۔ جنت کو اس کے بچے کو نقصان پہنچانے کی پاداش میں طلاق ہو گئی۔

فارس جنت کو وہیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ لندن سے واپسی کے بعد وہ جنت کو لاہور سے لینے آتا ہے۔ جنت کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوتی۔ راستے میں ایکسیڈنٹ ہوتا ہے۔ دونوں محفوظ رہتے ہیں۔ گاڑی کا نقصان ہو جاتا ہے۔
لاہور سے واپسی کے بعد جنت بدل جاتی ہے۔ وہ فارس و جدان کے معاملات میں مداخلت ترک کر دیتی ہے۔
فارس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ بروقت سی پی آر دے کر وہ اس کی جان بچاتی ہے۔ ڈاکٹر بخاری بتاتے ہیں اسے کیٹ الرجی ہے۔ جس کا ری ایکشن شدید ہوتا ہے۔

چوتھی قسط

وہ بیڈ سائڈ کے ساتھ پشت ٹکائے فرش پر دو زانو بیٹھی تھی۔ کمرے میں ہلکی سی روشنی کا مدھم سا تاثر تھا جو اس کی آنکھوں کی ویرانی کو عیاں کر رہا تھا۔
رنگت زرد۔ لب باہم پیوست۔ اور ایک ہی نقطے پر جمے براؤن عدسے۔ ایک آگ تھی۔ جس میں سب جل رہا تھا۔ خواب بھی...... خواہشات بھی...... امید بھی یقین بھی۔
پاس ہی موبائل پڑا تھا۔ اسکرین روشن تھی۔ انجان نمبر سے ارسال کی گئیں فارس اور عدینہ زبیر کی شادی کی تصاویر کھلی پڑی تھیں۔
زندگی سے بھرپور مسکراہٹ، سنجیدہ مگر کچھ نرمی لیے تاثرات، ہشاش بشاش چہرہ۔ مگر جنت کمال کی تمام تر توجہ ان ہیزل گرین آنکھوں پر مرکوز رہی تھی جن سے جھلکتے محبت کے حسین رنگ اسے ان پانچ ماہ میں ایک بار بھی نظر نہیں آئے تھے۔ جنت کی سنگت میں تو جیسے وہ ادھورا تھا۔ مکمل تو وہ عدینہ زبیر کے ساتھ لگ رہا تھا۔ جوڑی بھی کمال کی تھی۔ پہلی نظر میں خیال آئے تو بس یہی کہ بنے ہی ایک دوسرے کے لیے ہیں۔
''اگر میں اسے ''ہاں'' کہہ دوں۔ ذرا سوچو!! تمہاری حیثیت کیا رہ جائے گی؟''
دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ آنکھیں مکمل طور پر نم ہو گئیں۔
''حیثیت......'' ذہن کے پردے پر لمحہ بھر کے لیے ایک منظر ابھرا۔ پھر دوسرا۔ پھر تیسرا۔ آنکھوں میں ٹھہرے آنسو گالوں پر لڑھک گئے۔
ماضی مستقبل میں ڈھلنے لگا۔ اذیت روپ بدلنے لگی۔ چہرے گڈمڈ ہونے لگے۔ ''ماہین'' کی جگہ ''عدینہ'' آ گئی تھی۔ ''برھان'' کی جگہ ''فارس'' لے چکا تھا۔
وقت ایک بار پھر وہی حکایت لکھ رہا تھا۔ جس کا آغاز بے شک مختلف۔ مگر انجام اب بھی ایک سا تھا۔ حیثیت جتلا کر، عیب بتلا کر، راستے جدا کر دینا۔ اس کے ساتھ ایک بار پھر وہی ہو رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر اسی تکلیف سے گزرنے والی تھی۔ اسی پرخار راستے پر چلنے والی تھی۔ کمیل اب بھی نصیب کا تھا۔
فرق صرف اتنا تھا کہ اب کی بار اسے کوئی خواب نہیں دکھایا گیا تھا، امید نہیں دلائی گئی تھی۔ نہ

اعتبار جتایا گیا تھا، نہ محبت دکھائی گئی تھی۔ اب کی بار جذبات میں بناوٹ نہیں تھی، نہ انداز میں حلاوت تھی۔ اب کی بار وہ سچا کھرا انسان۔ اپنی نفرتوں میں بہت خالص تھا۔ اپنے ارادوں کا پختہ، اپنے فیصلوں پر آج بھی قائم تھا۔

بھٹک تو وہ گئی تھی جو یہ سوچ بیٹھی تھی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ٹھیک نہ بھی ہوا تو وہ سنبھل جائے گی۔ قسمت جس راستے کا انتخاب کرے گی، وہ چل پڑے گی۔ جس منزل کا تعین کرے گی وہ اس تک پہنچ جائے گی۔ مگر وہ ساری ہمت، وہ پورا کا پورا حوصلہ۔ وہ امید سے بھرا یقین۔ اس کا عزم۔ اس کا فیصلہ۔ سب بے معنی بنا ہوا تھا۔ وہ بکھر کر سمٹنے کے بجائے ریزہ ریزہ ہونے لگی تھی۔ آخر وہ کیوں ہر بار خالی ہاتھ کیوں دامن رہ جاتی تھی؟ کیوں عدم ہو جایا کرتی تھی؟ کیوں نفی کر دی جاتی تھی؟

"ممی کو بہو چاہیے تھی...... وہ اپنی مرضی اور پسند سے تمہیں یہاں لے بھی آئیں۔ مجھے لائف پارٹنر چاہیے ہوتا تو میں کم از کم تمہارا انتخاب نہ کرتا۔" اندر کہیں آواز گونجی تھی۔ سرد۔ خشک۔ جلا کر بھسم کر دینے والی آواز۔

"ایک سرپرائز ہے تمہارے لیے۔"

چہرہ ہاتھوں میں چھپائے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

گھٹنوں پر سر رکھے، روتے سسکتے اس نے اپنے گرد بازو باندھ لیے۔ وہ اپنے آپ کو اپنی گرفت میں لے کر جیسے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی مگر وہ سنبھل نہیں رہی تھی۔ اس کا دل رو رہا تھا۔ اس کی روح تڑپ رہی تھی۔

"بازیٔو سوچو بچے۔" نانا ٹہلتے ہوئے اکثر کہے جاتے تھے۔ آج بھی ان کی آواز بازگشت بن کر اس کے اندر گونجی تھی۔

"اس حالت میں بھی؟" وہ ہچکیوں کے بیچ بمشکل بول پائی۔ "اس حالت میں بھی بابا؟ اس حالت میں بھی؟"

"درد اور تکلیف کی انتہا پر اگر تم بازیٔو نہیں سوچو گی تو پھر کب سوچو گی؟" وہ مسکرائے۔

اس نے آنسوؤں سے تر چہرہ اوپر اٹھایا۔ کمرے میں اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

"روشنی میں یہ گمان رکھنا کہ راستہ مل جائے گا، قدرے آسان ہے۔" وہ کھڑکی کے پاس کھڑے باہر دیکھ رہے تھے۔ "اصل کمال تو اس کا ہوا جو آزمائش کی تاریکی میں اس سوچ پر قائم رہا۔ اس وقت جب کوئی راستہ تھا، نہ روشنی باقی رہی تھی۔"

اب وہ اس کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھے تھے۔ اس کا ہاتھ تھامے، اس کے آنسو پونچھ رہے تھے۔ اور وہ بے بسی سے روئے جا رہی تھی۔

وہ ہمت کر کے آج نانا سے کہہ دینا چاہتی تھی۔

"جینے کی ہر خواہش ختم۔ اب بس موت مل جائے۔ ایک نئے امتحان میں پڑنے سے پہلے، ایک نئی آزمائش کو جھیلنے سے پہلے۔ وہ بس کسی طرح مٹ جائے۔ اب کی بار وہ خاک ہو اور پھر خاک ہی رہے۔ اب کی بار جب اس کی موت ہو تو جگہ "قبر" ہی بنے۔ بس اب اور نہیں۔ اب مزید اور نہیں۔"

باہر آسمان پر بادل چمک رہے تھے۔ ہوائیں تیز ہو رہی تھیں۔ اپنے گرد بازو باندھے وہ قالین پر سمٹ کر لیٹ گئی تھی۔ وہ سونا چاہتی تھی۔ اپنے درد سے لاتعلق ہونا چاہتی تھی۔ مگر اندر کا شور ہمیشہ کی طرح اس خواہش پر بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

بادلوں کی گھن گرج کے ساتھ ہی ان کی آنکھ کھل گئی تھی۔ گولیوں سے چھلنی وجود۔ خون سے سرخ ہوتی سفید شرٹ۔ چال میں لڑکھڑاہٹ۔ وہیل چیئر پر براجمان آدھے زندہ۔ آدھے بے جان وجود کے سامنے پنجوں کے بل جھکا وہ۔

انہوں نے پلکیں جھپکائیں۔ سیڑھیوں کی آہنی ریلنگ اب سہارا ہو چکی تھی۔ وہ بمشکل اپنے قدموں پر کھڑی تھیں۔ بمشکل اپنا فوکس اس کے چہرے پر جمائے ہوئے تھیں۔

"جو کھیل آپ نے۔ اپنی طاقت سے شروع کیا تھا، اس کا انجام یہی ہونا تھا۔" لڑکھڑاتی، رندھی ہوئی، بیک وقت مضبوطی سے کمزوری کی طرف بڑھتی ہوئی آواز۔

"میرا...... میرا...... بیٹا...... کہاں ہے؟" اب کے وہ متوحش ہو کر آگے بڑھی تھیں۔

منظر بدلا تھا، روشنی اندھیرا ہوئی تھی، مگر احساسات وہی رہے تھے، درد بھی وہی۔ اذیت بھی وہی۔ ماضی بھی وہی۔

وہ تکیے کے سہارے اٹھ بیٹھیں۔ ہاتھ بڑھا کر لیمپ روشن کر دیا۔

ان کا چہرہ مکمل طور پر آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔ وجود پر ایک کپکپی سی طاری تھی۔

دیوار گیر کھڑکیوں کے پردے ڈوریوں میں بندھے ہوئے تھے۔ لان کی لائٹس کی زرکار روشنیوں میں بارش شدت سے برستی نظر آ رہی تھی۔ اندر اور باہر کا موسم ایک ہو رہا تھا۔

"آپ کو کبھی مجھ سے محبت نہیں تھی۔ آپ کو ہمیشہ وہ نظر آیا ہے۔ ہمیشہ اس کی فکر رہی ہے۔"

وہ سسک پڑیں۔

"یتیم بچوں کو صبر آ جاتا ہے کہ وہ جانتے ہیں، ان کے ماں باپ قبروں میں ہیں، اگر جو وہ زندہ ہوتے ان کی حالت ایسی نہ ہوتی! لیکن جن بچوں کو معلوم ہو، ان کے ماں باپ زندہ ہیں اور تب بھی ان کی یہ حالت ہے۔ ذرا سوچو انہیں صبر کیسے آتا ہو گا؟"

منظر بدل رہے تھے۔ مگر پنڈولم کی آواز وہی تھی۔ وہ ہر منظر میں، ہر حقیقت میں، ہر خیال میں ایک سی تھی۔

"انسان ان سوالات کا کیا کرے جو نیند اڑا دیں۔ بے قراری میں بہا دیں۔ جن کا کوئی جواب ہو، نہ منطق۔ نہ دلیل۔ بس ایک صراط۔ جیسے جنگ، بے چینی، بے سکونی...... بس درد، اذیت، کرب۔" وہ ہاسپٹل کے کاریڈور میں کھڑی تھیں۔

"سوال ضمیر اٹھاتا ہے۔ جواب ایمان دلاتا ہے۔"

"ایمان بتلا رہا ہے، میں بھٹک رہی ہوں۔"
"ایمان بتلا رہا ہے، تم اب بھی راستے پر ہو۔"
انہوں نے اذیت سے لب بھینچ لیے۔ اب وہ بے آواز رو رہی تھیں۔

"میں اگر اسے اڑان کے لیے پر دے رہا ہوں تو مناسب وقت پر لینے کا اختیار بھی رکھتا ہوں، میں جس وقت اسے حدود و قیود سے نکلتا دیکھوں گا اسے واپس اس کی اوقات میں لے آؤں گا، مگر جو تم کر رہی ہو اس پر تم بہت پچھتاؤ گی۔"

انہوں نے گہرا سانس لے کر اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کی۔ ذہن کو ماضی کی گرفت سے چھڑانا چاہا۔ مگر ناکام رہیں۔

"میں کیا ہوں گی؟ میں کہاں ہوں؟" انہیں لگا وہ ان کے سامنے آن کھڑا ہوا ہے۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھے وہ بے آواز روتی رہیں۔

دیوار گیر کھڑکیوں کے اس پار۔ بارش سے نم ہوتی بوجھل فضا میں کہیں بجلی چمکی تھی۔ دوسری منزل کے بیڈروم میں کارپٹ پر لیٹی، نیند کی گہری وادیوں میں اتری جنت کمال نے ذرا دیر کے لیے آنکھیں کھول کر بند کر لیں۔

موبائل سائلنٹ پر تھا۔ اندھیرے میں اسکرین روشن ہو رہی تھی۔ اور اسی روشنی میں سائڈ ٹیبل پر رکھے گلدان میں ٹھہرے پھولوں کی پتیاں ٹوٹ کر نیچے آ گری تھیں۔

☆☆☆

سارا دن آسمان بادلوں کی لپیٹ میں رہا تھا۔ موسم طوفانی تھا۔ وقفے وقفے سے بارش بھی دو تین بار برس چکی تھی۔ سیاہ رنگ کی اے لائن قمیص پر ہلکے رنگ کا لمبا اونی سویٹر زیب تن کیے، وہ اس وقت کچن میں خانساماں کے ساتھ رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔

سرخ و متورم آنکھوں میں خاموشی ٹھہری تھی۔

چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ طبیعت نڈھال لگ رہی تھی۔
اس کا ذہن الجھا ہوا سا تھا۔ وہ کیبنٹ کھولتی تو کچھ لمحوں تک سوچتی رہتی کہ کس لیے کھولا ہے۔ فریج کے اندر سے جو چیز نکال کر لاتی، اس کی ضرورت ہرگز نہ ہوتی۔ اور جس کی ضرورت ہوتی وہ چیز باوجود تلاش کے اسے نہ ملتی۔ سارے کام اس سے غلط ہو رہے تھے۔
مسز شیرازی بالکل سامنے گلاس وال کی طرف رخ کیے بیٹھی تھیں۔ شیشے پر پھسلتے قطروں پر نگاہ جمائے کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ کانوں میں ایئرفونز لگا رکھے تھے۔ موبائل پر یقیناً وہ کچھ سن رہی تھیں۔ اور کافی دیر سے سن رہی تھیں۔
ایک نظر ان پر ڈالتے ہوئے وہ آہستہ سے مڑی اور اگلے ہی لمحے اس کا سر چکرا گیا۔ اس نے بے ساختہ کاؤنٹر ٹیبل کو تھام کر خود کو گرنے سے بچایا تھا۔ ملازمہ نے اس کا بازو پکڑ کر اسے سہارا دینے کی کوشش کی۔
''میں...... میں ٹھیک ہوں۔'' بازو چھڑاتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ سے میز کا سہارا لے رکھا۔ پھر کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ تشویش سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ملازمہ نے تیزی سے گلاس میں پانی ڈال کر دیا تھا۔ چند گھونٹ بھرنے کے بعد وہ پیشانی مسلنے لگی تھی۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔
وہ رات بھر سو نہیں سکی تھی۔ اوپر سے پریشانی کے باعث بھوک بھی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ نہ وہ ٹھیک سے ناشتا کر سکی تھی، نہ دوپہر کا کھانا کھا سکی تھی۔ اور جو کھایا تھا، وہ زیادہ دیر پیٹ میں ٹھہر نہیں سکا تھا۔ شدید ڈپریشن اور انزائٹی میں اس کے ساتھ یہی ہوتا تھا۔
چند لمحوں تک وہ میز پر سر ڈالے بیٹھی رہی تھی۔ پھر کسی احساس کے تحت اس نے سر اٹھا کر مسز شیرازی کو دیکھا تھا۔ صد شکر کہ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھیں۔ ورنہ وہ اس کے لیے کتنا پریشان ہو جاتیں۔
گزشتہ رات جو کچھ ہوا تھا اس کا حوالہ اس نے مسز شیرازی کو نہیں دیا تھا۔ وہ عدینہ زبیر سے متعلق پوچھنے کی ہمت نہیں کر پائی تھی۔ نہ اس بات کا شکوہ کرنے کی سکت رکھتی تھی کہ یہ بات اس سے کیوں چھپائی گئی تھی۔ سائرہ خالہ بھی تو اس کی حقیقت چھپا گئی تھیں۔ اس کا ماضی۔ اس کی پہلی طلاق کی وجہ۔ کچھ بھی تو نہیں بتایا تھا انہوں نے۔ پھر وہ شکوہ کرتی بھی تو کیسے؟
یکایک مسز شیرازی کا موبائل بج اٹھا۔ فارس کی کال تھی۔ وہ ایئرپورٹ سے گھر کی طرف روانہ ہو رہا تھا۔ اس سے بات کرنے کے بعد مسز شیرازی ایک بار پھر سابقہ کام میں مصروف ہو گئی تھیں۔ وہ صبح سے جانے کیوں کچھ پریشان اور خاموش سی تھیں۔
باہر گھنٹی بجی تھی۔ انٹرکام پر بات کرنے کے بعد اقصیٰ نے مسز شیرازی کے پاس جا کر انہیں کسی خاتون کی آمد کے بارے میں آگاہی دی۔ مسز شیرازی پہلے حیران ہوئیں پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ خانساماں کو ضروری ہدایات دیتی وہ اٹھ کر لاؤنج کی طرف آنے لگی۔ اسی اثنا میں صدر دروازہ کھل گیا تھا۔ ملازم کے ہمراہ داخل ہوتی خاتون پر نظر پڑتے ہی جنت اپنی جگہ پتھر ہو گئی۔
فائزہ بیگم۔ ماہین کی ماں۔ وہ یہاں! اس کا دل رک سا گیا۔ سانسیں تھم گئیں۔
گھر میں داخل ہوتے ہی ان کی پہلی نظر جنت پر ہی پڑی تھی۔ وہ ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے اس کی طرف بڑھی تھیں۔ بددعائیں۔ دہائیاں۔ کوسنے دیتے اس پر چلانے لگی تھیں۔ مسز شیرازی کے سامنے۔ وہ اس کی ایک ایک گناہ، ایک ایک غلطی کی پٹاری کھولے اس کے ذات کے پرخچے اڑا رہی تھیں۔ وہ اس پر جھپٹنا چاہتی تھیں، اسے جان سے مار ڈالنا چاہتی تھیں۔ یہ تو اقصیٰ ہی تھی جو ایک دم سے ان کے آگے آ گئی تھی۔ وہی انہیں پیچھے ہٹاتے ہوئے اسے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور جنت تو یوں تھی جیسے اس میں جان ہی نہ رہی ہو۔

"میری بچی کی خوشیوں کی قاتل۔ اس نے جادو کروایا۔ اس نے۔"

جنت کا ذہن ماؤف ہونے لگا۔ کان سائیں سائیں کرنے لگے تھے۔

آسمان پر کہیں بجلی چمکی تھی۔ بادل بھی گرجے تھے۔ بارش شدت سے برسنے لگی۔ اور وہ دہشت زدہ سی اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔ اس کی ہمت نہ ہوئی وہ مسز شیرازی کی طرف دیکھ لیتی۔ ساری قوت اور سکت جیسے اس ایک لمحے ختم ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ ان کی آنکھوں میں اپنے لیے حیرت، صدمہ، بے یقینی جیسے تاثرات نہیں دیکھ سکتی تھی۔ واحد ہستی جن کی وہ نفرت نہیں سہہ سکتی تھی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی رخ نہیں بدلا۔ ایک لمحے کے لیے بھی ان کا چہرہ نہیں دیکھا۔

آنسوؤں سے نم آنکھوں کے ساتھ روتی سسکتی وہ بے اختیاری کے عالم میں صدر دروازہ دھکیلتی باہر نکل گئی۔

موسم اب بھی طوفانی تھا۔ بارش اب بھی برس رہی تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ کیسے رات کی تاریکی جیسا ہو رہا تھا۔ بیرونی دروازہ عبور کر کے فٹ پاتھ پر عجلت میں قدم رکھتے ہوئے وہ آگے بڑھتی گئی۔

یہی ایک رشتہ تھا۔ یہی ایک اعتبار جسے وہ کھونا نہیں چاہتی تھی۔ یہی ایک بے لوث محبت رہ گئی تھی جس سے وہ محروم نہیں ہونا چاہتی تھی۔ وہ اس گھر میں ان کی وجہ سے تھی۔ وہ اس گھر میں ان کی وجہ سے رہنا چاہتی تھی۔ مگر یہ کیا ہو گیا تھا؟ کیوں ہو گیا تھا؟ اس کا دل شدت غم سے پھٹنے لگا۔ وہ بے اختیار ہو کر رونے لگی۔

وہ کہاں جا رہی تھی اسے معلوم نہیں تھا۔ وہ کہاں چلے جانا چاہتی تھی اسے اندازہ نہ تھا۔ دماغ مفلوج ہو رہا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جیسے مفقود ہو کر رہ گئی تھی۔

سڑک کراس کرتے وہ کسی گاڑی کے تلے آتے آتے بچی تھی۔ پارک کے اس گوشے میں۔

مسجد کی پچھلی سائیڈ پر دیوار کے پاس رکتے ہوئے اس کا جی چاہا اب تو وہ چیخ چیخ کر رو دے۔ مگر منہ پر ہاتھ رکھے، اپنی چیخوں کا گلا گھونٹتی وہ نیچے بیٹھ گئی تھی۔

ذہن کی اسکرین پر ماضی کسی فلم کی طرح ابھرنے لگا تھا۔ مناظر واضح ہونے لگے تھے۔ زخم ادھڑنے لگے تھے۔ سانسیں تھم رہی تھیں۔ آواز ڈوبنے کو تھی اور درد تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

وہ ماضی۔ اس کا ماضی۔ اس کی غلطیاں۔ اس کے گناہ۔ اس کا احتساب۔

اب کے بجلی لمحے بھر کے لیے چمکی تو دھرتی پر اندھیرے بڑھا گئی۔ سہ پہر کا سورج مکمل غروب ہو چکا تھا۔ بارش ہنوز برس رہی تھی۔

☆☆☆

اس کی زندگی کی دھندلی تصویروں میں کچھ اجنبی شناسا سا چہرے تھے۔ شناسا اس لیے کہ خونی رشتے تھے۔ اور اجنبی اس لیے کہ اس کی پہچان نہیں رکھتے تھے۔ امی۔ ابو۔ اور حسنین۔ زندگی ان تین لوگوں سے جڑی تھی۔ مگر ان تینوں سے کٹ کر بھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

حسنین اس کا جڑواں بھائی تھا۔ چھ بہنوں کے بعد اس کے ساتھ پیدا ہونے والا کمال جنید کا اکلوتا بیٹا! جس کی پیدائش سے نفیسہ اور کمال جنید کی زندگی میں بہاریں اتر آئی تھیں۔ ہر وقت طعنے اور کوسنے دینے والی دادی کے رویے میں مٹھاس گھل گئی تھی۔ طرح طرح کی باتیں بنانے والے اپنوں اور غیروں کے منہ بھی بند ہو گئے تھے۔ نفیسہ مطمئن تھیں کہ اب دوسری شادی کا موضوع زیر بحث نہیں لایا جائے گا۔ نہ بیٹیوں کے طعنے دیے جائیں گے۔ نہ کمتر سمجھا جائے گا کہ اب وہ ایک بیٹے کی ماں تھیں۔ اور سات بیٹیوں کے بعد ایک بیٹے کی ماں ہونا کوئی چھوٹی بات ہرگز نہیں تھی۔

انہیں اب صرف حسنین یاد تھا۔ خیال تھا بھی تو صرف اس کا۔ اور جنت وہاں کہاں تھی؟ شاید کہیں

بھی نہیں! نفیسہ کو تو یاد بھی نہیں رہا تھا کہ انہوں نے حسنین کے ساتھ ایک بچی کو بھی جنم دیا ہے۔

حسنین کا نام تو اسی وقت رکھ دیا گیا تھا مگر وہ اپنے وجود کی طرح کتنے ہی دنوں تک بے نام رہی تھی۔ یہ تو نانا تھے جن کی توجہ اس پر پڑی تھی۔ نام بھی انہوں نے خود رکھا تھا اور جانے کیا سوچ کر۔ کیا کچھ کر وہ اس کی بڑی بہن حفصہ کو خاص طور پہ تاکید کر کے گئے تھے کہ وہ اس کا خیال رکھے۔ سدا کی شکر گزار، صبر کرنے والی خاموش طبع حفصہ نے یہ بات جیسے اپنی گرہ سے باندھ لی۔ وہ جنت کے لیے "ماں" ہو گئی۔

دودھ اس نے فیڈر کا ہی پیا تھا کہ نفیسہ نے اپنا دودھ پلانے سے انکار کر دیا تھا۔ حسنین کے بعد نہ انہیں اپنا کوئی ہوش رہا تھا نہ گھر کے کسی فرد کا خیال رہا تھا اور جنت تو پھر تھی ہی بچی۔ جس کی موجودگی کا احساس بھی اس کے رونے کی آواز سے ہوتا تھا۔

زندگی کے ابتدائی پانچ سال اس نے بے فکری کے عالم میں حفصہ کی سنگت میں گزارے تھے۔ ان پانچ سالوں میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ ماں باپ یا دادی میں سے کسی نے اسے پیار کیا ہو۔ یا بلا کر اپنے پاس بٹھایا ہو۔ کچھ کہا ہو۔ یا پھر سنا ہی دیا ہو۔ گھر کی ان تین ہستیوں کی زندگی تو جیسے حسنین سے شروع ہو کر حسنین پر ہی ختم ہو گئی۔

لیکن وہ حساس تھی۔ بلا کی سمجھ دار بھی۔ حسنین کو ہر وقت ماں کے ساتھ دیکھتی تو اس کا بھی دل چاہتا کہ وہ اسے بھی بلائیں۔ اسے بھی پیار کریں۔ اس کے لیے بھی قیمتی کپڑے خریدیں اور ڈھیر سارے کھلونوں کا انبار لگا دیں۔ بچی تھی۔ نا سمجھ تھی۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ جب یہ خواہشات اس کی دوسری بہنوں کی پوری نہیں ہوئی تھیں تو اس کی کیسے ہو جاتیں؟

احساس کمتری میں گھری کمال جنید کی سب ہی بیٹیاں عدم توجہی کا شکار تھیں۔ ماں ایک عورت ہوتے ہوئے بھی ان کا درد، ان کی اذیت، ان کی شخصیت کے خلا کو پر کرنے سے قاصر! شاید پندرہ سالوں کی ذہنی اذیت نے انہیں بھی نارمل نہیں رہنے دیا تھا۔ شاید لوگوں کی زبانوں نے ان سے ان کا "احساس" بھی چھینا تھا۔ وہ بس اب ایک بیٹے کی ماں تھیں۔ ایک بیٹے کی ماں ہی رہنا چاہتی تھیں۔

جب حفصہ کی شادی ہوئی تو اس کی عمر چھ سال تھی۔ ہنسی خوشی نئے کپڑوں میں اس نے ہر تقریب میں دلہن بنی حفصہ کی گود معمول کی طرح سنبھالے رکھی تھی۔ لیکن جب رخصتی کا وقت آیا تو اس پر یکا یک ہی انکشاف ہوا کہ وہ اسے چھوڑ کر جا رہی ہیں۔

بہت شور مچایا تھا اس نے۔ بہت روئی اور چلائی تھی وہ۔ دلہن بنی حفصہ کے سینے سے چمٹی اس سے جدا ہونے کو بھی تیار نہ تھی۔ اس کی بہنوں نے ہی اسے بمشکل حفصہ سے الگ کیا تھا۔ اسے جھوٹی تسلیاں دلاسے دیے گئے تھے۔ اسے بتایا گیا تھا وہ ابھی جا رہی ہیں، کل آ جائیں گی لیکن وہ پھر کبھی نہیں آئی تھیں۔

حفصہ کے جانے کے بعد اسے احساس ہوا وہ بھری دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی ہے۔ ان کی جدائی سے پیدا ہونے والے اس خلا نے جنت کی شخصیت میں عجیب سے رنگ بھر دیے تھے۔ اب ایمان اسے اپنی ذمہ داری سمجھ کر سنبھال رہی تھی مگر وہ پھر بھی اس کا اس طرح سے خیال نہیں رکھتی تھی جیسے کہ حفصہ رکھا کرتی تھی۔

اس کے معاملے میں بس یہی ضروری سمجھا جاتا کہ اسے وقت پر کھلا پلا دیا جاتا۔ نہلا دھلا کر کپڑے بدل دیے جاتے۔ ہوم ورک کروا دیا جاتا۔ مگر اسے تو محبت و دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔ ایمان تو اسے اپنے ساتھ سلاتی بھی نہیں تھی کہ اس طرح اسے نیند نہیں آتی تھی جبکہ اسے حفصہ کے سینے سے لگ کر سونے کی عادت تھی۔

جب سے حفصہ کی شادی ہوئی تھی، وہ گھر کے ایک ایک فرد میں اسے تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ مگر نہ اس کے جیسا کسی کا رویہ تھا۔ نہ اس کے جیسی کسی کی محبت تھی۔

فون پر اس سے بات ہوتی تو رو رو کر اسے واپس آنے کا کہتی اور وہ ڈھیر سارے کھلونوں کا وعدہ کر کے اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتیں۔ دوسرے شہر میں تھیں۔ جلد آ بھی نہ سکتی تھیں۔ دوسری بہنوں سے، خاص طور پر ماں سے بھی کہتیں، وہ حسنین کی طرح اسے بھی کچھ وقت دیں۔ مگر ہمیشہ کی طرح کوئی بھی اس بات کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

☆☆☆

جنت جتنی گم صم، حساس، معصوم اور شریف تھی، حسنین اتنا ہی شرارتی، بدتمیز اور افلاطون قسم کا بچہ تھا۔ لاڈ پیار سے سر چڑھا اور کچھ حد تک بگڑا ہوا۔

گھر میں کمزور صرف جنت ہی تھی تو اس کا بس بھی صرف اس پر ہی چلتا تھا۔ وہ بلاوجہ اس سے لڑ پڑتا۔ کاپیاں پھاڑ دیتا..... ذرا ذرا سی بات پر شکایت لگوا کر ڈانٹ پڑوا دیتا۔ بال کھینچتا۔ کھلونے بھی توڑ دیتا۔ جواباً وہ اسے کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ اگر کہہ دیتی تو ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ نفیسہ الٹا اسے ہی ڈانٹنے لگ جاتیں۔

”ایک ہی تو بھائی ہے تمہارا، اگر کچھ کہہ بھی دیا ہے تو کیا ہو گیا۔“

اس کی کسی بھی شکایت کو خاطر میں نہیں لایا جاتا تھا، الٹا حسنین کی ان حرکتوں کو انجوائے کیا جاتا۔ اس کی بدتمیزی ایک معصوم سی حرکت محسوس ہوتی۔ اس کی ہٹ دھرمی پر پیار کیا جاتا۔

جنت کو اپنا جڑواں بھائی اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ پہلے اس سے صرف ڈرتی تھی۔ مگر اب نفرت بھی کرنے لگی تھی۔ اس کی تمام تر کوشش یہی ہوتی کہ وہ کسی طرح حسنین سے دور رہے۔ کم نقصان نہیں تھے جو وہ اس کے کر چکا تھا۔ حفصہ جتنے بھی کھلونے اس کے لیے بھیجتیں، وہ انہیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا..... کھیلنے کی نوبت ہی نہ آتی۔

ماں کے غیر منصفانہ رویے سے وہ دن بدن شیر ہی ہوتا جا رہا تھا..... دوسری طرف بیاڑ جیسے چھ سال کی جنت اندر ہی اندر سے گھٹ رہی تھی مگر نہ کسی کو بتا سکتی تھی اور نہ ہی اس کی شکایت لگا سکتی تھی کیونکہ وہ سات بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ نفیسہ اور کمال جنید کا اکلوتا بیٹا۔ اس کی ہر غلطی معاف تھی..... اس کی ہر خطا پر درگزر۔ وہ جو چاہے کر سکتا تھا۔ اسے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ اسی لاڈ پیار نے اسے اتنا بگاڑ دیا تھا کہ وہ غصے میں گھر کی چیزیں بھی توڑ دیتا تھا۔ بہنوں سے الجھ پڑتا۔ خاص طور پر جنت اس کے عتاب کا زیادہ نشانہ بنتی تھی۔

اسے وہ دن آج بھی یاد تھا جب حفصہ آپی پورے چھ ماہ بعد لاہور آئی تھیں۔ اس کے لیے گڑیا اور کپڑے بھی لائی تھیں۔ لائی تو وہ بہت کچھ حسنین کے لیے بھی تھیں مگر حسنین سے تو جیسے اس کی خوشی برداشت ہی نہیں ہوتی تھی۔

سنہرے لمبے بالوں والی باربی ہاتھوں میں لیے اس دن وہ بے انتہا خوش تھی۔ بڑے چھوٹے سب ایک دوسرے سے محو گفتگو تھے۔ باتیں ہو رہی تھیں۔ اور وہ گڑیا ہاتھ میں لیے برآمدے میں آ گئی تھی۔ پھر وہیں سے اس نے سیڑھیوں کا رخ کیا تھا۔ اوپر کمرے میں اس کا ٹرنک پڑا تھا۔ حسنین کے عتاب کا شکار ٹوٹے پھوٹے کھلونوں کو ٹیپ سے جوڑ جوڑ کر اس نے وہاں اکٹھا کر رکھا تھا۔ کوئی ایک کھلونا بھی ایسا نہیں تھا جو سلامت رہا ہو۔ اور کوئی ایک کھلونا بھی ایسا نہ تھا جسے اس نے کچرے میں پھینک دیا ہو۔ جو چیز ٹوٹی تھی، وہ اس کے دل سے زیادہ قریب ہو جاتی تھی۔

وہ سنہرے بالوں والی اس گڑیا کو بھی اسی ٹرنک میں رکھ دینا چاہتی تھی۔ وہ خود حسنین سے محفوظ نہیں رہتی تھی مگر اپنی گڑیا کو محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔ جانتی تھی اس کا جنونی بھائی اس گڑیا کو بھی نہیں چھوڑے گا۔ چولہے میں جھونک دے گا۔ یا پھر اس کی گردن الگ کر دے۔ اس کی ٹانگیں توڑ مروڑ کر پھینک دے گا.....

وہ زیر لب مسکراتی خوشی خوشی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی اور حسنین اس کے پیچھے چپکے چپکے سے آ رہا

تھا......

کسی احساس کے تحت اس نے رک کر پیچھے دیکھا تھا اور پھر خوف سے وہیں تھم کر رہ گئی تھی۔

"جنت! تم نے مجھے اپنی ڈول دکھائی ہی نہیں۔"

جنت کی آنکھوں میں ہراس پھیل گیا۔ گڑیا پر گرفت بڑھ گئی۔ وہ صحیح معنوں میں اپنے اس جنگلی بھائی سے ڈرتی تھی جس کا بس اس پر۔ اور اس کے معصوم کھلونوں پر چلتا تھا......

اور اس لیے جب وہ چھت کی سیڑھیوں پر......

خاصی بلندی سے اس کے ہاتھ سے گڑیا چھین رہا تھا تو اس وقت اس نے شاید زندگی میں پہلی بار ہمت دکھاتے ہوئے اپنی گڑیا بچانے کی کوشش کی تھی۔ اسی کھینچا تانی کے دوران حسنین نے اس کی گڑیا کو بالوں سے پکڑ کر اس قوت سے کھینچا تھا کہ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی تھی۔ ایسے جیسے سچ مچ میں حسنین نے اس کے بال کھینچ ڈالے ہوں۔ کچھ ایسی ہی تکلیف تھی جو اس کے اندر اٹھی تھی کہ اب گڑیا کا سر حسنین کے پاس تھا اور دھڑ اس کے ہاتھوں میں۔ اور وہ ہنس رہا تھا اس پر، اس کی بے بسی پر۔ اس کا نقصان کر کے اب ہنس رہا تھا۔ پھر ▬ گڑیا کا دھڑ ہتھیانے کے لیے لپکا تھا۔

طیش کے عالم میں۔ کچھ غصے اور بے بسی سے اس نے روتے ہوئے حسنین کو خود سے پرے دھکیلا تھا۔ اور تب ہی وہ لڑکھڑایا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے...... بہت اچانک...... کھیل لمحے کا تھا۔ یا پھر لمحے سے بھی کم مدت کا تھا۔

ڈرائنگ روم سے نکلتی نفیسہ کی آنکھوں کے سامنے حسنین سیڑھیوں پر لڑھکتا پکی اینٹوں کے فرش پر جا گرا۔

اس کا سر پھٹ گیا۔ خون بہنے لگا۔ آنکھیں بند ہو گئیں اور جسم ساکت ہو گیا۔ نفیسہ کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ اور جنت ٹوٹی ہوئی گڑیا اپنے ہاتھوں میں لیے خوف سے تھر تھر کانپتی کھڑی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

حسنین موقع پر ہی دم توڑ گیا تھا۔ نفیسہ نیم پاگل سی ہو گئیں۔ وہ بھول گئیں جنت بھی ان کا خون ہے۔ انہوں نے پہلی بار اس پر ہاتھ اٹھایا۔ اتنا مارا کہ وہ مرنے کے قریب ہو گئی۔

"یہ بدبخت کھا گئی میرے بچے کو۔ مار دیا اس نے میرے حسنین کو...... میرے بچے کو مار دیا۔"

محبت تو شاید وہ پہلے بھی نہیں کرتی تھیں۔ مگر ساڑھے چھ سال کی عمر میں اس نے سگی ماں کی شدید ترین نفرت سہی۔ ان کا دماغی توازن درست نہ رہا تھا۔ رات کو روتی تڑپتی باہر بھاگ جاتیں۔ حسنین کی قبر سے لپٹ جاتیں۔ کہیں اور بس نہ چلتا تو جنت پر پل پڑتیں۔

کمال جدید الگ غم سے نڈھال تھے مگر نفیسہ کی نسبت کچھ متحمل تھے مگر پہلے سے زیادہ خاموش ہو گئے تھے۔

انہوں نے پہلے دن جنت پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ مگر اب تو نظر اٹھا کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھتے تھے۔ بیٹھی بھائی کو یاد کر کے الگ روتی...... اور سوچتی صرف گڑیا ہی تو تھی...... مگر گڑیا ساڑھے چھ سال کی اس بچی کے لیے بہت اہم تھی۔ جس کی زندگی میں پیار محبت اور رشتوں کی بے انتہا کمی تھی۔

"یہ پیدا ہی کیوں ہوئی؟ یہ پیدا ہوتے ہی مر کیوں نہیں گئی؟ میں نے اس کا گلا اسی وقت کیوں نہ گھونٹ دیا۔"

اور وہ سہمی سہمی، روئی روئی سی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہتی۔ کمرے میں چھپی رہتی۔ ماں اگر پاگل ہو رہی تھی۔ تو نارمل وہ بھی نہ رہی تھی۔

ایک دن تو انتہا ہو گئی تھی۔ نفیسہ نے گلا دبا کر اسے جان سے مارنے کی کوشش کی تھی۔ اگر ایمان بروقت مداخلت نہ کرتی تو شاید وہ ایسا کر بھی گزرتیں۔

انہی دنوں نانا آئے تھے۔ گھر کے معاملات کی خبر انہیں پہلے بھی تھی مگر جب جنت کی حالت دیکھی تو

رہا نہ گیا۔ بیٹی پر برس پڑے ..... گم صم داماد کو بھی آڑے ہاتھوں لیا۔ پھر اس کا سامان باندھا اور اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

"یہاں رہے گی تو حسنین کی طرح یہ بھی مر جائے گی۔"

جاتے وقت انہوں نے ایمان سے کہا تھا۔ وہ آنکھوں میں نمی لیے نظریں چرا گئی۔ بھائی کا غم تازہ تھا۔ صدمہ گہرا تھا..... صبر کسی کو بھی تو نہیں آیا تھا۔ اسے کیسے آ جاتا؟ ہر چند اس نے جنت کے لیے نرم ہونا چاہا مگر نہ ہو پائی۔

لاہور سے کوئٹہ کا سفر بے حد خاموشی سے کٹا تھا۔ وہ بیمار تھی۔ ذہنی طور پر بھی نارمل نہ رہی تھی۔ نانا ڈاکٹر تھے۔ اگلے چند دن وہ ان کے کلینک میں زیر علاج رہی تھی۔ طبیعت سنبھلی تو وہ اسے گھر لے آئے۔ وہ اتنی خوف زدہ اور ہراساں تھی کہ ان سے بھی ڈر رہی تھی۔ بولنا تو اس نے تقریباً چھوڑ دیا تھا۔ کھانا بمشکل کھاتی تھی۔

سوتے میں چیختے ہوئے اٹھ کر بیٹھ جاتی۔ ان کی گرفت میں چلا چلا کر روتی رہتی۔ ہر بار اسے لگتا اماں اسے مار رہی ہیں۔ ہر بار اسے لگتا حسنین سیڑھیوں سے اس کی وجہ سے گر رہا ہے.....

نانا کی آغوش میں وہ کچھ سنبھل جاتی۔ نرم رویہ اور محبت سے وہ کچھ بہل جاتی۔ روتے روتے سو جاتی مگر چہرے پر تکلیف دہ تاثرات نیند کی حالت میں بھی ٹھہرے رہتے۔

"وہ..... میری گڑیا..... توڑنا چاہتا..... تھا۔" سینے سے لگ کر۔ ان کی قمیص کو مٹھیوں میں بھینچ کر وہ روتی..... "میں نے نہیں گرایا تھا۔ وہ خود گر گیا بابا۔"

نانا اس کی ذہنی حالت کے پیش نظر کافی پریشان رہے۔ انہوں نے اس کا چائلڈ سائیکاٹرسٹ سے معائنہ کروایا۔ کچھ عرصے تک سیشن ہوتے رہے۔ علاج چلتا رہا۔ رفتہ رفتہ وہ نارمل ہونے لگی۔ مگر راتوں میں اب بھی روتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ جاتی تھی

اس کا ذہن بٹکانے کے لیے، اور زندگی میں اسے مصروف کرنے کے لیے انہوں نے اس کا سکول میں ایڈمیشن کروا دیا تھا۔ کافی حد تک نہ سہی۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ وہ کچھ حد تک ضرور سنبھل گئی تھی۔

☆☆☆

حسنین کی وفات کے دس ماہ بعد کار ایکسیڈنٹ میں کمال جنید کا انتقال ہو گیا تھا۔ اسے اچھی طرح سے یاد تھا نانا اسے اپنے ساتھ لاہور لے کر نہیں گئے تھے۔ وہ سارا وقت ان کے ملازم نورالدین کی بیوی کے ساتھ گھر میں رہی تھی ..... وہ بچی تھی۔ نقصان کی اتنی سمجھ نہ تھی۔

کمال جنید نے نہ اس سے محبت کی تھی اور نہ ہی اس کی بہنوں سے ..... ہمیشہ غصے سے جھنجلائے ہوئے رہا کرتے تھے۔ جب حسنین پیدا ہوا تھا، تب ہی ان کے چہرے کے تاثرات بدلے تھے اور وہ کچھ نرم ہوئے تھے۔ مگر یہ نرمی۔ خوش اخلاقی۔ اور محبت بھرا رویہ بھی صرف حسنین کے لیے ہی تھا..... وہ سات بیٹیوں کے باپ تھے۔ مگر ان کو خوشی حسنین کا باپ بن کر ہوئی تھی..... جب تک وہ ان کے ساتھ گھر میں رہی تھی۔ اسے یاد نہیں تھا انہوں نے کبھی اس سے پیار کیا ہو یا نام سے پکارا ہو۔ اسے شک تھا شاید انہیں اس کا نام بھی معلوم نہ ہو..... ایسا باپ جب دنیا سے رخصت ہوا تھا تو بس ذرا دیر کے لیے اس نے محسوس کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس نے زندگی میں ایک اہم رشتہ کھو دیا ہے..... یہ احساس تکلیف دہ تھا۔ آنکھوں میں نمی بھی آئی تھی۔ صدمہ بھی پہنچا تھا مگر وہ رو نہیں سکی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ ان کے قریب نہیں رہی تھی۔ شاید اس لیے بھی کہ وہ ساڑھے سات سال کی ایک کم عمر بچی تھی جسے ابھی ان معاملات کی ٹھیک سے سمجھ نہ تھی یا پھر یہ خیال تسلی بخش تھا کہ اس نے اپنے والد کو سیڑھیوں سے نہیں گرایا تھا۔ والد اس کی وجہ سے نہیں مرے تھے..... مگر باپ کی موت بھی اس کے کھاتے میں لکھ دی گئی تھی۔

وہ حسنین کی موت کی ذمہ دار سمجھی جاتی تھی۔

اب وہ اپنے باپ کی موت کی بھی ذمہ دار ٹھہرا دی گئی تھی۔

وہ منحوس، بدبخت اس کی ہی وجہ سے اس گھر کی رونقیں قبروں میں جا سوئی تھیں۔ ساری خطائیں اس کے کھاتے میں تھیں۔ سارے حساب اس کی طرف کھلتے تھے۔

نانا اسے ساتھ لے کر نہیں گئے تھے۔ انہوں نے ان دس ماہ میں اسے اس قدر مشکل سے سنبھالا تھا کہ اب وہ نہیں چاہتے تھے جنت پھر اسی گھر، اسی ماحول میں جائے۔ تب تک نہیں جب تک نفیسہ کا دل جنت کے لیے نرم نہیں ہو جاتا۔ یا وہ اس کے ناکردہ گناہوں کو معاف نہیں کر دیتیں۔

وہ ماں تھیں۔ بیٹے کے قاتل کو معاف نہیں کر سکتی تھیں۔ بیٹا بھی ایسا جو اکلوتا تھا۔ چودہ سالوں کے طویل انتظار کے بعد زندگی میں آیا ہو...... پھر شوہر کی حادثاتی موت۔ ان کے لیے یہ بڑے گہرے صدمے تھے۔ ابھی تک تو انہیں حسنین کا صبر نہیں آیا تھا تو اس حادثے پر کیسے سنبھل جاتیں؟

نانا کی امی سے فون پر بات ہوا کرتی تھی۔ وہ اب بھی لاہور جایا کرتے تھے۔ اتنا وہ جانتی تھی اس کی ماں پہلے سے بہتر تھی اور یہ بھی کہ وہ اسے قبولنے کے لیے ہرگز ہرگز تیار نہیں تھیں۔ بہنوں کا خیال تھا، وہ بمشکل سنبھلی ہیں۔ جنت کو دیکھیں گی تو انہیں حسنین یاد آئے گا۔ اور حسنین جسے نفیسہ نہیں بھولتیں۔ اس کا چہرہ یوں جنت کے روپ میں سامنے آئے گا تو وہ حواس کھو بیٹھیں گی۔

نانا کو بھی یہی لگتا تھا...... کہ یہ صورت حال صرف ان کی بیٹی کی نہ تھی۔ نواسی کی بھی تھی۔ جنت اسی طرح کے حالات سے دوچار تھی...... آج بھی وہ سوتے میں اٹھ کر بیٹھ جاتی تھی۔ ڈر جاتی تھی اور انہیں بھی ڈرا دیتی تھی۔

"اپنی ماں کو سمجھایا کرو، جنت کو بددعا نہ دیا کرے، اولاد ہے اس کی۔ اتنی بری باتیں...... کوئی سگی اولاد کے لیے بھی ایسے سخت الفاظ استعمال کرتا ہے؟"

نانا بھتے وہ سو رہی ہے مگر وہ سن رہی ہوتی۔

کبھی وہ اس کی ماں کو ہی سمجھا رہے ہوتے۔

"تمہاری بیٹی ہے، تمہارا خون۔ تم نے جنم دیا ہے اسے۔ ایسا کب تک چلے گا بیٹا؟ چھوٹی سی بچی ہے وہ۔ کچھ تو رحم کھاؤ اس پر، بچوں کی لڑائی تھی۔ حسنین غلطی سے گر گیا۔ اتنی ہی زندگی تھی اس کی۔" پھر رک جاتے۔

"غلطی تمہاری بھی ہے۔ تم نے حسنین کو بہت سر چڑھا رکھا تھا۔"

جانے آگے وہ روتے ہوئے کیا کہتیں کہ وہ یک دم چپ ہو جاتے۔ کافی دیر تک چپ ہی رہتے۔ پھر فون بند کر دیتے۔ وہ بھی آنکھیں بند کر لیتی......

تپتی ہوئی دوپہر۔ اماں کی چیخیں۔ مار دھاڑ۔ شور۔ کہرام...... اور حسنین۔ اس کی پیشانی سے پھوٹتا خون...... اور گڑیا کا ٹوٹا ہوا سر۔ مکمل ہاتھوں میں بھینچ کر وہ آنکھیں کھول دیتی۔

"کیا ہوا میرے بچے کو؟" نانا اسے بانہوں میں بھر لیتے۔

"اسے میں نے نہیں مارا تھا۔" سینے میں سر دیے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی۔ "پہلے اس نے مجھے مارا۔ میرے بال کھینچے۔ میری گڑیا کو توڑا۔ میں نے نہیں مارا اسے۔ میں نے نہیں مارا۔"

"جانتا ہوں۔" نانا تسلی دیتے۔ "وہ سب غلطی سے ہوا تھا۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔" وہ ہر بار کہتے...... اس کے ننھے ذہن کی گرہیں سلجھانے کی کوشش کرتے اور یقین دلاتے، وہ صرف ایک حادثہ تھا، جنت کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں...... اور وہ یقین کر لیتی۔ وہ یقین کرنا چاہتی تھی...... مگر اس "یقین" سے رشتہ داروں کی اس سے متعلق رائے کبھی نہیں بدلی تھی۔

وہ آئینے میں خود کو دیکھتی، اسے حسنین ہی نظر آتا۔ آنکھیں، چہرے کے خدوخال، شہد رنگ بال۔

جنت کے روپ میں وہ بھی تھا۔ بچپن کا صدمہ ٹراما کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ اک خوف۔ وحشت بھرا احساس...... اک پچھتاوا...... وہ اس کے ساتھ تاعمر رہنے والا تھا۔

☆☆☆

نانا کی سنگت میں اس نے بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی کی دہلیز پر قدم جمائے تھے۔ انہوں نے ماضی سے آزاد کر کے اسے سنبھالا دیا تھا۔ آنے والے وقت سے متعلق ممکنہ مسائل اور پریشانیوں کے پیش نظر وہ اسے پہلے سے ہی تیار کرتے رہے تھے۔ جب تک وہ ان کے ساتھ رہی تھی وہ اپنے بچپن کے ماضی کو کسی حد تک اپنی زندگی سے نکالنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ وہ اسے یقین دلاتے رہے تھے کہ یہ ایک حادثہ تھا اور وہ اس بات پر یقین رکھ چکی تھی۔

اس عرصے میں اس کی دو بہنوں کی شادیاں ہوئی تھیں مگر وہ کسی ایک کی شادی میں بھی شریک نہ ہو سکی تھی۔

جب طیبہ کی شادی طے ہوئی تو اس کی عمر پندرہ سال تھی۔ پورے نو سال بعد وہ نانا کے ہمراہ شادی میں شرکت کرنے کے لیے آئی تھی۔ لیکن یوں کہ وہ براہ راست اپنی ماں سے نہیں ملی تھی اور نہ ہی انہوں نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ نانا کی وجہ سے ہی وہ کچھ خاموش تھیں۔ یا شاید وقت نے انہیں صبر کی ردا اڑھا دی تھی مگر سب کہتے تھے وہ بہت خاموش رہتی ہیں۔ کسی سے زیادہ بات چیت نہیں کرتی تھیں۔ زندہ ہوتے ہوئے بھی ہوئی زندگی سے کیسے دور ہوتا ہے نفیسہ اس کی زندہ جاوید مثال تھیں۔

بھرے پرے خاندان میں جنت ایک ''اجنبی'' تھی۔ اس کے اپنے تو صرف ''نانا'' ہی تھے۔ اور اسے صرف نانا ہی کافی تھے۔

بظاہر کوئی اسے کچھ کہہ نہیں رہا تھا مگر کھوجتی نگاہوں میں عجیب سا تاثر ضرور جھلکتا تھا۔ اسے شادی کے دوران محسوس ہوتا رہا تھا کہ ماں اسے دیکھتی رہی ہیں۔ اس کے چہرے کے خدوخال میں اپنے حسنین کو کھوجتی رہی ہیں۔ اگر آج حسنین زندہ ہوتا تو وہ بھی اس کی طرح ایک خوب صورت ٹین ایجر ہوتا۔ اور شاید یہی خیال ہی ان کی طبیعت خرابی کا موجب بنا تھا۔

نئے گھر میں، رشتہ داروں سے مل کر، بہنوں سے باتیں کر کے، ان کے ساتھ شادی کی شاپنگ میں مصروف ہو کر اسے بہت اچھا لگا تھا۔ مایوں مہندی کے فنکشن اس نے بہت خاموشی اور دلچسپی سے اٹینڈ کیے تھے۔ یہ نانا ہی کی وجہ سے ممکن ہو پایا تھا کہ اس گھر میں اب بھولے سے بھی ماضی کا قصہ کم از کم کھلے عام نہیں چھیڑا جا رہا تھا...... بہنوں کا رویہ اس کے ساتھ قدرے بہتر تھا۔ تایا، چچا اور پھپھو کی فیملی کا اخلاق بھی کچھ برا نہ تھا۔

خاموشی تھی تو صرف ماں کی طرف سے تھی۔ فاصلے تھے بھی تو صرف ماں کی طرف سے۔ نانا نے منع کیا تھا تب ہی وہ چپکے چپکے سے، دور دور سے ہی انہیں دیکھ لیا کرتی تھی مگر ان کے سامنے آنے سے گریز کرتی تھی کہ نفیسہ کی آنکھوں سے جو نفرت جھلکتی تھی اس کی پہچان اسے بہت اچھی طرح تھی۔

☆☆☆

بارات والے دن وہ سیاہ اور سنہری کامدار فراک میں اس قدر حسین لگ رہی تھی کہ دیگر کئی چچا زاد، تایا زاد اور پھپھو زاد بھی اچانک سے حاضر ہو جانے والی اس کزن پر فدا ہوئے تھے۔

مگر وہ تو جیسے برھان کی تھی۔ برھان کے لیے ہی بنائی گئی تھی۔

برھان جنید! اس کے بڑے تایا کا اکلوتا بیٹا تھا...... پانچ سال بڑا تھا اس سے۔ خاندان بھر کا لاڈلا اور ہونہار سپوت۔

آتے جاتے، وہ کہیں نہ کہیں اسے روک لیتا۔ کوئی نہ کوئی سوال جھاڑ کر، اس کے سخت ردعمل کو انجوائے کرتا...... وہ لفٹ نہیں کروا رہی تھی۔ نہ اسے۔ نہ اپنے خاندان کے کسی بھی کزن کو...... مگر

دل ہی دل میں وہ برہان کی شخصیت اور وجاہت سے متاثر ضرور ہوئی تھی۔
جب وہ ایف ایس سی کے ایگزامز سے فارغ ہوئی تو تایا نے برہان کے لیے اس کا رشتہ مانگ لیا تھا۔ گو کہ تائی اس رشتے سے ہرگز خوش نہیں تھیں مگر بیٹے کی پسند کے آگے مجبور ہو گئی تھیں۔ نانا کو بظاہر سب ٹھیک لگا۔ برہان خوش شکل اور پڑھا لکھا تھا۔ اپنی یونیورسٹی کا ٹاپر تھا۔ اس کا برائٹ فیوچر تھا۔ ادب آداب، تمیز و تہذیب۔ انہوں نے سوچ و بچار کے لیے زیادہ وقت نہ لیا اور ہاں کر دی۔ سادگی سے نکاح کر دیا گیا مگر رخصتی جنت کی پڑھائی ختم ہونے تک کے لیے ملتوی کر دی گئی۔
ان ہی دنوں اسے برہان کو جاننے کا موقع ملا تھا۔ فون پر بات چیت ہوئی۔ تو وہ بھی اس سے محبت کرنے لگی۔ نانا کے بعد اس کی زندگی میں آنے والا وہ دوسرا مرد تھا جس سے اس نے خالص محبت کی تھی۔ نانا کے بعد اب وہی اس کا سب کچھ تھا۔
زندگی میں بظاہر سب ٹھیک ہی چل رہا تھا کہ نانا ہارٹ اٹیک کے بعد اچانک ہی دنیا سے چل بسے تھے۔ وہ یونیورسٹی کے فرسٹ ایئر سمسٹر سے فارغ ہوئی تھی کہ اتنا بڑا دھچکا لگا۔ اس کی دنیا تو جیسے ویران ہو گئی...... پڑھائی کو خیرباد کہہ کر اسے فوراً ہی لاہور سائرہ خالہ کے پاس جانا پڑا۔ نانا انہیں وصیت کر کے گئے تھے سو انہوں نے اسے اپنی ذمہ داری سمجھ لیا تھا۔
جنت کو اس صدمے سے نکل کر سنبھلنے میں کچھ وقت لگا تھا۔ دو ماہ بعد ہی تایا نے رخصتی پر زور دینا شروع کر دیا تھا۔ نانا اس کی شادی کی وصیت کر گئے تھے مگر وہ فی الوقت اس کے لیے تیار نہ تھی۔ اس سے بڑی دو بہنیں گھر بیٹھی تھیں مگر نفیسہ کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ بھی جیسے یہی چاہتی تھیں کہ وہ جلد از جلد اپنے گھر کی ہو جائے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ رخصت ہو کر برہان کے گھر چلی گئی تھی۔
زندگی نئی ڈگر پر چلنے لگی تو نئے گھر میں نئے رشتوں کو اس نے اپنا بنا لیا گو کہ تائی کے ساتھ ساتھ برہان کی بہنوں کا رویہ بھی اس کے ساتھ خوش گوار نہیں تھا مگر اس نے جیسے برہان کی محبت کو ہی اپنا سب کچھ مان لیا تھا۔ نانا صبر اور عزم کا سبق پڑھا کر گئے تھے اسے۔ تبھی وہ ان کے رویوں سے دل برداشتہ نہیں ہوئی تھی۔
وہ پڑھائی مکمل کرنا چاہتی تھی۔ برہان نے اسے نہ روکا۔ نانا کی جدائی کا زخم بھی مندمل نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر زندگی نے خوشیوں بھرے لمحات دیے تو وہ بھی جینے کی کوشش کرنے لگی۔
اور یہیں سے ایک کڑی آزمائش کا آغاز ہوا تھا۔

☆☆☆

شادی کے تین سال گزر جانے کے باوجود وہ ماں نہیں بن سکی تھی۔ اس کے بانجھ پن کی وجہ ڈاکٹرز کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ مرض لاعلاج ہو تو جواب دے دیا جاتا ہے۔ اسے بھی جواب دے دیا گیا تھا۔
اس رات وہ گھر آ کر بہت روئی تھی۔ برہان کتنی دیر تک اسے سمجھاتا بجھاتا رہا تھا۔ تسلی دلاسے دیتا رہا تھا۔ وہ اپنے شہر کی بہترین گائناکالوجسٹ کے پاس لے جانے کی بات کر رہا تھا۔ وہ اسے علاج کی یقین دہانی کرا رہا تھا۔
"تم نے سنا نہیں، وہ ڈاکٹر کیا کہہ رہی تھی! وہ میرے لیے کوئی علاج تجویز نہیں کر سکتی۔" رو رو کر اس نے اپنی حالت خراب کر لی تھی۔
"سوچو جنت! آج کون سی ایسی بیماری ہے جس کا علاج سائنس دریافت نہیں کر سکی؟"
"بانجھ ہونا ایک بیماری نہیں ہے...... بانجھ ہونا ایک حقیقت ہے۔"
وہ مایوسی کے اندھیروں میں اتنا غرق ہو چکی تھی کہ اسے اللہ کی ذات نظر آ رہی تھی، نہ اپنی تخلیق کی حقیقت سمجھ آ رہی تھی۔ ذہن خالی سا ہو گیا تھا۔ برہان کی کوئی دلیل، کوئی حجت اس کا غم ہلکا نہ کر سکی۔ اسے امید نہیں دلا سکی۔ یقین نہ کرا سکی۔

ٹیکے بعد دیگر شہر کے کئی بڑے ہاسپٹلز سے اس کے ٹیسٹ ہوئے۔ ہر ٹیسٹ کی ایک ہی رپورٹ تھی۔ ایک ہی حقیقت تھی جس کا احاطہ مختلف ڈاکٹرز نے اپنے مخصوص انداز میں کیا تھا۔

"میں ہی کیوں؟ میرے ساتھ ہی کیوں؟" وہ اپنی پوری زندگی میں بھی اتنا نہیں روئی تھی جتنا کہ اس رات روئی تھی۔ اس کے آنسو تھم ہی نہ رہے تھے، دل سنبھل ہی نہ رہا تھا۔ یہ محرومی اس کے لیے کیوں؟

اٹھتے بیٹھتے آتے جاتے اب اسے اپنی سسرال میں ساس اور نندوں سے طعنے سننے کو ملنے لگے تھے۔ نقص اس میں تھا تو عتاب کا نشانہ بھی وہی بن رہی تھیں۔ دوسری شادی کا ذکر بھی بار بار اس کے سامنے ہی چھیڑا جا رہا تھا۔ برھان اکلوتا بیٹا تھا اور تائی اپنے پوتے پوتیوں کو گود میں کھلانے کا خواب آنکھوں میں بسائے مزید انتظار کے حق میں نہیں تھی۔ وہ بس اب جلد از جلد برھان کی دوسری شادی کر دینا چاہتی تھیں۔ مگر برھان تھا کہ مان ہی نہ رہا تھا۔ وہ کسی طور بھی دوسری شادی کا سوچ ہی نہ رہا تھا۔ اسے اولاد کی کوئی جلدی نہ تھی۔ نہ پریشانی تھی نہ کوئی فکر۔ پروا تھی تو صرف جنت کی۔ قدر تھی تو صرف اس کے احساسات کی۔

"اگر میرے نصیب میں اولاد لکھی ہے تو وہ مجھے جنت سے بھی ہو سکتی ہے۔" وہ اکثر کہہ دیتا۔

"بانجھ ہے وہ بانجھ۔۔۔ ماں نہیں بن سکتی۔" تائی دن میں ہزار بار دہرایا جانے والا جملہ اس کے سامنے بھی دہرا دیتیں۔

وہ چپ ہو جاتا۔ کبھی غصہ کرتا۔ کبھی جھنجلا کر اٹھ جاتا۔ وہ ان سے کوئی بحث نہیں کر سکتا تھا۔ رپورٹس دکھا کر ان کی رائے نہیں بدل سکتا تھا۔

تائی نے دل کی بیماری سینے سے لگائی اور بستر پر پڑ گئیں۔ رو رو کر اپنا حشر الگ خراب کیا۔ برھان کو اپنی زندگی موت کے واسطے دیے۔ جذباتی بلیک میل کیا مگر وہ پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ کوئی بھی ایسا کام کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا جس سے جنت کے جذبات مجروح ہوتے ہوں۔

اس کی محبت دیکھ کر جنت ایک لمحے کے لیے خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکیوں میں شمار کرتی اور پھر اپنی محرومی کو سوچ کر بدقسمت ترین میں شامل ہو جاتی۔ وہ خود "ناقص" تھی۔ وہ برھان کو "کامل" کیسے کرتی؟ وہ خود "محروم" تھی۔ وہ اس کی "عطا" کیسے بنتی؟

گھر میں ٹینشن بڑھنے لگی۔ تائی امی کا رویہ اس کے ساتھ ہتک آمیز ہو گیا۔ اب اس کا ماضی زیر بحث لایا جانے لگا۔ اس کے باپ اور بھائی کا ذکر چھیڑے جانے لگا۔ اس کی بدنصیبی اور بدبختی کے سائے اس گھر کی خوشیوں پر محسوس کیے جانے لگے۔

بہت مجبور اور بے بس ہو کر برھان نے بالآخر گھر والوں کے آگے سر جھکایا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ کرلوں گا دوسری شادی مگر ابھی نہیں۔ آپ کچھ انتظار کرلیں، جنت بہت اپ سیٹ ہے، میں اسے مزید دکھ نہیں دینا چاہتا۔"

جنت کی آنکھیں کرب سے نم ہو گئیں۔ گویا وہ ارادہ کر چکا تھا مگر اسے کچھ وقت درکار تھا۔

کیا وہ وقت جنت کے زخم کا مداوا کر سکتا تھا؟ کیا وہ وقت جنت کے نقص کو پورا کر سکتا تھا؟ برھان کو وقت کیوں چاہیے تھا؟ جب ارادہ کر ہی لیا ہے تو پھر یہ انتظار کیوں؟ یہ انتظار کس لیے؟

"اے ہے اور کتنا انتظار کروں؟ پانچ سال کا انتظار کم ہے کیا؟" فضیلہ تائی کا پارہ ہی چڑھ گیا۔ "میرا بھی جی چاہتا ہے اپنے پوتے کو گود میں لوں۔ اسے اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں، جانے کتنے دن باقی ہیں زندگی کے۔۔۔۔"

وہ جانے اور کیا کہہ رہی تھیں، اس نے نہیں سنا، برھان کو ذہنی طور پر تیار کرنے کے لیے وہ اسے مزید کیا جتن اور دلیلیں دے رہی تھیں، اس نے نہیں جانا۔۔۔۔ جان بھی لیتی تو کیا کر لیتی؟

☆☆☆

اس رات برھان کافی تاخیر سے کمرے میں

آیا تھا۔ وہ بیڈ پر گھٹنوں کو سینے سے لگائے، ان کے گرد بازو باندھے کسی مجسمے کی طرح خاموش اور ساکت بیٹھی تھی۔ اس کی دودھیا رنگت کملا کر رہ گئی تھی۔ روشن چمکتی آنکھوں کے دیے بجھ گئے تھے، ان کے نیچے حلقوں کے اندھیرے تھے۔

وہ اس کے برابر میں بیٹھ گیا تھا۔

"جنت۔" اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس نے پکارا تھا۔ وہ ایک بار پھر سسک پڑی۔

"یہ تم نے اپنی کیا حالت کر لی ہے یار!"

جانتی تھی وہ اس سے شدید محبت کرتا تھا، وہ اسے کسی بھی صورت اس حالت میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایک محبت اس کی بھی تھی۔ جو شراکت داری برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ تو برہان کی کیمیل کولیگز سے بھی جیلس ہو جایا کرتی تھی کجا کہ اس کی دوسری بیوی۔ جس نے برہان کی زندگی میں آنا تھا...... اس کا نام لینا تھا۔ اس کے بچے کی ماں بھی بننا تھا۔ اس کی ہمت وہ کہاں سے لاتے؟ اس کا حوصلہ وہ کہاں سے لاتے؟ یہ اذیت زیادہ بڑی تھی۔ یہ زخم زیادہ گہرا تھا۔

"میری ایک بات غور سے سنو جنت۔" محبت بھرے لہجے میں ایک عزم تھا۔ ایک عہد۔ ایک یقین۔ "میری زندگی میں جو تمہاری جگہ ہے، اسے کوئی اور نہیں لے سکتا۔"

کمرے میں جلتے واحد بلب کی روشنی تیز ہوئی تھی۔

"محبت میں نے صرف تم سے کی ہے، اور صرف تم سے ہی کرتا رہوں گا۔" وہ اس کے ہاتھ پر گرفت مضبوط کیے بہت مان سے کہہ رہا تھا۔

"ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔ ہمارے درمیان کبھی کوئی فاصلہ نہیں آئے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔" وہ یقین دہانی کراتے ہوئے اسے آئندہ کل کے لیے تیار کر رہا تھا۔

"میں کل بھی تمہارا تھا، آج بھی تمہارا ہوں اور ہمیشہ رہوں گا۔"

اور جنت بنت کمال...... اپنی محرومی پر اس کی محبت کی ردا چڑھائے...... اس کے ایک ایک لفظ پر ایمان لے آئی تھی۔ لڑکپن سے لے کر آج تک اس نے یہی تو کیا تھا۔ اسے اب بھی یہی کرنا تھا۔

وہ تائی کا اکلوتا بیٹا تھا۔ بہت خواب تھے۔ امیدیں تھیں گھر بھر کے لوگوں کی اس کے لیے۔ اس کے بچوں کے لیے۔ وہ یہ ظلم اس پر نہیں ہونے دے سکتی تھی۔ جس سے محبت ہو، اس کی خوشیاں اپنی ذات سے بڑھ کر عزیز ہوتی ہیں۔ اسے بھی وہ بہت عزیز تھا۔ تب ہی نصیب کے آگے سر جھکاتے ہوئے اس نے دل پر بھاری پتھر رکھ لیا تھا۔ تب ہی اس کے وعدوں پر بھروسا کر کے دوسری شادی کے لیے راضی ہو گئی۔

☆☆☆

جس روز برہان کا نکاح تھا اس روز اس کی تمام تر ہمت جواب دے گئی تھی۔ وہ کمرے میں تیار ہو رہا تھا اور اس نے روتے سسکتے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"مت جاؤ برہان! میں مر جاؤں گی۔"

اس نے ہاتھ تھام کر اسے بیڈ پر بٹھاتے ہوئے وہ اس کے قدموں میں بیٹھ کر اسے ایک بار پھر سمجھا رہا تھا۔ اور وہ سمجھ نہیں رہی تھی۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے جا رہی تھی۔

کیا اس نے اپنی پوری زندگی میں کبھی اس وقت کو بھی سوچا تھا؟ اذیت پر مشتمل ان لمحوں کا گمان کیا تھا؟ برہان کی زندگی میں کوئی اور آئے گی اور وہ اسے آنے دے گی؟ کچھ کر ہی نہ سکے گی؟ وہ لمحے جب محبت کا واسطہ بھی کام نہیں آئے گا؟

"تم تیاری کرو میں تمہیں حفصہ آپی کے گھر ڈراپ کر دیتا ہوں، واپسی پر پک کر لوں گا۔"

"نہیں، مجھے کہیں نہیں جانا۔ یہیں بیٹھ کر تمہارا انتظار کرنا ہے۔"

"جنت ضد مت کرو!"

"میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔" وہ

حواسوں میں نہیں لگ رہی تھی۔ ناچار اسے هصہ آپی کو فون کرنا پڑا تھا۔ اس کی نند کے باوجود وہ اسے زبردستی اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔

شدت سے روتے ہوئے کچھ بے قابو ہو کر وہ اس رات امی کے گھر چلی آئی تھی۔ وہ ان سے ملنا چاہتی تھی۔ ان کے گلے لگنا چاہتی تھی۔ ان کے قدموں میں گرنا چاہتی تھی۔ مگر ہانیہ نے اسے ڈرائنگ روم سے آگے ان کے کمرے تک جانے نہیں دیا تھا۔

"وہ تم سے نہیں ملیں گی۔"

"صرف ایک بار۔ صرف ایک بار۔ مجھے ان سے بات کرنی ہے۔"

کھٹاک کی آواز کے ساتھ نفیسہ کے کمرے کا دروازہ مقفل ہو گیا تھا۔ ایسا پہلے بھی ہو چکا تھا۔ کئی بار ہو چکا تھا۔ وہ جب بھی آئی تھی۔ یہی ہوتا تھا۔ نفیسہ اس کی شکل تک نہ دیکھنا چاہتی تھیں۔ وہ خود کو کمرے میں بند کر لیتی تھیں۔

ہانیہ کو راستے سے ہٹا کر وہ ان کے بند کمرے کا دروازہ زور زور سے بجانے لگی تھی۔ ہمیشہ کی طرح۔ کچھ اذیت...... کچھ دکھ...... کچھ کرب اور بے بسی کے ساتھ۔

"مجھے دعا دے دیں امی! مجھے ایک دعا دے دیں۔ صرف ایک بار میرے لیے ہاتھ اٹھا لیں۔ صرف ایک بار۔ امی...... امی......!" وہ روتے ہوئے ان کی منتیں کر رہی تھی۔ گڑگڑا رہی تھی۔ "مجھے مار لیں۔ میرا منہ نوچ لیں۔ میری جان نکال لیں۔ لیکن یہ نہ کریں۔ پلیز یہ نہ کریں۔"

مگر دوسری طرف ہمیشہ کی طرح خاموشی چھائی رہی تھی۔

"اللہ کے لیے دروازہ کھول دیں امی۔ مجھے آپ کی ضرورت ہے...... بہت ضرورت ہے۔" روتے بلکتے وہ گھٹنوں کے بل گر سی گئی۔

"ان کی طبیعت خراب ہو جائے گی جنت۔ اب جاؤ یہاں سے۔" ہانیہ نے اسے کندھوں سے پکڑ کر وہاں سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس نے ہاتھ جھٹک دیئے تھے۔ دروازے کو پکڑ لیا تھا۔

"آج اس کا نکاح ہے۔ امی!" سسکیوں کے بیچ وہ بمشکل کہہ پائی۔ "میں ابھی تک ماں نہیں بن سکی تو اس لیے۔ وہ دوسری شادی کر رہا ہے۔"

لب بھینچ کر، آنکھیں رگڑ کر اس نے دروازے پر دستک دی۔ "امی! آپ سن رہی ہیں مجھے؟"

بہت پیار، بہت محبت اور لجاجت سے وہ دروازے سے لگ گئی تھی۔ "امی میں اس وقت صرف چھ سال کی تھی۔" اس کا گلا بیٹھا ہوا تھا۔ گلوگیر آواز کمزور سی تھی۔ "صرف چھ سال کی تھی امی!" جسم لرز رہا تھا۔ دل تڑپ رہا تھا۔ آنکھیں بار بار بھیگ رہی تھیں۔ وہ کسی ننھے معصوم بچے کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر اپنی صفائی دے رہی تھی۔ "میں نے اسے نہیں مارا تھا۔ میرا یقین کریں۔ میں نے اسے۔" اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ "مجھے معاف کر دیں۔ اللہ کے لیے۔ مجھے معاف کر دیں۔ مجھے دعا دے دیں۔ دیکھیں پاپا بھی نہیں رہے۔ برہان بھی نہیں رہے گا۔ میں اکیلی رہ جاؤں گی۔ امی اللہ کے لیے۔ صرف ایک دعا۔ میرے لیے صرف ایک دعا۔"

لیکن دعا نہیں ملی۔ دروازہ بھی نہ کھلا۔ ہمیشہ کی طرح اس رات بھی هصہ آپی اسے زبردستی وہاں سے اٹھا کر لے گئی تھیں۔

برہان بار بار فون کر رہا تھا۔ اس کی خیریت معلوم کرنا چاہ رہا تھا۔ مگر اس نے فون پر اس سے بات نہیں کی تھی۔ نیند کی گولی لے کر آرام کرنا چاہا مگر اس کی بے چینی اور بے قراری میں کسی صورت افاقہ نہیں ہوا تھا۔

اگر جو یہ نقص اس کی زندگی میں نہ ہوتا؟ اگر جو یہ محرومی اس کا مقدر نہ ہوتی؟ اس نے لاکھ کوشش کی واپس گھر جانے کی مگر هصہ آپی نے اسے جانے نہ دیا۔

یہ بھی برہان کی ہی خواہش تھی کہ وہ کچھ روز ان کے یہاں ہی ٹھہرے۔ نفیلہ تائی گھر کو سجا رہی

تھیں۔ نئی دلہن کا کمرہ سیٹ ہو رہا تھا، دیگر رسمیں ادا ہو رہی تھیں، اس صورت میں وہ جنت کو وہاں نہیں لانا چاہتا تھا۔ البتہ آفس سے واپسی پر وہ روز ہی اس کے پاس آتا تھا، محبت کا یقین دلاتا تھا، اس کا خوف، اس کے خدشات کو ختم کرنے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ جب تک وہ پاس ہوتا وہ ہر ایک بات پر یقین کرتے ہوئے ہلکی پھلکی سی ہو جاتی۔ صرف یہ احساس کہ برہان صرف میرا ہے، اسے تمام خدشات سے مبرا کر دیتا۔ ہمت جگا دیتا۔ حوصلہ بڑھا دیتا۔ اور جوں ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوتا تنہائی اسے سانپ کی طرح ڈسنے لگتی۔ محرومیاں نئے سرے سے سر اٹھاتیں اور وہ خود اذیتی کی دلدل میں دھنستی چلی جاتی۔

یہ اذیت، یہ دکھ، یہ کرب، یہ محرومی میری زندگی میں کیوں؟ وہ سوچتی اور رو دیتی۔

☆☆☆

برہان کی شادی دھوم دھام سے سرانجام پائی تھی۔ ولیمہ کے بعد ہی وہ اسے اگلے روز ہی لینے آ گیا تھا۔ حفصہ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھائے کافی دیر تک کچھ کہتی رہی تھیں اور وہ انہیں تسلی دیتا رہا تھا۔ وہ ان کی بہن کو جان سے بھی بڑھ کر چاہتا تھا۔ اسے تکلیف دینے کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ ہر طرح سے اس کا خیال رکھنے کی یقین دہانی کروا رہا تھا۔

تیار ہو کر جب وہ نیچے آئی تو برہان اسے بہت فریش اور نکھرا نکھرا سا لگا۔ جینز پر سفید شرٹ میں ملبوس، بال سلیقے سے جمے ہوئے، کلائی پر قیمتی گھڑی۔ وہ اپنی مکمل تیاری میں ہمیشہ کی طرح بہت اچھا لگ رہا تھا۔ جنت پر نظر پڑتے ہی اس کے آنکھوں کی چمک بڑھی تھی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ حفصہ آپی نے انہیں دعاؤں کے سائے تلے رخصت کیا تھا۔

ڈرائیونگ کے دوران وہ اس سے ہلکی پھلکی باتیں کرتا رہا۔ معمول کے مطابق۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ جیسے کوئی تیسرا فرد ان کی زندگی میں آیا ہی نہیں۔

یہاں سے وہ سیدھا اسے ریسٹورنٹ لے کر گیا تھا۔ اس کی من پسند ڈشز کا آرڈر دے کر وہ میز پر اس کی طرف جھکا تھا۔

"کیا خیال ہے لنچ کے بعد شاپنگ پر چلیں؟" وہ شاید اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتا تھا۔

جنت اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کا برہان تھا۔ وہ ذرہ بھر نہیں بدلا تھا۔ اس کی زندگی میں جنت کی وہی اہمیت تھی۔ وہی مقام تھا۔ وہ اس سے آج بھی اتنی ہی محبت کرتا تھا۔

"تم نے میرے لیے بہت بڑی قربانی دی ہے جنت! میں تمہارا یہ احسان کبھی چکا نہیں پاؤں گا۔" لنچ کے بعد جب وہ گاڑی کی طرف جا رہے تھے تو اس نے کہا تھا۔ "اللہ نے اگر مجھے اولاد سے نوازا تو ان پر تمہارا بھی اتنا ہی حق ہوگا جتنا میرا یا ماہین کا۔"

وہ خاموش ہو گئی تھی۔ اولاد کا ذکر ایسے ہی اس پر جمود طاری کر دیتا تھا۔

شاپنگ بیگز ہاتھوں میں پکڑے جس لمحے وہ برہان کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی، نگاہ سیدھی ماہین پر گئی۔

سرخ کامدار جوڑے میں ملبوس، ٹک ٹک سے تیار نئی نویلی دلہن اس سے بہت خوش اخلاقی سے ملی تھی۔ البتہ فضیلہ تائی کے تیور کچھ بگڑے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ انہیں برہان کا شادی کے دوسرے روز ہی جنت کو وقت دینا بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

جنت معذرت چاہتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف گئی تو برہان بھی اس کے پیچھے چلا گیا تھا۔

لاؤنج میں سامنے بیٹھی ماہین کے چہرے پر ایک تاریکی سی چھا گئی۔ سرتاج نے تو نظر بھر کر اسے دیکھا تک نہ تھا۔ حالانکہ وہ اپنی ساس کے کہنے پر اس کے لیے کتنے شوق سے تیار ہو کر بیٹھی تھی۔

فضیلے تائی بھی سارا وقت اندر ہی اندر جلتی کڑھتی رہی تھیں۔ انہوں نے تو ماہین سے بھی کہہ دیا تھا۔

"صبر سے کام لینا بیٹی! غلام ہے یہ جنت کا، وقت لگے گا پر وہ تمہارا بھی ہو جائے گا، آخر تم اسے بچہ دو گی۔" اپنی بہو کا اڑتا رنگ انہوں نے بھانپ لیا تھا۔ ماہین بدقت مسکرادی تھی۔ مگر اس کی آنکھوں میں کچھ تھا۔ کوئی ایسا تاثر جو شعلہ بن کر لہرا رہا تھا۔

☆☆☆

شادی کے بعد برحان اپنے حقوق و فرائض کا اسی طرح سے خیال رکھ رہا تھا جیسے وہ شادی سے قبل رکھا کرتا تھا۔ مجبوری تلے دبی جنت کے لیے صورت حال کچھ ایسی تھی کہ اسے بھی سمجھوتہ کرنا پڑا تھا۔ وہ ماہین کو پسند نہیں کرتی تھی، نہ ہی کر سکتی تھی مگر پھر بھی وہ اس کے کسی بھی معاملے میں دخل اندازی نہیں کرتی تھی۔ وہ اسے اس گھر میں مکمل طور پر اس طرح سے نظر انداز کرتی تھی جیسے وہاں اس کا وجود ہے ہی نہیں۔ جس ذہنی اذیت سے وہ روز گزرتی تھی اس لحاظ سے یہ خیال اس کے لیے بہتر بھی تھا۔

شروع کے دو ماہ سب ٹھیک رہا تھا۔ نہ برحان کے رویے میں تبدیلی آئی تھی۔ نہ محبت میں کمی واقع ہوئی تھی۔ وہ آج بھی اسے شدتوں سے چاہتا تھا۔ اور اس وقت۔ کبھی واہن جنت کے لیے برحان کی محبت آب حیات سے کم نہ تھی...... لیکن جب ماہین امید سے ہوئی تو جہاں اس کی سوئی ہوئی اذیتیں جاگ اٹھیں وہاں برحان کا دل بھی بدل گیا۔ ماہین پہلے اس کی صرف بیوی تھی۔ اب وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ اس کا اسٹیٹس اونچا ہو رہا تھا۔ وہ اس کے دل میں اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہو رہی تھی۔ وہ زیادہ وقت ماہین کو دینے لگا تھا۔ اس کی پسند ناپسند کا خیال رکھنے لگا تھا۔

پہلے احساسات میں فرق آیا پھر ترجیحات بدلنے لگیں۔ شادی کے پانچ سال اس نے صرف جنت کے نام کیے تھے۔ اب وہ کچھ وقت خالص اپنے بچے کی ماں کے لیے بھی نکالنا چاہتا تھا۔ اور یہیں سے فاصلے بڑھے تھے۔ دوریوں کا آغاز ہوا تھا۔ یہیں سے بدگمانیاں اٹھی تھیں اور شکووں کا آغاز ہوا تھا......

اور پھر رفتہ رفتہ سب بدل گیا تھا۔ جذبات، احساسات اور ترجیحات بھی۔ جانے کیسے وہ نظروں میں رہ کر بھی نظروں سے اوجھل ہوئی۔ جانے کیسے برحان کی محبت جب آزمائش کی بھٹی سے گزر کر نکلی تو پھر۔ محبت نہ رہی۔

☆☆☆

وہ سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ کندھے مایوسی کے بوجھ تلے جھکے ہوئے تھے۔ آنکھیں بے بسی کے احساس سے نم ہو رہی تھیں۔ اس کا رخ کچن کی طرف تھا اور کچن سے برحان واصف کی آواز آرہی تھی۔

"کیسی باتیں کرتی ہو ماہی! تم نے تو مجھے مکمل کر دیا ہے۔"

وہ جو پانی پینے کی غرض سے کچن کے اندر جا رہی تھی، اس کا یہ جملہ سن کر دروازے میں ہی رک گئی تھی۔ کاؤنٹر ٹیبل کے اس طرف۔ ماہین کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ مسکراتا ہوا پرکشش چہرہ...... اور بے داغ آنکھوں کی چمک۔ کتنا خوش لگ رہا تھا وہ...... کتنا مکمل لگ رہا تھا ماہین کے ساتھ۔

"آئندہ ایسی باتیں مت کرنا! بہت اہم ہو تم میرے لیے۔"

"صرف اہم ہوں؟ پیار نہیں کرتے آپ مجھ سے؟" وہ جنت کو دروازے میں دیکھ چکی تھی۔ اور بڑی لگاوٹ سے پوچھ رہی تھی۔

"اہم وہی ہوتے ہیں جن سے محبت ہوتی ہے۔"

اسے پتہ نہیں ہونا تھا مگر وہ ہو گئی تھی۔

محبت کا اعتراف! ہاں یہ محبت کا اعتراف ہی تھا۔ ماہین سے شادی کے پورے چھ ماہ بعد۔ یہ محبت کا اعتراف تھا۔ وہ جس کی پہلی اور آخری محبت "جنت" تھی، اب اس کی کل "محبت" اس کے بچے

کی ماں ہوگئی تھی۔
"ہاں میں جانتی ہوں، آپ کی محبت ہی تو میرا سہارا ہے۔" خوش دلی سے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھری تھی۔
ماہین کو اپنے بازو کے حصار میں لیتے ہوئے اس نے آہستہ سے رخ بدلا تھا اور تب اس کی نگاہ جنت پر پڑی، ایک لمحے کے لیے وہ رک سا گیا......
ماہین کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹا تھا۔ یونہی غیر ارادی طور پر......
اس کی یہ حرکت...... ماہین کو تاؤ دلا گئی۔
"ارے جنت! تم کب آئیں، ہمیں پتا ہی نہ چلا۔" اپنے تاثرات کو نرمی میں ڈھالتے ہوئے اس نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔ برھان کے سامنے اس کا یہ ہمیشہ خاص لیے ہوئے ہوتا تھا۔
وہ جو یہاں پانی پینے آئی تھی، ہم پر ہی اکتفا کر کے پلٹ گئی۔
تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر جب روم میں آئی تو اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔
اس نے دروازہ بند کر دیا مگر لاک نہیں لگایا۔ وہ چاہتی تھی جب برھان اس کے پیچھے آئے تو اسے دروازہ بند نہ ملے۔
اب وہ بھاری دل کے ساتھ بیڈ پر بیٹھی تھی۔ بے قراری سے انگلیاں چٹخا رہی تھی۔ آنسو تھے کہ تھمے جا رہے تھے، دل تھا کہ رکا جا رہا تھا۔۔
نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی؟ محض چند ماہ کے اندر اندر؟ وہ بے یقین سی ہوئی۔ نفی میں سر ہلا کر اس نے آنکھیں رگڑ کر صاف کیں، پھر خود کو سنبھالتے ہوئے نگاہیں دروازے پر مرکوز کرلیں۔
ابھی وہ بھاگا ہوا آئے گا اور کہے گا۔ "میری جنت! تمہیں سننے میں غلطی ہوئی ہے۔"
"ہاتھ پکڑے گا، آنسو پونچھے گا، پھر اس کی آنکھوں میں جھانک کر اپنا عہد دہرائے گا۔ بھلا مجھے بھی تمہارے سوا کسی اور سے محبت ہو سکتی ہے؟"
پھر اس کی آنکھوں میں نمی آئے گی اور یوں یہ محبت نام کی تسبیح...... "تم میری پہلی اور آخری محبت ہو! تمہاری جگہ میرے دل میں اور کوئی نہیں لے سکتا۔"
اور وہ فوراً مان جائے گی۔ کوئی نخرہ نہیں دکھائے گی۔ کوئی اعتراض نہیں اٹھائے گی۔
مگر وہ ہم سفر، ہم نوا، مجازی خدا! وہ یہ سب کہنے آیا ہی نہیں...... بار بار آنکھیں مسلتے، گال رگڑتے وہ منتظر سی بیٹھی رہی...... مگر برھان واصف! وہ آیا ہی نہیں۔
نیالی شام کے اندھیروں میں غرق...... اس کے انتظار میں بے قرار...... وہ ایک بار پھر بھول رہی تھی کہ پچھلے تین ماہ سے برھان ایک بار بھی تو اسے یہ سب کہنے نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

"تم بانجھ ہو جنت! اور بانجھ عورت مرد پر ایک بوجھ کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔"
بانجھ اور بوجھ؟ محرومی کا احساس شدید تر ہوا۔ بے بسی کا احساس قوی تر۔
اس نے گال پر پھسلتی لٹ کو کان کے پیچھے اڑس کر ماہین کی طرف دیکھا۔ کامدار کاٹن سوٹ میں ملبوس، ماتھے پر ماتھا پٹی لیے، سفید دوپٹا اپنے وجود پر پھیلائے وہ ہمیشہ کی طرح کم عمری کی نکھری سی بہت فریش لگ رہی تھی۔ اس نے اپنے دائیں اپنا ہاتھ میز پر سامنے رکھا ہوا تھا جس میں آج کی چوڑی ایک نئی رنگ چمک رہی تھی۔ جنت نے خاموشی سے ریفریجریٹر کھول کر پانی کی بوتل نکالی، ریک سے کانچ کا گلاس اٹھایا اور ٹھنڈا پانی انڈیلنے لگی۔
اس کا بغور جائزہ لیتے ہوئے ماہین نے چائے کا سپ لیا۔
"بہت محبت کرتا ہے وہ مجھ سے، بہت خیال رکھتا ہے وہ میرا۔ اور کیوں نہ رکھے؟ آخر میں اسے ایک بچہ دے رہی ہوں۔" لہجے میں تکبر بھرا تھا۔ آواز میں رعونت تھی۔ آنکھوں سے غرور جھلکتا تھا۔ جیسے سارا کمال صرف اس کا تھا، جیسے عطا صرف اس کے ہاتھ میں تھی۔ جیسے قضا کے فیصلے اس کی مرضی، اس کی

منشا سے ہوتے تھے۔

"جتنی طوفانی محبت وہ تم سے کرتا تھا اور شادی کے بعد بھی جس طرح وہ تمہارا خیال رکھتا تھا، میں تو یہ بھی تھی کہ وہ میری طرف دیکھے گا بھی نہیں۔"

جنت کی زرد رنگت میں اک کرب سا ٹھہر گیا۔ سرخ و متورم آنکھوں کی نمی کچھ اور بڑھ گئی۔

"اور اب دیکھو، اتنی محبت، اتنا پیار۔ آخر کیوں نہ کرے، میں اس کے ہونے والے بچے کی ماں جو ہوں۔" اترا کر کہتے ہوئے اس نے اپنی گردن اونچی کی تھی۔ سر یوں اٹھایا تھا جیسے وہ کسی سلطنت کی ملکہ ہو۔

بھلا وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جنہیں اللہ بغیر کسی تڑپ، بغیر کسی دعا بغیر کسی انتظار کے سب عطا کر دیتا ہے؟ اس نے خالی گلاس میز پر رکھ دیا تھا۔

"سچ پوچھو تو میں بھی اس سے محبت کرتی ہوں..... شراکت داری اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔" ماہین نے ایک اور وار کیا تھا۔ اور اس کا ہر وار ٹھیک نشانے بیٹھتا تھا۔

"جب میں نے شراکت برداشت کر لی تو تمہیں کیا مسئلہ ہے؟" اس نے تحمل ہو کر پوچھا تھا۔

"تمہاری تو مجبوری ہے، میری ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے، میں برحان کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ میں اسے ایک بچہ دے رہی ہوں جنت..... تم اسے کیا دے رہی ہو؟ پچھلے پانچ سالوں میں تم نے اسے دیا ہی کیا ہے؟" تمسخر اڑاتا ہوا لہجہ۔

جنت کا وجود چھلنی ہوا۔ جواباً وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ ماہین برحان کے ہونے والے بچے کی ماں تھی۔ اس کا پلڑا بھاری تھا..... وہ اس سے کوئی بحث نہیں کر سکتی تھی۔

اب یہی مناسب تھا وہ ناشتے کا ارادہ ترک کر دے اور بھوکی پیاسی یہاں سے چلی جائے۔

"تم اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟"

جنت کے قدموں کی حرکت تھمی۔ کچھ متوحش ہو کر اس نے ماہین کو دیکھا۔ وہ سینے پر بازو باندھے اس کے سامنے کھڑی تھی......

"تم ہوش میں تو ہو۔"

"ہاں ہوش میں ہوں، اور دیکھنا چاہتی ہوں ایک بانجھ لڑکی کہاں تک لڑ سکتی ہے۔" استہزائیہ انداز میں کہتے ہوئے وہ کچن سے چلی گئی اور جنت صدمے سے گنگ اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔

بانجھ وہ ایک لفظ نہیں خنجر تھا۔ دل میں اترتا تھا اور لہولہان کر دیتا تھا۔

بانجھ!! وہ محرومی کا احساس نہیں، جلتا ہوا انگارہ تھا وجود پر گرتا تھا اور بھسم کیے جاتا تھا۔

☆☆☆

شام کے پانچ بج رہے تھے۔ سہ پہر کا سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ اپنے کپڑے استری کر رہی تھی۔ معاً کسی خیال کے ذہن میں آتے ہی اس نے استری رکھ کر موبائل اٹھایا تھا۔ اب وہ برحان کا نمبر ڈائل کر رہی تھی۔ پھر خاموشی سے اگلے کئی لمحوں تک گھنٹی گنتی رہی تھی۔ موبائل شاید سائلینٹ پر تھا۔ برحان نے خاصی تاخیر سے کال ریسیو کی تھی۔

"ہاں بولو۔" اس کی محبت، عنایت اور الفت کی طرح، اس کے لفظ بھی کم پڑ گئے تھے۔

فقط دو لفظوں کا متحق جانا گیا تھا اسے......

جنت کو اپنا آپ بے حد ارزاں محسوس ہوا جیسے وہ خاک ہے۔ پیروں تلے روندی جا رہی ہے......

"تم نے تو مجھے مکمل کر دیا ہے۔" اس نے ذہن میں ابھرتی اس آواز کو جھٹک دیا اور ڈھیٹ بن گئی، بے حس ہوئی۔

"السلام وعلیکم، کیسے ہو؟"

گھر میں تو بات کرنے کے موقعے کم ہی میسر تھے۔ کمرے میں آنا بھی تقریباً چھوڑ دیا تھا اس نے تمام تر محبت، توجہ اور عنایتیں دوسری بیوی کے لیے رہ گئی تھیں۔

"ہوں! ٹھیک ہوں! لیکن مصروف ہوں۔" وہ اکثر سوچتی تھی۔ آج پھر سوچنے لگی تھی، کیا یہ وہی برحان ہے جو اپنی دوسری شادی سے اپ سیٹ تھا؟ جو اس کے احساسات کی اتنی قدر کرتا تھا کہ بمشکل دوسری شادی کے لیے راضی ہوا تھا؟ جسے جذبات کی

اتنی فکر تھی کہ گھر کو برقی قمقموں سے سجانے نہ دیا تھا۔

وہ جو صرف اس کا تھا جو صرف اسے چاہتا تھا؟

اب تو ان کے مابین بدگمانیوں کی اتنی دیواریں کھڑی ہو چکی تھیں کہ وہ کچھ کہنا بھی چاہتی تو کہہ نہیں سکتی تھی مگر آج اسے کچھ کہنا تھا، فاصلے کی اس دیوار کو توڑنے کے لیے۔ ایک کوشش اسے ضرور کرنی تھی۔

''میں سوچ رہی تھی اگر آج ہم لوگ ممی، حفصہ آپی کی طرف چلے جائیں؟'' کیا کبھی اس نے سوچا تھا کہ اسے اس قدر محتاط انداز میں ڈر ڈر کر برہان سے بات کرنا ہو گی؟

''اور ماہین کو گھر میں اکیلا چھوڑ جائیں؟'' وہ اس کے مطالبے پر بدک ہی تو گیا تھا۔ ''جانتی بھی ہو اس کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ آج شام ڈاکٹر کے پاس اپائنٹمنٹ بھی ہے۔''

''اصل میں حفصہ آپی نے فون کیا تھا۔ آج شام کھانے پر...''

''ان سے معذرت کر لو پھر کبھی چلے جائیں گے۔'' اس نے فوراً سے کال کاٹ دی۔ جنت موبائل کان سے لگائے کھڑی رہ گئی۔ خشک لبوں پر [illegible] کرتے ہوئے اس نے موبائل رکھ دیا۔

ایک بار پھر اپنی تمام تر توجہ آئرن اسٹینڈ کی جانب مرکوز کی اور اپنا وہ جوڑا پریس کرنے لگی جس کا رنگ برہان کا پسندیدہ رنگ تھا اور جسے آج وہ اس کے لیے پہننا چاہتی تھی، اس کے لیے تیار ہونا چاہتی تھی۔

آنسو ٹپ ٹپ آنکھوں سے گرنے لگے اور یہی برہان کہا کرتا تھا۔ مر جائے گا مگر دوسری شادی نہیں کرے گا۔

کپڑے پریس کر کے، الماری میں ہینگ کر کے وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر اس نے حفصہ سے فون پر بات کر کے ان سے معذرت کر لی کہ آج رات وہ ان کی طرف کھانے پر نہیں آ سکے گی کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

اس کا دل تنگ سا ہونے لگا۔ وہ ہوا خوری کے لیے باہر لان میں آ گئی۔ سامنے ہی ماہین فون کان پر لگائے ٹہل رہی تھی۔

''نہیں برہان مجھے وہ بلیک والا ہی چاہیے، آپ کو ہر حال میں مجھے وہی دلانا ہو گا۔'' دوسری طرف سے جانے کیا کہا گیا تھا کہ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

ایک نظر جنت پر ڈالی پھر ایک ادا سے ہٹا کر رک گئی۔

''ارے ہاں بے بی کا نام تو ابھی تک ہم نے سوچا ہی نہیں ہے۔''

جنت کو دیکھ کر ہی اسے اپنے ہونے والے بچے کا خیال آیا کرتا تھا۔

''ہوں! ٹھیک ہوں! لیکن مصروف ہوں۔''

جنت نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ اندر کی گھٹن سے تنگ ہو کر باہر آئی تھی مگر باہر کا حبس شدید تھا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔

میرے لیے اب اس کے پاس چند لمحے بھی نہیں رہے؟ یہی برہان تھا جسے پوری دنیا میں سوائے جنت کے اور کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا اور اب سب نظر آتا تھا۔ سوائے اس کے۔

حلق میں آنسوؤں کا پھندا سا اٹک گیا۔

روشن ٹھیک ہی کہتی تھی۔ زندگی میں تو وہ اسے [illegible] ... [illegible] رہی تھی۔ اس نے خود [illegible]

پھر اس نے گاڑی کی [illegible] میں آ گئی۔ ماہین خاص طور پر برہان کے لیے تیار ہوئی تھی۔ اس کا پسندیدہ رنگ زیب تن کیے۔ کسی پھول کی طرح کھلی کھلی لگ رہی تھی۔ تیاری سے واضح تھا وہ صرف ہاسپٹل نہیں جائیں گے...... آج رات کا کھانا بھی کہیں باہر تناول فرمایا جائے گا۔ آج رات بھی وہ تاخیر سے لوٹیں گے۔

ملازمہ نے دستک دے کر اس سے شام کے کھانے سے متعلق پوچھا تو اس نے منع کر دیا۔ آج رات پھر اسے بھوکا ہی سونا تھا۔

☆☆☆

دروازہ کھلنے کی آواز سماعت سے ٹکرائی تو اس

کی آنکھ کھل گئی تھی۔ گھٹنوں سے سر اٹھاتے ہوئے اس نے بے اختیار سامنے دیکھا۔ برہان سرد نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے دروازے میں کھڑا تھا۔ چہرے کے تاثرات سرد تھے۔

"تم آگئے برہان! میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔"

برہان کے تاثرات ہنوز سخت ہی تھے۔ وہ اس کی خاموشی سے کچھ پریشان ہوئی۔ "کیا بات ہے، سب ٹھیک تو ہے؟"

"ماہین کے ساتھ تم کس طرح کی باتیں کرتی رہتی ہو؟"

"جی؟" وہ خاک نہ سمجھی۔

"ہم ہنی مون پر کہاں گئے۔ کہاں گھومتے پھرتے رہے۔ میں نے تمہیں کیا گفٹ دیے۔ ہم نے وقت کیسے گزارا۔ یہ سب...... یہ سب اسے بتانے کی کیا ضرورت ہے؟ کیوں دل جلاتی ہو اس کا جنت! وہ اپ سیٹ ہو جاتی ہے۔"

وہ ہق دق اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اس نے یہ نہیں پوچھا جنت تم نے کچھ کھایا یا نہیں۔ میں تمہیں روز اکیلا چھوڑ کر چلا جاتا ہوں تمہیں ڈر تو نہیں لگتا؟ تم خفا تو نہیں ہوتیں؟ تمہیں وقت نہیں دیتا۔ تم سے بات نہیں کرتا۔ تمہیں کہیں برا تو نہیں لگتا؟ کہا بھی تو کیا؟ ڈانٹا بھی تو کس بات پر؟ فکر ہوئی بھی تو کس امر کی؟

"جنت آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ کیوں اپنی اور میری زندگی مشکل بنا رہی ہو یار!" وہ زچ ہو رہا تھا۔

اور جنت اپنی جگہ ساکت بیٹھی تھی۔ ماہین کچھ بھی کہتی ہے اور وہ یقین کر لیتا ہے؟ کچھ بھی بتاتی ہے اور وہ مان لیتا ہے؟

اس نے کچھ کہنے کے لیے لبوں کو حرکت دی مگر آواز نے ساتھ نہ دیا۔ آواز باغی ہوئی، آواز کرب میں معدوم ہوئی۔

"میں سمجھ سکتا ہوں محرومی کا احساس برا ہوتا ہے مگر اس محرومی میں دوسروں کو اذیت پہنچانا، انہیں نیچا دکھانا...... کم از کم اس کی توقع نہیں کر رہا تھا میں تم سے......" جنت کے اندر چھناکے سے کچھ ٹوٹا تھا۔ وہ سر تا پیر لہولہان ہو گئی۔

صرف "محرومی" ہی ہے اس کے اندر؟ اور کچھ نہیں؟ جذبات، احساسات، خواب، خواہشات۔ اور کچھ بھی نہیں؟

"مجھے اپنے بچے کی بہت فکر ہے اور ماہین کے ساتھ تمہارا رویہ میری برداشت سے باہر ہو رہا ہے۔"

وہ کہہ کر چلا گیا...... اور جنت سن ہوتے وجود کے ساتھ بیٹھی رہ گئی تھی۔

اس برس جو خزاں اتری تھی وہ صرف دھرتی پر ہی نہیں اس کے وجود پر بھی اتری تھی۔ وہ اسے بھی بے رنگ کر رہی تھی۔ اس کے حصوں کو بھی جھاڑ رہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا دھرتی کی خزاں گزر جانے والی تھی۔ مگر اس کے اندر کی خزاں اس کے اندر ہی رہنے والی تھی۔

☆☆☆

"جی آپا بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔" وہ کچن میں کھانا بنا رہی تھی جب فون کان سے لگائے نورین آپا سے بات کرتی ماہین کچن میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔

"کتنی تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔ ایسے تو نہیں اللہ نے ماں کے قدموں تلے جنت رکھی۔"

تیزی سے پیاز کاٹتے اس نے سکینہ کے ذمے دوسرے کام لگائے اور خود مرغی کے لیے مسالا بھوننے لگی۔

"مگر جن کی اولاد نہ ہو انہیں بھلا کیا اندازہ۔"

جنت نے بمشکل خود کو سنبھالا۔ وہ کام نہ کر رہی ہوتی تو یقیناً ادھر ادھر ہو جاتی۔

"خیال تو بہت رکھتی ہوں آپا پر پھر بھی دھڑکا سا لگا رہتا ہے۔" جنت کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے اس نے ایک اور تیر چھوڑا تھا۔ "ارے نہیں، یہ بات نہیں...... نہیں آپا! جنت بہت اچھی ہے۔ میری چھوٹی بہنوں جیسی ہے۔ بہت خیال رکھتی ہے میرا۔"

ایک لمحے کو رک کر اس نے کچھ سنا، پھر مسکرائی، سر اٹھا کر جنت کو دیکھا۔ "ان شاء اللہ بیٹا ہی ہو گا۔

میں برہان کو بیٹا ہی دوں گی۔"

جنت کٹنگ بورڈ پر ٹماٹر کاٹنے لگی تھی۔

"امی کے بارے میں بتائیں وہ کراچی سے کب آ رہی ہیں؟" اب وہ اپنی ساس سے متعلق پوچھ رہی تھی جو پچھلے کچھ دنوں سے اپنی چھوٹی بیٹی کی طرف گئی ہوئی تھیں...... دوسری طرف جانے کیا بتایا گیا کہ وہ بے اختیار چونک اٹھی تھی۔ جنت نے اس کے لہجے کا بدلاؤ خاص طور پر محسوس کیا تھا۔

"اچھا! میں بھی وہ ایک دو ہفتے وہیں رہیں گی۔ چلیں اچھا ہے وہ آ جائیں۔ مجھے ویسے بھی ان کی بہت ضرورت ہے۔ میری ماں جیسی ہیں وہ۔"

نکاوٹ سے کہہ کر کچھ دیر تک سنتی رہی پھر فون بند کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی......

شام کا کھانا تیار کر کے سکینہ کو ہدایات دے کر جنت اپنے کمرے میں آ گئی۔

الماری کے پٹ کھولے وہ کپڑوں کو ترتیب سے رکھ رہی تھی جب بیرونی گیٹ پر برہان کی گاڑی کا ہارن گونجا تھا۔

اس نے سر ضرور اٹھایا مگر اٹھ کر کھڑکی تک نہ گئی۔

"بی بی جی!" عین اسی لمحے سکینہ ہانپتی کانپتی اس کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"وہ ماہین بی بی...... ان کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ درد سے چیخے جا رہی ہیں۔"

برہان کی شرٹ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے جا گری۔ وہ پریشانی کے عالم میں تیزی سے کمرے سے باہر نکلی۔

سیڑھیاں اتر کر جس لمحے وہ بالائی منزل پر ماہین کے کمرے میں داخل ہو رہی تھی، اسی لمحے گاڑی پارک کر کے برہان لیپ ٹاپ کیس سنبھالے صدر دروازے کا رخ کر چکا تھا۔

وہ دروازہ کھول رہا تھا اور جنت کے آنے کے بعد۔ ماہین اپنے کمرے کا دروازہ بند کر رہی تھی۔

اسے صحیح سلامت دیکھ کر وہ الجھ گئی۔

"کیا مذاق ہے ماہین، سکینہ کہہ رہی تھی تمہاری طبیعت خراب ہو گئی ہے۔" اس افراتفری میں وہ اس کی دروازہ لاک کرنے والی حرکت کو نوٹس کر ہی نہ پائی۔

"ہاں طبیعت تو میری خراب ہے۔" عجیب سے انداز میں کہتے ہوئے وہ پیچھے ہٹی، اور اس سے قبل کہ جنت کچھ سمجھ پاتی، اس نے ایک جھٹکے سے ڈریسنگ ٹیبل کا سامان بکھیر دیا۔ گلدان توڑ دیا۔ کانچ کا گلاس الماری کے شیشے پر دے مارا۔

جنت حیران و ششدر اپنی جگہ کھڑی رہ گئی۔

اگلے ہی لمحے اس نے پیٹ پر ہاتھ رکھا اور بلند آواز میں چیخنے لگی۔

"جنت...... جنت نہیں...... جنت میرا بچہ!"

جنت کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

روتے چیختے چلاتے ہوئے اس نے کانچ کے ٹکڑے سے اپنا ہاتھ بھی زخمی کر لیا۔

بند دروازے کے اس پار برہان اس کا شور سن کر پاگل ہو رہا تھا۔

اندر وہ پتھر کا مجسمہ بنی ماہین کے سامنے کھڑی تھی۔ اسے روتا تڑپتا چیختا دیکھ رہی تھی۔ اپنی قسمیں کرتا سن رہی تھی۔

"دروازہ کھولو جنت! جنت دروازہ کھولو۔"

برہان اپنے کندھے کے زور سے دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا، چیخ رہا تھا، چلا رہا تھا۔

ماہین نے خود کو فرش پر گرا لیا۔ اب وہ یوں سانس لے رہی تھی جیسے بس مرنے کو ہو۔

سکینہ دوسری چابی لے آئی تھی۔ دروازہ جھٹکے سے کھل گیا تھا۔

برہان کی پہلی نظر اپنی بے حال ہوتی بیوی پر پڑی تھی۔ دوسری نظر بے جان مجسمے کی طرح کھڑی جنت پر...... جو ساکت تھی۔ صامت تھی۔ متوحش تھی۔

"یہ...... یہ...... جھوٹ...... بول رہی ہے......"

اور ہر ٹوٹی ہوئی شے کی طرح۔ اس کے ٹوٹے ہوئے لفظ بے اثر رہے۔ غیر اہم رہے۔

برہان کا داہنا ہاتھ اٹھا، ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر پڑا...... ایک مضبوط و توانا مرد اور پھر جس

وہ اپنے بھائی، اپنے باپ، اور اب اپنی ماں کی بھی مجرم تھی۔ وہ اس گھر پر نازل ہونے والی ہر بربادی کا "سبب" تھی۔ اس پر کوئی ترس کھاتا بھی تو کیوں؟ کوئی ہمدردی جتاتا بھی تو کیسے؟ سب کو لگتا تھا "طلاق" ایک سزا تھی۔ اسے ٹھیک وقت پر بالکل ٹھیک ملی۔ اس کے ساتھ جو ہوا، بالکل صحیح ہوا۔ ابھی تو آغاز تھا۔ ابھی تو اسے در در کی ٹھوکریں کھانی تھیں۔ ذلیل و خوار ہونا تھا۔

عدت اس نے اسی گھر میں گزاری جو اس کا بھی نہیں تھا۔ چھت کا ایک کمرہ جس میں وہ مستقل ٹھہرے رہنا چاہتی تھی۔ کمرہ روحینہ چچی کے ٹیرس کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ منڈیر ایک ہی تھی۔ عدت کے بعد بڑے چچا نے آناً فاناً اس کا رشتہ اپنے بڑے بیٹے زمان سے طے کر دیا۔ وہ جنت سے پورے پندرہ برس بڑا تھا۔ بیوی روز روز کی مار دھاڑ سے تنگ آکر خلع لے چکی تھی۔ تین بچے بھی تھے جو ماں کے ساتھ رہتے تھے۔

کسی نے اس سے رائے پوچھی نہ مرضی جاننے کی کوشش کی۔ فیصلہ ایک سزا کی طرح بس سنا دیا گیا۔ نکاح اور رخصتی کی تاریخ طے کر دی گئی۔

ایک جہنم سے نکال کر دوسرے جہنم کا بندوبست کیا جانے لگا۔ نکاح سے ایک ہفتہ پہلے خالہ آئیں۔ بہانے بہانے سے چچا سے اجازت لے کر اسے اپنے ساتھ گھر لے گئیں۔ وہ ان کے گھر صرف دو دن رہی۔ تیسرے دن اس کا بہت اچانک اور ہنگامی طور پر فارس وجدان کے ساتھ نکاح ہو گیا۔ سائرہ خالہ سب ہی معاملات پہلے سے طے کر چکی تھیں۔ اسے تو عین موقع پر چچا کے گھر سے نکال لائی تھیں۔

"میں نے ابو سے تمہارا ہر طرح سے خیال رکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ زمان کے ساتھ میں تمہاری زندگی مزید برباد نہیں ہونے دے سکتی۔" انہوں نے بس اتنا کہا تھا اور وہ نم آنکھوں کے ساتھ ان کے حکم کے آگے سر جھکا گئی تھی۔

ایک نئی زندگی کی آس لیے۔ سکون کی متلاشی۔ وہ رخصت ہو کر اسلام آباد آ گئی تھی مگر شادی کی پہلی رات فارس وجدان کے رویے نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ اس کی سزا ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ صرف شہر ہی تو بدلا تھا۔ زندگی وہی تھی۔ نصیب بھی وہی۔ قسمت بھی وہی۔ اور محرومی بھی وہی۔

☆☆☆

آسمان پر چمکتی بجلی زمین کے کسی نامعلوم گوشے میں بار بار گم ہو رہی تھی۔ ہوائیں تیز تھیں۔ مگر اتنی نہیں کہ اس کی ہر اذیت اڑا لے جائیں۔ بارش ہنوز برس رہی تھی۔

وہ پنجوں کے بل خود میں سمٹ کر بیٹھی جلتی ہوئی ویران آنکھوں سے سامنے دیکھ رہی تھی۔ وجود مکمل طور پر بھیگا ہوا تھا۔ آنکھوں میں سرخی اتری تھی۔ چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ اور آنسو مسلسل بہتے جا رہے تھے۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ وہ اپنے آنسو نہیں پونچھ رہی تھی۔ نہ خود کو دلاسا دے رہی تھی۔ نہ سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

پارک کی آہنی باڑ کے اس پار، سبزے کے بیچ و بیچ اسے ٹریک نظر آ رہی تھی۔ وقت رکا نہیں تھا۔ دنیا اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھی۔

دیوار کا سہارا لے کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی، پھر اسی موسم میں۔ اپنی تمام تر وحشتوں کے ساتھ وہ فٹ پاتھ پر قدم دھرتی آگے بڑھنے لگی۔ اس کا توازن درست نہ تھا۔ چال میں واضح لڑکھڑاہٹ تھی۔ ارتکاز کسی ایک جگہ نہ تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جیسے مفقود ہو کر رہ گئی تھی۔

موت از زندگی کا انجام۔

اذیت کا اختتام!

ایک آزادی!

ہاں، وہ راستہ ایسا ہی تھا۔ اسی رنگ میں، اسی روپ میں نظر آتا تھا۔ پہلے بھی نظر آتا رہا تھا، تب وہ خودکشی کی سوچ سے پیچھا چھڑا لیا کرتی تھی۔ جینے کی کوئی نہ کوئی وجہ۔ کوئی نہ کوئی مقصد تلاش کر لیا کرتی تھی۔ مگر اب کی بار وہ ایسا نہیں کر پا رہی تھی۔ اب کی بار جو اندھیرے اکٹھے ہوئے تھے وہ اسے مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں اتار رہے تھے۔ اور وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر پا رہی تھی۔

"خودکشی بذات خود ایک مسئلہ ہے۔ کسی مسئلے کا حل ہرگز نہیں۔"

منظر لمحے بھر کے لیے بدلا تھا۔ اس کے سامنے سبزہ بچھ گیا تھا، ہاتھوں میں پھول آ گئے تھے۔ نانا برابر میں تھے۔ اس کے قدموں کے ساتھ قدم ملا کر چلتے ہوئے۔ اسے سمجھاتے، اسے کچھ بتلاتے ہوئے۔

"سانسوں کی ڈور خود سے ٹوٹنے تو ٹوٹے، تم توڑنے کی کوشش بھی مت کرنا۔"

اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ آنکھیں رگڑ کر صاف کرتے اس نے ایک بار پھر قدم بڑھائے۔ وہ ماضی میں تھی۔ نہ حال میں۔ وہ جیسے ایک خلا میں تھی۔

"جس وقت منفی سوچ جڑ پکڑے اور مایوسی انتہا کو پہنچ جائے تو سمجھ جاؤ۔ یہ شیطان کا آخری وار ہے۔ ٹھیک اس وقت پڑ رہا ہے جب وہ تمہارے "انعام" سے واقف ہو چکا ہے۔"

لمحے بھر کے لیے وہ لڑکھڑا کر سنبھل گئی تھی۔ آہنی باڑھ کا سہارا لے کر، ایک بار پھر قدم اٹھانے لگی۔

"ہر صابر کے حصے میں بشارت آتی ہے۔ اور اس بشارت سے ذرا دیر پہلے۔ شیطان اندھیرے بڑھا دیتا ہے۔ یہ کام وہ ہر اس مومن کے ساتھ کرتا ہے جو اپنی آزمائش میں صابر (ڈٹا ہوا) رہا ہو۔"

وہ سسک پڑی۔ نانا کے الفاظ ایک طرف۔ اس کا درد، اس کا غم، اس کی محرومی دوسری طرف۔

"طلوع آفتاب سے پہلے رات بہت تاریک ہوتی ہے جنت! بہت زیادہ تاریک ہوتی ہے۔"

وہ سڑک کنارے رک گئی تھی۔ اس کے لب کپکپا رہے تھے، پلکیں لرز رہی تھیں۔ سردی کی شدت سے ٹھٹھرتا وجود نڈھال ہو رہا تھا۔ وہ اپنا حل تلاش رہی تھی۔ اور اسے اپنا حل کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ راستہ ایک ہی بچا تھا۔ موت کا راستہ۔ تباہی کا راستہ۔ دائمی عقوبت کا راستہ۔

"اگر ماضی درد کا حصہ ہو، اور مستقبل اندھیرے میں ڈوبا ہو تو سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھ لینا چاہیے۔"

اس کا ضبط ختم ہو گیا۔ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے وہ زمین پر جھک گئی۔

بعض دفعہ چھپی ہوئی بامعنی دعا اور کوئی نہیں ہوتی۔ محض چند لمحوں کا توقف تھا۔ اور چند لمحوں کی ہی گفتگو تھی۔ اور اس نے بے حد خاموشی سے سڑک کی جانب قدم بڑھا دیے تھے۔

☆☆☆

کبھی تمنا کے راستوں پر نکل پڑو تو خیال رکھنا
ہوائیں، بادل، فضائیں، موسم، خیال
چہرے بدل بدل کر تمہیں ملیں گے
تو لمحہ لمحہ بدلتے رنگوں کے شوخ دھوکے میں آ نہ جانا
کبھی جو چاروں طرف تمہارے
کرن کرن اپنا خواب سا بدن نکھارے
زمیں پہ اترے
تو دھندلکوں میں سما نہ جانا
کبھی جو آنکھوں میں چاند جس جس کے
چاندنی کا خمار بھر دے
تو اپنی آنکھیں کہیں خلا میں گنوا نہ آنا
کہ یہ نہ ہو پھر جو خواب ٹوٹے
دھنک [illegible] ٹوٹے
[illegible]
اور تم [illegible]
کرچی کرچی بدن سنبھالے
کہیں بلندی پہ چڑھ کے
رستی ہوئی نگاہوں سے
واپسی کے نشان ڈھونڈو
اجڑ گیا جو جہان ڈھونڈو
کبھی تمنا کے راستوں پر نکل پڑو تو خیال رکھنا
کہیں سے خالی پلٹ کے آنا بہت کٹھن ہے۔
بہت کٹھن ہے
بہت کٹھن ہے
بہت کٹھن ہے

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

حنا بشریٰ
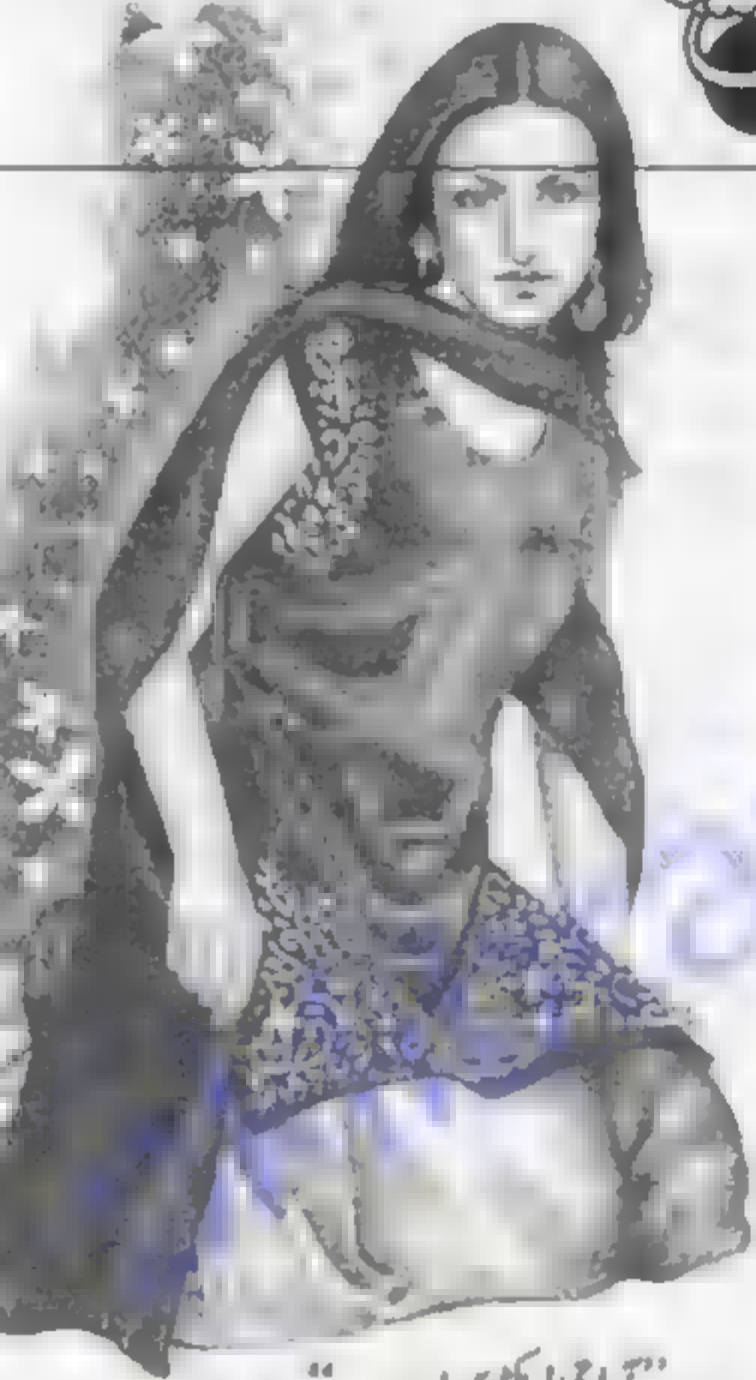
"خوب ڈٹ کر کھایا کر، شرمانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

فون سے باہر آتی بھاری مردانہ آواز حلیمہ کی سماعتوں کے آر پار ہوئی تو تحیر سے اس کے قدم یوں جم گئے کہ جہاں تھیں، وہیں کھڑی رہ گئیں۔ چند روز پہلے جو منظر ان کی آنکھوں نے دیکھا تھا، جس کو دیکھ کر وہ کتنے ہی روز سکتے کی سی حالت میں گم صم سی رہی تھیں، اس منظر کا سارا پس منظر حلیمہ کو ان دونوں کی فون پر گفتگو سے سمجھ میں آ گیا تھا کہ اب مزید کچھ سمجھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

"آج ناشتہ میں کیا کھایا؟" دوبارہ سے مردانہ آواز گونجی۔

"انڈا، پراٹھا اور دودھ کا گلاس۔" بڑی ادا سے جواب دیتے پست آواز میں ہلکا سا فاتحانہ قہقہہ بھی لگایا گیا۔

اور اس سوال و جواب سے آگے حلیمہ کو مزید کچھ اور نہیں سننا تھا۔ ان کے تیزی سے اٹھتے قدموں کا رخ اپنے کمرے کی طرف تھا۔ جہاں ان کو تلاش تھی، فون کی ڈائری میں ایک نمبر کی...... جو انہیں چند پل کی تلاش کے بعد ہی مل گیا۔ انہوں نے کال ملائی۔ بیس منٹ کی تفصیلی بات کے بعد وہ مکمل مطمئن تھیں۔ ایک گہرا سانس سپرد فضا کرتے ہوئے حلیمہ نے آنکھوں کو بند کیا تو گزشتہ دنوں کے واقعات ان کے دماغ کی اسکرین پر کسی فلم کی طرح چلتے کڑی سے کڑی ملاتے چلے گئے۔

☆☆☆

"آپا جی! پکڑیں اسے......"

عصر کا وقت تھا۔ حلیمہ محلے کے بچے بچیوں کو قرآن پاک پڑھانے میں مشغول تھیں کہ ڈور بیل بجی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ ان کا پڑوسی مشتاق جو کہ حلیمہ سے تین چار گھر چھوڑ کر اسی گلی میں رہتا تھا۔ اپنی چودہ پندرہ سالہ بیٹی کے ہمراہ شدید پریشانی کے عالم میں کھڑا تھا اور اس کے چہرے کے تاثرات غصے کے غماز تھے۔

"مشتاق بھائی! خیریت؟" حلیمہ ان دونوں کو یوں اچانک اپنے دروازے پر کھڑا دیکھ کر گھبرا گئیں۔

"آپا جی! بڑا تنگ کیا ہے اس مرن جوگی نے مجھے۔ میں نے کسی دن اس کی حرکتوں کی وجہ سے اس کو مار دینا ہے یا خود "پھاہے" لگ جانا ہے۔" بازو سے بے دردی سے اسے گھسیٹتے مشتاق نے اس بری طرح سے اندر کی طرف دھکا دیا کہ اگر حلیمہ اسے تیزی سے نہ سنبھالتیں تو وہ یقیناً نیچے گر پڑتی۔

"ایسی اولاد سے تو بہتر تھا کہ میں بے اولاد ہی رہتا۔" دو چار کوسنے اور لعن طعن کرنے کے بعد مشتاق سرخ آنکھوں سے اپنی بیٹی کو گھورتا جو کہ حلیمہ کے ساتھ لگی ہچکیاں بھر رہی تھی، چلا گیا اور حلیمہ اس ڈری سہمی لڑکی کے آنسو پونچھتے اسے اپنے ساتھ اندر لے آئی۔

"رونا تو بند کرو، اچھا بتاؤ کیا ہوا ہے؟" اپنے پاس شفقت سے بٹھاتے ہوئے حلیمہ نے دو چار دفعہ اس لڑکی کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور اس سے رونے اور باپ کی ڈانٹ ڈپٹ کی وجہ پوچھی مگر وہ بنا کچھ بولے، بس ہچکیاں ہی بھرتی رہی۔

دبلی پتلی بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ بنی اس لڑکی کو دیکھ کر حلیمہ کو بے حد ترس آیا تھا۔ محبت سے اسے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے حلیمہ نے اس لڑکی کو تسلی اور حوصلہ دینے کی کوشش کی تو وہ اور شدت سے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بے حال ہی ہوتی چلی گئی۔

☆☆☆

حلیمہ کے گھرانے کو پورے محلے میں بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور اس کی وجہ حلیمہ کا حسن اخلاق، ہمدردانہ رویہ، ملنساری اور خوش گفتاری تھی۔ پورا محلہ انہیں احترام سے "آپا جی" کہا کرتا تھا۔ محلے کی ساری خواتین آپا جی کی عادات اور اچھے طور طریقوں کی ایسی گرویدہ تھیں کہ وہ اپنے بچوں کو قرآن پڑھنے کے لیے ان کے پاس بھیجا کرتی تھیں اور آپا جی انہیں نہ صرف فی سبیل اللہ قرآن پڑھاتیں بلکہ ان کی اخلاقی تربیت بھی کیا کرتی تھیں۔

بہت سی بچیوں نے ان سے سلائی کڑھائی کے علاوہ کھانا پکانا بھی سیکھا تھا۔ محلے کی عورتیں اپنی الجھنوں کے لیے آپا جی سے مشورے بھی لینے آتی تھیں۔

ایسا نہیں تھا کہ آپا جی دنیا میں تن تنہا تھیں، ان کے شوہر تھے کلیم صاحب (وہ بینک میں اعلا افسر تھے)۔ ایک اکلوتا بیٹا سیف تھا جو تھرڈ ایئر کا طالب علم تھا اور انتہائی سلجھا ہوا لڑکا تھا۔ اس دور میں ایسا شریف لڑکا صرف ماں کی اچھی تربیت کی وجہ سے ہی ہو سکتا تھا۔

بیٹا اپنی تعلیم میں مگن اور شوہر سارا دن آفس کے کاموں میں مصروف رہتے تو حلیمہ کے پاس فرصت ہی فرصت ہوتی۔ فرصت کے لمحات میں محلے کے بچوں کو قرآن پڑھانے کا کام شروع کر دیا۔ جس سے ان کا دل لگا رہتا تھا۔

مشتاق بھی حلیمہ کے محلے میں ہی رہتا تھا۔ اس کی بیوی سے علیحدگی ہو گئی تھی۔ مشتاق کی ایک بیٹی تھی انعمی۔ مشتاق کے مطابق اس کی بیوی اچھے کردار کی عورت نہیں تھی۔ اس لیے اس نے اسے طلاق دی تھی۔

"آپا جی! ایسی عورتیں کہاں گھر بسانے والی ہوتی ہیں۔" مشتاق اکثر اپنے گھریلو مسائل سے متعلق حلیمہ سے بات کر لیا کرتا تھا۔ پیشے کے اعتبار سے وہ سبزی فروش تھا۔ جو شام تک کماتا، بس اسی پر گزارا کیا کرتا تھا۔ حالات اکثر تنگی و ترشی کا شکار رہتے تھے۔

حلیمہ نے سن رکھا تھا کہ مشتاق کی بیوی نے اس سے طلاق ہی اس تنگی و ترشی کی وجہ سے لی تھی۔ وہ گھٹ گھٹ کر مشتاق جیسے "کنگلے" شخص کے ساتھ یوں اذیت بھری زندگی نہیں گزار سکتی تھی۔ وہ شکل و صورت میں بھی بہت خوب صورت تھی اور جبکہ مشتاق انتہائی واجبی سے شکل و صورت کا۔

"آپا جی! اس بے وفا عورت کو تو کوئی موٹر والا چاہیے تھا۔ مجھ جیسے بندے کے ساتھ اس کا کہاں

گزارا تھا؟"

کچھ روز پہلے یہ خبر سننے میں آئی تھی کہ مشتاق کی بیوی نے علاقے کے نائب کونسلر سے شادی کرلی تھی جو کہ اس کے حسن کے اسیر ایک زمانے سے تھے۔ مشتاق کے مطابق وہ نہ اچھی بیوی تھی اور نہ ہی اچھی ماں...... مگر حلیمہ کی جب بھی اس سے ملاقات ہوتی، اسے ایک ہی مطالبہ کرتے دیکھا کہ میری بیٹی مجھے دے دے۔ جبکہ مشتاق بیٹی کے حوالے سے اس قدر حساس خیالات کا مالک تھا کہ وہ اسے دینے پر ہرگز راضی نہ تھا۔

"ہاں، تجھے دے دوں اپنی بیٹی تاکہ کل کو تیری طرح "آوارہ" بن جائے۔" وہ جب بھی اپنی مطلقہ بیوی کے بارے میں کچھ برا بھلا کہتا تو حلیمہ اسے ٹوکے بنا نہ رہتیں۔

"چھوڑیں مشتاق بھائی! جو بھی تھی...... جیسی بھی تھی۔ آپ کی بیٹی کی ماں تھی۔ بیٹی کے سامنے اس کی ماں کے بارے میں ایسی ویسی باتیں نہ کیا کریں۔" مگر غصے میں بپھرا مشتاق تو جیسے بے قابو ہی ہو جاتا۔ اسے برا بھلا کہتا، کوستا اور جب دماغ کا میٹر تیزی سے گھومتا تو غصہ اقصیٰ پہ نکال دیتا۔ جو کہ شکل و صورت میں بالکل ماں پر گئی تھی۔ "رج کے سوہنی" اور کچھ عادت و چال ڈھال بھی بالکل ماں جیسی تھی، جس کو دیکھ کر مشتاق تپ جاتا تھا۔

"کتنی بار منع ہے تجھے اپنی ماں جیسی حرکتیں کرکے میرا خون نہ جلایا کر۔" اور پھر غصے میں پاگل ہو کر بیٹی کو اس بری طرح سے مارتا پیٹتا کہ اس کے رونے کی آواز حلیمہ کے گھر تک آتی۔

"مشتاق بھائی! اقصیٰ کو میری طرف چھوڑ جایا کریں۔" مشتاق سارا دن کام کی وجہ سے باہر ہوا کرتا تھا۔ باپ کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتی اقصیٰ دن بھر گلی کے بچوں کے ساتھ کھیلتی کودتی رہتی اور جب رات کو باپ لوٹتا تو اقصیٰ کا گندا مندا حال، جو کہ دن بھر کے کھیل کود کی وجہ سے ہوتا تھا۔ دیکھ کر کھول اٹھتا۔

حلیمہ نے بہت بار مشتاق سے کہا کہ بیٹی کو اس کی ماں کے حوالے کر دے۔ بیٹیاں کب باپوں سے پلتی ہیں مگر مشتاق تو جیسے اس طرف آتا ہی نہیں تھا۔ اسے اقصیٰ کی ماں پر کسی طرح بھی بھروسا نہ تھا کہ وہ بیٹی کی اچھی تربیت کرے۔ اگر اسے کسی پر بھروسا تھا تو صرف اور صرف حلیمہ پر...... کیونکہ وہ جانتا تھا کہ حلیمہ باکردار، پڑھی لکھی عورت ہیں۔ جنہوں نے اپنی اولاد کی تربیت اتنی اچھے طریقے سے کی ہے۔ یقیناً وہ اس کی بیٹی کی تربیت بھی اچھی طرح سے ہی کریں گی۔

"کسی کی بیٹی کا معاملہ ہے۔ میں منع نہیں کرتا، مگر کل کو کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو ساری ذمہ داری آپ پر ہوگی۔"

یہ نعیم صاحب تھے۔ حلیمہ کوئی بھی کام کرنے سے پہلے شوہر سے مشورہ ضرور لیا کرتی تھیں۔ ان کی اجازت کے بغیر وہ کچھ نہیں کرتی تھیں۔ انہوں نے اقصیٰ کو پاس رکھنے کی اجازت تو دے دی، مگر ساتھ ہی زمانے کے حوالے سے جو خطرات و اندیشے محسوس کیے، ان سے آگاہ بھی کر دیا۔

"اس لیے جو قدم اٹھائیں انتہائی احتیاط اور جو عمل کریں میانہ روی کے ساتھ۔" یہ دو اصول اپنی بیوی کے ہاتھ تھما کر نعیم صاحب نے اجازت دے دی۔

☆☆☆

اقصیٰ صبح سے شام تک حلیمہ کے پاس رہنے لگی۔ مشتاق صبح کام پر جاتے ہوئے اسے چھوڑ جاتا اور رات کو واپسی پر گھر لے آتا اور اس احسان مندی میں وہ اکثر ہی ایک دو سبزیاں بنا پیسوں کے حلیمہ کو دے جایا کرتا۔

"ارے بھائی! اس کی کیا ضرورت ہے؟" حلیمہ کو اندازہ تھا کہ مشتاق کچھ زیادہ نہیں کماتا۔ ایسے حالات میں حلیمہ لگتا کہ وہ اس احسان مندی میں خواہ مخواہ ہی خود پر بوجھ ڈال رہا ہے۔

"آپا جی! میری اقصیٰ سارا دن آپ کی طرف رہتی ہے، کھاتی، پیتی ہے۔ جیسا خیال آپ اپنی اولاد

کار کھتی ہیں۔ ایسا ہی میری بچی کا بھی رکھتی ہیں۔"

احسان مندی کے مارے مشتاق کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تھے۔ اقصیٰ کو حلیمہ کے پاس رہتے ہوئے ابھی مہینہ ہی ہوا تھا کہ اس کے اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے میں نمایاں اثرات نظر آنے لگے تو باپ کے دل میں ڈھیروں سکون اتر آیا۔ وہ تو حلیمہ کے پاس اقصیٰ کو چھوڑ کر ایسا مطمئن ہو گیا تھا کہ جتنا خیال حلیمہ اس کا رکھ رہی تھیں، ایسا تو اس کی سگی ماں بھی نہ رکھ سکتی۔

"آپا جی! آپ نے مجھ غریب پر ایسا احسان کیا ہے کہ میں تو اپنی کھال اتار کے اس کے جوتے بھی آپ کو پہنا دوں تو تب بھی احسان نہ اتار پاؤں۔"

حلیمہ کے پاس آنے سے پہلے اقصیٰ کی زندگی کسی بھیڑ بکری جیسی تھی۔ سارا دن گلی کوچوں میں بچوں کے ساتھ بھوکے پیاسے کھیلتے دوڑتے رہنا، نہ اپنا خیال، نہ اپنی عمر کا خیال۔ جب مشتاق بیٹی کو یوں کھیل کود کرتے بچوں کے ساتھ دیکھتا (جن میں اکثریت لڑکوں کی تھی) تو پریشانی میں اپنا سر پیٹ لیتا۔

"آپا جی! اس لڑکی نے تو مجھے کھپا رکھا ہے۔ جوان ہو رہی ہے مگر بچپنا اتنا ہے کہ گلی کے بچوں کے ساتھ دن بھر کھیلنا کودنا... کل کو کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو......"

ان خدشات کے پیش نظر مشتاق نے اپنی لاابالی سی بیٹی کو حلیمہ کے سپرد کیا تو دھیرے دھیرے وقت نے ثابت کرنا شروع کر دیا کہ اس کا یہ فیصلہ کسی طور غلط نہ تھا۔

☆☆☆

"اقصیٰ! ٹھیک سے دوپٹا اوڑھا کرو۔" حلیمہ نے تربیت کا آغاز کیا۔

"تم لڑکی ہو، تمہارا کیا کام ہے گلی کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کا۔" آہستہ آہستہ بہت سی اخلاقی طور تربیت کے حوالے سے حلیمہ، اقصیٰ کو سکھاتی چلی گئیں اور وہ سیکھتی چلی گئی۔

"لڑکیاں اونچی آواز میں نہیں بولتیں۔" اقصیٰ کبھی بلند آواز میں بولتی یا روتی تو حلیمہ اسے ٹوکنا ضروری سمجھتیں۔

"یہ کس انداز میں لیٹی ہو تم؟" اکثر لاپروا سے انداز میں اپنے دوپٹے اور قمیص کو درست کیے بغیر وہ صوفے پر بے خبر پڑی سو رہی ہوتی نعیم صاحب اور سیف کا گزر وہاں سے ہوتا۔ نعیم صاحب تو دوسری نگاہ بھی غلطی سے ڈالے بنا قدم آگے بڑھا دیتے مگر سیف یہ منظر دیکھ کر تپ جاتا۔

"امی! اس جنگلی پاگل لڑکی کو سونے کا بھی ڈھنگ نہیں۔" اور پھر حلیمہ سیف کے توجہ دلانے پر اسے سمجھاتیں۔

"لڑکیاں اپنے آپ کو سمیٹ کر، ڈھانپ کر سوتی ہیں۔ چاہے اپنے گھر میں ہوں یا کسی کے گھر میں۔"

پاگل سی لڑکی کو اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، کھانے پینے کے ادب و آداب حلیمہ نے سکھائے تو چند ہی مہینوں میں وہ پاگل سی لڑکی کیا سے کیا نظر آنے لگی۔ حلیمہ کی پوری کوشش تھی کہ بن ماں کی یہ بچی اگر ان کی تربیت اور رہنمائی سے اچھی رہتی ہوئی لڑکی بن جائے تو یہ ان کے لیے فخر کی بات ہوگی۔

"لقمہ مناسب لیا کرو، منہ چبا چبا کر کھایا کرو اقصیٰ۔"

"دل چاہے ہے فریج سے نکال کر کھا لیا کرو۔"

حلیمہ نے محسوس کیا تھا کہ وہ ان کے سامنے کھانے پینے سے شرماتی ہے، سو حلیمہ نے کھلے دل سے اجازت دے رکھی تھی کہ جو دل چاہے کھا لیا کرو۔ یہ حلیمہ کی فراخ دلی کی انتہا تھی، جس کو دیکھ کر اکثر سیف غصہ کرتا تھا۔

"بہت سر پر چڑھا نہیں رہی آپ اس لڑکی کو۔" اور حلیمہ بیٹے کی بات کو جس کر نظر انداز کر دیتیں۔

"جو جس کا رزق ہوتا ہے، اسے مل جاتا ہے کسی نہ کسی بہانے سے۔ یہ نہ سمجھنا کہ تمہارے کھانے

سے میرے گھر کے بجٹ پر بوجھ آتا ہے۔" حلیمہ کی اپنی کوئی بیٹی نہیں تھی سوانہوں نے سمجھ لیا تھا کہ شاید اللہ نے اقصیٰ کے ذریعے اس کی یہ محرومی دور کر دی ہے۔

☆☆☆

"آپا جی! میں جھاڑو لگا دیتی ہوں۔" اقصیٰ گھر کے کاموں میں حلیمہ کا ہاتھ بٹانے لگی تھی۔ وہ چند ہی روز میں صفائی ستھرائی میں ایسی طاق ہو گئی تھی کہ حلیمہ کے گھر کو مزید چمکا کر رکھ دیا تھا۔

"آپا جی! لائیں مجھے دیں، میں آٹا گوندھ دیتی ہوں۔" وہ بھاگ بھاگ کر آپا جی کے ہاتھ سے کام لیا کرتی تھی، تو آپا جی کو بھی آرام کا وقت مل جایا کرتا تھا۔

محلے سے کوئی خاتون حلیمہ سے ملنے آئی ہوئی تھیں۔ باتوں ہی باتوں میں اتنی دیر ہو گئی تھی کہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ اقصیٰ نے انہیں مصروف دیکھا جو باتیں کرتے ہوئے آٹا گوندھنے کے لیے اٹھی کر اس نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"آپا جی! میں نے مونگ کی دال پکنے پر چڑھا دی ہے۔" حلیمہ نے اسے کھانا پکانے کی بھی تربیت دینا شروع کر دی تھی۔

"اور چاول!" حلیمہ کے پوچھنے پر اس نے انتہائی فرماں برداری سے جواب دیتے ہوئے اقصیٰ نے بتایا کہ وہ پہلے ہی ابال چکی ہے۔

"آپا جی! مجھے پتا ہے کہ انکل جی (آپا جی کے شوہر) مونگ کی دال کے ساتھ ابلے ہوئے چاول کھاتے ہیں اور آپ اور سیف بھی روٹی کھاتے ہیں، وہ بھی گھی کی چپڑی ہوئی۔" اقصیٰ مختصر عرصے میں ہی گھر والوں کی پسند و ناپسند سے واقف ہو چکی تھی۔

"رات کو گھر جاتے ہوئے اپنے ابا کے لیے بھی کھانا لے جانا۔" حلیمہ روز ہی کچھ نہ کچھ پکا ہوا اقصیٰ کو ساتھ دے دیا کرتی تھی تا کہ بیٹی کے ہاتھ کا پکا کھانا مشتاق کھائے تو اسے بھی علم ہو کہ وہ گھر داری میں بھی طاق ہو رہی ہے۔

"اچھا آپا جی!" آپا جی اس سے بیٹیوں والا سلوک کرتیں تو وہ بھی انہیں چاہتی تھی۔

"حلیمہ بہن! برا نہ ماننا۔ کسی پر اتنا بھروسا اچھی بات نہیں ہے۔" حلیمہ سے اکثر محلے والی خواتین ملنے آتی رہتی تھیں۔ حلیمہ ان کے کپڑے سی کر دیا کرتی تھیں۔ اس دوران ایک دوسرے کے گھر بار اور حالات کے بارے میں بات چیت بھی ہو جاتی تھی۔ محلے والوں کو بھی پتا چل گیا تھا کہ مشتاق نے اپنی بیٹی کو تربیت کے لیے حلیمہ کے گھر بھیجا ہے جو سارا دن سائے کی طرح ان کے ساتھ رہتی ہے اور رات کو اپنے گھر آ جاتی ہے۔

"میں بھی نہیں۔"

"میرے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ یہ لڑکی شکل سے ہی بڑی گھنی میسنی لگتی ہے۔ بالکل اپنی ماں کی فوٹو کاپی۔" آواز کو قدرے دھیما کرتے ہوئے ہمسائی نے کن اکھیوں سے باورچی خانے کی کھڑکی کی طرف دیکھا جہاں سے کام کرتی اقصیٰ بخوبی دکھائی دے رہی تھی۔

"مشتاق کے ساتھ رہتے ہوئے اس بدذات عورت نے کیسے اندر ہی اندر تاثیب کو تسلسل سے پینگیں بڑھائیں کہ شوہر کی ناک کے نیچے سے نکل کے یوں چلی گئی کہ اسے خبر بھی نہ ہوئی۔"

حلیمہ ابھی بھی لبوں پر انگشت شہادت رکھے ہمسائی کو حیرت سے تک رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے جھلکتی حیرت بتا رہی تھی کہ وہ ابھی تک بات کا مطلب نہیں سمجھ پا رہیں۔

"حلیمہ! نظر رکھا کرو اس لڑکی پر۔"

عشرت کے مطابق ناقابل اعتبار اور ناقابل بھروسا لڑکی ہے۔ اپنی ماں کی طرح ہی چلتر۔ اقصیٰ پر اعتبار کر کے پورا گھر اس کے حوالے کر دینا کوئی دانش مندی نہیں۔ خوب صورت لڑکیاں بڑی تیز طرار ہوتی ہیں، اندر ہی اندر یوں کھیلتی ہیں کہ کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔

"گھر میں جوان بیٹا ہے تمہارے۔ آنکھیں کھلی رکھنا۔" عشرت ایک گھنٹہ تک سرگوشی کے انداز

میں علیمہ کے کانوں میں کھسر پھسر کرتی رہی اور علیمہ اس کی ہر بات کو "روایتی عورتوں" کی باتیں سمجھ کر خاموشی سے سر ہلاتے ہوئے سلے ہوئے کپڑوں پر بٹن ٹانکتی رہیں۔ ان کی مسکراہٹ سے واضح تھا کہ وہ ہمسائی کی باتیں صرف سن رہی تھیں، ان پر کان نہیں دھر رہیں۔

"ارے بہن! اقصیٰ بالکل ایسی نہیں ہے، جیسا تم سمجھ رہی ہو۔ وہ بہت سیدھی ہے۔" ایک دو بار علیمہ نے دبے لفظوں میں یہ کہا مگر عشرت نے تو لفظ "سیدھی" کو پکڑ ہی لیا۔

"جس کی ماں سیدھی نہ تھی بھلا اس کی بیٹی کیسے اتنی سیدھی ہو سکتی ہے۔"

پھر عشرت نے لفظ "سیدھی" پر ہی ایک گھنٹے کا طویل لیکچر دے ڈالا کہ علیمہ کو لگا کہ ایک گھنٹے یہ لیکچر سنتے سنتے ان کی کمر دہری ہو گئی ہے۔ علیمہ کو اقصیٰ پہ واقعی بہت بھروسا تھا، وہ اس بن ماں کی بچی کی طرف سے اپنا دل ہرگز میلا نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

☆☆☆

علیمہ محسوس کرنے لگی تھیں کہ گزرتے وقت کے ساتھ اقصیٰ ان سے بہت مانوس ہی ہو رہی تھی۔

"آپا جی! آپ سے بہت محبت ہے۔ آپ تو مجھے میری ماں سے بھی زیادہ پیاری ہیں۔" جوانی کی طرف قدم بڑھاتی اقصیٰ اب دلی جذبات کا اظہار لفظوں میں کرنے لگی تھی۔ لفظ بھی ایسے جو اکثر بھیگے ہوتے تھے۔

"ارے پگلی! اماں تو ماں ہی ہوتی ہے، اس کی جگہ بھلا کون لے سکتا ہے۔" فرط جذبات سے اقصیٰ علیمہ کی گود میں سر رکھے ہوئے تھی۔ علیمہ کو اس کی وابستگی کا اندازہ ہو چلا تھا مگر وہ اس کی ماں کی طرف سے ہرگز بدگمان نہ کرنا چاہتی تھیں۔

"نہیں، آپا جی! جو آپ ہو، وہ کوئی نہیں۔ بس مجھے کبھی اپنے سے دور نہ کرنا۔" علیمہ بچوں کی نفسیات سمجھتی تھیں کہ وہ جن کے زیادہ قریب ہوں، ان سے مانوس بھی زیادہ ہو جاتے ہیں۔ بے شک ان سے خون کا رشتہ ہو نہ ہو۔

مشتاق بھی اپنی بیٹی کی طرف سے مکمل مطمئن رہنے لگا تھا۔

"آپ نے میری اقصیٰ کو کیا سے کیا بنا دیا ہے۔" صاف ستھرے کپڑوں میں نہائی دھوئی آنکھوں میں کاجل لگائے، لمبے بالوں میں تیل لگا کر سلیقے سے چوٹی بنائے وہ اس اقصیٰ سے (جو گلی میں سارا دن گندے بچوں کے ساتھ مٹی میں اٹی، پسینے اور گندگی کا بھسوکا بنی ہوتی تھی) بہت مختلف نظر آنے لگی تھی۔

"آپا جی! اقصیٰ آپ کی بیٹی ہے، میں اسے آپ کے حوالے کرتا ہوں۔" مشتاق جب بھی آتا ایسے ہی جملے بولتا تھا۔

"اس کی تینوں پھوپھیاں بہت دفعہ کہہ چکی ہیں کہ اسے ہمارے پاس قصور بھیج دو۔ ہمارا خون ہے بھلا ہم سے زیادہ کون بہتر دیکھ بھال کر سکتا ہے۔ مگر نہ جی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ میں اسے آپ کے گھر کے علاوہ کہیں اور بھیجوں۔"

اقصیٰ کی تینوں پھوپھیاں قصور میں رہا کرتی تھیں۔ تینوں ہی اقصیٰ سے بہت محبت کرتی تھیں جب سے انہیں بھائی کے گھریلو حالات کا علم ہوا تو انہوں نے بہت بار اصرار کیا کہ اقصیٰ کو ہمارے پاس بھیج دو مگر مشتاق نہ مانا۔ حالانکہ تینوں بہنیں بھائی پر جان چھڑکتی تھیں۔

"میں نہیں جاتی ابا! اس شہر کو چھوڑ کر اس گندے شہر میں۔" پہلے تو مشتاق بچی کو وہاں بھیجنے پر رضامند نہ تھا۔ اب جب سے بچی عقل و شعور والی ہوئی تو اس کا بھی یہی فیصلہ تھا۔

"علیمہ بہن! مشتاق کی سوچ میں کچھ دال میں کالا لگتا ہے۔"

عشرت سی آئی ڈی بنی مشتاق اور اقصیٰ کے تعاقب میں رہتی تھی۔ اسے تو اقصیٰ کا علیمہ کے گھر مستقل طور پر "ڈیرہ" ڈالنا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ علیمہ ایک نیک اور سادہ طبیعت عورت

تھی۔
"پتا نہیں دونوں باپ بیٹی کس منصوبے کے تحت چل رہے ہیں۔ یہ لڑکی تو یہاں "ڈیرہ" ڈال کے ہی بیٹھ گئی ہے۔" اب اقصیٰ اکثر رات کو بھی حلیمہ کے گھر سو جاتی تھی۔ کام سے فارغ ہو کر مشتاق بیٹی کو لینے آتا تو حلیمہ اسے مطمئن کر کے بھیج دیتیں۔
"مشتاق بھائی! اقصیٰ تو سو گئی ہے۔" یہ بات سن کر مشتاق کے چہرے پر ڈھیروں سکون اتر آتا۔
"یہ میں اس کے لیے کھانا لایا تھا۔" مشتاق روز ہی رات کو اقصیٰ کے لیے کچھ نہ کچھ کھانے کو لاتا۔
"مشتاق بھائی! میں اسے بھوکا رکھتی ہوں جو آپ اس کے لیے کھانا لائے ہیں۔ آپ اس کی طرف سے بے فکر رہا کریں۔" حلیمہ کا جواب مشتاق کو اتنا مطمئن کر دیتا کہ دو تین دن تو باپ بیٹی کے ملے بغیر ہی گزر جاتے۔ مشتاق پرسکون تھا اور واقعی خوش...... مگر حلیمہ محسوس کر رہی تھیں کہ ہمسائی ہرگز خوش اور مطمئن نہیں تھی۔
"عشرت! تم پتا نہیں کیوں ان باپ بیٹی کے پیچھے پڑ گئی ہو۔ مسکین سے تو ہیں دونوں۔"
حلیمہ اکثر ہی اسے ٹوکتیں مگر عشرت تو ان کے ٹوکنے کو نظر انداز کر کے اندیشوں اور خدشات کی تیز رفتار ٹرین پر حلیمہ کو بھی زبردستی سوار کرنے کی سعی میں مصروف نظر آتی۔
"حلیمہ! آنکھیں اور کان کھلے رکھنا۔ تمہارے بھلے کے لیے کہتی ہوں۔ یہ سادہ لوح باپ بیٹی کہیں تمہیں مل کر "الو" ہی نہ بنا ڈالیں۔"

☆☆☆

حلیمہ کے کان تو کھلے تھے مگر آنکھیں بند تھیں۔ شام سے ہی ان کے سر میں درد تھا۔ اقصیٰ نے ان کے سر میں تیل لگا کر مالش کی تھی مگر افاقہ نہ ہوا۔ درد جب حد سے بڑھا تو وہ دوا لے کر اپنے کمرے میں آ گئیں۔ درد کی شدت میں نیند بھی نہیں آ رہی تھی کہ سوتی جاگتی کیفیت میں انہوں نے کچھ شور سنا۔
"کیوں آئی ہو اس وقت میرے کمرے میں؟" یہ حلیمہ کے بیٹے سیف کی آواز تھی۔
آگے سے مدھم آواز والی اقصیٰ نے نجانے کیا کہا تھا کہ حلیمہ کچھ سمجھ نہ پائی تھی۔
"اپنی حد میں رہو اقصیٰ" اور پھر چٹاخ کی زوردار آواز آئی کہ حلیمہ خود کو مزید روک نہ سکیں۔
وہاں جا کر حیرت انگیز منظر دیکھنے کو ملا تھا۔ کندھے سے اپنا دوپٹا گزار کر سڈول کمر کے ایک طرف باندھے، آنکھوں کو کاجل کی دھار سے دو آتشہ بنائے، ہونٹوں کو سرخ لپ اسٹک سے سجائے، ریشمی بالوں کی لٹ پیشانی کے دائیں طرف گرائے اقصیٰ...... اس اقصیٰ سے بہت مختلف تھی جو سارا دن حلیمہ کے ساتھ گزارتی تھی۔
حلیمہ کی نظریں روز دیکھتی تھیں، دوپٹے میں خود کو چھپائے، سیدھی سادی، بھولی بھالی، شرم و حیا کا پیکر۔
ایک گہری نگاہ اس کے سراپے پر ڈالتے ہوئے حلیمہ کی پیشانی پر بل آ گئے۔ اقصیٰ کے دائیں گال پر سیف کی انگلیوں کا نشان صاف نظر آ رہا تھا۔
"وہ...... میں...... امی جی......؟" بجلی کی تیزی سے دوپٹا کمر سے کھول کر سر پر ڈالتے ہوئے وہ سخت گھبرائی ہوئی تھی مگر لفظ "امی جی" نے حلیمہ کو حیرتوں کے سمندر میں دھکیل دیا تھا۔
"آپا جی سے امی جی......" یہ راتوں رات کیا انقلاب آ گیا تھا کہ حلیمہ آپا جی سے "امی جی" ہو گئی تھیں۔ حیرانی و پریشانی کا مجسمہ بنی حلیمہ کبھی سیف کو دیکھ رہی تھیں تو کبھی اقصیٰ کو۔
"یہ...... یہ کیا ہو رہا ہے سب؟" سیف کچھ دیر پہلے ہی جم سے آیا تھا۔ اس کے گیلے بال اور کندھے پر رکھا تولیہ بتا رہا تھا کہ وہ ابھی نہا کر نکلا ہے۔
"آپا جی! میں تو کمرے کی صفائی ستھرائی کے لیے آئی تھی اور یہ سیف جی......" سرخ لالی زدہ گالوں میں پہلی بار حلیمہ کو جھوٹ کی سرخی نظر آئی تھی۔
"بکواس کر رہی ہے امی! یہ......" ایک زوردار دھکا اقصیٰ کو دیتے ہوئے سیف نے ماں کے سامنے

وہ انکشافات کر ڈالے کہ جسے سن کر حلیمہ کو احساس ہو رہا تھا کہ نہ تو ان کے کان کھلے تھے اور نہ ہی آنکھیں۔

سیف کے مطابق اقصیٰ روز اس وقت صفائی ستھرائی کے بہانے آتی، کبھی شوخ تو کبھی ذومعنی گفتگو کرتی اور بہت بار اظہار محبت بھی کر چکی تھی۔ اپنے حسن کو ہتھیار بنا کر بظاہر سیدھی سادی نظر آنے والی اقصیٰ سیف کو مائل کرنے کے لیے خوب داؤ پیچ کھیل رہی تھی۔

اس سارے کھیل میں پہلا "داؤ" یہ تھا کہ اقصیٰ اب رات کو بھی یہیں سونے لگی تھی۔ حلیمہ سمجھتی تھیں کہ بے چاری بچی تھک جاتی ہے۔ صفائی ستھرائی، برتن دھونا، ہفتے میں ایک بار واشنگ مشین لگانا، باغیچے کی صفائی ستھرائی، پودوں کو روز پانی ڈالنا، گھر میں پالے ننھے منے چرند پرند کی دیکھ بھال کرنا۔ اس کے علاوہ رات کے کھانے کی مکمل ذمہ داری لے کر اقصیٰ نے حلیمہ کا تو جیسے بوجھ ہلکا کر دیا تھا۔ اقصیٰ کی وجہ سے اتنی سہولت ہو گئی تھی کہ حلیمہ نے کام والی کو ہٹا دیا تھا۔

"آپا جی! میں ہوں نا...... اب کام والی کی کیا ضرورت۔" اقصیٰ کے اصرار پر ہی حلیمہ نے کام والی کو فارغ کیا تھا کیونکہ اقصیٰ کی وجہ سے پانچ چھ ہزار کی بھی بچت ہو گئی تھی۔ جو ہر ماہ کام والی کو دینے پڑتے تھے۔

"آپ نے مجھ سے پوچھے بغیر کام والی کو کیوں فارغ کیا؟" نعیم صاحب کو بھی بیوی کے عمل کی خبر ہو گئی تھی۔ ہوا یوں کہ راستے میں آتے ہوئے ان کی ملاقات کام والی سے ہو گئی، جس نے روتے ہوئے حلیمہ کی شکایت لگائی تھی کہ اسے کام کی ضرورت تھی اور پیسوں کی بھی مگر آپا جی نے اسے زبردستی کام سے ہٹا دیا۔

"ہاں تو کیا غلط کیا۔ سارا کام تو دن بھر وہ "بے چاری بچی" کرتی ہے اور یہ خواہ مخواہ تنخواہ لے جاتی ہے۔" حلیمہ کو مہینے کے چھ ہزار بچ جانے کی خوشی تھی تو کام والی کو اپنے ہٹائے جانے کا دکھ تھا۔ حلیمہ نعیم صاحب سے پوچھنے کی بھی زحمت نہ کی تھی۔

"پتا نہیں خود سے کیا کیا فیصلہ کرنے لگی ہیں۔ نہ جانے ان کا نتیجہ کس صورت میں نکلے گا۔"

یہ نعیم صاحب کے خدشات تھے جن کا اظہار وہ اکثر کرنے لگے تھے۔ جبکہ حلیمہ اپنے پانچ ہزار بچ جانے پر نہال تھیں۔ ان پیسوں سے دو عدد سوٹ، ایک عدد جوتی اور کچھ ضرورت کی چیزیں حلیمہ نے اقصیٰ کو لا دی تھیں۔ جبکہ آج ہی تو اقصیٰ کو رات کے وقت اپنے بیٹے کے کمرے میں دیکھ کر احساس ہوا تھا کہ کاجل، سرخی پاؤڈر جو کہ اکثر حلیمہ کی ڈریسنگ ٹیبل سے غائب ہو رہے تھے اور جب حلیمہ ان کے متعلق اقصیٰ سے پوچھتی تو ایک ہی جواب ہمیشہ ہوتا۔

"آپا جی! مجھے تو ان چیزوں کا شوق ہی نہیں۔"

"یہ ہاتھ کی صفائی کام والی دکھا رہی ہے۔" کام والی کو کام سے ہٹانے کی وجہ ایک یہ بھی بنی تھی کہ اس حوالے سے حلیمہ کے دل میں "چوری" کا شک بیٹھ گیا تھا اور یہ بھی مہربانی اقصیٰ کی تھی۔ مگر آج یہ منظر دیکھ کر حلیمہ پر یہ نیا انکشاف ہوا تھا کہ چور تو اقصیٰ کے دل میں آ بیٹھا تھا۔

"امی! آج تو اس نے ہر حد ہی پار کر دی۔"

اور پھر سیف نے غصے میں چلاتے ہوئے اس "حد" سے پار کرنے کی ماں کے سامنے ایسی بے باک تشریح کی کہ جس کو سن کر حلیمہ تو جیسے سناٹے میں ہی آ گئیں۔

سیف کے مطابق یہ سلسلہ پورے دو مہینے سے جاری تھا۔ وہ کبھی سیف کو دیکھ کر گنگنانے لگتی۔ کبھی اس کا راستہ بڑی ادا سے روک کر کھڑی ہو جاتی۔ تو کبھی کاجل بھری مست آنکھوں سے شرارت بھرے اشارے کرنے لگتی اور سیف اسے اول روز سے ہی روک رہا تھا مگر وہ تو جیسے روز بہ روز بے خوف ہوتی جا رہی تھی۔ نہ جانے کس کی شہ پر؟ حلیمہ کے دل نے اس سے سوال کیا تو ساتھ ہی جواب اقصیٰ اور مشتاق کی فون پر گفتگو سن کر اسے مل گیا تھا۔

"کوئی اتنا بڑا احسان نہیں کر رہی آپا جی ہم

پر.... دو وقت کی ''مفت'' سبزی ان کے گھر روز دیتا ہوں۔''

یہ مشتاق کی تند و تیز آواز تھی جو اریچیں سے چھنتے ہوئے دھول کی طرح باہر آ رہی تھی۔ مشتاق دن میں ایک دو بار بیٹی سے بات کرنے کے لیے حلیمہ کے فون پر کال کرلیا کرتا تھا۔ اس سے پوری رپورٹ لیا کرتا تھا۔

رہی تھی کہ اقصیٰ ان کے گھر کی مالکن بننے کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ لالچی مشتاق اپنے مقاصد کے لیے اپنی بیٹی کو ہتھیار بنا کر استعمال کر رہا تھا۔ حلیمہ ان کی چال ہی نہ سمجھ سکیں۔ شاید ہمدردی میں وہ اس حد تک آگے بڑھ گئیں کہ سچ مچ ہی اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں۔ اور آج جب آنکھیں کھلیں تو یہ سب دیکھ کر صدمہ ہوا تھا۔

''کیا کھایا...... کیا پیا......''

''پیسے ویسے کچھ پکڑائی ہیں تجھے آپا جی!''

''نہ ابا...... بڑی کنجوس عورت ہے۔ مجال ہے جو دس روپے بھی دینے کا حوصلہ ہو۔'' یہ لہجہ اور انداز حلیمہ کے پیروں تلے سے جیسے زمین ہی نکل گئی تھی۔

''سارا دن ہنڈیاں رگڑ کر اس عورت کے گھر کی صفائی ستھرائی کرو اور ایک یہ ہے کنجوس مکھی چوس۔'' اقصیٰ کے الفاظ میں نا جانے کس وجہ سے اتنی نخوت بھری تھی۔

''چل کوئی نہیں، ایک ساتھ ہی اس کنجوس عورت سے پیسے نکلوانا ''بہو'' بن کے۔''

اور پھر دونوں باپ بیٹی کے بلند ہوتے قہقہے کی سن کر حلیمہ کو اپنی سماعتیں مفلوج ہوتی محسوس ہوئیں۔ تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کی بھلائی کا صلہ اس شکل میں دینے کا یہ گھناؤنا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔ اقصیٰ جو کچھ بھی کر رہی تھی۔ باپ کی شہ پر کر رہی تھی۔ یہ سارا منصوبہ مشتاق کا تھا جس نے اپنی خوب صورت بیٹی کو اس گھر میں اپنی اس سوچ اور مقصد کے تحت بھیجا تھا۔

''آپا جی کی کوئی بیٹی نہیں ہے۔ تو ان کے قریب ہونے کی کوشش کر...... بس پھر یہ گھر تیرا ہوگا اور تو اس کی مالکن......''

مشتاق کا خیال تھا کہ بیٹی کی شادی تو کرنی ہی ہے تو پھر حلیمہ کے بیٹے سے ہو جائے تو کیا ہی اچھا تھا۔ حلیمہ کے گھر میں دولت کی فراوانی بھی تھی اور اپنی سادہ طبیعت کے باعث وہ دونوں باپ بیٹی سے کچھ زیادہ ہی نرم دلی برت رہی تھیں جس کی سزا حلیمہ کو مل

اس سارے معاملے کو سمیٹتے ہوئے حلیمہ کو ایسی تدبیر کرنی تھی کہ زمانہ ان کی سادگی کا مذاق بھی نہ بنائے اور شوہر کے سامنے بھی عزت رہ جائے۔ ان لالچی باپ بیٹی نے تو حلیمہ کا ''سمدھی'' اور ''بہو'' بننے کی پلاننگ کرلی تھی۔

''لوگ اتنے بھی سیدھے نہیں ہوتے۔ جتنا تم سمجھ کر اعتبار کرلیتی ہو۔'' حلیمہ کو عشرت کی بات یاد آ رہی تھی۔

حلیمہ نے اس ساری چال کو ناکام بنانے کے لیے دانش مندی سے تدبیر کی کہ اقصیٰ کی پھوپھو کو فون کر دیا جو کہ شروع سے ہی مشتاق کے اس اقدام کے خلاف تھی کہ بیٹی کو غیروں کے ہاں چھوڑا جائے۔ اب بے چاری بہن کو کیا معلوم کہ لالچی بھائی کی نظر تو حلیمہ کے شان دار گھر بار اور اکلوتے بیٹے پر تھی۔ حلیمہ نے بات کا پردہ رکھا اور اقصیٰ کی پھوپھو کو صرف یہ کہا کہ میں مہینے دو مہینے کے لیے اپنی بہن کے پاس اسلام آباد جا رہی ہوں۔

''میرے پیچھے اقصیٰ یہاں اکیلی...... کچھ مناسب نہیں لگتا۔''

اور یوں حلیمہ نے ان لالچی لوگوں سے جان چھڑائی۔

حلیمہ صرف نیک نیتی کی بنا پر ایک بچی کی تربیت کر رہی تھی۔ اسے اپنی بہو بنانے کا کوئی ارادہ نہ تھا اور پھر ایسی بہو سے تو اللہ ہی بچائے۔ جو شادی سے پہلے ہی حلیمہ کے گھر کی مالکن بننا چاہتی تھی۔

حلیمہ دل ہی دل میں اس نجات پر اللہ کا شکر ادا کر رہی تھی۔

رخسانہ نگار عدنان

کشف اپنے پرانے طرز کے گھر سے شدید بے زار ہے اور وہ اپنی آنی سے ہزار بار کہہ چکی ہے کہ وہ اس گھر سے جان چھڑا لیں لیکن وہ ہر بار اس کی بات ہنس کر ٹال دیتی ہیں۔ کشف گلیوں سے گزرتے خوانچا فروشوں سے بھی سخت بے زار رہتی ہے اور انہیں حسب توفیق بددعاؤں سے نوازتی رہتی ہے۔

طاہرہ بیگم کا اپنے گھر پر کافی ہولڈ ہے۔ ان کی بہو سونیا اور بیٹا آرزو دونوں ہی ان کے فرماں بردار ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کسان کی پوتی کا رشتہ ان کی مرضی سے طے ہو۔

جبکہ وہ اپنے آفس میں کام کرنے والے جبران سے محبت کرتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ وہ اس کا رشتہ لے کر آئے۔

دوسری جانب کشف کا پڑوسی اسے چھیڑتا ہے اور وہ اس کے پاؤں پر امنڈ دے مارتی ہے۔ بعد میں اسی لڑکے کی ماں سے بھی خوب جھگڑا کرتی ہے۔

زینب شاعری کرتی ہے اور ساتھ ہی ایک اسکول میں بھی پڑھاتی ہے وہ اپنا مسودہ حیدر کے پاس لے کر جاتی ہے تاکہ وہ میر فراز سے بات کر کے اسے چھپوا سکیں۔

آفس سے واپسی پر اس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور وہیں تیز برستی بارش میں اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔

آڈیٹوریم لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہے جہاں ڈاکٹر موسد مہلک بڑی بیماریوں کو کنٹرول کرنے کے حوالے سے لیکچر
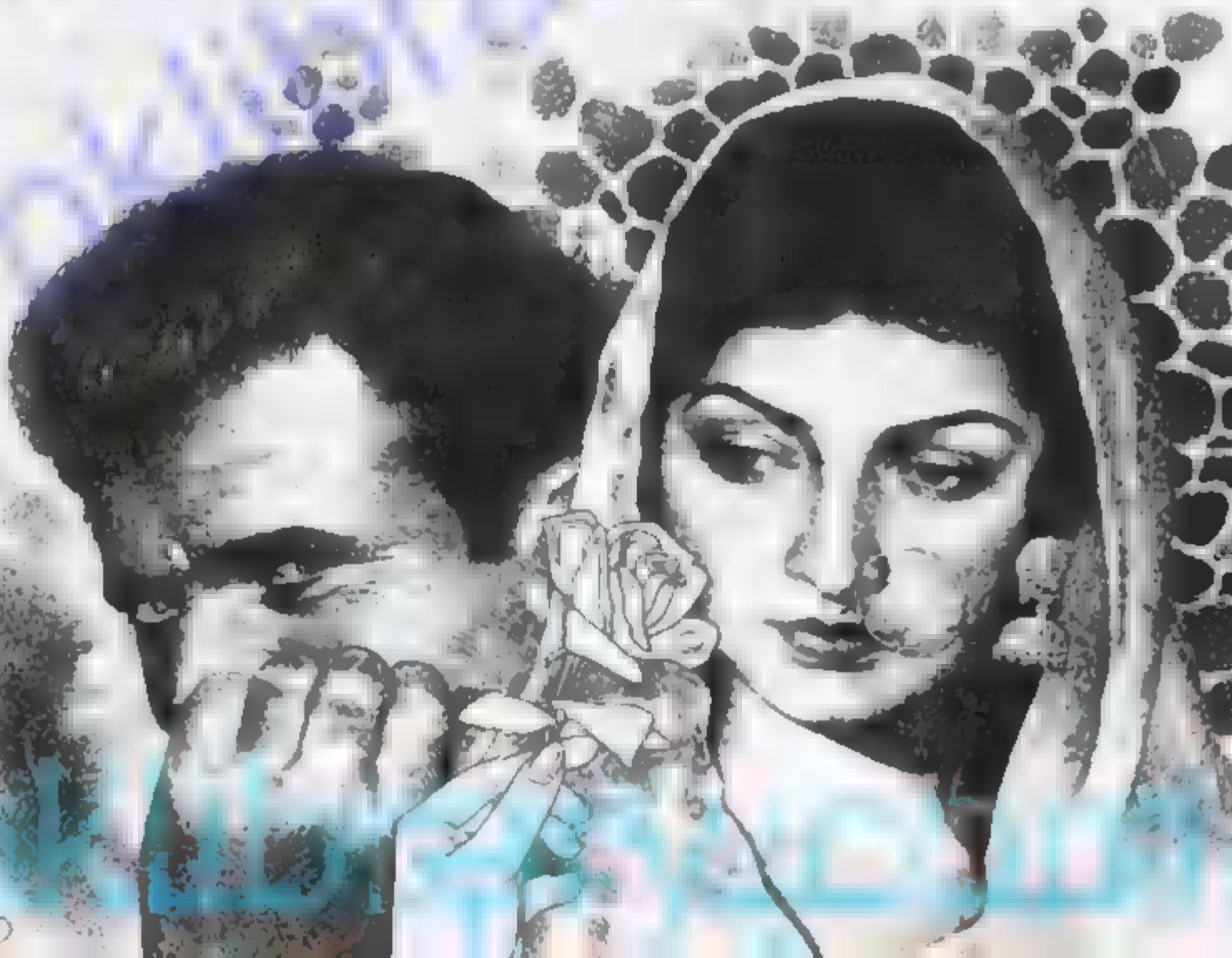
دے رہے ہیں۔ اور ہال میں تمام لوگ ساکت ہو کر سن رہے ہیں۔

کشف، ناہید کو دیکھ کر اس سے بے اختیار لپٹ جاتی ہے۔ ناہید کو زینب کی فکر ستاتی ہے اور وہ بارش سے بھی خوف زدہ ہیں۔ کشف انہیں کہتی ہے کہ زینب فون نہیں اٹھا رہی۔ ناہید اس سے بتول خالہ سے کیے گئے جھگڑے کے بارے میں پوچھتی ہیں اور اسے سمجھاتی ہیں۔

میرو خزاں کے موسم میں اپنی گاڑی میں موجود ہے اور کسی کی یاد ہے جو اسے گھیرے ہوئی ہے۔ وہ اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے اگر کبھی ناراض ہوئی تو میرو اسے منا لے۔ وہ ان سوچوں میں الجھا چلتا چلا جاتا ہے۔

موحد راستے میں رش دیکھ کر اترتا ہے اور سامنے بے ہوش پڑی زینب کو دیکھ کر اسے ہاسپٹل لے جاتا ہے۔

آذر کو ایک فون کال آتی ہے اور وہ عجلت میں آفس سے باہر نکلتا ہے۔ زینب کے بارے میں کوئی بھی معلومات نہ پا کر کشف شدید پریشان ہو جاتی ہے۔ کیل اپنے طور پر پتا کروا لیتا ہے اور اسکول بھی چکر لگا آتا ہے۔ لیکن وہ وہاں بھی موجود نہیں ہوتی۔ وہ حیدر کو فون کرتی ہے وہ بھی پریشان ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد اس کے فون پر موحد کی کال آتی ہے۔ اور وہ اسے زینب کے بارے میں بتاتا ہے۔

دوسری طرف زینب کو ہوش آتا ہے اور موحد اسے جانا پہچانا لگتا ہے۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرتی ہے اور گھر جانے کا کہتی ہے۔ اور موحد سے اس کے باپ کا نام بھی پوچھ لیتی ہے۔ موحد اسے اس کے گھر چھوڑ کر آتا ہے۔ جہاں کشف کے ساتھ بلال بھی موجود ہوتا ہے۔ باتوں کے دوران بتول خالہ آ جاتی ہیں اور ماں بیٹی کے کردار پر الزام تراشیاں کرتی بکتی جھکتی بلال کے ڈرانے پر گھر سے نکل جاتی ہیں۔

آذر، روا کو لے کر گھر پہنچتا ہے جہاں پورا گھر روا کی غیر حاضری کے باعث پریشان ہے۔ روا اپنے کمرے میں جاتی ہے جہاں رمشا اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن وہ اسے ڈانٹ کر بھگا دیتی ہے۔ سونیا اس کے کمرے میں آتی ہیں اور اس سے پوچھتی ہے کہ کیا ہوا ہے اور کمرے کا دروازہ بند کر دیتی ہے۔ روا حیران رہ جاتی ہے۔

میرو دیوار میں کیل ٹھونک رہا ہوتا ہے جب وہ عورت چیختے ہوئے آتی ہے اور اس سے جھگڑتی ہے۔ اس مسکین عورت کی طرف میرو شرمندگی سے دیکھتا اس کی بدزبانی سنتا ہے۔ تبھی ان کی بیٹی آتی ہے اور اس کا سرخ لباس دیکھ کر وہ عورت پھر سے چیختا چلاتا اور آخر میں رونا شروع کر دیتی ہے۔

وہ نوجوان لڑکی ماں کی اس حالت سے شدید ارجک ہے اور کہتی ہے کہ اسے پاگل خانے بھیج دیا جائے۔ جبکہ وہ عورت چلاتے چلاتے میرو کے گریبان میں چہرہ چھپا لیتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے دور نہ جائے۔

دادی، شائستہ کو فون کر کے کہتی ہیں کہ آذر اور سونیا کو اس رشتے پر اعتراض نہیں۔ وہ بیس دن بعد نکاح رخصتی کی تاریخ رکھ لیتی ہیں جبکہ دروازے میں کھڑا آذر یہ سن کر ساکت رہ جاتا ہے۔

آذر اپنی ماں سے کہتا ہے کہ انہیں رشتہ طے کرنے سے پہلے کم از کم روا کی مرضی ضرور معلوم کرنی چاہیے۔ لیکن وہ بات کو یوں گھماتی ہیں کہ آذر چپ رہ جاتا ہے۔

کشف آپی سے اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے۔ وہ اسے ساری تفصیل بتاتی ہے۔ میر منصور باہر گیا اور وہاں جا کر دوسری شادی کر لی۔ کشف ضدی لہجے میں کہتی ہے کہ وہ ان سے ضرور ملے گی۔

سونیا، روا سے پوچھتی ہے کہ برسات میں کیا ہوا تھا۔ وہ کہتی ہے کہ کچھ نہیں ہوا۔ پھر وہ اسے بتاتی ہے کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے اور جبران سے ہی شادی کرے گی۔ سونیا اسے زوردار تھپڑ مارتی ہے۔ سونیا، آذر کو ڈھکے چھپے لفظوں میں بتاتی ہے کہ اس کی بیٹی شادی کے لیے راضی نہیں۔

حیدر، زینب سے ملتا ہے تو وہ اسے کشف کے رویے کے بارے میں بتاتی ہے۔

کشف خیالوں میں گم بس میں بیٹھی رہ جاتی ہے۔ اڈے پر پہنچ کر وہ چونکتی ہے اور گھبرا کر رہائشی علاقے کی طرف آ جاتی ہے۔ جہاں حمزہ اسے سونیا کے گھر ڈراپ کر دیتا ہے۔ کشف کی موجودگی سے آذر بے سکون ہوتا ہے۔

میر منصور، ایما کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ بدتمیزی کرتی ہے جواباً وہ اسے تھپڑ مار دیتا ہے۔ ایما پولیس بلا لیتی ہے۔ گھر پر اس کی ماں ایک پرتکلف ڈنر تیار کر کے اس کا انتظار کرتی ہے۔ ایما ماں کو خوشی خوشی بتاتی ہے کہ اس نے باپ کو

پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔

کشف سونیا سے بھی اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے اور اس کے سامنے اس عزم کا اظہار کرتی ہے کہ وہ ضرور امریکہ جائے گی۔

زینب، بتول خالہ سے معافی مانگنے جاتی ہے جہاں وہ اسے کشف کی شادی کا مشورہ دیتی ہیں۔

ڈاکٹر موحد گاؤں میں ہونے والی ایک فوتگی پر جاتے ہیں اور وہاں نہ صرف جنازے میں شریک ہوتے ہیں بلکہ قبر کھودنے میں بھی مدد کرتے ہیں جس پر گاؤں کے لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔

سونیا زینب کو فون پر کشف کی وجہ سے بہت سناتی ہیں۔ زینب کشف سے اس بارے میں پوچھتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ ہاں وہ سونیا کے پاس اپنے باپ کی معلومات لینے گئی تھی۔ اسے سونیا کا عجیب رویہ یاد آتا ہے۔

آزر حیران سے ملتا ہے اور اسے بے عزت کرتا ہے، ردا غصے سے باہر نکل جاتی ہے۔

کشف، کچن میں ردا کو دیکھ کر ایک کپ کافی کا کہتی ہے۔ باتوں باتوں میں وہ ردا سے کہتی ہے کہ وہ اس شادی سے خوش نہیں کیا وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ ردا یہ سن کر چراغ پا ہو جاتی ہے۔ سونیا ردا کو آ کر تھپڑ مارتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ اس کی ماں کی وجہ سے آج تم اس گھر میں ہو اور آج ہماری عزت رہ گئی ہے۔

ہوٹل سے میر منصور زینب کا ہاتھ پکڑ کر باہر لاتا ہے اور اسے زینی کے نام سے بلاتا ہے۔ زینب کہتی ہے کہ اس کا نام زینی نہیں زینب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم جس سے محبت کرتی ہو وہ میں تھا یا کوئی اس کی خاطر میری بات سن لو۔ زینب کہتی ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی اور نہیں تھا۔ میر منصور اس بات پر یقین نہیں کرتا۔ موحد کے پہنچنے پر زرین بہت خوش ہوتی ہے۔ زرین کو برے حالوں میں دیکھ کر موحد کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایما کی وجہ سے اس حال میں ہیں، میں ان کا کچھ نہیں۔

میر منصور کی یہ بات سن کر زینب حیران رہ جاتی ہے کہ زینب نے بے وفائی میں پہل کر کے شادی کر لی۔ دونوں ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ منصور یہ سن کر پریشان ہو جاتا ہے کہ بیس سال سے اکیلی رہ رہی ہے۔

کشف زینب سے فون پر کہتی ہے کہ وہ اپنے گھر جانا چاہتی ہے زینب منع کر دیتی ہے۔

کشف کی آنکھ ایک ڈراؤنے خواب سے کھلتی ہے۔ وہ چیخ مار کر اٹھتی ہے ٹائم دیکھتی ہے۔ ابھی تو بارہ بھی نہیں بجے تھے۔ پانی پی کر وہ خالی گلاس لے کر باہر جاتی ہے۔ کچن میں اندھیرا ہوتا ہے۔ وہ ڈسپنسر سے پانی لینے آگے بڑھتی ہے۔ کہ اس کے ہاتھ سے گلاس گر کر ٹوٹ جاتا ہے۔ کسی نے اس کو بری طرح اپنے بازوؤں میں لے کر جھنجوڑا تھا۔ اس نے چیخنا چاہا تو کسی نے اس کے منہ کو پوری قوت سے بھینچ دیا۔

کشف پر حملہ کرنے والا کوئی اور نہیں آزر تھا۔ سونیا آزر سے پوچھتی ہے۔ اس کی چیخ و پکار سن کر رمشا، ردا اور طاہرہ بیگم بھی آ جاتے ہیں۔ آزر ڈھٹائی سے کہتا ہے کہ میں نے صرف اپنے بیٹے کو اس سے بچانے کی خاطر یہ قدم اٹھایا ہے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ حمزہ میر سن لیتا ہے۔ وہ یہ برداشت نہیں کر پاتا۔ طاہرہ بیگم آزر کی حمایت کرتی ہیں۔

حیدر کشف کو سمجھاتا ہے کہ وہ گھر کے اندر آ جائے۔ بلال ثمینہ کو اس کے کمرے میں لے جاتا ہے۔ ماں کو کمرے میں چھوڑ کر بلال کشف کو اندر صالحہ کے کمرے میں لے آتا ہے لیکن کشف وہاں رکنے پر تیار نہیں ہوتی صالحہ اسے کہتی ہیں کہ صبح وہ خود اس کے ساتھ اس کے گھر چلیں گی۔

ثمینہ حیدر سے لڑتی ہے کہ اسے طلاق چاہیے۔ بلال سمجھاتا ہے تو وہ کہتی کہ بلال اپنے باپ کی حمایت کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو زخمی کر لیتی ہے۔

موحد ایما سے ملنے ہاسپٹل آتا ہے جہاں زرین اسے کہتی ہے کہ وہ منصور کو چھوڑ دے گی بس موحد اس کے پاس آ جائے۔ منصور کو یہ سن کر احساس زیاں ہوتا ہے وہ زینب کے پاس جانے کا ارادہ کر لیتا ہے۔ کشف صالحہ بیگم کے ساتھ اپنے گھر آ جاتی ہے۔

موحد کے پاکستان واپس جانے کا سن کر زرین بہت دکھی ہوتی ہے۔ وہ بی اپنے بچے کے ساتھ جو رات جنگل میں گزارتی ہے اس سے اس میں اتنی ہمت آ جاتی ہے کہ وہ اپنے بچے کے لیے تنہا جینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ زینب اس کی کہانی سے بہت متاثر ہوتی ہے۔

آزر ماں اور بیوی کے ساتھ رمشا کو بھی لے کر ایئرپورٹ جاتا ہے گھر میں ردا اکیلی ہے۔ اچانک وہاں وہ ایک جانی پہچانی آواز سنتی ہے۔ زینب سے ملنے کے لیے منصور ہوٹل آتا ہے۔ وہیں اس کی ملاقات موحد سے ہوتی ہے۔ وہ اس غیر

متوقع صورت حال پر حیرانی سے اسے دیکھتا ہے۔

ردا گھر میں اکیلی ہوتی ہے فرحان آکر اسے اکساتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ بھاگ چلے ردا کے انکار پر اسے غصہ آجاتا ہے اور وہ بدتمیزی پر اتر آتا ہے۔ ردا اپنے آپ کو زخمی کر لیتی ہے فرحان بھاگ جاتا ہے۔ حمزہ آکر اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہے۔

منصور زینب سے ملنے آتا ہے تو وہاں موحد بھی پہنچ جاتا ہے موحد حیران ہوتا ہے کہ زینب سے منصور کا کیا تعلق ہے منصور بتاتا ہے کہ وہ اس کی فرسٹ کزن ہے۔

زینب کا شاپنگ پر جانا تھا منصور اسے اس کے والد کا واسطہ دے کر کہا ہے کہ وہ اس کے ساتھ شاپنگ پر چلے۔ اسے سونیا اور اس کی بیٹیوں کے لیے شاپنگ کرنی تھی۔ منصور اس کے لیے ایک ساڑھی گفٹ لیتا ہے۔ زینب کو یاد آتا ہے کہ وہ سونیا کی شادی میں اس کے لیے ساڑھی لایا تھا۔ وہ اس کی دی ہوئی ساڑھی ریسپشن پر چھوڑ جاتی ہے۔ منصور حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔

بلال کشف سے ملنے آتا ہے کشف اس سے رکھائی سے پیش آتی ہے۔ اس کے یہ پوچھنے پر کہ وہ سونیا کے گھر سے رات میں کیوں آئی کشف ناراض ہو جاتی ہے۔

سونیا ردا کی حالت دیکھ کر پریشان ہے کہ اس کے سسرال والے آچکے ہیں اور کسی وقت بھی ہوٹل سے گھر ملنے آسکتے ہیں۔ ردا کہتی ہے کہ وہ چکر آنے پر گر پڑی تھی۔ موحد کے جانے کے بعد زرین منصور سے معافی مانگتی ہے منصور کے نہ ماننے پر بہت روتی ہے۔

سونیا کشف سے معافی مانگتی ہے اور کہتی ہے کہ زینب یا کسی کو پتا نہ چلے۔

زینب پاکستان آ کر حیدر کے گھر آتی ہے وہ یہ جان کر حیرت زدہ ہے کہ کشف سونیا کے گھر نہیں بلکہ اپنے گھر میں ہے۔ حیدر یہ جان کر کہ زینب منصور کے کینیڈا میں رہتی ہے چونک جاتا ہے۔

سونیا اور آفندی نے سلیمان کی دعوت رکھی تھی جس میں ان کی شادی کی تاریخ مقرر ہونا تھی۔ رمشا ردا کو تیار کرتی ہے۔ ردا رمشا سے محبت کے حوالے سے بات کر رہی ہوتی ہے۔ ردا سے میں سلیمان کو کمرا دکھا کر شاکڈ رہ جاتی ہے۔

موحد کو زینب فون پر کرتی ہے۔ کشف کو بہت غصہ آتا ہے۔ وہ زینب پر موحد سے بدتمیزی کرتی ہے۔ میر وجیل میں بیٹھا شدید غم میں ہوتا ہے۔ اسے اپنی بیٹی سے اس حرکت کی توقع نہیں ہوتی۔ وہ جبران پر الزام دیتا ہے۔ اور پھر اسے کہتا ہے کہ وہ کل ہر اس صورت اس سے ملاقات کرے جبران ردا کو ایک ایجان دے جاتا ہے۔

حیدر، زینب کو میر منصور کا کینیڈا کا ایڈریس دینا بھول جاتا ہے۔ رمشا، کشف کے آنے پر بہت خوش ہوتی ہے۔ طاہرہ بیگم ان سے اجازت لیے بغیر کشف کے وہاں آنے کا بہت زیادہ برا مناتی ہیں۔ کشف کو کہتا ہے کہ وہ گھر جانے کی۔ وہ سونیا سے وہاں سے جانے کی ضد کرتی ہے۔

میر منصور کے گھر فون آتا ہے کہ ایمان بلڈنگ سے گر کر انتہائی زخمی حالت میں اسپتال میں ہے۔ زینب نے وہاں بہت پذیرائی ہوتی ہے۔

موحد کو ایمان کے زخمی ہونے کا پتا چلتا ہے۔ وہ پریشان ہوتا ہے۔ منصور اور زرین میں کھٹ پٹ ہو جاتی ہے۔ منصور کو اپنی ماں کی بات یاد آتی ہے کہ انہوں نے زینب کی شادی کردی ہے۔

طاہرہ بیگم سونیا کو سخت سست سناتی ہیں۔ زر کو بھی کشف کا وہاں رہنا پسند نہیں آتا ہے۔

کشف گھبرا کر موحد کے پاس جاتی ہے وہ اپنی پریشانی میں الجھا ہوتا ہے۔ کشف کو ناگوار گزرتا ہے۔ زینب فون پر کشف کو ڈانٹتی ہے کہ وہ بغیر بتائے سونیا کے گھر سے کیوں نکل آئی۔ زینب کے ساتھ آنے ایک شاعر کو دل کا دورہ پڑتا ہے اور سب کے ساتھ زینب بھی انہیں دیکھنے اسپتال جاتی ہے۔ جہاں اس کا سامنا میر منصور سے ہوتا ہے۔ وہ دونوں حیران رہ جاتے ہیں۔

موحد کے کینیڈا جانے کا سن کر کشف موحد سے کہتی ہے کہ وہ بتا کر جاتا تو وہ اپنے باپ کا اتا پتا معلوم کروا لیتی اس سے۔ موحد کہتا ہے کہ تمہاری آنی کا بھی تو کینیڈا میں رابطہ ہے ان کے کزن ہیں وہاں۔ کشف کی حیرانی پر بتاتا ہے کہ زینب کی اجازت کے بغیر اسے نہیں بتانا چاہیے تھا۔ وہ کشف سے اس کے والد کا نام پوچھتا ہے اور منصور احمد کا نام سن کر چکرا جاتا ہے۔

سلیمان کو دیکھ کر رمشا جلدی سے آگے بڑھتی ہے۔ وہ روا کی چوٹ دیکھ کر استفسار کرتا ہے۔ رمشا اور روا یہ جاننے کے لیے بے چین تھیں کہ کہیں سلیمان نے ان کی باتیں تو نہیں سن لیں۔

کشف زینب سے شکایت کرتی ہے کہ وہ اسے اکیلا چھوڑ کر کیوں گئی۔ زینب پریشان ہوتی ہے کشف کی حالت دیکھ کر۔ وہ اس سلسلے میں صالحہ بانو سے بھی بات کرتی ہے۔

روا شاپنگ پر جانے سے انکاری ہے، ماں کے سمجھانے پر سلیمان اس کی والدہ رمشا اور سونیا کے ساتھ وہ چلی جاتی ہے، وہاں وہ لوگ کچھ دیر کے لیے سلیمان اور روا کو بات کرنے کا موقع دیتے ہیں، فرحان اسے سلیمان کے ساتھ دیکھ لیتا ہے۔

منصور زرین سے کہتا ہے کہ اسے دس پندرہ دن کے لیے پاکستان جانا ہے، اس کی بھانجی کی شادی ہے۔

زینب کشف کی وجہ سے پریشان ہے کہ سونیا کے ہاں ایسا کیا ہوا جو وہ وہاں سے آ گئی۔ کشف کہتی ہے کہ وہ ایک شرط پر بتائے گی کہ زینب اسے بتائے کہ زینب منصور سے کینیڈا میں ملی ہے اور یہ بات اسے ڈاکٹر موحد نے بتائی ہے۔

سونیا نکاح والے دن زینب کو بتاتی ہے کہ منصور پاکستان نہیں آ رہا۔

حمزہ روا کے نکاح والے دن کشف سے ملنے جاتا ہے۔ کشف اسے دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے وہ اس سے معافی مانگتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ وہ باہر جا رہا ہے۔ کشف اسے معاف کر دے۔

منصور زرین سے کہتا ہے کہ وہ پاکستان اس لیے جا رہا ہے کہ وہ اپنا گھر بیچ کر اس کا قرض اتارے۔ لیکن زرین اس کی بات پر یقین نہیں کرتی کہ تم وہاں جا کر ہمارے رشتے سے مکر سکتے ہو۔ جس پر منصور اسے بتاتا ہے کہ زرین کے والد نے اس کی خوشامد کر کے اسے زرین سے شادی پر مجبور کیا تھا۔

روا سلیمان کو ہار کر محسوس کرتی ہے کہ یہ اس کی ماں باپ کی فرمانبرداری کا انعام ہے۔

کشف، فائقہ کے ساتھ ورکشاپ اٹینڈ کرنے آتی ہے تو اس کی ملاقات وہاں موحد سے ہوتی ہے۔ موحد اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے کھانے پینے کا انتظام اچھے سے کروا دیتا ہے۔ کشف کو بہت محسوس ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں وہ اس کی وضاحت کر دیتا ہے۔

زینب کشف کی وجہ سے پریشان ہے۔ وہ حیدر کے آفس جاتی ہے۔ وہاں اس سے کشف کے رشتے کی بات کرتی ہے وہ بلال کی بات کرتا ہے۔ وہاں ثمینہ آ جاتی ہے اور ان دونوں کو خوب ذلیل کرتی ہے۔ حیدر ثمینہ کو لے جاتا ہے۔ زینب وہاں سن سی رہ جاتی ہے چوکیدار آ کے اسے جانے کا کہتا ہے۔

کشف، ڈاکٹر موحد سے ملتی ہے اور کہتی ہے کہ اگر آپ مجھے اچھا سمجھتے ہیں تو میری ماں سے میرا ہاتھ مانگیں اور مجھ سے شادی کر لیں۔

فرحان، سلیمان کے ہوٹل پہنچ جاتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ وہ روا کا پرانا فرینڈ اور سابقہ محبوب ہے۔

موحد کشف سے محبت کا اظہار کرتا ہے۔ حمزہ باپ سے ناراض ہے۔ آزر غصے میں حمزہ کو گھر سے نکل جانے کو کہتا ہے۔

فرحان سلیمان سے مل کر اسے اپنے اور روا کے تعلق کے بارے میں بتا دیتا ہے۔ سلیمان روا کی کال ریسیو نہیں کرتا۔

ثمینہ حیدر سے لڑتی ہے۔ اور بہت غلط زبان استعمال کرتی ہے بلال اسے روکتا ہے تو وہ اسے بھی لتاڑتی ہے۔ کشف کے حوالے سے کہتی ہے کہ وہ اسے بھی بہو نہیں بنائے گی کشف یہ سب سن لیتی ہے۔ اور روتی ہوئی گھر چلی جاتی ہے۔ سلیمان روا سے فرحان کے متعلق سوال کرتا ہے۔

ستائیسویں قسط

تیز برستی بارش نے جل تھل مچا رکھا تھا۔

اندھیری رات بارش کے قطروں سے جیسے روشن ہوئی جا رہی تھی۔ بارش کی تنی چادر میں اس سے آگے کیا ہے، کچھ بھی ڈھنگ سے نظر نہیں آ رہا تھا۔

اور جو سیل رواں اس کی آنکھوں سے جاری تھا، وہ بھی رکنے پر آمادہ نہیں تھا۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی مگر جیسے

سارے بند ٹوٹ گئے تھے۔ وہ کوشش کے باوجود بہتے آنسوؤں کو روک نہ سکی۔
کسی نے سختی سے اس کا بازو دبوچا تھا۔
''یہ کیا حماقت ہے؟'' وہ اس کی گردن کے پاس غرایا۔
وہ جانتی تھی اس کے پیچھے کون ہے مگر اس نے ذرا سی بھی گردن نہیں موڑی۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کو ذرا دل نہیں چاہ رہا تھا۔
وہ تو آج خود کو بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔
آخر وہ چاہتی کیا ہے؟ وہ خود سے سوال کر رہی تھی جس کا جواب اس طوفانی گرجتی برستی بارش کی طرح کہیں نہیں تھا۔
''چلو، روم میں۔ بیمار ہونا ہے تم نے یہاں کھڑے ہو کر۔'' اس کی انگلیاں کشف کے بازو میں بھی جا رہی تھیں۔
وہ ڈھیٹ بنی اسی طرح بے حس کھڑی تھی۔
وہ اسے اپنا چہرہ دکھا کر اپنی کمزوری کا اظہار نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ اسے خود پر غصہ آ رہا تھا۔
سارا دن جس طرح اپنا بھرم قائم رکھا، اب یوں رو دھو کر دھوم مچانے کی کیا ضرورت تھی۔
''کشف! میں تم سے کیا کہہ رہا ہوں۔ تم سن نہیں رہیں؟'' وہ اب کے پورا اس کی طرف گھوم گیا تھا۔
''مجھے واپس جانا ہے گھر۔'' بظاہر وہ خود کو کمپوز کرتے ہوئے سختی سے بولی۔ موحد کو لگا شاید اس کا میٹر گھوم گیا ہے۔
''مذاق ہے تمہارے لیے یہ یا بچوں کا کھیل ہے، گھر چھوڑ کر آ جانا اور گھر واپس چلے جانا۔''
لمحہ بھر کو اس کا جی چاہا اپنے پہلو میں کھڑی اس لڑکی کا گلا ہی دبا دے۔
''مجھے نہیں پتا کچھ بھی۔ مجھے گھر واپس جانا ہے۔ آنی کے پاس ... وہ بہت دکھی ہوں گی اور پریشان بھی۔ مجھے گھر لے کر جائیں۔'' وہ اپنے آنسوؤں کو ڈانٹ ڈپٹ کر اندر اتار چکی تھی۔ سنبھلے ہوئے لہجے میں اس کی طرف چہرہ گھما کر ضدی لہجے میں بولی۔
''کیا یہ اتنا آسان ہے کشف؟'' وہ ضبط کی آخری سیڑھی پر قدم جما کر بولا۔
''مشکل بھی نہیں ہے۔ ابھی رات نہیں گزری میں ان کو.....''
''اوہ شٹ اپ۔ رات نہیں گزری...... پورا دن سفر کیا ہے ہم نے تو واپس کیا چند منٹوں میں چلے جائیں گے۔ تمہیں یہ قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیے تھا۔ اب اٹھا لیا ہے تو واپسی کو بھول جاؤ۔''
اس کے لہجے میں عجیب سرد مہری تھی۔ اس سرد رات سے بھی زیادہ...... کشف کو ہو جانے والی غلطی کا شدید احساس ہوا۔
''ہم ابھی واپس جائیں تو صبح تک......''
وہ بچوں کی طرح اسے سمجھانے لگی جس پر اس کا چہرہ متغیر ہوا تھا۔
''اس موسم میں......'' اس نے برستی بارش کی طرف اشارہ کیا۔
''ابھی رک جائے گی بارش تو۔'' وہ تسلی دینے والے انداز میں بولی۔
''پلیز موحد! میں آپ کی منت کرتی ہوں۔ مجھے واپس لے جائیں۔ آنی بہت بہت زیادہ پریشان ہوں گی پلیز۔ آئی ریکویسٹ یو۔'' وہ منتوں پر اتر آئی۔
''یہ ممکن نہیں ہے۔ وہ یقیناً بہت دکھی اور رنجیدہ ہوئی ہوں گی لیکن اب وہ خود کو سمجھا چکی ہوں گی تم ان کو فون

کر کے سب کچھ بتا دینا کل صبح۔" اس کا انداز بھی تسلی دینے والا تھا۔
"کل صبح" اس نے آنکھیں پھاڑیں۔
"کشف! تم نے یہ فیصلہ اپنی خوشی اور مرضی سے کیا تھا میرے ساتھ آنے والا اب بچوں کی طرح گھر واپس جانے کا واویلا مچانا ٹھیک نہیں تمہیں ٹھنڈ لگ جائے گی چلو روم میں۔" اس کی انگلیاں ابھی بھی کشف کے بازو میں گڑی تھیں۔
"نہیں۔" وہ اڑیل پن سے بولی۔
"چلو میں کہہ رہا ہوں تم سے ورنہ" وہ غرایا۔
"ورنہ کیا کر لیں گے میرے ساتھ؟" وہ بھی بے خوف تھی۔ "میں تمہیں اسی طرح گھسیٹتا ہوا زبردستی کرے میں لے جاؤں گا۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا تھا۔
اور کشف کو لگا وہ ایسا کر بھی گزرے گا۔
"میں ایک شرط پر واپس جاؤں گی۔" وہ بے دلی سے راضی تو ہو گئی تھی مگر آخری حربے کے طور پر کچھ منوانا چاہتی تھی۔
وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔
"مجھے کل واپس لے جائیں گے۔ آپ خود نہیں لے جا سکتے تو واپس بھجوا دیں، میں خود سے چلی جاؤں گی۔" وہ کچھ پر اعتمادی پہلی والی کشف بنتی جا رہی تھی۔
"دیکھیں گے یہ پاسبل ہو سکتا ہے یا نہیں۔ ابھی تم چلو۔" وہ سرسری انداز میں ہنس کر اس کا بازو اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا۔
"میرا بازو چھوڑیں، اف!" وہ تکلیف سے کراہی۔
موحد نے گرفت ڈھیلی کی لیکن بازو نہیں چھوڑا۔
"روم میں چلو، یہاں بہت سردی ہے ٹھنڈ لگ گئی تو واپس کیسے جاؤ گی۔" وہ قدرے نرم پڑ کر اسے دلاسا دینے والے انداز میں بولا۔
"آپ مجھے واپس لے جائیں گے ناں! ابھی آنی نے کسی سے بات نہیں کی ہو گی میں جا کر ان سے معافی مانگ لوں گی۔ ان کی منت کر لوں گی وہ مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں میری اس غلطی کو معاف کر دیں گی۔" وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بچوں کی طرح خود کو تسلی دے رہی تھی۔

☆☆☆

سونیا سامنے کھڑے آزر کو دیکھ کر جیسے سکتے میں آ گئی۔
کچھ ایسی حالت آزر کی بھی تھی۔
زینب نے یونہی گردن موڑ کر دیکھا آزر کے تاثرات بتا رہے تھے کہ سب کچھ سن چکا ہے۔
"تو یہ ایمرجنسی تھی جس کے لیے سونیا کو بلایا جا رہا تھا۔" وہ نفرت بھرے کسیلے لہجے میں بولا۔
اور زینب اپنی اس جلد بازی پر پچھتا رہی تھی جب سونیا کے دیر سے نہ پہنچنے کی وجہ سے کہ وہ کال بھی ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ زینب نے آزر کو کال کر کے کہہ دیا کہ اس نے کسی ایمرجنسی کی وجہ سے سونیا کو بلایا ہے اور وہ ابھی تک آئی نہیں تھی۔
اسے کیا پتا تھا آزر کی شکی طبیعت اسے اسلام آباد جانے کے بجائے یہاں لے آئے گی۔
"آزر آپ یہاں...... آپ تو اسلام آباد" شاید آزر نے کچھ نہ سنا ہو ایک معصوم سی آس پر سونیا نے سوکھے

حلق کو تھوک نگل کر تر کرتے ہوئے سہمے لہجے میں پوچھا۔
''تو تمہاری جائز بیٹی ہے وہ لڑکی کشف!'' وہ جیسے انگارے چباتا ہوا کہہ رہا تھا۔
منصور کو بھی موقع کی نزاکت کا احساس ہو گیا مگر اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ آزر کو سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔
''آزر...... وہ......'' سونیا کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ اس نے مدد طلب نظروں سے قدم بھر کے فاصلے پر کھڑی زینب کو دیکھا۔
جو اسے بے بسی سے فقط دیکھ سکی تھی۔
''بتاؤ مجھے کیا حقیقت ہے تمہاری؟'' وہ غرایا تھا حلق کے بل، سونیا کی حالت جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں ہو رہی تھی۔
''آزر بھائی! آپ غلط سمجھے ہیں۔'' زینب نے کمزور لہجے میں کہنا چاہا۔
''خاموش خاتون! یہ آپ کا معاملہ نہیں ہے کہ آپ کی اصلیت تو سب کے سامنے عیاں ہو چکی۔ بیٹی کی ماں کا جو ڈھونگ تم نے رچا رکھا تھا۔ دنیا کو بے وقوف بنانے کے لیے۔ منصور کی بیوی کا بہروپ اپنا رکھا تھا تم نے۔ تمہاری تو اب کوئی بھی بات قابل اعتبار نہیں کہ تم خود کسی کے بھروسے کے لائق نہیں ہو۔'' آزر کے لہجے میں زمانے بھر کی نفرت تھی۔
''آزر! بہتر ہے بیٹھ کر بات کر لی جائے۔'' منصور نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔
''بیٹھ کر بات کرنے کا انتظار وہ کرے جس کو امید ہو کہ کچھ باقی ہے ابھی۔'' اس کے لہجے میں کیا نہیں تھا۔
''آزر!'' سونیا کھڑے قدموں سے گرنے والی تھی۔
''بتاؤ تم مجھے تمہاری وہ جائز بیٹی کیسے ہوئی؟ کس طرح؟ تم نے مجھے ساری زندگی دھوکا دیا۔ میری بیوی بن کر میری آنکھوں میں دھول جھونکتی رہیں۔''
اب تو کچھ کہنا بھی فضول تھا اور سمجھانا بھی۔
آزر کے دل میں دراڑ آ چکی تھی جو اب کسی بھی طرح بھری نہیں جا سکتی تھی۔ زینب نے گرتی سونیا کو سہارا دے کر کرسی پر بٹھایا۔
وہ دونوں ہاتھوں میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔
آزر ایک نفرت بھری نظر اس پر ڈال کر الٹے پیروں سے واپس چلا گیا۔
☆☆☆
صبح سے پہلے کشف تیز بخار میں جل رہی تھی۔
موحد نے اس کی جلتی پیشانی کو چھوا۔ اس نے بے اختیار آنکھیں کھول دیں۔
''آنی...... آنی کو بلائیں۔'' وہ مدھم کانپتی آواز میں بولی۔
''ابھی تمہاری حالت ایسی نہیں کہ تمہیں میں اتنا لمبا سفر کرا کے واپس لے جا سکوں۔'' موحد نے نرمی سے اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹی رکھتے ہوئے کہا۔
وہ رات بھر سو نہیں سکا تھا۔
کمرے میں لا کر کشف کو بستر پر لٹا کر وہ خود صوفے پر کمبل میں نیم دراز پڑا رہا۔
یوں ہی اس کی آنکھ لگی تو اس نے کشف کو نیند میں بڑبڑاتے سنا۔
اسے شک سا ہوا۔ اس نے آہستہ سے اس کی پیشانی کو چھوا، اسے تیز بخار ہو چکا تھا۔

بخار میں بھی وہ زینب کو پکار رہی تھی۔
موحد اس کی حالت دیکھ فکر مند ہو گیا تھا۔
وہ اسے اس حالت میں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا۔
وہ جتنا اسے سمجھ سکا تھا، اسے معلوم ہو چکا تھا کہ کشف ایک انتہائی جذباتی لڑکی ہے، جو صرف جذبات میں آ کر لمحوں میں بڑے بڑے فیصلے کر لیتی ہے اور پھر ان پر پچھتانے میں بھی دیر نہیں لگاتی۔
یہ پچھتاوا اس کے دل کا روگ نہ بن جائے، مجھے اسے واپس لے کر جانا چاہیے۔
''پلیز! مجھے آنی کے پاس لے جائیں۔'' وہ اپنی سوچوں میں گم تھا، جب اس نے موحد کا ہاتھ پکڑ کر التجا کی۔
''ٹھیک ہے، میں لے جاؤں گا۔ پلیز...... تم پہلے ٹھیک تو ہو جاؤ۔'' موحد کا دل پسیج گیا۔
''میں ٹھیک ہوں، میرا یقین کریں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ فوراً اٹھنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔
''ابھی نہیں اٹھنا۔ لیٹی رہو۔ کچھ کھا کر میڈیسن لو، پھر ہی سفر کے قابل ہو سکو گی۔ رکو...... میں کچھ کھانے کو منگواتا ہوں۔''
اس نے نرمی سے اسے لٹا دیا تھا۔
''آپ سچ بول رہے ہیں ناں، مجھے آنی کے پاس لے جائیں گے۔'' وہ بے یقین سی ہو رہی تھی۔
''کیا مجھ پر بھروسا نہیں اور خدانخواستہ میں آپ کو اغوا کر کے تو نہیں لے جا رہا۔ میں آپ کی خوشی سے آپ کو لے جانا چاہتا ہوں کشف!'' اس نے رک کر اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔
''میں واپس آ جاؤں گی آپ کے ساتھ، لیکن مجھے ایک بار آنی سے ملنا ہے۔ جا کر ان سے بات کرنی ہے، پھر میں واپس آ جاؤں گی پر اس۔'' وہ بچوں کی طرح اس سے وعدہ کر رہی تھی۔
موحد کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری تھی، جسے کشف غنودگی میں دیکھ نہیں سکی تھی کہ مسکراتے ہوئے وہ اس کے جاگے ہوئے حسن کو کن گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

طاہرہ بیگم کو حمزہ اور رمشا ہاسپٹل لے گئے تھے۔
آزر گھر پہنچا تو ملازم نے بتایا۔
آزر نے اپنا فون چارج کر کے حمزہ سے ہاسپٹل کے بارے میں پوچھا۔
''اگر اماں جان کو سونیا کی حقیقت پتا چلی تو کیا ہوگا؟ حمزہ اور رمشا پر کیا گزرے گی اور خود مجھ پر۔ سونیا! میں مر کر دوبارہ زندہ ہو جاتا تو بھی تم پر ایسا گمان نہیں کر سکتا تھا یہ تم نے کیا کیا؟''
دکھ، صدمے، غصے، نفرت اور بے یقینی کی وجہ سے اس کے دل کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔
''دادو کی طبیعت اب بہتر ہے۔ رات ان کی حالت بہت خراب تھی پاپا!'' رمشا اسے بتا رہی تھی۔
''ڈاکٹرز کیا کہہ رہے ہیں؟''
اگر ایک گھنٹہ بھی اور لیٹ ہو جاتے تو بالکل اچھا نہیں ہوتا۔'' رمشا رات بھر کی جاگی بکھرے حلیے میں تھی۔
''آپ کو کس نے بتایا، آپ راستے سے واپس آ گئے۔''
وہ اس کے یوں اچانک آ جانے پر حیران تھی۔
''ہوں!'' لفظ جیسے اس کے اندر مر سے گئے تھے۔
''آپ کا فون بھی بند جا رہا تھا۔ میں نے اور حمزہ نے آپ کو اتنی بار کال کی...... آپ کو ماما نے بتایا مگر وہ تو

زینب آنی کی طرف تھیں۔"
"حمزہ کہاں ہے؟" اس وقت وہ سونیا کا ذکر بھی نہیں سننا چاہتا تھا۔
"کچھ میڈیسن لکھ کر دی تھیں ڈاکٹر نے، وہی لینے گیا ہے۔"
رمشا باپ کے گرم سے انداز کو دیکھ رہی تھی۔ مگر سوال کرنے کی اس میں جیسے جرأت نہیں تھی۔
"مما آپ کے ساتھ کیوں نہیں آئیں؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھ لیا۔
"نہیں وہ اب کچھ عرصے تک اپنی کزن زینب کے گھر میں رہے گی اور تم لوگ اس بات کا ذکر اماں جان کے سامنے نہیں کرو گے۔ وہ خوامخواہ پریشان ہو جائیں گی۔"
آزر نے رک کر رمشا کو سمجھانے والے انداز میں کہا۔
"کیوں پاپا؟" رمشا کی زبان سے پھسلا۔
"سوال نہیں رمشا! جو میں نے کہا ہے صرف وہ سنو اور یاد رکھو، تم دونوں اب دوبارہ مجھ سے اپنی ماں کے بارے میں نہیں پوچھو گے۔" حمزہ آچکا تھا اور آزر کے پیچھے کھڑا اس کا حکم سن چکا تھا۔
رمشا کے چہرے پر اب واضح پریشانی تھی۔
وہ باپ سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر آزر کے کرخت رویے نے اس کے جیسے لب سی دیے۔
"میں اماں جان کو دیکھ کر آتا ہوں۔ حمزہ! تم کچھ دیر میں رمشا کو لے کر چاہو تو گھر چلے جاؤ اور کچھ ریسٹ کر لو گھر جا کر۔" وہ حمزہ کی موجودگی سے باخبر تھا۔
"نہیں پاپا! میں ٹھیک ہوں۔" رمشا آہستہ سے بولی۔
"میں بھی گھر نہیں جانا چاہتا ابھی۔" حمزہ نے بھی جتا کر کہا۔ آزر نے جواب میں یونہی سر ہلا دیا۔
وہ ماں کو دیکھنے اندر کمرے میں چلا گیا۔
"کیا ہوا ہے رمشا! یہ پاپا کیا کہہ رہے تھے؟" اس کے جاتے ہی وہ بے چینی سے بولا۔
"پتا نہیں حمزہ! میں نے پوچھنے کی کوشش کی۔ تمہارے سامنے انہوں نے کس طرح منع کیا ہے۔" وہ پریشان تھی۔
"اور ماما کہاں ہیں؟" وہ ہنوز الجھا ہوا تھا۔
"شاید زینب آنی کی طرف اور کہہ رہے ہیں کہ اب وہ فی الحال وہیں رہیں گی۔ ان کے گھر۔" رمشا بتاتے ہوئے رونے کو تھی۔ وہ پریشان سا اسے دیکھنے گیا۔
"کیا دونوں میں جھگڑا ہوا ہے؟"
"پتا نہیں۔" وہ آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی۔
"اور پاپا تو اسلام آباد جا رہے تھے واپس کیسے آگئے، جبکہ ان کا فون بھی بند تھا۔"
"پتا نہیں حمزہ! مجھے کچھ بھی نہیں پتا اور ماما تو اپنا فون بھی گھر میں بھول گئیں۔ کال کر کے انہی سے کچھ پوچھ لیں۔" رمشا حقیقتاً بہت پریشان ہو چکی تھی۔
"دادو ٹھیک ہو جائیں تو میں وہاں چکر لگا کر آتا ہوں۔"
حمزہ نے سوچتے ہوئے جیسے اسے تسلی دینے کو کہا۔
"میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔" وہ بے قراری سے بولی۔
"اُفوہ، ابھی میں اکیلا جاؤں گا۔ تمہیں بعد میں لے جاؤں گا اور تم پاپا سے اس کا ذکر نہیں کرنا۔" وہ تاکیدی انداز میں بولا۔

”میں پاگل تھوڑی ہوں۔“ وہ خفا ہو گئی۔
دونوں اپنی جگہ کھڑے کچھ سوچتے رہے۔

☆☆☆

گھر میں اچانک مہمان آ گئے تھے۔
سونیا، زرین، منصور..... زینب نے جلدی جلدی تینوں کے لیے بستر تیار کیے۔ یہ الگ بات کہ کوئی بھی سونے کے لیے تیار نہیں تھا۔
زرین کو دوا لینی تھی اور سونا بھی ضروری تھا۔
منصور نے اصرار کر کے اسے دوا دے کر سلا دیا تھا۔
وہ اب کمرے سے نکل کر نیم تاریک برآمدے کے آخری سرے کے پاس بنے بڑے سے کمرے کی طرف گیا۔
یہ کمرہ بھی منصور کی ماں ہاجرہ بیگم کا ہوتا تھا۔ ایک دبنگ عورت جو مشکل سے مشکل حالات میں بھی اپنا دبدبہ قائم رکھتی ہے۔
وہ طاہرہ بیگم کی بہن تھیں۔ دماغ اور مزاج بھی بہن کی طرح اکھڑ اور غصیلا پایا تھا۔ ماں اور بچوں میں کبھی بے حد قربت پیدا نہیں ہو سکی۔ ایک فاصلہ سا بہر حال وہ اپنے اور اولاد کے درمیان رکھتی ضرور تھیں۔ کارنس پر پڑی ہاجرہ بیگم کی تصویر دیکھتے ہوئے منصور سوچنے لگا۔
سونیا اور منصور کی عمروں کا زیادہ فرق نہیں تھا۔
منصور سونیا سے بمشکل سوا سال بڑا تھا۔
زینب ان کی چچا زاد ماں باپ کی وفات کے بعد اس گھر میں ان کے ساتھ رہ رہی تھی۔
منصور کی سب سے قیمتی دوست اور سب سے پیارا رشتہ زینب سے ہی تھا اس کا۔
یہ الگ بات کہ سونیا اور زینب میں بھی بہنوں سے زیادہ پیار تھا۔ شاید زینب کی اصل جو نیک فطرت مزاج ہی ایسا تھا کہ وہ ہر ایک کو عزیز ہو جاتی تھی۔
یہ پیارا سا رشتہ دوستی سے کب محبت میں ڈھلا اس کا پتا منصور کو بہت جلد چل گیا تھا۔ زینب اسی طرح سادگی اور معصومیت سے اس کے آگے پیچھے پھرتی اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھی۔
ضرورت تو اب گھر کی بیری بن گئی تھی۔ جمع جتھا سالوں پہلے ختم ہو چکا تھا۔ کچھ زیور اور کچھ گھر کے کاغذ بینک میں رکھوا کر چند سالوں کی ضرورتوں کو آگے دھکا دیا تھا۔
مگر ابھی منصور کی تعلیم ادھوری تھی۔ سونیا نے محض انٹر ہی کیا تھا کہ اسے اپنی دوست کے والد کے توسط سے ایک اچھی فرم میں ٹائپسٹ کی جاب مل گئی۔
ہاجرہ بیگم نوکری نہیں کروانا چاہتی تھیں مگر اس کے سوا کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا۔ منصور کی تعلیم مکمل ہونے میں ڈھائی سال تھے۔
اتنا وقت تو نکالنا ہی تھا کسی طرح...
اسی طرح سونیا کی تھوڑی سی تنخواہ سے گھر کی کچھ بنیادی ضرورتیں پوری ہونے لگیں۔
زینب شام کو کچھ بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر اپنی پڑھائی کا خرچ نکالنے کی کوشش کرتی۔
اگرچہ اس محلے میں اس وقت ٹیوشن پڑھانے کا رواج نہ ہونے کے برابر تھا اور ٹیوشن بھی بہت معمولی پیسوں کے عوض!

سونیا نے پارٹ ٹائم بھی جاب کرلی تھی۔
یوں وہ صبح نو بجے گھر سے نکلتی اور رات کو آٹھ نو بجے سے پہلے گھر نہ لوٹتی۔
ہاجرہ بیگم کی یہ بھی خواہش تھی کہ سونیا کی نوکری کی بھنک ان کی سعودیہ میں جیٹھی بہن طاہرہ کو نہ مل جائے جس کے بیٹے آزر سے سونیا کی بات بچپن سے ٹھہر چکی تھی۔
طاہرہ بیگم بڑی نخرے والی اور طعنہ باز تھیں۔ ہاجرہ بہرحال ان سے دبتی تھیں۔
اس دوران منصور نے بھی بہتیری کوشش کی کسی طرح اسے بھی کوئی چھوٹی موٹی جاب مل جائے مگر کہیں سے سلسلہ نہ بن سکا۔

اس کے ایک دو دوست تعلیم ادھوری چھوڑ کر ملک سے باہر گئے اور دنوں میں ان کے دن پھر گئے تو منصور کے دل کو بھی ملک سے باہر جانے کی لگن لگ گئی۔
اس کے لیے اس نے دن رات ہاجرہ کے کان کھائے کہ وہ کسی طرح طاہرہ بیگم سے کہہ سن کر اس کی نوکری اور ویزے کا کوئی بندوبست کروادیں۔
ہاجرہ نے بیٹے کی ضد اور گھر کے حالات سے مجبور ہو کر طاہرہ کو ایک بار نہیں کئی بار کہا مگر شاید اللہ کی مرضی تھی نہیں کہ منصور یہاں آئے وہ ہر بار کوئی نہ کوئی بہانا بنا کر صاف ٹال جاتیں۔
اور منصور نے بھی ضد پکڑ لی کہ اب وہ کمائے گا تو ملک سے باہر جا کر ہی کمائے گا۔ اس دوران اسے دو تین چھوٹی موٹی نوکریاں بھی ملیں مگر اس نے نخوت سے ٹھکرادیں۔
"پلیز منصور! تم ابھی فی الحال پارٹ ٹائم کے طور پر تو کوئی جاب کرلو۔ تمہارے ایگزام اور ڈگری کے بعد تمہیں اس سے بھی بہت اچھی جاب مل جائے گی۔ گھر کے حالات کتنے خراب ہیں، تمہارے سامنے ہے سب کچھ۔" زینب اکیلے میں جیسے ہی منصور ملتا اس کی منتیں کرنے لگتی۔
"میں نے یہ چند سو کی نوکری کے خواب بھی نہیں دیکھے جن سے میں اپنا اور تمہارا کوئی ایک خواب بھی پورا نہیں کرسکوں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگالیتا۔
وہ اپنا ہاتھ کھینچ کر کچھ سٹ جاتی۔
"اس سے... تو یہ پھر بھی بہتر ہے۔" وہ پھر اصرار کرتی۔
"ہرگز نہیں، میں اتنی گھٹیا جاب نہیں کرسکتا۔ مجھے اب ملک سے باہر جا کر ہی کمانا ہے، زینی! میں سوچ چکا ہوں۔"
اس کی آنکھوں میں باہر جانے کے خواب پوری طرح سے سج چکے تھے۔
اب تو زینب کے بس میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس کو سمجھا سکتی۔
"تم کوشش کرو سونیا! اپنے باس سے کہو، تمہیں کچھ رقم ایڈوانس دے دے۔ منصور کا ویزا لگ جائے اس کا باہر جانے کا کوئی سلسلہ ہوجائے تو سارا قرض اتر جائے گا۔"
صبح جب آفس کے لیے تیار ہوتی سونیا سے ہاجرہ کو یہ کہتے سنا تو ناشتہ بناتی زینب سمجھ گئی کہ منصور کے دل میں باہر جانے کا خیال کس نے اتنی شدت سے بٹھایا ہے۔
اب تو ہاجرہ تائی اٹھتے بیٹھتے منصور کے باہر جانے اور اس کے لمبی چوڑی رقمیں بھیجنے کے خواب دیکھنے لگی تھیں۔
سونیا مجھا اور ایکسٹرا کام کرنے لگی۔
وہ آفس سے مزید لیٹ ہونے لگی اب تو وہ کبھی کبھی گیارہ بارہ بجے بھی آنے لگی تھی۔

تھکن اور پژمردگی اس کے چہرے سے صاف پڑھی جا سکتی تھی پھر سونیا نے منصور کے ویزے کے لیے ایڈوانس رقم کا بندوبست کرلیا بہت سالوں بعد اس گھر کے درودیوار نے اس گھر کے مکینوں کو یوں ہنستے خوشی مناتے دیکھا تھا۔

☆☆☆

صالحہ خالہ نے آج کئی مہینوں کے بعد ادھر چکر لگایا تھا۔
زینب نے خوشی خوشی چائے کے ساتھ پکوڑے تلے، ساتھ میں بسکٹ تھے۔
وہ ٹرے سجا کر اندر کمرے میں لے کر جارہی تھی۔
جہاں ہاجرہ بیگم صالحہ سے باتوں میں مشغول تھیں۔
''زینب میری مرحومہ بہن کی نشانی ہے اور مجھے بڑی جان سے پیاری ہے۔ حیدر کی نوکری جیسے ہی لگی، میں سب سے پہلے مٹھائی لے کر آ دھر آئی ہوں۔'' وہ کہہ رہی تھیں۔
''مبارک ہو پھر تو، کہاں لگی نوکری حیدر کی؟'' ہاجرہ خالہ نے مٹھائی کا ڈبہ اپنی طرف کرتے ہوئے پوچھا جو صالحہ نے آتے ہی کھول کر سامنے رکھ دیا تھا۔
''اخبار کے دفتر میں۔'' وہ فخریہ بولیں۔
''تو یہ، میں بھی جانیں کہیں افسر وفسر لگ گیا ہے۔ پھر تو چپڑاسی وغیرہ ہی لگا ہوگا۔'' ٹرے لا کر رکھتی زینب کو بھی صالحہ کی طرف ہاجرہ کی بات سیدھی دل پر جا کر لگی۔
''اللہ نہ کرے میرا بچہ چپڑاسی لگے۔ صحافی ہے۔ پورے پانچ ہزار تنخواہ لگی ہے اور دوسرے الاؤنس بھی ملیں گے۔'' صالحہ ۔ ہاجرہ کو سخت جواب دینے کے بجائے خندہ پیشانی سے بولیں۔
''چلو جو بھی ہے۔'' ہاجرہ کا انداز مسخرانہ تھا۔
زینب کا دل بہت برا ہوا۔
''زینب بیٹی! تم بھی منہ میٹھا کرو۔'' صالحہ محبت سے اسے پاس بٹھا کر کھلانے لگیں۔
کیا ہوا، ماں نہیں تھی تو ماں جیسا رشتہ تو موجود تھا اور اسے صالحہ خالہ سے وہی لگاؤ اور محبت تھی۔
''میرا منصور تو چند دنوں میں امریکہ جانے والا ہے۔ بس ویزہ لگنا رہ گیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو وہ بھی ہو جائے گا۔'' ہاجرہ کیوں پیچھے رہتیں، فوراً سے بولیں۔
''اللہ اس بچے کے لیے بھی اپنے رزق کے دروازے کھولے۔ ماں بہن کا سہارا بنے، آسانیاں ملیں اسے۔'' صالحہ خالہ عادتاً دعا دینے لگیں۔
''زینب بچے! میرے لیے پانی کا گلاس تو لاؤ۔ چائے سے پہلے نہ پیوں تو بی پی بڑھنے لگتا ہے۔'' صالحہ کے کہنے پر وہ پانی لینے باہر آ گئی۔
''اپنے حیدر کے لیے زینب کا رشتہ لینے آئی ہوں۔ میری بہن سلمیٰ زندہ رہتی تو یہ بات ہم دونوں میں پہلے سے طے تھی۔ مجھے یوں جھولی پھیلانے کی ضرورت نہ پڑتی۔'' وہ جھٹ پٹ پانی کا گلاس لائی تھی اور دروازے میں ہی ٹھہر گئی تھی۔
صالحہ کی بات پر اس کا پانی کے گلاس والا ہاتھ کپکپایا تھا۔
''اللہ معاف کرے، پہلے لوگ مردوں پر جھوٹ باندھا کرتے تھے۔ تم نے وہ مثال سچ ثابت کر دی صالحہ بہن!'' ہاجرہ کی پاٹ دار آواز سارے کمرے میں گونجی تھی۔
''اللہ مجھے معاف کرے۔ کون سا جھوٹ باندھا میں نے مرے ہوؤں پر۔'' صالحہ کو حقیقتاً بری لگی تھی یہ

بات۔
"سلمیٰ میری دیورانی کم بہن زیادہ تھی۔ کبھی ہم دونوں میں دیورانی جیٹھانی والا حساب نہیں رہا۔"
"میں جانتی ہوں۔" صالحہ بولیں۔
"جانتی ہوتیں تو ایسی بات نہ کرتیں اور یہ میرا سلمیٰ اور اپنے دیور کے لیے وہی پیار محبت تھا جو میں نے ان کے جگر کے ٹکڑے زینب کو کسی کو نہ دیا۔ برے حالات کے باوجود اس بچی کو سینے سے لگایا اور معاف کرنا صالحہ! تم خالہ تھیں۔ حق تمہارا بھی تھا اس یتیم کو پالنے کا۔ ایسا تو تمہیں خیال نہ آیا پرورش کے وقت زینب کا۔" وہ جذبات میں تیز تیز بولتی گئیں۔
"مجھے کیوں خیال نہیں آیا، جتنی بار میں نے زینب کو لے جانا چاہا، آپ نے کہہ دیا کہ وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں بیٹھی ہے۔ دو روٹیاں اس کی مجھ پر بھاری نہیں، جہاں میرے بچے کھاتے ہیں وہاں وہ بھی کھا لیتی ہے۔" صالحہ صاف گوئی سے بولیں۔
"تو کیا کہتی۔ جاؤ میں اس یتیم کو دو وقت کا کھانا نہیں کھلا سکتی...... لے جاؤ ساتھ۔" وہ جواباً اسی لٹھ مار انداز میں بولیں۔
"خیر یہاں ان باتوں پر بحث سے کیا حاصل۔ اب تو میں زینب کو کھلے دل کے ساتھ اپنی بیٹی بنانے کے لیے آئی ہوں۔ اب مجھے خالی جھولی نہ لوٹایئے گا۔ بہت تڑپی ہوں میں اپنی زینب کے لیے، اسے میرے حیدر کی دلہن بنا دیں۔"
"واہ، یہ خوب کہی۔ اب پلی بڑھی گئی تو آپ کے حوالے کر دوں، یہ نہیں ہو سکتا۔" ہاجرہ دو ٹوک قطعی لہجے میں بولیں۔
"کیوں نہیں ہو سکتا، میری بہن کی اور میری خواہش تھی۔ یہ طے تھا ہم دونوں میں۔" صالحہ خالہ تیزی سے بولیں۔
"ایسا کچھ طے ہوتا تو سلمیٰ ضرور مجھ سے ذکر کرتی لیکن ہم دونوں کے درمیان اس معاملے پر کبھی کوئی بات نہیں ہوئی۔"
صالحہ نے پریشان نظروں سے اسے دیکھا۔
"ہاں، میری اور سلمیٰ کی ضرور بات طے ہوئی تھی زینب اور منصور کو لے کر۔" انہوں نے اعلان کرنے والے انداز میں کہہ ڈالا۔ صالحہ سے کچھ لمحوں کے لیے بولا ہی نہیں گیا۔
"یہ آپ زیادتی کر رہی ہیں ہاجرہ بہن!" وہ آخر میں روہانسی ہو کر رہ گئیں۔
"زیادتی ہو تو قیامت کے روز میرا گریبان ہو اور سلمیٰ کے ہاتھ ہوں۔" وہ اتنی بڑی بات بول گئیں کہ صالحہ کو لگا اب کچھ بھی کہنا بیکار ہو گیا۔
وہ چند لمحے سر جھکا کر لاچار سی بیٹھی رہیں۔
"ہاجرہ بہن! پھر بھی میری جھولی پھیلی ہے، میری زینب مجھے دے دیں۔ مجھے ہر چیز سے بڑھ کر عزیز ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے منصور کو اعتراض ہو، کیا آپ نے اپنے بیٹے سے پوچھ لیا ہے۔"
آخر میں انہیں اعتراض سوجھا۔
"اچھا تو کیا تم اپنے بیٹے سے پوچھ کر چلی ہو؟" وہ ہاتھ نچا کر بولیں۔
"ہاں، اس سے پوچھ کر اپنے دل کی تسلی کر کے تو یہاں تک آئی ہوں۔" وہ اطمینان سے بولیں تو زینب سے وہاں مزید کھڑے رہنا محال ہو گیا۔

تو گویا وہ جو اتنے مہینوں سے حیدر بھائی کی آنکھوں کے بدلے بدلے انداز دیکھ رہی تھی، ان کا یہ مطلب تھا۔

اب خالہ مایوس و نامراد لوٹیں گی۔

ان کو نامراد لوٹانا تو میرے بس میں بھی نہیں تھا، منصور کے علاوہ تو میں کسی اور کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔

اور اگر تائی خالہ کے سامنے مجھے بلا کر پوچھ لیتیں تو میں کیسے خالہ کے سامنے انکار کرتی۔

وہ کمرے میں آ کر بھیگی آنکھیں صاف کرنے لگی، جب ہاجرہ اسے باہر سے پکارنے لگیں۔

وہ بھاگی ہوئی آئی۔

''تمہارے دل میں کوئی شک نہ رہ جائے یا تم یہ سمجھو کہ تائی نے جھوٹا ــــ بہانا گھڑ لیا ہے۔ لڑکی کو قبضے میں کرنے کا۔ تم خود پوچھو بچی سامنے کھڑی ہے۔ اس سے پوچھ لو یہ منصور کو پسند کرتی ہے یا نہیں۔''

اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ تائی اسے یوں بلا کر خالہ کے سامنے پوچھیں گی۔

''زینب! اپنی خالہ کی تسلی کرو، بتاؤ انہیں۔'' وہ اس کی خاموشی اور جھکے سر کو دیکھ کر پھر سے بولیں۔

زینب نے گیلی آنکھوں سے صالحہ کو دیکھا۔

وہ امید بھری نظروں سے زینب کو دیکھ رہی تھیں۔

''خالہ! آپ سمجھیں ناں اور ــــ'' اس کے منہ سے یہی نکل سکا۔

''پسند کرتی ہے منصور کو۔ یہ اپنے بیٹے کا پانچ ہزار کی نوکری لگنے پر بڑے فخر سے رشتہ لے کر چلی آئیں، جیسے وہ ڈپٹی کمشنر لگ گیا ہو۔''

گھمنڈ، فخر، اترا ہٹ کیا نہیں تھا ہاجرہ کے لہجے میں۔

صالحہ نے خاموشی سے زینب کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے پیار کر کے خاموشی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔

زینب تڑپ کر ان کی طرف مڑی کہ جا کر ان کو اپنی بانہوں میں بھر لے۔ ان کو پیار کرے۔ ان کا سہارا بنے مگر یہ خواہش کرنے میں بھی دیر ہو چکی تھی۔ اس کے دل میں ہر طرف صرف منصور تھا۔

وہ بے بسی سے اس عورت کو جاتے دیکھتی رہ گئی جو آتے وقت جانے دل میں کتنے ارمان اس مٹھائی کے ڈبے کے ساتھ سجا کر لائی تھی کہ جاتے ہوئے بھی اس کے ہاتھ میں ایسی ہی رنگ برنگی ربلی مٹھائی کا ڈبا ہو گا۔

زینب کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

☆☆☆

لیکن رات میں ہی منصور بھی ایک مٹھائی کا ڈبا اٹھا کر لے آیا۔

اس کا ویزا لگ گیا تھا۔

بات تو خوشی کی تھی مگر زینب کو لگا جیسے کوئی اس کے دل میں چھید کر گیا ہے۔

وہ اس کی خوشی میں خوش بھی نہ ہو سکی۔

ہاجرہ، سونیا، منصور از حد خوش تھے۔

منصور تو آتے ہوئے گرما گرم افرائی مچھلی بھی لے کر آیا تھا۔ اس دن بہت عرصے کے بعد اس گھر میں جشن کا سماں تھا۔

''بس اماں! اب میرے جانے کی تیاریاں شروع کریں، صرف پندرہ دن کا وقت ہے میرے پاس۔ کل اللہ نے چاہا تو ٹکٹ بھی کنفرم ہو جائے گا۔'' منصور بہت خوش تھا۔

"سنا تم نے، صالحہ بیگم آئی تھیں آج۔ ان کے بیٹے کو اخبار کے دفتر میں پانچ ہزار کی نوکری مل گئی۔ مٹھائی کا ڈبا اٹھا کر لائی تھیں۔" ہاجرہ کے لہجے میں پھر وہ تمسخر تھا۔
زینب جلدی جلدی دستر خوان سمیٹنے لگی۔
سونیا تو خوب کھا پی کر اب بچی ہوئی بوٹیاں پلیٹوں میں سے چن چن کر کھا رہی تھی۔
"توبہ ہے سونیا! تم کتنا کھانے لگی ہو، اب بس بھی کرو۔" منصور نے اسے یوں کھاتے دیکھ کر ناگواری سے ٹوکا۔
"کھانے دو اسے، دن بھر مزدوروں کی طرح کام کرتی ہے میری بچی۔ باہر نکلو، محنت کرو تو ذرا پتا چلے۔"
جانے زینب کو کیوں لگا کہ تائی نے جملہ اسے مارا ہے۔
"مٹھائی کا ڈبا پانچ ہزار کی نوکری لگنے پر۔ حد ہے اماں۔" منصور کو ماں کا لطیفہ یاد آیا تو بے تکے انداز میں ہنسنے لگا۔ زینب برتن اٹھا کر باہر لے گئی۔
"اپنے بیٹے حیدر کا رشتہ لے کر آئی تھی زینب کے لیے۔" اور مٹھائی کا پیس منہ میں رکھتے منصور کو اچھو لگ گیا۔
"حیدر کا رشتہ زینب کے لیے...... دماغ ٹھیک ہے ان کا۔"
وہ بمشکل گلاب جامن نگل کر غصے میں بولا۔
"نہیں بھی ٹھیک تھا تو میں نے ٹھیک کر کے بھیج دیا، اب بھی ایسی تمنا زبان پر لا کر یہاں نہیں آئیں گی۔"
"اچھا کیا، بہت اچھا کیا۔" زینب کو منصور کی باتیں نہ جانے کیوں بہت بری لگیں۔
بات اتنی بڑی بھی نہیں تھی جتنی تائی بناتی جا رہی تھیں۔
"رشتہ اچھا تھا اماں! ہاں کر دیتیں۔" سونیا کسلمندی سے وہیں پلنگ پر تکیوں کے ڈھیر پر لیٹ گئی تھی۔
"ارے واہ، ایسے ہی کر دیتی میں ہاں۔" ہاجرہ چمک کر بولیں۔
"اماں! ایک بات میری کان کھول کر سن لیں، زینب صرف میری ہے اور میرے سوا اور کوئی اس کے بارے میں سوچے بھی نہیں۔"
لمحہ بھر کو سونیا اور ہاجرہ بھی چپ سی رہ گئیں۔
باقی کے برتن اٹھانے کے لیے آتی زینب بھی وہیں رک گئی۔
"سوچ سمجھ کر بولا کرو منصور! تم ابھی پانچ سال کا ویزا لگوا کر امریکا جا رہے ہو، تو کیا زینب پانچ سال یہاں بیٹھی تمہارا انتظار کرتی رہے گی۔" سونیا خفگی سے بولی۔
"پانچ سال ہی ہیں ناں، پچاس سال تو نہیں ہے ناں اماں۔" وہ جواباً بولا۔
"یوں بھی یہ میرا اور زینب کا معاملہ ہے، وہ میرے لیے پانچ سال تو کیا پندرہ سال بھی انتظار کر سکتی ہے۔ سونیا تم اس کی ٹینشن نہیں لو۔" منصور کو زینب کی محبت پر مان اور بھروسا تھا تو کچھ غلط بھی نہیں تھا۔
زینب اس منصور کی اتنی دیوانی تھی کہ وہ اسے پچاس سال انتظار کا کہتا تو وہ تن من گنوا کر بھی اس کا انتظار کرتی رہتی۔ وہ اس کے پیار میں ایسی ہی تو تھی۔ سب کچھ لٹا دینے والی۔
اور لٹا دیا سب کچھ......
"تم میرا انتظار کرو گی نا زینی؟" تھوڑی دیر بعد وہ دونوں چھت پر تھے۔
زینب کو اسے الگ سے ویزا لگنے کی مبارک باد جو دینا تھا۔ اگرچہ اس کا دل بالکل بھی اسے مبارک باد دینے کو نہیں چاہ رہا تھا۔

''کروں گی کیوں نہیں...... کروں گی۔'' وہ آنکھیں بند کر کے محبوب کے سامنے اقرار کر رہی تھی۔
''میری زینی!'' وہ اس کے قریب ہوا۔
وہ غیر محسوس انداز میں اس سے پرے ہوئی تھی۔
''تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں۔'' وہ اس کی حرکت پر خفا ہو کر بولا۔
''مجھے خود پر بھروسا نہیں۔'' وہ فوراً بولی۔
''لیکن تم بھی منصور! مجھ سے وعدہ کرو گے۔'' وہ بات بدل کر بولی۔
''کون سا وعدہ؟'' وہ اس کے بالوں کی لٹ نکال کر اس سے کھیلنے لگ گیا۔
''تم صرف پانچ سال کے لیے جا رہے ہو منصور! صرف پانچ سال کے لیے......'' وہ زور دے کر بولی۔
''اگر زیادہ دن لگ گئے؟'' وہ رک کر بولا۔
''کیوں لگیں گے؟'' وہ تنگ کر بولی۔
''لگ بھی سکتے ہیں۔ پردیس میں سب کچھ اپنے بس میں تو نہیں ہوتا ناں پگلی!'' وہ کچھ افسردگی سے کہہ رہا تھا۔
''تو پھر تم مجھے اپنے پاس بلا لینا۔'' وہ جھٹ سے بولی۔
''ہاں، یہ سب سے اچھی بات ہوگی۔ بس وہاں جاتے ہی کوشش کروں گا، تمہیں اپنے پاس بلا لوں۔'' وہ خوش ہو گیا۔
''پتا ہے زینی! میں نے سوچا ہے میں اتنی دولت کماؤں اتنی دولت...... جس سے میں ساری دنیا خرید کر تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں۔'' وہ وارفتگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔
''لیکن منصور! مجھے ساری دنیا نہیں چاہیے، مجھے صرف تم چاہیے۔ سنو منصور! ایک بات مانو گے؟'' وہ جھجک کر اس کا ہاتھ چھو کر بولی۔
اس نے زینب کا سرد ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں جکڑ لیا۔
''ایک بات نہیں...... میں تمہاری ہر بات مانوں گا میری جان!'' وہ اس طرح والہانہ انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔
زینب کو اپنی نظریں جھکانی پڑیں، اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔
''بولو ناں۔'' وہ منہ اس کے قریب لا کر مخمور لہجے میں بولا۔
''منصور پلیز تم نہیں جاؤ امریکا۔'' وہ بمشکل خود پر ضبط کے بند باندھتی ہوئی بولی تھی۔
''اگر نہیں جاؤں گا تو اپنے اور تمہارے خواب کیسے پورے کروں گا۔'' وہ اور قریب ہوا۔
''میرے سارے خواب تو بس تمہارے ہونے سے ہیں۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔'' وہ آہستہ سے اپنا ہاتھ کھینچتی مزاحمت کرنے لگی تھی۔
''مگر میں چاہتا ہوں میں تمہارے ساتھ دیکھے ہوئے ہر خواب میں رنگ بھروں۔''
اس نے بے اختیار اس کا ہاتھ چھوڑ کر اسے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا تھا۔
زینب کے منہ سے دبی دبی چیخ نکلی۔
وہ اسے پرے دھکیل رہی تھی اور اس کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی مزاحمت دم توڑتی جا رہی تھی۔
''پلیز منصور! یہ مت کرو...... پلیز۔'' وہ سسکی لے کر رہ گئی۔

"زینب...... زینب...... کہاں ہو تم؟" سونیا صحن میں آ کر چلائی تھی۔
حالانکہ وہ تو کھانا کھاتے ہی سو گئی تھی۔
زینب نے ایک جھٹکے سے منصور کو پرے دھکیلا اور سیڑھیاں پھلانگتی نیچے چلی گئی۔
سونیا اسے ڈھونڈتی اندر کے کمرے میں چلی گئی تھی۔
"پلیز مجھے معاف کر دو...... سوری مگر میں کچھ بھی جان بوجھ کر نہیں کر رہا تھا۔ وہ تو تم پاس ہو تو میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں رہتا۔"
اگلی صبح زینب ناشتہ بنا رہی تھی سب کے لیے۔ چھٹی کا دن تھا اور منصور اس کے آگے پیچھے پھر رہا تھا۔ اس سے معافی مانگ رہا تھا۔
"منصور! مجھے خود سے زیادہ تم پر بھروسا ہے۔" وہ شکایتی نظروں سے اسے دیکھ کر بولی۔
"کہا ناں، آئندہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میرے جانے میں صرف دو ہفتے رہ گئے ہیں۔ پلیز تم اتنے تھوڑے سے دن میں مجھ سے خفا نہیں ہو۔"
منصور کو اس کی ناراضی نے جیسے دیوانہ کر دیا تھا۔
"اگر تم دوبارہ ایسی حرکت نہیں کرو گے تو میں اپنی ناراضی ختم کر سکتی ہوں۔" اسے منصور کی منتوں پر ترس آ گیا تھا۔
اس نے ہاتھ جوڑ کر کان پکڑ لیے تو وہ ہنس پڑی۔

☆☆☆

اس کی ماں کا تھوڑا سا زیور تھا جو صالحہ خالہ کے پاس تھا۔ وہ ضد کر کے ان سے لے آئی اور اسے بیچ کر اس نے منصور کے باہر جانے کی ساری تیاری کروائی تھی۔
کچھ رقم اسے ٹکٹ میں کم پڑنے والے لاکھوں کے لیے بھی چاہیے تھی۔
"بیٹی! یہ تمہاری مری ہوئی ماں کی امانت ہے میرے پاس۔ یہ تمہارے مشکل وقت کے لیے ہے۔ تمہاری شادی کے لیے ہے۔ اسے یوں مت لے کر جاؤ۔" صالحہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔
"خالہ! ان کے بہتر استعمال کا اس سے اچھا وقت اور نہیں ہو سکتا۔ تائی نے مجھے پالا پوسا، پڑھایا، میری ہر خواہش پوری کی۔ اب انہیں اگر میری ضرورت ہے تو کیا میں یہ زیور چھپا کر بیٹھ جاؤں۔ خالہ! یہ تو سراسر احسان فراموشی ہوگی۔ امی بھی اگر ہوتیں تو مجھے اسے لے جانے سے منع نہیں کرتیں۔"
اس نے یہ کہہ کر صالحہ کا منہ ہی بند کر دیا۔ انہوں نے خاموشی سے زیور اسے دے دیا۔

☆☆☆

منصور کے لیے ملک سے باہر جانا ایک ڈراؤنا خواب بن گیا۔ اس کا ویزا لیگل نہیں تھا۔
بہت سے ایسے قانونی تقاضے تھے جو پورے نہیں کیے گئے تھے۔
وہ جہاں بھی جاب کے لیے جاتا، اس کے ڈاکومنٹس اس کے رستے کی رکاوٹ بن جاتے۔
اس نے دیہاڑی دار مزدور کی طرح کام کرنا شروع کر دیا۔ جس میں ملنے والی اجرت سے وہ اپنا دو وقت کا پیٹ بھی نہیں بھر سکتا تھا کجا کہ وہ گھر بھی رقم بھجواتا۔
اس کے امریکا آنے سے پہلے صرف صالحہ خالہ کو جتانے کے لیے ہاجرہ نے ایک بہت بڑا فنکشن کیا۔
تھوڑے سے پیسے جو سلمیٰ کے زیور بکنے کے بعد بچ گئے تھے اور زینب انہیں صالحہ کے پاس ہی رکھوانا چاہتی تھی۔

منگنی کے لیے منصور نے اس سے وہ بھی لے لیے۔
صالحہ نے کہا "اگر اتنا بڑا فنکشن کرنا تھا تو دونوں کی شادی کر دیتے۔ فضول خرچی بھی نہ ہوتی تو ایک شرعی کام بھی ہو جاتا۔"
مگر صالحہ کے اعتراض کو کوئی کیا سمجھتا۔
بہر حال منصور اور ہاجرہ نے اپنے دل کے خوب ارمان پورے کیے۔ زینب کو باقاعدہ دلہن بنایا گیا اور منصور کو دولہا۔
منگنی کی انگوٹھی پہنا کر ڈھیر ساری تصویریں بنائی گئیں۔ ان ہی میں سے کچھ تصویریں منصور اپنے ساتھ لے آیا تھا۔
شدید ٹھٹھرتی سردی میں سیلن زدہ تہہ خانوں میں جہاں پچاس ساٹھ اس کی طرح کے غیر قانونی مزدور رہتے تھے وہ چپکے سے زینب کی تصویر نکال کر اس کو حوصلہ دیتا رہتا۔
پھر ایک رات اس تہہ خانے پر پولیس کا چھاپہ پڑا۔ اس کا تھوڑا بہت سامان اور اس میں موجود اس کا خزانہ زینب کی تصویریں بھی وہیں رہ گئیں۔
اسے سب سے زیادہ غم ان تصویروں کے کھو جانے کا تھا۔
وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے لیے یہاں آیا تھا اور اب اس کے پاؤں جیسے زمین سے ہی اکھڑ گئے تھے۔
وہ جہاں بھی قدم جمانے کی کوشش کرتا وہیں سے اسے بھاگنا پڑتا۔ اللہ کی زمین جیسے اس کے لیے تنگ پڑتی جا رہی تھی۔
"اماں! میں واپس آ رہا ہوں، مجھ سے یہاں اس طرح نہیں رہا جا رہا۔" وہ ڈیڑھ سال بعد ماں کے آگے رو پڑا۔
"خبردار، ایسا سوچنا بھی نہیں۔ ابھی گھر کے کاغذ چھڑوانے ہیں، قرض اتارنا ہے، سونیا کی شادی سر پر ہے۔ تم اس کے لیے سوچو۔ اس طرح تم واپس نہیں آ سکتے۔" ہاجرہ نے اس کے واپسی کے راستے پر ایک بھاری فرض کا تالا لگا دیا تھا۔
وہ واپس نہیں آ سکتا تھا۔
اس نے سونیا کی شادی کے لیے دن رات میں بیس بیس گھنٹے کام کر کے پیسہ کمایا۔
اور سارا اماں کو بھیج دیا۔
"تمہارے بھیجے ہوئے تھوڑے سے پیسے سے شادی ہوتی ہے بھلا۔ تمہاری خالہ طاہرہ نے بھی مجھے برداری کے سامنے ذلیل کر کے رکھ دیا کہ یہ بیٹا کما کر بھیج رہا ہے، اس سے تو اچھا تھا تم بچی کو چار کپڑوں میں رخصت کر دیتیں۔"
اماں کی باتیں سن کر منصور کا خون کھول گیا۔
"تو پھر میرے یہاں رہنے کا کیا فائدہ، اگر اتنی محنت کر کے جو میں کماتا ہوں، خود فاقے کاٹتا ہوں پھر بھی کوئی خوش نہیں ہوتا نہ کسی کو فائدہ ہوتا ہے تو اماں! پھر مجھے واپس آ جانے دیں۔ میں اب آپ لوگوں کے بغیر نہیں رہ سکتا، یہاں پردیس میں رہنا مرنے کے برابر ہے اماں۔"
وہ پھر سے رو پڑا۔
"مرد یوں بے ہمت ہو کر رویا نہیں کرتے منصور! ہمت پکڑو۔ گھر تو گروی ہے، چھڑوا لے۔ یہاں آ کر کیا کرے گا۔ چار پیسے جیب میں ہوں گے تو کوئی کام کر لیتا اپنا۔" اماں نے پھر اسے بہلایا۔

"میں نہیں رہ سکتا اور یہاں، آپ کے بغیر، زینب کے بغیر۔ میری ایک ایک سانس مجھ پر بھاری ہے اماں! مجھے آنے دو۔"

"یہاں آئے گا تجھے زینب نہیں ملے گی، تو کیا کرے گا۔"

اماں نے اچانک کہا۔

"کیا مطلب زینب کہاں ہے؟" وہ بری طرح سے چونکا تھا۔

"بتایا تھا نا اسکول میں نوکری کرنے لگی ہے، وہیں سے کسی ٹیچر کے بھائی کا رشتہ آیا تو میں نے اس کی رخصتی کر دی۔"

اگر اس کے سر پر بم بھی بلاسٹ ہو جاتا تو شاید اسے اتنا صدمہ نہیں ہوتا، جتنا ماں کی یہ بات سن کر ہوا۔

وہ شاید مر گیا تھا یا گر کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا، آنکھ کھلی تو وہ ہاسپٹل میں تھا۔

☆☆☆

راستہ بھر اسے بخار میں اونگھ سی آتی رہی۔

"کشف! تمہارا بخار بڑھ رہا ہے۔ ابھی واپسی کا سفر تم سے نہیں ہوگا۔ ضد مت کرو۔" موحد اسے بار بار سمجھاتا اور وہ ہر بار انکار کر دیتی۔

"نہیں، مجھے آپی کے پاس جانا ہے۔ میرا یہ بخار ان کے پاس جا کر بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ ایک ہی رٹ لگا کر بیٹھی تھی۔

اور اس نے ٹھیک کہا تھا۔

اپنے گھر کی گلیوں میں داخل ہوتے ہی اس کا بخار یوں اترا جیسے کبھی چڑھا ہی نہ تھا۔

"یہ تو بھئی معجزہ ہے۔" موحد نے اسے چھیڑا۔

"میں نے کیا کہا تھا آپ سے۔" وہ کھل کر مسکرائی۔

اسے یقین تھا زینب اسے معاف کر دے گی۔

"اگر انہوں نے تمہیں معاف نہیں کیا؟" موحد اسے ذہنی طور پر تیار کرنا چاہتا تھا۔

"ایسا ہو نہیں سکتا۔ آپی کبھی بھی مجھ سے ناراض نہیں رہ سکتیں۔ یوں بھی غلطی میری ہے۔ میں ان کے پاؤں پکڑ کر بھی معافی مانگ لوں گی۔"

اف...... کشف کتنی ایموشنل لڑکی ہے۔

"سنو، تم ہر ایک سے ایسے ہی ٹوٹ کر محبت کرتی ہو۔" وہ اسے روک کر پوچھ رہا تھا۔

"ہر ایک سے نہیں، صرف آپی سے۔" وہ ہنسی ضبط کر رہی تھی۔ موحد اسے دلچسپی سے دیکھ کر رہ گیا۔

میرون شال میں اس کا گورا رنگ دمک رہا تھا۔

گلی میں قدم رکھتے ہی اس میں جیسے بجلی بھر گئی۔ وہ موحد سے کئی قدم آگے نکل کر گھر میں داخل ہو گئی تھی۔

گھر کا دروازہ شاید اس کے انتظار میں ابھی تک کھلا تھا۔

"نہیں زینب! آزر مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔ اب انہیں پتا چل گیا ہے کہ کشف میری سگی بیٹی ہے۔ میں اس کی ماں ہوں۔ وہ مجھے معاف نہیں کریں گے۔"

اور دروازے میں کھڑی کشف شاکڈ سی کھڑی رہ گئی۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

یہ زندگی کی راہ گزر

فریحہ اشتیاق

اپنے تھکے ہوئے قدموں کو گھسیٹ گھساٹ کر بڑی مشکل سے وہ گھر کے دروازے تک لا سکی تھی۔ بس اسٹاپ سے گھر تک کا راستہ بمشکل پانچ منٹ کا تھا جو وہ آسانی سے طے بھی کر لیتی تھی لیکن آج تھکن اور بھوک کی وجہ سے یہ چند قدم اٹھانا بھی محال تھا۔

اسکول میں اچانک کی میٹنگ کی وجہ سے وہ دیر سے گھر پہنچی تھی۔ دروازہ کھلا تھا ہر روز کی طرح، امی اس کے اسکول واپسی کے وقت پر دروازہ کھول دیتی تھیں۔ تاکہ اتنی گرمی میں انتظار کی کوفت نہ ہو۔ سامنے ہی برآمدے میں رابعہ خاتون سلائی مشین پر جھکی کپڑے سینے میں مگن تھیں۔ اس نے قدموں کی تھکن کو پرے پھینکا اور تیزی سے امی کی طرف بڑھی۔

"امی میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ اسکول سے آ کر میں مکمل کر دوں گی۔ زیادہ بیٹھنے سے آپ کی کمر میں پھر درد شروع ہو جائے گا۔"

"ارے تمہارا انتظار کرتے ہوئے بس ابھی ابھی بیٹھی تھی کچھ تو کام ختم ہو۔"

"وہ آج پرنسپل سر نے اچانک ہی میٹنگ بلوا لی تھی۔ اسی لیے دیر ہو گئی۔"

"اچھا تم کپڑے بدل لو۔ میں تمہارے لیے کھانا گرم کرتی ہوں۔" رابعہ خاتون اٹھتے ہوئے بولیں۔

"ہاں، بھوک تو زوروں کی لگی ہے۔ کیا پکایا ہے؟" "آلو کی ترکاری اور ساتھ تمہاری پسند کا کچومر سلاد بنایا ہے۔"

"ارے واہ! آپ کھانا گرم کریں۔ میں بس ابھی آئی۔"

زارا اندر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ رابعہ خاتون برآمدے کے ایک طرف بنے کچن میں چلی گئیں۔ کھانے کے بعد زارا اور امی قیلولے کی غرض سے بڑے کمرے میں لیٹ گئیں۔ پنکھے کی ہوا گرم ہونے کے باوجود زارا جلد ہی نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔

☆☆☆

چار سال پہلے زہرا کے ابو اختر صاحب ایک ایکسیڈنٹ میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ یہ ایک

سفید پوش گھرانہ تھا۔ بہت خوشحالی نہ تھی مگر کوئی خاص تنگی بھی نہ تھی۔ اس وقت زارا میٹرک کے امتحانات کے بعد فارغ تھی۔ ان بیتے زیادہ ترش کم شیریں سالوں میں وہ بی۔ اے کر کے ایک درمیانے درجے کے اسکول میں جاب کر رہی تھی۔ مگر اس کی تنخواہ میں گھر کا کرایہ، بجلی گیس کے بل اور گھر کے دوسرے اخراجات پورے نہ ہوتے تھے۔ اس لیے زارا تھوڑا بہت سلائی کا کام کر لیتی اور شام میں بچوں کو ٹیوشنز بھی پڑھا لیتی تھی۔

زندگی بہت مشکل اور مصروف ہو گئی تھی مگر اپنی تمام تر تلخیوں سمیت گزر رہی تھی۔ زارا اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کے ابو دو بھائی ایک وہ خود اور ایک ان سے بڑے انور صاحب اور دو بہنیں نجمہ اور عذرا تھیں۔ انور صاحب کی مالی حیثیت کافی سے زیادہ مستحکم تھی۔

نجمہ پھوپھو کی شادی ایک زمین دار گھرانے میں ہوئی تھی اور عذرا پھوپھو شادی کے بعد کینیڈا جا بسی تھیں۔ ان سب میں اختر صاحب کم حیثیت والے تھے اسی وجہ سے ان کے تینوں بہن بھائی ان سے ملنے سے کتراتے تھے اور ان کی وفات کے بعد تو جو برائے نام سا تعلق تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔

پہلے وہ اپنے آبائی گھر میں رہتے تھے۔ مگر اختر صاحب کی وفات کے بعد ان کے بڑے بھائی انور نے وہ گھر خالی کروا لیا، یہ کہتے ہوئے کہ یہ گھر میرا ہے اس پر میں نے سرمایہ لگایا تھا۔ بات کسی حد تک سچ بھی تھی کہ پہلے یہ گھر کچا سا پرانے وقتوں کا بنا ہوا تھا بعد میں جب قسمت کی دیوی انور صاحب پر مہربان ہوئی تو انہوں نے اس گھر کو جدید اسٹائل سے تبدیلیاں کروائیں۔

اختر صاحب کی وفات کے بعد انور صاحب نے گھر ان سے خالی کروا کر چند لاکھ ان کے ہاتھ میں رکھے کہ یہ آپ کا گھر میں حصہ بنتا ہے باقی پیسے میں نے لگائے تھے۔ اس لیے اب یہ گھر میری ملکیت ہے۔

دونوں ماں بیٹی نے خاموشی سے اپنا سامان سمیٹا اور "جو دے دیا گیا اسے بہت سمجھا اور جو دبا لیا گیا اسے اللہ پر چھوڑ دیا" پر عمل کرتے اس گھر کو چھوڑ ایک مناسب سے کرائے کے گھر میں بس گئیں۔

☆☆☆

دیوار کے ساتھ ساتھ بنی لمبی سی کیاری میں چنبیلی کے پھول کھلے تھے، ساتھ ہی سرسبز دھنیا لہرا رہا تھا دھنیے کے ساتھ ٹماٹر کا ایک پودا لگا تھا جو ابھی چھوٹا تھا۔

زارا نماز سے فارغ ہو کر پانچ دس منٹ اپنے پودوں کو ضرور دیتی تھی، ابھی بھی وہ کیاری میں گرے سوکھے پتوں کو ہٹا کر صاف کر رہی تھی۔ اسے پودوں اور پھولوں سے عشق تھا چھوٹے سے گھر کا یہ مقام اس کا پسندیدہ تھا۔

کیاری کو اچھی طرح صاف کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی واش روم کی دیوار کے ساتھ چھوٹا سا بیسن لگا تھا ہاتھ دھو کر برآمدے میں آئی تو پونے سات ہوئے تھے۔ پونے آٹھ بجے تک اسے اسکول کے لیے ہر صورت نکلنا ہوتا تھا۔ ناشتہ بنانے کے لیے وہ کچن میں گھس گئی۔

ایک چولہے پر چھوٹی پتیلی میں چائے کا پانی رکھا فریج سے آٹا نکالا اور دوسرا چولہا جلا کر توا اوپر رکھ دیا۔ پھرتی سے پہلے امی کے لیے سادہ روٹی بنائی پھر اپنے لیے بل دار پراٹھا توے پر پھیلا دیا۔ چائے چھان کر کپوں میں ڈالی اور ناشتے کی ٹرے اٹھائے امی کے پاس آ گئی۔

"آرام سے کھاؤ۔" اسے تیزی سے لقمے لیتے امی نے ٹوکا۔

"امی! دیر ہو رہی ہے! ابھی مجھے تیار ہو کر اسکول کے لیے نکلنا ہے۔" وہ گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔

"ہاں! ہاں ٹھیک ہے بیٹا! ابھی ٹائم ہے تم سکون سے بیٹھ کر ناشتہ کرو اور یہ چابی لیتی جانا میں آج تمہاری خالہ کی طرف جاؤں گی۔ آپا کی طبیعت خراب ہے کچھ دنوں سے، سوچا آج ہو آؤں۔"

"تو آپ کا شام تک رکنے کا ارادہ ہے۔" زارا نے امی کے ہاتھ سے چابی تھام لی۔

"نہیں، تمہارے آنے تک واپس آ ہی جاؤں گی پھر بھی ایک چابی تم لے جاؤ۔ دیر ہوئی تو مجھے تسلی رہے گی۔"

"ٹھیک ہے۔" زارا اٹھ کر کپڑے بدلنے کے لیے کمرے میں چلی گئی۔ لے دے کر ایک خالہ ہی

تھیں جن کے ہاں ان کا آنا جانا تھا۔ ان کا شمار متوسط طبقے میں ہوتا تھا۔
خالو حیات نہ تھے۔ خالہ اور ان کے تین بیٹے بہوویں اور ان کے بچے تھے۔ خالہ زیادہ تر بیمار رہتی تھیں۔ زارا کے جانے کے بعد رابعہ خاتون نے کپڑے بدلے اور دروازے کو مقفل کیا۔ سیدھی ہوئیں تو سامنے ہی احسن اپنی موٹر سائیکل گھر سے باہر نکال رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر احسن کی باچھیں دائیں سے بائیں اپنی آخری حدوں تک کھل گئیں۔
''آپ کہیں جارہی ہیں آنٹی، آئیں میں آپ کو چھوڑ دوں گا۔'' احسن نے مؤدب بنتے ہوئے کہا۔
''نہیں، مجھے نزدیک ہی جانا ہے میں چلی جاؤں گی۔ سامنے سڑک سے رکشہ مل جائے گا۔'' رابعہ خاتون نے اس کی پیش کش رد کرتے ہوئے کہا۔ مگر موصوف چپکو بنے پھر سے بولے۔
''ارے تکلف مت کریں آنٹی ابھی چھوڑ دوں گا۔''
''نہیں بیٹا میں کبھی موٹر سائیکل پر بیٹھی نہیں اس لیے ڈر اور جھجک سی محسوس ہوتی ہے۔ تم جاؤ دیر ہو رہی ہوگی تمہیں، میں بھی چلتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے رابعہ خاتون آگے بڑھ گئیں۔ جبکہ احسن بددل سا اپنی بائیک اسٹارٹ کرنے لگا۔
احسن اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا دو منزلہ جدید طرز کا بنا ہوا خوب صورت گھر جس کے گراؤنڈ فلور پر وہ خود رہائش پذیر تھے جبکہ اوپر والا پورشن کچھ لڑکوں کو کرائے پر دے رکھا تھا جو دوسرے شہروں سے آئے تھے اور ملازمت کی وجہ سے کرایہ پر رہ رہے تھے۔
رابعہ خاتون کی احسن کے گھر والوں سے رسمی سی سلام دعا تھی جس کی ایک وجہ ان کے کنوارے کرائے دار تھے جو زیادہ تر نیچے ہی پائے جاتے تھے۔ چونکہ احسن کی امی کے علاوہ گھر میں کوئی عورت نہیں تھی۔ اس لیے بلا رکاوٹ ان کے کرائے دار سارے گھر میں دندناتے پھرتے تھے۔ اسی لیے زارا اور اس کی امی ان کی طرف آتی جاتی نہیں تھیں۔ حالانکہ احسن کی امی خاصی خوش مزاج خاتون تھیں اور بہت محبت سے ملتی تھیں۔ جبکہ احسن کی خوش مزاجی کی وجہ زارا سے جا کر ملتی تھی۔ آتے جاتے راستے میں بڑی سی چادر میں خود کو چھپائے کندھے پر شولڈر بیگ پہنے وہ گندم کے خوشوں سی سنہری لڑکی اس کے دل کی مکین بن گئی تھی۔

☆☆☆

وہ اسکول سے آئی تو دروازہ کھلا ملا۔ دروازہ بند کر کے اس نے ایک نظر گرمی سے کملائے پودوں پر ڈالی پھر اندر چلی گئی۔ کمرے میں امی دوپٹہ ایک طرف ڈالے پانی پی رہی تھیں۔
''آؤ، پانی پی لو۔ آج تو شدید گرمی ہے۔''
''ابھی آئی ہیں آپ؟'' گلاس پکڑتے اس نے پوچھا۔
''ہاں، ابھی آئی ہوں تمہاری خالہ کافی بیمار ہیں میں گئی تو رونے لگیں مجھے دیکھ کر۔ ایک بہن ہی تو ہے جس سے دل کی چار باتیں کر لیتی ہوں وہ بھی علیل ہو گئیں میرا تو بہت جی دکھا ان کی ایسی حالت دیکھ کر۔''
''سب بھائی علاج تو کروا رہے ہیں نا ان کا؟'' زارا نے پانی کا گلاس نزدیک پڑی لکڑی کی ٹیبل پر رکھا۔
''ہاں علاج تو ہو رہا ہے، تینوں بیٹے ہی بہت پریشان ہیں، بہوویں بھی اچھی ہیں۔ ہر ممکن خیال رکھتی ہیں لیکن فالج جیسے ظالم مرض نے آپا کے اعصاب پر اچھا خاصا اثر چھوڑا ہے۔ چلو اللہ انہیں شفا دے، آمین۔''
زارا نے دل سے آمین کہا اور اٹھ کر اپنی چادر اور بیگ سمیٹنے لگی۔

☆☆☆

وقت کا پہیہ اپنی ازلی روانی سے محو سفر تھا۔ موسم گرما دور دیس جا چکا تھا اور موسم سرما اپنے مخصوص خنک تاثر کے ساتھ جلوہ افروز تھا۔ رابعہ خاتون کچن میں کھڑی مچھلی کا شوربے والا سالن تیار کر رہی تھیں جبکہ زارا چھوٹی کھرپی کی مدد سے کیاری کے پاس پنجوں کے بل بیٹھی مٹی نرم کر رہی تھی۔
چھوٹے سے گھر میں مچھلی کی اشتہا انگیز خوشبو

پھیلی ہوئی تھی۔ زارا کو امی کے ہاتھ کا بنا مچھلی کا سالن بہت پسند تھا۔ اسی لیے آج رابعہ بیگم کھانا بنا رہی تھیں اور زارا اپنے پودوں کے ساتھ مصروف تھی۔

رابعہ بیگم کچن سے فارغ ہو کر برآمدے میں بچھے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ آواز دے کر زارا کو متوجہ کیا۔ زارا نے کھرپی رکھی۔ اٹھ کر ہاتھ دھو کر برآمدے میں چلی آئی۔

"سالن میں نے بنا دیا ہے۔ اب چپاتیاں تم ڈال لینا۔"

"جی امی! ابھی میں بنا لوں گی۔" زارا پلنگ پر بیٹھی پھر ماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

"کل تمہارے بڑے تایا جی کا ہماری طرف آنے کا ارادہ ہے۔"

"کیوں؟ کس وجہ سے تشریف لائیں گے وہ پہلے تو کبھی حال تک پوچھنے کی توفیق سے محروم تھے۔" وہ سراپا حیرت بنی ماں کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"کل دن میں تمہاری بجو پھوپھو نے فون کیا تھا۔ اسی نے بتایا کہ بھائی صاحب اپنے سلیم کے لیے مجھ سے بات کرنے آئیں گے تو میں ہاں کر دوں۔"

رابعہ بیگم نے سپاٹ چہرے کے ساتھ زارا کو بتایا۔

"سلیم بھائی کی کون سی بات اور کس بات کی ہاں کے لیے آپ کو بولا تھا؟" زارا کا لہجہ کڑوا سا ہوا۔

"بھائی صاحب سلیم کے لیے تمہارا رشتہ مانگنے آئیں گے۔ جس کی ہاں کے لیے مجھے پہلے سے کہا جا رہا ہے۔" رابعہ خاتون نے زارا کے الجھے تاثرات سے سجے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "کیا؟"

زارا نے جھٹکے سے اپنا سر ماں کی گود سے اٹھایا اور اٹھ بیٹھی۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ اماں سلیم بھائی تو عمر میں کافی بڑے ہیں اور سب سے بڑی اور اہم بات وہ تو مینٹلی ابنارمل ہیں اور مجھے ان سے کوئی تعلق رکھنا ہی نہیں، جب وہ ابو کے بڑے بھائی ہو کر رشتے کا حق ادا نہیں کر سکے تو نئے کسی رشتے کا استوار ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ پانچ سال کچھ کم عرصہ نہیں ہوتا امی، اتنے قریبی رشتوں کے ہوتے ہوئے لاوارث بن کر یہ پانچ سال گزارے ہیں۔ اب اپنے ابنارمل بیٹے کے لیے انہیں میں نظر آ گئی ہوں۔"

زارا کی آواز بھرا گئی۔ کالی سیاہ آنکھیں کھارے پانیوں سے بھر گئیں۔ رابعہ خاتون نے تڑپ کر اسے گلے لگایا۔

"روؤ نہیں، زارا! تم بے فکر رہو۔ میں بھائی صاحب کو صاف انکار کر دوں گی۔ میں نے پہلے سے سوچ رکھا ہے میری طرف سے نہ ہے۔ لیکن پھر بھی دل جانے کیوں گھبرایا ہوا سا ہے۔"

رابعہ خاتون نے ٹوٹے سے لہجے میں کہا۔

"خیر جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔" امی نے زارا کے بہتے ہوئے آنسو صاف کیے اور اٹھ کر کمرے میں چلی گئیں۔ زارا اترا ہوا چہرہ لیے وہیں بیٹھی رہ گئی۔

☆☆☆

بہت دنوں بعد آج نکھرا نکھرا سا دن آسمان کی آغوش سے برآمد ہوا تھا۔ ورنہ کچھ دنوں سے سارا دن دھند کا راج رہتا۔ کچھ وقت کے لیے دھند کی چادر سرکتی پھر دوبارہ سے تن جاتی۔

زارا نے آج اسکول سے چھٹی کی تھی۔ باہر چھوٹے سے صحن میں چارپائی پر رابعہ خاتون بیٹھی لہسن چھیل رہی تھیں۔ جبکہ زارا کچن میں نل کھولے چکن صاف کر رہی تھی۔ خیالات کا ایک ہجوم تھا جو اس وقت اس کے ذہن میں چکرا رہا تھا۔

"گزری ہوئی زندگی جس میں اسے ماں اور باپ دونوں کا ساتھ میسر تھا۔ اگرچہ مختصر دور تھا۔ مگر سکون، خوشیوں اور کھٹی میٹھی خوب صورت یادوں سے لبریز تھا۔ ایک موجودہ زندگی کہ باپ کے مضبوط سہارے اور شفقت سے محروم مگر ماں کا راحت بھرا ساتھ حاصل تھا۔ اچھی گزر رہی تھی۔ مگر اب تایا جی کے چھوڑے ہوئے شوشے کی وجہ سے آنے والی زندگی ایک سوالیہ نشان کی طرح لگ رہی تھی۔

رابعہ خاتون نے ٹوکری اور چھری لا کر سلیب پر رکھی تو کھٹکے کی آواز سے زارا کو اپنے خیالات کی قید سے رہائی ملی۔ "لہسن چھیل چکا ہے۔ ٹماٹر بھی کاٹ دیے ہیں۔ چکن خشک ہو جائے تو دہی میں

اچار گوشت مسالہ ڈال کر میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ دو۔ کھیر تو رات کو ہی بنا دی تھی۔ ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ آٹا بھی گندھا ہوا ہے۔ لاؤ میں فرائیڈ رائس بنا دیتی ہوں تم اچار گوشت بنا لو۔"

رابعہ خاتون نے چاولوں کے لیے بڑی دیگچی نکالی۔ زارا نے ان کے ہاتھ سے لے لی۔

"امی اب آپ جا کر لیٹ جائیں تھوڑی دیر، میں سنبھال لوں گی صبح سے لگی ہوئی ہیں آپ۔"

"ارے کام جلدی ختم ہو جائے گا اور تمہاری مدد بھی ہو جائے گی۔"

"امی آپ پہلے ہی میری بہت مدد کر چکی ہیں مزید کی ضرورت نہیں، میں کر لوں گی۔" زارا نے اصرار کیا۔

"اچھا ٹھیک ہے مگر مدد کی ضرورت ہوئی تو کہہ دینا۔"

"جی اچھا۔"

رابعہ خاتون برآمدے میں بچھے تخت پر لیٹ گئیں۔

☆☆☆

ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ ساتھ والے پلنگ پر امی سو رہی تھیں، امی کی نیند گہری ہونے کا یقین ہوتے ہی زارا دبے قدموں چلتی ہوئی کمرے سے نکلی برآمدے میں پڑی پلاسٹک کی کرسیوں میں سے ایک کرسی اٹھائی اور باہر صحن میں نکل آئی، کیاری کے پاس کرسی رکھی اور بیٹھ گئی۔ نیند کوسوں دور تھی۔ ویسے بھی ان حالات میں نیند آ بھی کیسے سکتی تھی۔

ابھی بھی شام میں تایا جی کی کہی گئی باتیں دماغ میں گردش کر رہی تھیں۔ سفید براق سوٹ پر سیاہ کوٹ پہنے تایا جی بڑے کروفر سے صوفے پر براجمان تھے ساتھ ہی ان کی اہلیہ بیٹھی تھیں اور ایسے جھجکی تھیں جیسے بس نہ چل رہا ہو ورنہ ابھی اٹھ کر چل دیں۔ دائیں طرف والے صوفے پر رابعہ خاتون بیٹھی تھیں جبکہ بائیں طرف نجمہ پھوپھو تشریف فرما تھیں۔ اور خود زارا ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے ساتھ چپکی کھڑی تھی تاکہ اندر ہو رہی گفتگو سے فیض یاب ہو سکے۔

بے شک اس طرح چھپ کر باتیں سننا سخت معیوب تھا اور اس کی تربیت کے خلاف بھی مگر تجسس کے ہاتھوں مجبور تھی۔

"زارا میرے چھوٹے بھائی کی اکلوتی نشانی ہے اسی لیے میں اسے ہمیشہ اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ میں سلیم کے ساتھ زارا بیٹی کو منسوب کرنا چاہتا ہوں۔"

تایا جی کی بھاری اور کھردری آواز گونجی۔ رابعہ بیگم سیدھی ہو کر بیٹھیں کہ رخ بالکل انور صاحب کی طرف ہو گیا۔

"آپ مجھ سے رشتے میں بھی بڑے ہیں اور عمر میں بھی اور سب سے بڑی بات کہ اختر کے بڑے بھائی ہونے کی وجہ سے میرے لیے اور زیادہ محترم ہیں۔ آپ میرے گھر آئے مجھے بہت خوشی ہوئی کہ ایک عرصے بعد ہم آپ کو یاد آ ہی گئے خیر آئندہ بھی ضرور آتے رہیے گا مگر زارا کے رشتے کی بات لے کر نہیں مجھے یہ رشتہ نہیں کرنا۔"

وہاں موجود تینوں نفوس کے چہروں پر واضح ناپسندیدگی جھلکی۔ انہیں جیسے نہ سننے کی توقع نہ تھی۔

"رابعہ! تم اچھی طرح سوچ لو کوئی جلدی نہیں گھر کی ہی بات ہے۔" انور صاحب کے لہجے میں بڑی واضح تنبیہ تھی۔

"مجھے یہ رشتہ کرنا ہی نہیں نہ آج نہ کبھی آنے والے وقت میں تو سوچ بچار کیسی۔"

"لیکن مجھے یہ رشتہ ہر صورت میں کرنا ہے۔ یہ بات تم اپنے ذہن میں بٹھا لو۔ تمہارے لیے بہتر ہو گا۔" انور صاحب ایک جھٹکے سے کھڑے ہوئے ساتھ ہی ان کی بیوی اور نجمہ پھوپھو بھی اٹھ کھڑی ہوئیں، شمسہ تائی سر سے لے کر پاؤں تک برانڈڈ چیزوں سے لدی بڑی نخوت سے اپنے کپڑے جھٹک جھٹک کے صاف کر رہی تھیں۔

"اتوار کو نکاح کرنے آئیں گے ہم۔ میری خواہش تھی کہ دھوم دھام سے شادی کرتے مگر تمہارے تیور دیکھتے ہوئے اب فوری نکاح ہو گا۔"

اگر ایسی بات ہے تو آپ کو یہاں دوبارہ آنے کی ضرورت نہیں، میں اپنی پھولوں جیسی بچی کا ہاتھ

آپ کے نیم پاگل بیٹے کے ہاتھ میں نہیں دوں گی۔ آپ زبردستی نہیں کر سکتے۔"

انور صاحب عین رابعہ خاتون کے سامنے آ کھڑے ہوئے...... اور چبا چبا کر کہا۔

"میں کر سکتا ہوں تم مجھے جانتی ہو۔" رابعہ خاتون بے دم سی ہو کر صوفے پر ڈھے گئیں۔ جبکہ وہ تینوں آگے پیچھے ڈرائنگ روم سے نکلے اور باہر کھڑی زارا کو چونک کر دیکھا۔ پھر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور گھر سے نکلتے چلے گئے۔

زارا تیر کی سی تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ تو نظر امی کی طرف گئی جو زرد چہرہ لیے گم صم سی بیٹھی تھیں۔ زارا بھاگ کر ان کے لیے پانی لائی اور گلاس امی کی طرف بڑھایا۔ زارا گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھی رابعہ خاتون زارا کا پریشان چہرہ تکتی رہیں پھر اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں بھرا اور زار و قطار رونے لگیں۔ ساری بہادری ہوا ہو چکی تھی۔

رابعہ خاتون رو رو کر ہلکان ہو رہی تھیں۔ زارا نے بمشکل انہیں چپ کروایا۔ پھر سہارا دے کر صحن اور برآمدہ عبور کرتے کمرے میں لے آئی جبکہ ڈرائنگ روم کی میز پر پڑی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی اور ساتھ رکھے لوازمات کسی کا پیٹ بھرنے کے بجائے بے قدری سے وہیں رکھے تھے۔

☆☆☆

زارا نے بیرونی دروازہ مقفل کیا اور اندر امی کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ رابعہ خاتون بہت حد تک خود کو سنبھال چکی تھیں۔ انہوں نے نظر اٹھا کر زارا کا چہرہ دیکھا، جہاں آنے والے کل کا خوف صاف نظر آ رہا تھا۔ امی نے زارا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے جیسے تسلی دے رہی ہوں۔

"زارا تم میری بہت پیاری اور فرماں بردار بیٹی ہو۔ بیٹا مجھے اجازت دو کہ میں تمہارے حق میں بہتر فیصلہ کر سکوں تاکہ تمہاری آنے والی زندگی محفوظ رہے۔"

زارا نے بے بسی سے لب کاٹے۔ اس کی خاموشی پہ رابعہ خاتون دوبارہ گویا ہوئیں۔

"اگر میں تمہارا نکاح احسن سے کر دوں تو تمہیں اعتراض تو نہ ہوگا؟"

امی نے بڑی آس سے زارا کی طرف دیکھا۔ جبکہ زارا کو جیسے بجلی کے ننگے تار نے چھو لیا ہو۔

"امی! کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" زارا کا صبیح چہرہ آن کی آن میں آنسوؤں سے گیلا ہوا۔

"ہاں ٹھیک کہہ رہی ہوں میں۔ اب اس کے سوا کوئی راستہ نہیں نکلتا۔"

رابعہ خاتون نے پرسوچ انداز میں کہا۔

"کچھ ہفتے پہلے احسن کے گھر قرآن خوانی کی محفل میں گئی تھی تو احسن کی والدہ نفیسہ نے مجھ سے تمہارے لیے پوچھا تھا پر میں نے خود ہی ٹال دیا تھا کہ بہر حال رشتہ جوڑنے کی باتیں ایسے کسی ہجوم میں نہیں ہونی چاہئیں مگر اب مجبوری ہے میں خود سے بات کروں گی۔ اس سے پہلے بھی وہ مجھ سے اشاروں کنایوں میں تمہارے لیے پوچھتی رہی ہیں مگر میں ہی پہلو بچا رہی تھی۔ پانچ سال ہو گئے ہیں ہمیں یہاں آئے اچھے شریف اور خاندانی لوگ ہیں احسن بھی اچھا اور خوش شکل ہے۔ بینک میں اچھی پوسٹ پر ہے۔ مگر کوئی نخرہ اور غرور نہیں۔ اچھی طبیعت کا ہے۔"

"امی لیکن وہ..." زارا بیچ میں بول پڑی "مگر ایسے کیسے آپ خود سے رشتے کی بات کریں گی۔ وہ کیا سوچیں گے ہمارے بارے میں۔" زارا بھی بے بسی سے بولی۔

"کچھ نہیں سوچیں گے وہ۔ تم مجھے کھانا نکال کر دو۔ ساتھ لے جاتی ہوں اور بات بھی کر لوں گی۔"

رابعہ خاتون اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے دوبارہ بیٹھ گئیں اور اسے اپنے ساتھ لگا کر آہستہ آہستہ بولنے لگیں۔

"آج جمعہ ہے اتوار کو تمہارے تایا آ کر تمہارا نکاح اپنے ایب نارمل بیٹے سے کر دیں گے تو میں اکیلی کیا کر لوں گی تمہارے سر پر باپ کا سایہ نہیں اور جن کے باپ نہ ہوں انہیں لوگ مال غنیمت کی مانند تصور کرتے ہیں۔ ورنہ انور بھائی ایسے نہ کہہ کر جاتے۔ یہ حالات کا تقاضا ہے گڑیا مجھے کرنے دو جو میں تمہارے لیے کر سکوں۔"

بات کے اختتام پر رابعہ کی ہچکیاں بندھ گئیں۔
اس وقت وہ خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہی تھیں۔ کہنے کو ان کی بڑی بہن تھیں مگر وہ خود بیمار تھیں ان کے تین بیٹے تھے شاید مدد کر بھی دیتے کچھ نہ کچھ کر ہی لیتے مگر وہ انور صاحب کی ضدی طبیعت سے واقف تھیں اور سب سے بڑا اختیار کہ زارا ان کے بھائی کی بیٹی تھی۔ تایا تھے وہ زارا کے۔ طاقت والے تھے کچھ بھی کر سکتے تھے۔
یہی سب سوچتے انہیں یہ بہترین حل لگا تھا۔ اس مسئلے سے نکلنے کا۔ وہ اٹھ کر باہر آ گئیں زارا نے دو بڑے پیالے پکڑائے۔ سارا کھانا ویسے کا ویسا رکھا تھا آنے والے مہمان کھانا کھائے بغیر چلے گئے تھے۔ کھانے والے برتن اٹھائے رابعہ خاتون بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔
"زارا! دروازہ اچھی طرح سے بند کر لو ہو سکتا ہے آنے میں دیر ہو جائے۔"
زارا نے اثبات میں سر ہلایا اور دروازہ بند کر دیا۔ کافی دیر ہو گئی تھی مگر امی ابھی تک نہیں لوٹی تھیں۔ کئی دفعہ دل چاہا دروازہ کھول کر دیکھ آئے مگر قدم پھر واپس موڑ لیے، تھک کر صحن میں ڈرائنگ روم کی دیوار کے ساتھ نیچے بیٹھ گئی۔
تھوڑی دیر گزری کہ دروازے پر جانی پہچانی سی دستک ہوئی زارا نے بھاگ کر دروازہ کھولا۔ رابعہ خاتون اندر داخل ہوئیں اور دروازہ بند کر دیا۔ پھر زارا کا ہاتھ تھاما کمرے میں لے آئیں۔
"کل چار بجے تمہارا نکاح ہے وقت بہت کم ہے۔ ورنہ سارے ارمان پورے کرتی۔" رابعہ کی آواز بھرا گئی۔ "مگر تم محفوظ ہاتھوں میں ہو گی تو مجھے بھی سکون ملے گا۔ میں نے انہیں سب بتا دیا ہے بھلے مانس لوگ ہیں، وہ تو پہلے سے ہی تمہارے خواہش مند تھے۔ بلکہ احسن کی ایما پر ہی انہوں نے تمہارے لیے پوچھا تھا احسن بھی وہیں تھا۔ سب رضا مند ہیں تم بوجھ نہیں ہو گی، سارے وہم دل سے نکال دو۔ جب نکاح ہو جائے گا تو تمہارے تایا کچھ نہیں کر سکیں گے۔ نکاح کے ساتھ ہی کل رخصتی بھی ہو گی۔"

"اور آپ؟" زارا نے بے کلی سے پوچھا۔
"میں کیا؟ میں گھر پر رہوں گی سامنے گلی کا تو فاصلہ ہے بس۔ پھر مجھے بچی کے ساتھ اتنا اچھا بیٹا مفت میں مل جاتا ہے۔ پھر کوئی ٹینشن نہیں ہو گی۔ میں بہت مطمئن ہو گئی ہوں۔" انہوں نے جیسے خود کو تسلی دی۔
"اب میں سوؤں گی آج کا دن بہت تھکا دینے والا تھا۔"
امی لیٹ گئیں۔ مگر زارا کی آنکھوں سے نیند جیسے روٹھ کر دور چلی گئی تھی کافی دیر جب کروٹیں بدل بدل کر تھک گئی تو دبے پاؤں اٹھی رابعہ خاتون کو سوتا چھوڑ کر باہر نکل گئی۔
دور سے آتی اذان کی آواز سے چونکی۔ پریشان کن خیالوں کو دور کیا۔ گہری سانس بھری اٹھ کر وضو کیا پھر نماز ادا کی۔ پر رابعہ خاتون باہر نہ آئیں۔ ورنہ ہمیشہ وہ خود نماز کے لیے زارا کو اٹھاتی تھیں۔ زارا کمرے میں گئی لائٹ آن کی امی کو جگانے کے لیے بازو ہلایا۔ پھر آوازیں دیں مگر جواب ندارد۔
انہوں نے جنبش تک نہ کی۔ زارا کے دل میں خوف کے اندیشوں کی فصل اگ آئی۔ ٹھنڈے پسینے سے بھیگی پیشانی صاف کرتے کسی انہونی کے خوف سے زارا نے [illegible] زور سے ہلایا۔ ان کا چہرہ کپکپاتے ہاتھوں سے تھپتھپایا مگر وہ [illegible] کی۔ قسمتوں کا کھیل تھا وہ باہر تاروں کے [illegible] رہی تھی اور موت دبے قدموں آ کر اس کی ماں کو ساتھ لے جا چکی تھی۔ اب سامنے بے جان وجود پڑا تھا بس۔ بے بسی اور دکھ کے شدید احساس نے اسے اپنی لپیٹ میں لیا۔ وہ چیخ چیخ کے امی کو آوازیں دینے لگی ساتھ زور زور سے روتی جا رہی تھی۔ رو رو کر نڈھال ہوتی وہ اکیلی ماں کے قدموں میں جھکتی چلی گئی۔ کبھی ان کے پاؤں پکڑ کر ہلاتی اور آوازیں دینے لگتی مگر جانے والے کب واپس آتے ہیں اس پل زارا پر انکشاف ہوا۔ "دنیا میں ہر چیز کا نعم البدل ہو سکتا ہے مگر ماں باپ جیسے رشتوں کا نعم البدل نہیں ہوتا۔" اسی وقت اس کے کانوں میں زوردار دستک کی آواز گونجی۔ شاید کوئی بہت دیر سے دروازہ بجا رہا تھا

مگر وہ سن نہ سکی۔

وہ ڈولتے قدموں کے ساتھ اٹھی۔ بڑی دقت سے دروازے تک پہنچی۔ جیسے تیسے کر کے دروازہ کھول دیا۔ باہر نفیسہ آنٹی احسن اور قمر الدین (احسن کے والد) کھڑے تھے اور بھی لوگ تھے شاید محلے والے وہ شناخت کر ہی رہی تھی مگر اس سے پہلے ہی وہ لہرا کر گری۔ نفیسہ خاتون اور احسن نے بروقت سہارا دے کر گرنے سے بچا لیا۔

دوبارہ اس کی آنکھ کسی کے آوازیں دینے اور چہرے پر گیلا پن محسوس کرتے ہوئے کھلی نفیسہ آنٹی اس کے سرہانے بیٹھی تھیں اور ہاتھ میں پکڑے گلاس سے پانی کے چھینٹے اس کے چہرے پر مار رہی تھیں۔ وہ جلدی سے اٹھی اور اس سمت دیکھا جہاں کچھ دیر پہلے رابعہ خاتون کا بے جان وجود پڑا تھا۔ مگر اب پلنگ خالی تھا۔

''امی......'' اس نے بے چینی سے پکارا۔ نفیسہ نے اسے بڑھ کر گلے سے لگا لیا۔

''وہ باہر ہیں' محلے والے سب جمع ہیں۔ احسن اور اس کے ابا تمہارے نکاح اور رابعہ باجی کے کفن دفن کا انتظام کر رہے ہیں۔''

زارا نے نفی میں سر ہلایا۔

''بیٹا تمہاری امی نے سب بتایا تھا ہمیں' اس لیے پہلے تمہارا نکاح ہوگا۔ بعد میں تمہارے تایا اور خالہ و دیگر عزیزوں کو رابعہ باجی کے انتقال کی خبر دیں گے یہ ضروری ہے بیٹا۔''

انہوں نے دھیمے لہجے میں اسے سمجھایا۔ زارا کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں۔

''یہ کیا ہوا میرے ساتھ امی خود تو مطمئن ہو کر روانہ ہو گئیں مگر اسے کیسے حالات کے سپرد کر گئیں۔'' زارا کی حالت دیکھ کر نفیسہ کے دل کو کچھ ہوا کیا قسمت پائی تھی۔ بے چاری نے چھوٹی عمر میں باپ چھوڑ گیا۔

نامساعد حالات، رشتے داروں کی تقریباً قطع تعلقی اور اب سخت پریشانی کے عالم میں ماں کا ساتھ بھی چھوٹ گیا۔ نفیسہ مسلسل روتی زارا کو چپ کروا رہی تھیں جبکہ زارا جب سے ہوش میں آئی تھی روئے جا رہی تھی۔

اسی وقت قمر الدین اندر داخل ہوئے انہوں نے تاسف سے روتی ہوئی زارا کو دیکھا پھر قریب آتے ہوئے اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا۔

''بیٹا! صبر سے کام لو۔ روؤ نہیں' جانے والے کو پیچھے رہ جانے والوں کے آنسو پریشان کرتے ہیں اللہ کی دی ہوئی امانت واپس لوٹانی ہی پڑتی ہے۔ بانی آپ کو کسی قسم کی پریشانی کو دل میں رکھنے کی ضرورت نہیں، رابعہ بہن سے آپ کے تحفظ کا وعدہ کیا تھا وہ ہر حال میں نبھاؤں گا۔ آپ کی امی مرحومہ کی خواہش پر میں اپنے بیٹے سے آپ کا نکاح کروا رہا ہوں، بچی آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟''

احسن کے والد نرمی سے اس سے پوچھ رہے تھے۔ زارا خاموشی سے روتی رہی پھر نفیسہ کے دوبارہ پوچھنے پر آہستگی سے سر کو اثبات میں ہلایا۔ گویا اپنی رضامندی دی۔

''نفیسہ! بچی کے سر پر دوپٹہ اوڑھا دیں میں نکاح خواں اور گواہان کو لے کر آتا ہوں۔''

قمر الدین باہر نکل گئے۔ نفیسہ نے زارا کے شانوں پر پھیلا دوپٹہ ذرا کھسکا کر اس کے سر کو ڈھک دیا۔

تھوڑی دیر میں نکاح ہو گیا۔ زارا کا غم سے بوجھل دل مزید پانی ہوا۔ کیسی بدنصیب بیٹی ہوں میں کاش امی کے بجائے میں مر جاتی۔ وہ انہی سوچوں میں غرق تھی کہ نفیسہ نے اس کا کندھا ہلایا۔ وہ چونکی۔

''بیٹا! اپنے تایا، خالہ اور دوسرے رشتے داروں کے نمبرز دو تاکہ ان کو تمہاری امی کی موت کی خبر دیں۔''

زارا اٹھی اور فون نمبرز کی چھوٹی سیاہ ڈائری لا کر تھما دی۔

رابعہ خاتون کی تدفین کر دی گئی تھی چھوٹا سا گھر رشتہ داروں سے بھرا ہوا تھا یہ وہ رشتے دار تھے جن کے قدم اس سے پہلے ان کے گھر کی دہلیز پار نہ کر سکے تھے۔ رات نے اپنے سیاہ پر پھیلائے تو سارے لوگ اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ کسی کے جانے سے دنیا کے کام نہیں رکتے۔ جس کا اپنا چھوڑ جاتا اصل نقصان اسی کا ہوتا ہے۔

خالہ کی چھوٹی بہو اپنی دو بچیوں کے ساتھ اس کے پاس ٹھہر گئی تھیں۔ باقی گھر والے خالہ کی خراب طبیعت کی وجہ سے گھر واپس چلے گئے تھے۔

تایا اور تائی جی بھی ادھر ہی رک گئے تھے۔ نفیسہ زارا کے ساتھ ساتھ تھیں۔ زارا امی کے بستر پر بیٹھی تھی پاس ہی نفیسہ آنٹی بیٹھی تھیں۔

سعدیہ بھابھی (خالہ کی بہو) زارا کے لیے دودھ کا گلاس اور کچھ بسکٹ لے آئی۔ زارا بے توجہی سے سامنے دھری ٹرے کو دیکھ رہی تھی۔ نفیسہ نے دودھ کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھمایا اور بسکٹ اس کے منہ کی طرف بڑھایا۔

''نہیں آنٹی! دل نہیں چاہ رہا میرا۔'' زارا نے بسکٹ پکڑ کر واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔

بیٹا مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔ صبر کرو تمہارا غم بے شک بڑا ہے۔ مگر تم اپنا صبر بڑا کر لو گی تو غم چھوٹا پڑ جائے گا۔''

زارا نے بمشکل دو بسکٹ نگل کر آدھا گلاس دودھ پی کر ٹرے میں رکھ دیا۔ ''اب تم آرام کرو۔'' نفیسہ اس کے بستر سے اٹھ کر ساتھ بچھائی چارپائی پر لیٹ گئیں جبکہ زارا بستر پر چت لیٹی کثرت سے رونے سے سرخ آنکھیں چھت پر جمائے اسی کو سوچنے لگی۔

''یہ کیا بکواس ہے؟'' انور صاحب نکاح کی بات سنتے ہی غصے سے اکڑ گئے۔ ''زارا کا نکاح ہر صورت میرے بیٹے سے ہوگا۔ مجھے یہ جھوٹی کہانیاں نہ سنائیں اور ہمارے گھر کے معاملات میں مداخلت نہ کریں۔''

قمرالدین نے نکاح نامہ جیب سے نکالا اور تایا جی کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ انور صاحب نے نکاح نامہ پکڑ کر پڑھا۔ پھر لال بھبھوکا چہرہ لیے وہ زارا کی طرف مڑے۔

''کیا چکر ہے یہ؟ بے حیا لڑکی اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔''

اس سے پہلے کہ زارا کچھ کہتی احسن نے زارا کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پیچھے کر لیا اور انور صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''آپ کو جو بھی بات کرنی ہے مجھ سے کریں۔ زارا اب میری بیوی ہے اور میں یہ ہرگز برداشت نہیں کروں گا کہ آپ زارا سے ایسے بات کریں اور آپ کو جو بھی کرنا ہو سوچ سمجھ کر کیجیے گا۔ اگر آپ اثر و رسوخ والے ہیں تو ہمارے تعلق بھی وہاں جا کے ہیں جہاں آپ کے ختم ہوتے ہیں۔''

انور صاحب نے جیسے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے پھر سختی سے بھینچ لیے۔ وہ جیسے بہت کچھ کہنے نہ کہنے کی کیفیت میں تھے۔ پاٹ دار آواز میں اپنی بیگم کو ساتھ آنے کو کہا اور گھر کی دہلیز پار کر گئے۔ زارا نے جیسے سکون کا سانس لیا۔

''میں دیکھوں گھر میں کھانے کا انتظام کہاں تک پہنچا۔'' نفیسہ بولتی ہوئی باہر نکل گئیں۔ قمرالدین بھی پیچھے چلے گئے۔ سعدیہ ... نے چھوٹی بچی کے لیے دودھ کا فیڈر تیار کیا اور کمرے میں چلی گئی۔

زارا کا ہاتھ ابھی تک احسن کی مضبوط گرفت میں تھا۔ پھر پاس پڑی کرسی پر زارا کو بٹھایا اور خود بھی دوسری کرسی گھسیٹ کر سامنے بیٹھ گیا۔

''میں بہت لمبے چوڑے دعوے نہیں کروں گا مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ سارے مسئلے کے شروع ہونے سے کہیں پہلے میں تمہارا اسیر ہوا تھا۔ جذبے سچے ہوں تو خدا راہیں بھی نکال دیتا ہے۔ میں احسان مند ہوں تمہارا کہ تم نے مجھ سے نکاح کی ہامی بھری۔''

جبکہ زارا منہ کھولے حیرت سے احسن کی شکل دیکھ رہی تھی۔ احسن اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھا۔

''میں اپنی پوری کوشش کروں گا کہ آئندہ زندگی میں کوئی پریشانی اور دکھ نہ ملے تمہیں۔ اگر تمہارے دل میں ہمارے رشتے کے حوالے سے کوئی بات ہے تو تم مجھ سے کہہ سکتی ہو۔''

''نہیں۔'' زارا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''نہیں میرا مطلب ہے مجھے اعتراض نہیں ہے۔'' زارا نے کچھ بوکھلاتے ہوئے وضاحت دی۔ جبکہ اس کے گھبرائے سے انداز پر احسن زیر لب مسکرا دیا۔

یقیناً آنے والی زندگی میں ڈھیروں خوشیاں ان دونوں کی منتظر تھیں۔ یہ زندگی کی راہ میں اللہ نے مشکلیں اور آسانیاں دونوں رکھی ہیں۔

اس نے آخری دنوں میں کچھ خط
بھیجے تھے
جن کی تحریر جگہ جگہ سے مٹی ہوئی تھی
میں نے کوشش کی کہ پڑھ سکوں مگر
میں نہیں پڑھ پایا
وہ خط، وہ تحریریں میں نے اپنے کاغذوں
میں رکھ دی تھیں
آج جب میں کچھ لکھ رہا تھا تو کھڑکی سے
آتی ہوئی
سرد ہوا کے جھونکے
ٹھنڈی بارش کی بوندیں
میں چونک گیا، کاغذ کو دیکھا
جس پہ حالِ دل کا لکھا تھا
مدھم ہو کر مٹ رہا تھا
مجھے جیسے خیال آیا
میں نے وہ پرانے خط نکالے
اس نے لفظ لکھے بھی کہاں تھے
اس نے خط میں درد میں لپٹی
بارش بھیجی تھی

سمیرا ستار انجھانی

یہ اور بات کہ رنگِ بہار کم ہوگا
نئی رُتوں میں درختوں کا بار کم ہوگا

تعلقات میں آئی ہے بس یہ تبدیلی
ملیں گے اب بھی مگر انتظار کم ہوگا

میں سوچتا تھا کل رات بیٹھ کر تنہا
کہ اس ہجوم میں میرا شمار کم ہوگا

پلٹ تو آئے گا شاید کبھی یہی موسم
ترے بغیر مگر خوشگوار کم ہوگا

بہت طویل ہے انس یہ زندگی کا سفر
بس ایک شخص پہ دارومدار کم ہوگا

انس معین

ایک دیوانے سے بھرے شہر کو جا لگتی ہے
یہ محبت تو مجھے کوئی وبا لگتی ہے

روز آتی ہے مرے پاس تسلی دینے
شبِ تنہائی! بتا تُو مری کیا لگتی ہے

ایک نقطہ تو ہے جو بدلا ہے دنوں میں ورنہ
لگتے لگتے ہی زمانے کی ہوا لگتی ہے

آنکھ سے اشک گرا ہے سو یہاں! ہاتھ اٹھا
تارہ ٹوٹے پہ جو کی جائے دعا لگتی ہے

تیری آنکھوں کے ستاروں کے طفیل اے مرے دوست
دشت پر ہول کی ظلمت بھی ضیا لگتی ہے

بات جتنی بھی ہو بے جا مگر اے شیریں سخن
جب ترے لب سے ادا ہو تو بجا لگتی ہے

خوش گمانی کا یہ عالم ہے کہ فارس اکثر
یار کرتے ہیں جفا، ہم کو وفا لگتی ہے

رحمان فارس

جان پہچان سے ڈر لگتا ہے
عہد و پیمان سے ڈر لگتا ہے

خود تو میں کب کا ہوا پتھر کا
دلِ نادان سے ڈر لگتا ہے

گو سمندر سے نکل آیا ہوں
پھر بھی طوفان سے ڈر لگتا ہے

جو نکلتا ہی نہیں دل سے
ایسے مہمان سے ڈر لگتا ہے

روز لوٹ آتا ہے جو شام کو گھر
اس پشیمان سے ڈر لگتا ہے

چلو جنگل کو ٹھکانہ کر لیں
مجھ کو انسان سے ڈر لگتا ہے

ہو قیامت کہ محبت ابرک
ان کے امکان سے ڈر لگتا ہے

اتباف ابرک

وجہ

ساس اپنے لنگڑاتے داماد کو سہارا دیتے ہوئے کلینک میں داخل ہوئی اور ڈاکٹر سے کہا۔

"میرے داماد کے لیے کچھ کیجیے ڈاکٹر! اس کی دائیں ٹانگ میں زخم ہو گیا ہے۔"

ڈاکٹر نے پوچھا۔ "زخم کیسے ہو گیا ہے؟"

وہ بولی۔ "دراصل کل میں نے اس پر گولی چلائی تھی۔"

"تم نے..... گولی چلائی اپنے داماد پر۔" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب!" ساس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس وقت تک یہ میرا داماد نہیں بنا تھا۔"

افسوس

پلمبر نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے کہا۔

"آپ نے ٹنکی ٹھیک کروانے کے لیے کہا تھا۔"

"تو بالآخر آپ پہنچ ہی گئے۔" اندر سے خاتون کی آواز آئی۔ "میں نے آپ کو پرسوں بلوایا تھا۔"

"اوہو، پھر غلطی ہو گئی۔" پلمبر پیشانی پر ہاتھ مار کر بولا۔ "میں تو ان کا گھر تلاش کر رہا ہوں جنہوں نے چار روز پہلے مجھے بلایا تھا۔"

پچھتاوا

ایک بڑے ہاسپٹل کے لیے ڈاکٹر کے معاون کی اسامی کے لیے انٹرویو ہو رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک نوجوان ڈاکٹر کا انٹرویو لیتے ہوئے سوال کیا۔

"......... غلطی تو نہیں کی؟"

"جی ڈاکٹر صاحب! ایک مرتبہ ایک ایسی غلطی کی کہ آج تک پچھتا رہا ہوں۔" نوجوان ڈاکٹر نے کہا۔

"وہ کیا؟" سینئر ڈاکٹر نے پھر سوال کیا۔

"میں نے ایک ارب پتی کا علاج صرف تین دن میں کر دیا۔"

ماضی

ایک صاحب نے اپنے دوست کو خیالوں میں کھویا ہوا دیکھا تو پوچھا۔

"یار! ہر وقت تم کن خیالوں میں کھوئے رہتے ہو، زندگی سکون اور آرام سے گزارنی ہے تو ماضی کی یادوں سے پیچھا چھڑا لو۔"

"میرے دوست! کیسے پیچھا چھڑا لوں؟" انہوں نے اداس لہجے میں کہا۔

"ماضی کی وہ یاد اب گھر آ گئی ہے۔"

تحفہ

سردار جی ایک دکان سے خریداری کر رہے تھے، اچانک تیل کا ڈبا اٹھا کر دکان دار سے بولے۔

"اس تیل کے ساتھ میرا گفٹ کہاں ہے؟"

دکان دار نے کہا۔

"اس کے ساتھ کوئی گفٹ نہیں ہے بھائی صاحب!"

سردار جی منہ بنا کر بولے۔

"اوئے ..... اس پر لکھا ہے کولیسٹرول فری۔"

ایک ایرلائن نے دو ہفتوں کے لیے یہ پرکشش آفر کی کہ اس کے ہوائی جہازوں میں اگر شوہر اور بیوی ایک ساتھ سفر کریں گے تو انہیں آدھے کرائے کی چھوٹ دی جائے گی۔

دو ہفتے کی تمام پروازیں مکمل ہو چکیں تو ایرلائن کے پبلسٹی سیکشن نے مسافروں کی بیویوں کو خط لکھے کہ انہیں جہازوں میں سفر کرنا کیسا لگا؟

سب بیویوں کی طرف سے ایک جیسا جواب آیا۔

''ہم نے کب سفر کیا؟''

جھٹکا

ایک صاحب نے ریسٹورنٹ میں چرغے کا آرڈر دیا۔ چرغہ آیا تو اسے چکھنے کے بعد انہوں نے ویٹر کو بلایا اور پوچھا۔

''تمہارے ہاں چرغہ کس طرح تیار کیا جاتا ہے۔ گیس کے ذریعے یا کوئلوں پر؟''

''ہمارے ہوٹل میں چرغہ بجلی سے پکایا جاتا ہے جناب!'' ویٹر نے فخر سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، تو پھر اسے بجلی کے دو تین جھٹکے اور لگوا لاؤ۔'' ان صاحب نے چرغے کی پلیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

پچھتاوا

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ شادی کے بعد مرد میں فہم کا مادہ بڑھ جاتا ہے۔'' بیوی نے پوچھا۔

''ہاں معلوم ہے، مگر اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔'' شوہر نے جواب دیا۔

دوست کہیں جسے

ایک محفل میں عطا الحق قاسمی نے صرف آدھے گھنٹے میں جب چھٹا سگریٹ سلگایا تو بیرون ملک سے آئے ان کے دوست نے قدرے پریشانی سے کہا۔

''عطا...... یار! تم بہت سگریٹ پینے لگے ہو۔ اچھی بات نہیں ہے یہ۔''

''اب کم کر دوں گا۔'' عطا الحق قاسمی نے جواب دیا۔

''کم کردوں گا نہیں۔ ابھی کم کردو۔'' دوست نے فوراً کہا ''لاؤ ایک سگریٹ مجھے دے دو۔''

آرام اور تفریح

اطلاعی گھنٹی پر ملازم نے دروازہ کھولا، سامنے صاحب کے دوست کھڑے تھے۔

''صاحب گھر پر ہیں تمہارے؟''

''جی نہیں وہ سفر پر گئے ہوئے ہیں۔'' ملازم نے جواب دیا۔

''اوہ اچھا!'' دوست نے کہا۔ ''کیا آرام اور تفریح کی غرض سے گئے ہیں؟''

''میرے خیال میں نہیں۔'' ملازم نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''کیونکہ بیگم صاحبہ بھی ساتھ ہی گئی ہیں۔''

فائدہ

ایک بیوٹیشن کو اپنی کسٹمر کے شوہر کہیں مل گئے سلام دعا کر کے بیوٹیشن نے یوں ہی پوچھ لیا۔

''میں نے آپ کی وائف کو ملتانی مٹی کا ماسک لگانے کا مشورہ دیا تھا۔ کیا اس سے ان کا چہرہ بہتر ہوا؟''

''جی ہاں۔'' بالکل شوہر نے فوراً جواب دیا۔ ''جب تک ماسک لگا رہتا ہے۔ چہرہ بہتر لگتا ہے۔''

ثمرہ عاقب ـــــــ کراچی

دیکھ یہ ہاتھ میرا اور بتا دست شناس
رزق کتنا ہے مقدر میں، محبت کتنی؟

آسیہ جاوید ـــــــ علی پور چٹھہ

زندگی، جس میں بوجھ لگتی ہے
وہ بھی دن آئیں گے شمار میں کیا
لگ رہے ہیں بھول جاؤں تمہیں
یہ مجھے میرے اختیار میں کیا

ارم کمال ـــــــ فیصل آباد

اپنے تلاشِ یار میں گم ہو گیا ہوں میں
آؤں گا اب نظر کسی اہلِ نظر کو میں!

ندا طارق ـــــــ فیصل آباد

زندگی کسی طرح بسر ہو گی
دل نہیں لگ رہا محبت میں

ہاجرہ تہامی ـــــــ کراچی

زمانہ جس کو دریا کہہ رہا ہے
ہماری آنکھ سے ہو کر گیا ہے

عظمیٰ رزاق ـــــــ کراچی

بتاؤ جس تجارت میں خسارہ ہی خسارہ ہو
بنا سوچے خسارے کی تجارت کون کرتا ہے
ہمیں ہی غلط فہمی تھی کسی کے واسطے ورنہ
زمانے کے رواجوں سے بغاوت کون کرتا ہے

اقرا امین ـــــــ کوہاٹ

اب تک شکستِ ذات کی خفت نہیں گئی
اک جنگ اپنے آپ سے ہارا تھا میں کبھی

ناصیہ یاسر ـــــــ گوجر خان

اپنوں کی بے وفائی بڑا کام کر گئی
اس آگ میں حیات تپی اور نکھر گئی

رضوانہ فیصل ـــــــ میانوالی

بس ذرا توڑ پھوڑ ہوتی ہے
لوگ بھرے مر نہیں جاتے

حمیرا ناصر ـــــــ کراچی

عشق اور مشک چھپے لوگوں تک چھپ جائے
خالی اور جھوٹی کو بنا کبھی نہ جھپے بکنے

اریبہ فرخ شاہد ـــــــ آزاد کشمیر

ایک دن بوجھ بھی پھر سے گی حیات
اہلِ دل کس قدر میں رہتے ہیں
منزلِ زیست کی کشش مت پوچھ
راستے بھی سفر میں رہتے ہیں

ماہ نور علی ـــــــ کراچی

اب تو خواہش ہے کہ یہ زخم بھی کھا کر دیکھیں
لحہ بھر کو ہی سہی اس کو بھلا کر دیکھیں
رونے والوں کے تو ہم درد بہت ہیں محسن
ہنستے ہنستے کبھی دنیا کو رلا کر دیکھیں

فائقہ سہیل ـــــــ کراچی

اگلی محبتوں نے وہ نامرادیاں دیں
تازہ رفاقتوں سے دل تھا ڈرا ڈرا سا

صفیہ، نازیہ منیر ـــــــ گوجر خان

تمہارے وصال کے لمحے عجب طرح گزرے
نظر خموش، دل پہ تھا جیسے برپا

لائبہ امینی ـــــــ مظفر آباد

کوئی بھی شکل مکمل نظر نہیں آتی
یہ کس نے توڑ دیا ہے نظر کا آئینہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"تم آگ سے بچو، اگرچہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ساتھ ہی۔"
(بخاری و مسلم)

فائدہ:۔
اس سے معلوم ہوا کہ حسب استطاعت اللہ کی راہ میں تھوڑا سا خرچ کرکے بھی اللہ کی رضا حاصل کی جاسکتی ہے۔

سادگی

حضرت ابورافع کی بیوی حضرت سلمیٰ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: "حضرت حسن بن علی، حضرت عبداللہ بن جعفر اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔
"آپ ہمارے لیے وہ کھانا تیار کریں جو حضور کو پسند تھا۔"
میں نے کہا: "اے میرے بیٹو! میں پکا تو دوں گی لیکن آج تمہیں وہ کھانا اچھا نہیں لگے گا۔"
چنانچہ میں اٹھی اور جو لے کر انہیں پیسا اور پھونک مار کر موٹی موٹی بھوسی اڑا دی پھر اس سے ایک روٹی بنائی پھر اس پر تیل لگایا اور اس پر کالی مرچ چھڑکی پھر لے ان کے سامنے رکھا اور میں نے کہا۔
"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کھانا پسند تھا۔"

غریب کا ہدیہ قبول کرنا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔
"ایک مسکین عورت میرے پاس آئی۔ وہ مجھے تھوڑی سی چیز ہدیہ کرنا چاہتی تھی۔ مجھے اس کی حاجت ...

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"تم نے ایسا کیوں نہ کیا کہ تم اس سے ہدیہ قبول کر لیتیں اور پھر اسے ہدیے کے بدلے میں کچھ دے دیتیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ تم نے اس عورت کو حقیر سمجھا ہے۔ اے عائشہ! تواضع اختیار کرو کیونکہ اللہ تواضع کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

اعلیٰ درجہ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔
"آدمی علم کے اعلیٰ مرتبہ پر اس وقت ہوگا جب اپنے سے اوپر والے سے حسد نہ کرے اور اپنے سے نیچے والے کو حقیر نہ سمجھے اور علم کے بدلے میں کوئی قیمت نہ چاہے۔"

بہترین آدمی

حضرت معاویہ بن حرمل رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ میں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔
"اے امیر المومنین! آپ کے لشکر کے قابو پانے سے پہلے ہی میں نے توبہ کر لی ہے۔"
حضرت عمرؓ نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"
میں نے کہا: "میں مسیلمہ کذاب کا داماد معاویہ بن حرمل ہوں۔"
حضرت عمرؓ نے فرمایا: "جاؤ اور مدینہ والوں میں جو سب سے بہترین آدمی ہے ... کے مہمان بن جاؤ۔"
میں حضرت تمیم داری ...

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آکر تمیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا: "چلو۔" (اس آگ کا انتظام کرو)
حضرت تمیم رضی اللہ عنہ نے کہا: "میری کیا حیثیت ہے؟ اللہ کیا آپ اس بات سے نہیں ڈرتے کہ میرے پوشیدہ عیوب آپ پر ظاہر ہوں؟"
اس طرح حضرت تمیم رضی اللہ عنہ کسر نفسی کر رہے تھے۔
لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اصرار فرمایا تو حضرت تمیم رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور آگ کو دھکے دیتے رہے یہاں تک کہ جس دروازے سے نکلی تھی اسی میں اسے داخل کر دیا اور پھر خود بھی آگ کے پیچھے اس دروازے کے اندر چلے گئے اور پھر باہر آگئے اور ان سب کے باوجود آگ انہیں کچھ نقصان نہ پہنچا سکی۔

برکت ؛

حضرت سعد بن میناء رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔
"حضرت بشیر رضی اللہ عنہ کی بیٹی جو کہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی بہن ہیں۔ وہ فرماتی ہیں۔
مجھے میری والدہ حضرت عمرہ بنت رواحہ رضی اللہ عنہا نے بلایا اور مٹھی بھر کھجوریں میری جھولی میں ڈال کر فرمایا۔
"اے بیٹی! اپنے والد اور اپنے ماموں حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے پاس ان کا دوپہر کا کھانا لے جاؤ۔"
میں وہ کھجوریں لے کر چل پڑی اور اپنے والد اور ماموں کو ڈھونڈتی ہوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزری۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اے بیٹی! یہاں آؤ یہ تمہارے پاس کیا ہے؟"
میں نے کہا: "یہ کھجوریں ہیں جنہیں دے کر میری والدہ نے میرے والد اور ماموں کے پاس بھیجا ہے تاکہ وہ یہ کھائیں۔"
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مجھے دے دو۔"
میں نے وہ کھجوریں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں ہاتھوں میں ڈال دیں۔
وہ کھجوریں اتنی تھوڑی تھیں کہ ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ نہ بھر سکے۔
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر ایک کپڑا بچھایا گیا جس پر آپ نے وہ کھجوریں ڈال دیں۔ وہ کھجوریں کپڑے پر بکھر گئیں۔
ایک آدمی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھا۔ آپ نے اس سے فرمایا۔
"خندق والوں میں اعلان کر دو کہ کھانے کے لیے آ جائیں۔"
چنانچہ خندق والے سب جمع ہو گئے اور کھجوریں کھانی شروع کر دیں۔ تو کھجوریں بڑھتی جا رہی تھیں۔ یہاں تک کہ سب خندق والے کھا کر واپس چلے گئے اور کھجوریں اتنی زیادہ ہو گئی تھیں کہ کپڑے سے نیچے گر رہی تھیں۔

غیبی امداد ؛

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے کہ انہیں بہت زیادہ پیاس لگی تھی ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہے تھے کہ اتنے میں ہمیں ایک عورت ملی جو پانی کے دو بڑے مشکوں کے درمیان پاؤں لٹکائے ہوئے اونٹنی پر بیٹھی ہوئی تھی۔
ہم نے اس سے پوچھا: "پانی کہاں ہے؟"
اس نے کہا: "یہاں تو کہیں پانی نہیں ہے۔"
ہم نے اس سے کہا: "تمہارے گھر سے پانی کتنے فاصلے پر ہے؟"
اس نے کہا: "ایک دن ایک رات کی مسافت پر ہے۔"
ہم نے کہا: "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلو۔"
اس نے کہا: "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کون ہوتے ہیں؟"
ہم نے اسے نہ کچھ کہنے دیا اور نہ بولنے دیا اور نہ بھاگنے دیا۔ بلکہ اس پر قابو پا کر اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کی خدمت میں لے آئے۔

اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی ویسی ہی باتیں کیں جیسی ہمارے سامنے کی تھیں، البتہ اس نے یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ اس کے بچے یتیم ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے پر اس کی دونوں بڑی مشکیں ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مشکوں کے منہ پر دست مبارک پھیرا۔ ہم چالیس آدمی تھے۔ پہلے تو ہم نے ان مشکوں سے خوب سیر ہو کر پانی پیا پھر ہمارے ساتھ جتنے مشکیزے اور برتن تھے، وہ سب بھرے اور اتنے زیادہ بھرے کہ وہ پھٹنے والے ہو گئے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو کچھ تم لوگوں کے پاس ہے، وہ لے آؤ۔"

چنانچہ ہم نے روٹی کے ٹکڑے اور کھجوریں جمع کر کے اس عورت کو دے دیں۔

پھر وہ عورت اپنے گھر والوں کے پاس گئی اور انہیں بتایا۔

"میں یا تو سب سے بڑے جادوگر سے مل کر آئی ہوں یا پھر سچ مچ وہ نبی ہیں۔ جیسے کہ ان کے ساتھی کہہ رہے تھے۔"

چنانچہ اس عورت کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اس کے ڈیرے والوں کو ہدایت عطا فرمائی اور وہ عورت بھی مسلمان ہو گئی اور ڈیرے والے بھی مسلمان ہو گئے۔

اس حدیث کو بخاری اور مسلم دونوں نے ذکر کیا ہے۔ ان دونوں کی دوسری حدیث میں یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت سے فرمایا۔

"یہ کھانے کا سامان اپنے ساتھ اپنے بچوں کے لیے لے جاؤ اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم نے تمہارے پانی میں سے کچھ نہیں لیا۔ ہمیں تو یہ سارا پانی اللہ نے اپنے غیبی خزانے سے پلایا ہے۔"

برداشت:

یونانی فلاسفر سقراط کی درس گاہ کا صرف ایک اصول تھا، اور وہ تھا برداشت۔ یہ لوگ ایک دوسرے کے خیالات تحمل کے ساتھ سنتے تھے۔ یہ بڑے سے بڑے اختلاف پر بھی ایک دوسرے سے الجھتے نہیں تھے۔ سقراط کی درس گاہ کا اصول تھا اس کا جو شاگرد ایک خاص حد سے اونچی آواز میں بات کرتا تھا، یا پھر دوسرے کو گالی دے دیتا تھا یا دھمکی دیتا تھا یا جسمانی لڑائی کی کوشش کرتا تھا اس طالب علم کو فوراً اس درس گاہ سے نکال دیا جاتا تھا۔

سقراط کا کہنا تھا، برداشت سوسائٹی کی روح ہوتی ہے۔ سوسائٹی میں جب برداشت کم ہو جاتی ہے تو مکالمہ کم ہو جاتا ہے اور جب مکالمہ کم ہو جاتا ہے تو معاشرے میں وحشت بڑھ جاتی ہے۔ اس کا کہنا تھا: اختلاف، دلائل اور منطق پڑھے لکھے لوگوں کا کام ہے۔ یہ فن جب تک پڑھے لکھے عالم اور فاضل لوگوں کے پاس رہتا ہے۔ اس وقت تک معاشرہ ترقی کرتا ہے لیکن جب یہ دلائل یا اختلاف جاہل لوگوں کے ہاتھ آ جاتا ہے تب معاشرہ انارکی کا شکار ہو جاتا ہے۔

تجربہ بارے:

- نیا سال عمر کی گردش، بڑھتے ہوئے خطرے کا نشان ہے جو زندگی کا کچھ حصہ اور یادیں، یادداشت بھی توڑ دیتا ہے۔ کبھی روکتا ہے کبھی ٹوکتا ہے اور آنے والے دنوں کی تلخیوں، توقعات اور امیدوں کے ٹوٹے ٹوٹوں اور امید پر یقین سے بے خبر کرتا ہے۔
- کہتے ہیں کبھی کوئی ایک کسی شخص کی منزل بن جاتا ہے، نہ دولت نہ طاقت وہی ایک وجود مرکز بن جاتا ہے، سوچوں کا محور بن جاتا ہے۔

(اختر عباس)

مردان سے صائمہ گل نے لکھا ہے

28 تاریخ سے ہی میاں جی کے چکر لگوانا شروع کر دیے۔ (روزانہ آفس فون کر کے یاد دہانی کروائی پلیز واپسی پر شعاع کا معلوم کر لیجیے گا۔ میاں جی روزانہ پوچھتے پوچھتے تھک آ گئے۔ آخر کار 2 فروری کو شعاع ہاتھ نہیں آیا۔

بے صبری سے خطوں کی محفل میں جھانکا، ہمارا خط ندارد۔ میاں جی شکل ملاحظہ کر کے جان گئے کہ خط نہیں آیا۔ "حد ہوتی ہے بچپنے کی بھی" میاں جی بڑبڑائے۔ ہم بھی کیا کریں کہ شعاع اور خواتین کے معاملے میں ہم ابھی "بچے" ہی ہیں۔

اچھا تبصرے سے پہلے ایک بہت ہی اچھی خبر۔ محمد نہال (بڑا بیٹا) نے اللہ کے فضل و کرم سے قرآن حفظ کر لیا ... ترجمے کے ساتھ اور محمد طلال نے ناظرہ ... مکمل کر لیا ہے ... خوشی میں ایک چھوٹی سی تقریب ... ہے۔

بس میری طرف سے آپ سب کو دعوت ہے۔

ماڈل بالکل بھی پسند نہیں آئی۔ پتا نہیں کیوں سلسلے وار ناول بورنگ ہوتے جا رہے ہیں۔ "بے لوث خادمی رقصم" مدت بعد شاہوں کو پڑھا، زبردست۔ واقعی میں چور راستے تباہی لاتے ہیں۔ میمونہ صدف کی 2021ء کی جو لیسٹ اچھی تھی لڑکیوں کو ایسا ہی خوددار ہونا چاہیے۔

"عمر پیرا" "حسن حسین کسی گریٹ ہو" "ایک گلاس پانی" نجانے کیوں لکھ کر یہ کہانی بچی گئی۔ "زنجیر" ایسی فتنہ پرور عورتیں خون کی ندیاں بہا دیتی ہیں پڑھ کر دل زخمی سا ہوا۔

سب سے پیارا افسانہ "چھوٹے ٹیگل" لگا ہماری آج کی رائٹرز خاص کر افسانہ نگار بہت اچھا لکھتی ہیں۔ پیار و محبت سے ہٹ کر چھوٹے چھوٹے گھریلو مسائل کو بہت اچھے سے سامنے لاتی ہیں۔ باقی سلسلوں میں تاریخ کے جھروکے اور خوب صورت پلیے سوئٹ فیورٹ ہے۔

☆ پیاری صائمہ! بہت دلچسپ خط لکھا ہے آپ نے۔ پڑھ کر مزا آیا۔ شعاع اور خواتین والوں کا کہہ کر شوہر صاحب کو ڈرایا نہ کریں وہ شعاع اور خواتین کا گھر

رضیہ جمیل

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔
Email:shuaa@khawateendigest.com

میں داخلہ بند کر دیں گے۔

آپ کے بچوں نے قرآن حفظ کیا۔ ترجمہ کے ساتھ پڑھا۔ یہ بہت بڑی سعادت اور خوش بختی ہے۔ ہماری طرف سے دلی مبارک باد۔ کبھی مردان آنا ہوا تو آپ کے گھر ضرور آئیں گے۔ پکا وعدہ۔

تناشا انصاری سیالکوٹ سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

آج 2 فروری ہے رسالہ کل موصول ہوا مگر ابھی پڑھا نہیں کیوں کہ مصروفیت کچھ ایسی ہے کہ وقت نہ مل سکا جامعہ کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ اسکول میں جاب بھی کر رہی ہوں اس لیے روٹین ٹف ہے۔

پیاری تناشا! آپ نے خط لکھا بہت خوشی ہوئی۔ آپ کی کہانیوں کے لیے معذرت آپ کو مزید محنت کرنے کی ضرورت ہے۔

حرا ملک نے وہاڑی سے لکھا ہے

اس ماہ کا شمارہ پڑھا یقین کریں دل شاد شاد ہوگیا۔ تمام رسالہ زبردست تھا۔ پلیز مجھے یہ بھی بتایے کا

کہ کیا مجھ میں کوئی ناول وغیرہ لکھنے کی قابلیت ہے۔ میری بہن ثمینہ، شارقہ فاطمہ کے انٹرویو کی درخواست کر رہی ہیں آپ سے پلیز..... میں نے اور میری بڑی آپی ثمینہ نے "پیا ملن کی رت" ام طیفور کا ناول دوبارہ پڑھا، آپی ان سے درخواست ہے کہ اس طرح کے خالصتاً پنجابی ناول پھر لکھیں ذہن فریش ہو جاتا ہے۔

☆ پیاری حرا! اللہ تعالیٰ آپ کے بہن بھائیوں کے گھر آباد کرے۔ آمین۔ شادی زندگی کا حصہ ہے زندگی نہیں۔ وقت آنے پر آپ کے بہن بھائیوں کے گھر بھی ضرور بس جائیں گے (ان شاءاللہ)

آپ کی جاب کے لیے دعا گو ہیں۔ آپ اچھی جاب کے لیے کوشش کرتی رہیں۔ لیکن فی الحال جو بھی جاب ملے اسے قبول کرلیں۔ صلاحیت کا پتا تو تب ہی چلے گا جب آپ کچھ لکھ کر بھیجیں گی۔

امرحہ حسین لکھتی ہیں

سرورق پر ماڈل بہت خوب صورت لگ رہی تھیں، ماشاءاللہ۔

سب سے پہلے "خط آپ کے" کی طرف بھاگے، اپنے خط کا انتظار جو تھا۔ اور جب اپنے نام پر نظر پڑی تو دل جھوم گیا۔ میری تجویز کو آپ نے اہم جانا۔ اس کے لیے میں آپ کی تہ دل سے ممنون ہوں۔

اس کے بعد اپنا فیورٹ ناول "عمر یسرا" پڑھا۔ حنہ حسین میرے پاس الفاظ کا ذخیرہ یقیناً بہت کم ہے جو آپ کو خراج تحسین پیش کرسکے۔ ناولٹ میں "یہ نوک خاری رقصم" کی کہانی جیسی جیسے کے لکھنے کا انداز بہت عمدہ تھا۔ افسانوں میں حمیرا شفیع کا افسانہ بہت اچھا لگا۔

☆ پیاری امرحہ! ہم آپ کا سوال نمرہ احمد کو پہنچادیں گے۔ انہوں نے جواب دیا تو ضرور شامل کریں گے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے ممنون ہیں۔

نظیر زہرا راولپنڈی سے شریک محفل ہیں

آغاز حنہ حسین کے ناول "عمر یسرا" سے کیا۔ انتہائی زبردست کہانی ہے۔ چوتھی قسط کا بے صبری سے انتظار ہے۔ اس کے بعد تنزیلہ ریاض کا "نور القلوب" پڑھا۔

تنزیلہ ریاض کا کوئی ناول میں پہلی بار پڑھ رہی ہوں، البتہ میری والدہ ان کے ناول پڑھتی رہی ہیں۔ رخسانہ نگار عدنان کا "شام کی حویلی میں" پڑھا۔ یہ کشف کوئی عجیب سا کردار ہے۔ یہ ناول کافی لمبا ہوتا جارہا ہے۔ افسانوں میں "سال نو کی پہلی صبح" ٹاپ پر رہا ہے۔ بلاشبہ یہ ہمارے معاشرے کی ایک سچی تصویر ہے۔ چھوٹے [illegible] ایک بہت جاندار افسانہ تھا۔ قرۃ العین خرم ہاشمی جب بھی آتی ہیں، چھا جاتی ہیں۔ باقی افسانے کوئی اتنے خاص نہیں لگے۔

ناولٹ میں "رومیو جیولیٹ" بہت پسند آیا۔ "یہ نوک خاری رقصم" بھی زبردست تھا۔ "نیلی پھوپھو" ایک روایتی سی کہانی تھی۔ شعاع کے سارے سلسلے زبردست تھے مگر "تاریخ کے جھروکے" اور "خط آپ کے" سب سے بہترین تھے۔ ایک بات بتاؤں، میں نے شعاع اور خواتین ڈائجسٹ اب پڑھنا شروع کیا جبکہ میری والدہ 1990 سے شعاع اور خواتین ڈائجسٹ پڑھ رہی ہیں۔

☆ پیاری نظیر! آپ کی والدہ کا شعاع سے ان کا تیس سال تعلق ہے۔ اپنی والدہ کو ہمارا سلام پہنچادیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

فریدہ جاوید ملتان سے لکھتی ہیں

شعاع حسب معمول بہت پسند آیا۔ ماشاءاللہ فرماں بردار ہے میرا بیٹا۔ [illegible] کے شعبے میں ماسٹرز کررہا ہے اور کہتا ہے ماسٹرز کے بعد پی ایچ ڈی کرے گا ایجوکیشن میں اور پھر جاب اور پھر شادی۔ جبکہ مجھے شوق ہے کہ جلدی سے اپنے پوتے پوتی کھلاؤں۔ رسالے پڑھنے کی وجہ سے بھی اس کی شخصیت میں نکھار آیا ہے۔

اگر آج یونی ورسٹی میں بیٹے کی کچھ عزت ہے تو میں سمجھتی ہوں کہ کہیں نہ کہیں ان رسائل کا بھی حصہ ہے کہ مثبت کہانیوں سے کردار سازی ہوتی ہے اور شخصیت کی تعمیر۔ ہاں میری پسندیدہ ترین رائٹر نگہت سیما، صاحبہ بھی شاید ٹیچنگ کے شعبہ سے وابستہ ہیں۔ ٹائٹل اچھا لگا۔ غرارے اور شرارے مجھے بہت پسند ہیں۔ مگر مجھے آج کے دلہنوں کے لباس سے وہ چالیس سال پرانے لباس دلہنوں کے پسند ہیں۔ ویسے میرے تو چار لگتے تھے۔ منگنی میں گلابی تھا۔ کھل کام تھا بھرا ہوا پھر بارات و ولیمہ کا سسرال

کی طرف سے اور بارات کا گھر کی طرف سے بھی تھا۔ اور ابھی تک وہ لباس میری پیٹی میں پڑے ہیں کام کا لانہ ہوا۔
آپ نے شعاع میں ایک بہن کو خط کے جواب میں کہا تھا کہ الفاظ ایسے نہ ہوں کہ وہ کسی کو تکلیف دیں۔
آپ کی بات کو پڑھ کر مجھ میں مثبت تبدیلی پیدا اور خامی دور ہوئی۔ رخسانہ جی کے ناول میں "کشف" تیرے لیے سے جاری ہے اب وہ بھی کیا کرے۔ تنزیلہ کے ناول میں ابھی تک کچھ وضاحت نہیں ہوئی۔ "بیلی پھوپھو" اینڈ میں بھی شرمندہ نہ ہوئیں۔ واقعی دنیا میں ایسی بھی پھپھیاں ہوتی ہیں۔ "یہ لوگ خارجی رقص" پڑھ کر عنوان سے 1992 کا ناول شعاع کا "یہ لوگ خارجی رقص" یاد آ گیا اور نگہت سیما جی کی تحریر اب جلدی سے شعاع میں لائیں آخری اکتوبر 2019ء میں "اک دیا رہنے دیا" تھی۔ اب جلدی سے نگہت آ جائیں طویل ناول کے ساتھ آئیں۔ نبیلہ جبیں کے ناول میں ہیرو کا فیصلہ پسند آیا کہ عزت بچ گئی۔ اگرچہ ناول روایتی سا ہے مگر جبیں کا انداز بیاں اور منظر کردار نگاری کمال کی ہے۔ "عمارہ جہاں" کا افسانہ مختلف تھا اور اچھا لگا کہ مجھے حویلی کی کہانیاں پسند ہیں۔ شعاع میں تاریخی کہانی بھی لائیں۔ "میرا انتخاب" کا تو نام ہی کافی ہے۔ تیرا اب آپ مکمل ناول بھی لکھیں۔ "ماں اور ساس" بھی افسانہ پسند آیا۔ "چھوٹے محل" بھی اچھا تاثر چھوڑ گئے اور آخر میں دیورانی جیٹھانی اور ساس کا ملن دلکش تھا۔
"شاہ راحیل شیف" سے سوالات اچھے تھے۔ جبکہ اور دوسروں سے ملاقات نہ پسند آئی۔ پیارے نبی کی باتیں پسند ہمیشہ ہی آتی ہیں۔ بہنیں دعا کریں جنید پڑھ لکھ کر اچھے عہدے پر لگے کہ تمام کام ہوں اور مجھ پریشانیاں کم ہوں کہ بیٹا باپ کی مدد کرے۔
☆ پیاری حمیدہ! شعاع کا ٹائٹل دیکھ کر آپ کو اپنی شادی کے غرارے یاد آ گئے۔ بلاشبہ شادی کا دن ایک لڑکی کی زندگی کا اہم ترین دن ہوتا ہے جسے وہ کبھی نہیں بھولتی۔ یہ ہمیشہ ایک خوش گوار اور کبھی کبھی ناگوار یاد کی صورت اس کی یادداشت میں محفوظ رہتا ہے۔ جہاں تک پرانے غراروں کی بات ہے تو روایت کا اپنا ایک حسن ہے یہ جو آج کل غراروں کی مختلف شکلیں اور ان پر کام نظر آ رہا ہے۔ یہ پرانی روایت کا ہی تسلسل ہے تھوڑی تبدیلی کر کے نئی شکل دے گئی ہے۔
پوتی پوتوں کو گود میں کھلانے کا شوق اپنی جگہ لیکن بیٹے کی شادی میں جلدی نہ کریں اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے دیں ورنہ آگے چل کر کئی مسائل کھڑے ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ جنید کو ان کے من پسند شعبہ میں کامیاب کرے، آمین۔
آپ کو جس طرح تحریریں اور ان کی اشاعت کا مہینہ اور سال تک یاد ہے اس کی داد دیں گے۔ نگہت سیما تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں کہ وہ شعاع کے لیے بھی ناول لکھیں۔
نگہت سیما ٹیچنگ کے شعبہ سے وابستہ ہیں۔ ان کا طویل ناول اس ماہ خواتین میں شامل ہے۔
اپنی شادی کا احوال ضرور لکھیں۔ دلچسپ ہوگا۔ آپ کی پرانی شادی کا احوال اور یادیں۔

سیدہ بخاری اینڈ بخاری سسٹرز نے کبیر والا سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

کیا میں نہیں بولتی آپ سے چھ ماہ ہو گئے اگر میں خط نہیں لکھوں گی تو کسی نے یاد بھی نہیں کیا اتنی بے مروتی؟
اب آتے ہیں رسالے کی طرف مجھے سمجھ نہیں آ رہی کیا تبصرہ کروں مہینے ڈیڑھ بعد ویک اینڈ گزارنے جاتی ہوں بس جلدی جلدی میں کچھ سے پڑھا بھی نہیں جاتا ساری کہانیاں گڈمڈ ہو جاتی ہیں اس لیے خط بھی نہیں لکھتی تھی۔ بہرحال شام کی حویلی اچھا جا رہا ہے۔ ردا کی وفات کا بہت دکھ ہوا۔ چلو جو بھی ہوا پندرہ دن تو ختم ہوئے۔ دوسرا سال ہے پندرہ دن ہی نہیں گزر رہے تھے پلیز اسپیڈ بڑھائیں ناول کی۔ فائزہ بھٹی، زینب نور اور ریحانہ چوہدری کو مبارک باد۔ ڈاکٹر فریال ہستی مسکراتی رہو۔ ایک ٹپ ہے آپ کے لیے۔ میری تین سالہ بھانجی ڈاکٹر مسفرہ نے پیٹ کے درد کا علاج دریافت کیا ہے شاید آپ کے مریضوں کو بھی فائدہ ہو جائے۔ ہم منہ پھیل رہی تھیں چار سالہ خزیمہ کہتا "امی ای سفرہ منہ کھا رہی ہے اس کے پیٹ میں درد ہو جائے گا وہ کہتی پھر کیا ہوا میں پیٹی ترلوں گی (پھر کیا ہوا میں پٹی کرلوں گی) ہاہاہا۔ آپ بھی اپنے مریضوں کو یہ مشورہ مفت دے سکتی ہیں۔ ا[illegible] میری چار سالہ [illegible] سب اسے پچھلے مہینے [illegible]

کہتی "مجھے چھٹی دے دیں مجھے بھوک لگی ہے۔"
انہوں نے کہا "روٹی کھالو ہمارے پاس روٹی ہے۔"
کہتی "نہیں میں تو دودھ پیتی ہوں۔"
انہوں نے کہا "دودھ بھی ہے یہ لو!" اب بے چاری چپ۔

تھوڑی دیر بعد کہتی "مجھے چھٹی دے دیں آج میری مما کا نکاح ہے۔" ٹیچر ہکا بکا۔ ٹیچر بھی کزن ہے۔ اس نے کہا "تمہاری مما کا تو نکاح ہوا ہوا ہے۔" کہتی "اچھا تو منگنی ہوتی (اچھا پھر منگنی ہوں) چھٹی دے دو۔"

آپ میں سے بھی کبھی کسی نے ایسا بہانا لگایا چھٹی کے لیے۔ اصل میں ہوسٹل سے خط لکھ رہی ہوں۔ بچوں کی باتیں بڑی یاد آ رہی ہیں۔

ہاں پچھلے دنوں پتا کیا ہوا۔ رضائی میں پڑی کانپ رہی تھی۔ اسماء نے کہا کہتی "باجی مالٹا کھا کر دکھائیں انعام دوں گی" میں نے کہا "مہربانی۔ اپنا انعام اپنے پاس رکھو" کہتی "اچھا میں اور ثابت چھلکے سمیت کھالوں تو کیا انعام دیں گی" میں نے کہا "پڑھ لو" مجھے "کام نہیں کرنے"۔ ایک اور ٹیچر نے بھی کہا کہتی "آپ کو کیا پتا ایڈونچر کیا ہوتا ہے۔"

چلو ٹھیک ہے پھر کھا کر دکھاؤ۔ 60 روپے شوارمے سے زنگر برگر پر بات فائنل ہو گئی۔ میں نے کہا "اسماء کلمہ پڑھ لو، مر بھی سکتی ہو۔" مذاق میں بات ہو رہی تھی، میں نے اسے کلمہ پڑھایا۔ اچھا اس نے پورا مالٹا چھلکے سمیت منہ میں ٹھونس لیا۔ میں دوسری طرف رخ کیے بیٹھی تھی۔ چھپانے کی کوشش میں۔ جو نہی میری نظر اسماء پر پڑی، وہ ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتی جا رہی تھی۔ منہ میں مالٹا پھنسا تھا اور آہستہ آہستہ آنکھیں سرخ ہوتی جا رہی تھیں اور پھر یکدم وہ ایک طرف لڑھک گئی۔ ٹیچر نے جلدی جلدی منہ سے مالٹا نکالا۔ وہ بے ہوش تھی پھر اس کے منہ میں چھینٹے مارے۔ کہتی تھی باجی اگر میں مر جاؤں تو زنگر برگر میرے ختم میں رکھنا، اصل میں اس کا سانس بند ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسے ہوش آ گیا اور پھر جو ہنسی آئی ہم نے اس کی فرضی میت کے بین سنائے۔ تمہاری پھوپھی کیسے روتیں اور تمہاری خالہ اور امی چیختیں۔ "ہائے نی میری بھلاں رور گی نی مالٹا کھاندی مر گئی صدقے کردیواں، سارے باغاں نوں۔"

اس کے خاندان میں تو لیٹے پر ہی کرفیو لگ جاتا تھا۔

بہرحال اس نے توبہ کے نفل پڑھے۔ یہ اور بات کہ توبہ کئی مرتبہ ٹوٹ چکی ہے۔

اور ہاں آپی ہم نے شہد اتارا ہے مجبور پر تھا، اسماء اور میں نے۔ اوپر دیوار سے نیچے لٹک کر اتارا اور تو کوئی مسئلہ نہیں ہوا بس میری زبان پر مکھی نے ڈنک مارا ہے ظالم۔

یہ شرارتیں ہیں بڑھاپے کا زاد راہ ہے جب ہم بوڑھی ہو جائیں گی تو ان حسین دنوں کو یاد کریں گی اور چھوٹے بچوں کو بتایا کریں گی کہ ہم کتنی اچھی لڑکیاں تھیں۔ اب تو ڈانٹ ڈپٹ ہوتی اگر مر جائیں تو بھی ڈانٹ والے کہیں گے ہائے ہائے نی کڑی مخولن سی (ہائے ہائے کتنی مزاحیہ تھی)

پیاری سیدہ! اتنا دلچسپ خط ہے ایڈیٹ کرنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا اس سے اچھا تھا افسانہ لکھ لیتیں۔ ہم خوشی خوشی پورا شائع کرتے۔ قارئین بھی پڑھ کر خوش ہوتے۔

ویسے آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ آپ ضرور لکھیں۔ یہ آپ نے کیسے سوچ لیا کہ ہم نے آپ کو یاد نہیں کیا۔ اب تو آپ جانتی ہیں ہماری قارئین ہمیں کتنی عزیز ہیں۔ جب کوئی غیر حاضر ہو تو ہمیں تشویش ہوتی ہے۔

اسماء نے خالد ... سے لکھا ہے

پچیس سالوں میں میں آپ کو تین خط لکھے۔ ہر دفعہ پکا ارادہ کرتی ہوں کہ اب ہر مہینے خط لکھنا ہے۔ جو بھی ذہن میں ہوتا ہے بلکہ وہی تبصرہ کوئی قاری بہن کر رہی ہے۔ جیسے تابی کنول نے لکھا کا اچھا ہے ویسے ہی میں عالیہ تصور اور ... کا پوچھوں گی۔ آپ کو پتا ہے یہ کہاں ہیں؟ "نور القلوب" واقعی تنزیلہ ریاض کا نام ہی کافی ہے۔ "پیارے نبی کی باتیں" بہت بہت اچھی ہوتی ہیں۔

اگر کوئی ان پر عمل کرلے تو پکا مسلمان۔ ہر دفعہ پڑھ کے اپنی خامیاں ڈھونڈتی ہوں۔ رخسانہ نگار مجھے بہت پسند ہیں۔ اچھی ہوتی رائٹر ہیں۔ "عمر ہیرا" جنت کو "الف" کا کیا پتا چلتا ہے۔ تیرہ سال کی عمر سے شروع کیا تھا پڑھنا سب سے پہلی کہانی ... مجھے یاد ہے

رائٹر کا سمعان علی گردیزی ہیرو کا نام تھا 1995 یا 96 میں پڑھی گئی۔ کافی عرصہ ہو گیا ہے سائرہ رضا اور سمیرا حمید کو پڑھے ہوئے۔ راحت جبیں کا قلم تو اتنا اچھا ہے رکتا ہی نہیں۔ اتنی بے ساختہ اور عام زندگی میں رونما ہونے والے واقعات قلم سے نکلتے ہیں۔ میں سوچتی ہوں ان کو کیسے پتا چل جاتا ہے کہ دنیا میں کیا کیا ہو رہا ہے۔ لوئر طبقے کے حالات اور کے مسائل ہائے ہائے سا ہیوال دور بہت ہے ورنہ ہزاول کرتا ہے کہ مل کے آؤں۔

پیاری اسما! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ اتنا اچھا خط لکھتی ہیں آپ۔ لکھائی بھی خوب صورت ہے پھر بھی اتنی تاخیر کی خط لکھنے میں، خیر ہمارے لیے یہ بھی بہت ہے کہ آپ نے ہمیں یاد تو کیا۔ تبصرہ بہت جامع ہے اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔

لبنیٰ تصور و... کا تو پتا نہیں البتہ درثمین شادی کے بعد مردان اور بچوں میں مصروف ہیں۔

نورین ظفر خان نے چھاؤں سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں۔

سنو!

یہ کوئی نصف صدی کا قصہ نہیں

بس...

ذکر ہے کئی سال کا

اور سال بھی بس اتنے کہ جن کی گنتی انگلیوں کی پوروں پر سما جائے۔ ذکر ہے ان گزرے وقتوں کا جب زندگی "ایک دفعہ کا ذکر" ہے اور پھر "سب ہنسی خوشی رہنے لگے" جیسی کہانیوں کی طرح ہی خوب صورت لگتی تھی۔

پھر وقت کا دھارا بہتا ہے اور تغیر زیست کا حصہ بنتا ہے۔ بے فکری کے پرندے ذمہ داریوں اور مصروفیت کے سنہری پنجروں میں قید کر دیے جاتے ہیں۔ صد شکر کہ حضرت انسان کو ہر سانچے میں ڈھل جانے والی نرم خو مٹی سے تخلیق کیا گیا ہے ورنہ تو تغیر زمانہ انسان کو ذرہ ذرہ کر کے مٹی میں رولنے پر کمر بستہ ہے ہی.....

ہاں وہ وقت بہت بہت خوب صورت تھا جب لکھنا، پڑھنا۔ قلم کتاب، رسالے، کہانیاں اور ڈائریاں ہی زندگی کا حاصل تھیں۔

وقت گزرا، لیکن اتنا بھی نہیں کہ یاد سے محو ہو جائے۔ صرف دو برس کی چلمن ہٹائیں تو اکتوبر 2019ء کا شمارہ "خواتین" سامنے ہی جلوہ نمو ہوتا ہے اور اس کا صفحہ نمبر 94 پر حسنہ حسین کا غالباً پہلا ناول (ہے ناں؟) "نور سین" چمکتا دمکتا نظر آئے گا۔

اسی ناول کی بدولت میں نے مصروفیت سے کچھ پل کی چوری کی اور "خواتین" میں خط لکھا اور پھر منتظر رہی، ایسے ہی کسی اور شاہکار ناول کی جو مجھے مصروفیت سے بغاوت پر آمادہ کر دے اور پھر آخرکار حسنہ حسین تشریف لے ہی آئیں۔ فارس، جنت کے بے مثال کردار، منظر باکمال، جملے برجستہ، گفتگو روبرو، انداز بیان، خوب اور زبان بیاں خوب ترین۔

کیونکہ یہ ذکر تھا کئی سال کا ... تو یہ آپ کی یادداشت کا امتحان بھی ہے کہ آپ کو میں یاد ہوں کہ نہیں؟

☆ نورین! آپ نے یہ سوچا بھی کیسے کہ آپ ہمیں یاد نہیں ہوں گی۔ محبت کرنے والوں کو اتنی جلدی تو نہیں بھلایا جاتا۔ ہمیں یاد ہیں وہ دن جب ہر ماہ ڈاک میں آپ کا لفافہ ضرور شامل ہوتا تھا اور اس میں مختلف سلسلوں کے لیے تحریریں ہوتی تھیں۔

ہمیں خوشی ہے کہ آپ نے اپنی مصروفیات سے بغاوت کی اور ہمارے لیے وقت نکالا۔ حسنہ حسین تک آپ کی ستائش پہنچا رہے ہیں۔ مصنفین کی محنت کا صلہ آپ کی ستائش ہی ہوتی ہے۔ شعاع کے دوسرے سلسلوں میں بھی شرکت کریں۔ بہت خوب صورت خط لکھا ہے، اب رابطہ رکھیے گا۔

ثریا راجپوت نے جاتری شریف سے لکھا ہے

قلانچیں بھرتے بھاگتے دوڑتے "عمر یسرا" پر پہنچے۔ اس ناول میں برجستگی کا عنصر نمایاں ہے جو کہ ذہین لوگوں کی نشانی ہے۔ ویل ڈن میری بہت ہی پیاری اور ذہین حسنہ حسین۔ "شام کی حویلی میں" کشف کو صرف بھاگنا آتا ہے لیکن کوئی تو اس کو بتائے فرار مسائل کا حل نہیں ہوتا۔ ایک مستند ناول، دلکشی سے بھرپور کہ پڑھنے والا طلسماتی فضا میں مقید ہو جاتا ہے۔ "چار سو پھیلی محبت" اچھا نہیں لگا۔ "یہ لوگ خاری رقصم" پڑھ کر آنکھیں نم ہو گئیں۔ "رومیو جیولٹ" کو صرف ٹائم پاس کرنے کے لیے پڑھا، مزا آنے میں نمک کے برابر بھی نہیں آیا

(سوری میمونہ)۔ پاکستانی گھریلو زندگی کی چند تصویریں پیش کرتی "بلی پیمپو" حنا بشریٰ نے اچھی کہانی لکھی۔ افسانے پانچ تھے لیکن "زنجیر" ٹاپ پر رہا۔ "ماں اور ساس" فریحہ اشتیاق نے مزیدار موضوع کا چناؤ کیا کیونکہ بدفطرت کوئی بھی ہوسکتا ہے پر بدنام ساس ہی کیوں؟ میری امی اتنی اچھی ساس ہیں۔ امی کا موٹو خوش رہو اور رہنے دو۔ "سال نو کی پہلی صبح" حمیرا النجم کا افسانہ اس عہد کی بے رنگ محفل کی کہانی بیان کر رہا تھا۔ "ایک گلاس کی پیاس" خولہ نے متاثر کرنے کی کوشش میں زخم پر نمک چھڑک دیا۔ نہیں سوری، زخم ادھیڑ دیے۔ "خط آپ کے" میں ہر بار سوچتی ہوں ڈاکٹر شکیلہ بھی شاید اب کی بار محفل کی رونق بڑھانے آ گئیں۔ (بھئی مشورہ دیا تھا اپنے علاقے کی مشہور قابل ڈاکٹر کو)۔ رضیہ سلطانہ (تاریخ کے جھروکے) کے بارے میں بہت سنا تھا، اس بہادر اور جری خاتون کے نام ایک سیلوٹ۔ "پہلی شعاع" سب سے آخر میں پڑھی۔ دل اداس ہو گیا، اللہ ہمارے حال پر رحم کرے۔

☆ پیاری گڑیا! تفصیلی اور جامع تبصرے کے لیے شکریہ۔ آپ کی کہانیاں قابل اشاعت ہو سکتی ہیں، اگر آپ محنت کر کے دوبارہ لکھیں۔ تحریر میں ناپختگی ہے بالفعل کچھ اور لکھیں۔

فائزہ بھٹی چونی سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

شعاع میں شرکت کیے کتنوں گزر گئے۔ شعاع آتا رہا، پڑھتی رہی۔ کچھ مجھے مصروف کر دیا گیا۔ کچھ میں نے خود دل و جان سے اس مصروفیت کو قبول کیا۔ فروری کا شمارہ ملا، اچھا لگا۔ ٹائٹل بھی اچھا تھا۔ نرم گرم دھوپ میں تازگی کا احساس دلاتا ہوا۔

"پہلی شعاع" سالگرہ نمبر سروے میں شرکت کروں گی۔ "شام کی حویلی میں" رخسانہ ذرا تیزی لاؤ۔ "نور المقلوب" تنزیلہ ریاض تمہارا آنا مجھے بہت اچھا لگا۔ خوش الحان تم اچھے کردار ہو، پلیز اچھے ہی رہنا۔ لاریب کو سمجھنے کی کوشش میں لگی ہوئی ہوں، دیکھو کتنا وقت لگتا ہے۔

"عمر پیرا 6" حسنہ حسین مجھے لگتا ہے میں نے آپ کو ایک دفعہ پہلے بھی پڑھا ہے مگر اس دفعہ بھی آپ کا نام پڑھ کر مجھے اچھا لگا اور کہانی پڑھ کر اور بھی اچھا لگا۔

"خط آپ کے" زینب نور افسانے پر مبارک باد دے۔ فوزیہ ثمر بٹ کہاں ہو؟ ماہا اور تبسم بھی غائب ہیں۔ ناہید اسماعیل بھی کم کم آ رہی ہیں۔ ماریہ نذیر، اقرا امتیاز، صائمہ مشتاق بھی غائب ہیں۔ سب آجاؤ، میں منتظر ہوں۔ کبریٰ اختر! کیا آپ اب بھی ٹرین میں سفر کرتے ہیں اور فوزیہ ثمر کا گھر تلاش کرتی ہیں کہ چھوڑ دیا۔

☆ پیاری فائزہ! آپ کے خط سے ہمیں آپ کی خوش گوار مصروفیت کا کچھ کچھ اندازہ ہو رہا ہے لیکن اصل بات تو آپ ہی بتائیں گی۔ خوش رہیں، آباد رہیں۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ نے ہمیں یاد رکھا، وقت نکال کر خط لکھا ہمارے لیے یہ بہت خوشی کی بات ہے۔

تسنیم کوثر نے کراچی سے لکھا ہے

فروری کا شمارہ پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ ماشاء اللہ زیادہ تر افسانے اور ناولز بے حد بہترین لگے۔ ڈھونڈنے پر کوئی نقص ہاتھ نہیں لگا، خاص طور پر رخسانہ نگار عدنان کی "شام کی حویلی" تو اسے دون جاری ہے۔ اسی لیے رخسانہ ہماری پسندیدہ رائٹرز میں شامل ہو گئی ہیں اور "یہ لوگ" "تاری رقصم" عمدہ ناولٹ لگا۔ بہت مزیدار خوب صورت سا ناول میمونہ صدف کا "رومیو جولیٹ" لگا۔ اب آگے بڑھتے ہیں "بلی پیمپو" بھی بہت اچھا لگا۔ حنا بشریٰ نے نہایت محنت سے ایک جامع ناول لکھا، ہمیں پسند آیا۔ تنزیلہ ریاض کے "نور المقلوب" پر ابھی کوئی رائے نہیں ہے۔ البتہ "عمر پیرا 6" حسنہ حسین کا ناول بہت بہت اچھا لگ رہا ہے دیکھتے ہیں آگے کیا کیا پیش ہے۔

اور افسانے تو سارے ہی بہت پیارے لگے۔ قرۃ العین خرم کا "چھوٹے گل" کو ایک عمدہ سی نصیحت آمیز اسٹوری کہہ سکتے ہیں۔ "ماں اور ساس" بہت خوب بھئی بہت ہی خوب۔

"سال نو کی پہلی صبح" بھی شاندار لگا اور خولہ سعید جاوید نے "ایک گلاس پانی کی پیاس" بے مثال لکھا۔

☆ پیاری تسنیم! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ محفل میں آپ کی آمد ہمیشہ ہی بہت اچھی لگتی ہے۔

اجسام عبدالباسط نے تحصیل و ضلع شیخوپورہ سے

شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

ہمارے گھر میں بھی ڈائجسٹ پڑھنا معیوب ہی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن چھوڑا میں نے پھر بھی نہیں، ایک اور بات چند ماہ قبل میں صحن میں چارپائی پر بیٹھ کر ڈائجسٹ پڑھ رہی تھی کہ اچانک "بڑے ابو" آ گئے اور پیچھے کھڑے ہو گئے معلوم مجھے بھی نہیں تھا۔ اچانک میرے سامنے چارپائی پہ بیٹھ کر پوچھنے لگے کہ "اس میں یہی لکھا ہے نا۔ ایک لڑکی تھی وہ لڑکے سے ملی۔ پہلے ان کی لڑائی ہوئی اور دوبارہ ملنے سے پیار ہو گیا اور گھر والوں سے جنگ کرنے کے بعد انہوں نے شادی کر لی۔"

یقین کریں، وہ اتنا اچانک اور صاف الفاظ میں بولے کہ میں کچھ نہ بول سکی لیکن جواباً میرا سر اثبات میں ہل ہی گیا (اف یہ سر کی گستاخی آہ!)

میرے سات تایا ابو ہیں، چاچو نہیں ہیں اور سب بہن بھائیوں میں زیادہ سخت، رعب والے اور ڈرانے والے یہی ہیں اب آپ خود اندازہ لگا لیں اس وقت میری کیا حالت ہوئی۔ لیکن سلسلہ پھر بھی جاری ہے باقاعدگی کے ساتھ۔ میں نے ایف ایس سی مکمل کر لی ہے اور اب تھرڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ "حمد و نعت" اور "نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتیں" پڑھ کر ایمان کو تازگی بخشی۔ اس کے بعد چھلانگ لگائی حسنہ حسین جی کے ناول "عمر میرا" کی طرف لیکن سب سے پہلے آخری ورق کو دیکھا اور (باقی آئندہ......) دیکھ کر کندھے ڈھیلے پڑ گئے۔ حسنہ حسین جی آپ بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ اور میرے خط لکھنے کی وجہ بھی یہی ہے اور تو اور میں تو اس آیت کے راز کو کھوجنے کی کوشش بھی کر رہی ہوں۔ سحرش خان بھٹو کہاں ہیں آپ؟ یہ پہلی بار ہوا ہے کہ پورے کا پورا رسالہ مجھے متاثر کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ تنزیلہ ریاض کو فرصت تام پڑھ رہی ہوں۔ انداز تحریر مجھے اور میری ماما کو بہت پسند آیا۔ میری "ماما" بھی بہت شوق سے پڑھتی ہیں اور خریدنے کے پیسے بھی ماما ہی دیتی ہیں۔ اسی وجہ سے یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے (پڑھنے کا......) "شام کی حویلی" میں اب صبح کر دیں، ہر طرف تاریکی ہی پھیلی ہوئی ہے۔ کشف سونیا کی بیٹی (آئم شاکڈ) یاسمہ فرحین، جبین چیمہ، میمونہ صدف، حنا بشریٰ، حمیرا شفیع، فریحہ اشتیاق، عمارہ جہاں، قرۃ العین، خرم ہاشمی اور خوب سعید جاوید ا... اچھا اور سبق آموز لکھنے کا بہت بہت شکریہ۔ سب ... سب لاجواب تھے۔ اس بار سب نے دل جیت لیا۔

انٹرویو سب اچھے تھے۔ حمیرا شفیع اور امت العز... شہزاد دونوں کی والدہ محترمہ اس دار فانی کو الوداع کہہ گئیں "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھ کر دلی دکھ اور افسوس ہوا۔

☆ پیاری ابتسام! شعاع کی بزم میں خوش آمدید

اپنے تایا جان کے بیان پر اثبات میں سر ہلا کر اپنے ساتھ ... زیادتی کی ہی، ہمارے ساتھ تو ظلم عظیم کیا۔ کبھی پہلے ایک... کہانیاں بھی شائع ہوتی تھیں۔ اب تو بہت وقت گزر گیا... ہے۔ لکھنے والے اور پڑھنے والے دونوں ہی حقیقت پسند ہو گئے ہیں۔ اور آپ کے تایا جان کو کیا کہیں، جنہوں نے پرچا پڑھے بغیر ہی فتویٰ صادر کر دیا۔ کم از کم ایک نظر ہی ڈال لیتے پھر کچھ کہتے۔

اپنی امی کو ہمارا سلام کہیں، وہ ہماری دیرینہ قاری ہیں۔ یہ جان کر خوشی ہوئی۔

اپنی شاعری بھجوا دیں قابل اشاعت ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ شاعری کا معاوضہ نہیں دیا جاتا۔

سائرہ نورین نے ملتان سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

میں 1984ء سے آپ کی باقاعدہ قاری ہوں۔ خواتین، شعاع، کرن ان سب کی تمام مصنفات اور قاری بہنوں کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں اور ان سے محبت کرتی ہوں۔ کیونکہ سلسلے وار ناول پڑھنے کے بعد سب سے پہلے خطوط کے جوابات پڑھتی ہوں۔ بہن ثمینہ اکرم کے بیٹے معیز کا جب پتا چلا تو بہت دکھ ہوا لیکن اس وقت یہ پتا نہیں تھا کہ ان کا اور میرا غم ایک جیسا ہی ہوگا۔ میرا سب سے بڑا بیٹا "حمزہ راحیل" جو اکیس سال کا تھا، پڑھنے جا رہا تھا۔ اکیڈمی کے راستے میں ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ 19 مارچ کو میرے بیٹے کا ایکسیڈنٹ ہوا اور وہ کوما میں چلا گیا۔ 22 مارچ کو اس کی ڈیتھ ہو گئی۔ اس ماں کا درد آپ بخوبی سمجھ سکتی ہیں جو بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کے لیے بالکل تیار ہو لیکن اسے بارات لے جانے کے بجائے اس کی میت قبر کے سپرد کرنی پڑے۔ 22 مارچ 2019ء کو میرے بیٹے کی ڈیتھ ہوئی تھی۔ اب 22 مارچ پھر آنے والی ہے۔ بہنوں سے دعائے مغفرت کی اپیل ہے۔

رفعت سراج کے ناولوں کے بعد اگر کسی رائٹر کے ناول کی اگلی قسط کا انتظار مشکل لگا تو وہ نبیلہ عزیز اور نمرہ احمد ہیں۔فروری کا سارا شمارہ پڑھ لیا ہے۔لیکن اب اگلے مہینے کا انتظار بہت مشکل ہے۔ کیونکہ حسنہ حسین کا ناول ''عمر بسرا'' پڑھ لیا ہے۔اور تعریف کرنے پر مجبور ہوں۔ ان کے اتنے اچھا لکھنے پر تعریف نہ کرنا ان کے ساتھ زیادتی لگا۔بہت اچھا لگا۔کردار اور جملے کمال کے ہیں۔

☆ پیاری سائرہ! آپ نے اتنی مدت بعد یاد کیا، بہت خوشی ہوئی۔آپ کے بیٹے کی وفات کا پڑھ کر بہت صدمہ ہوا۔اکیس سالہ جوان بیٹے کی اچانک وفات بہت بڑا دکھ ہے۔اللہ تعالیٰ آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم حمزہ راحیل کی قبر کو نور سے بھر دے۔آمین قارئین سے بھی مغفرت کی درخواست ہے۔

ایس ایم چیمہ چک نمبر 21 آر بی گنیا نوالہ تحصیل سانگلہ ہل سے لکھتی ہیں

شعاع سے میرا تعلق اس وقت سے ہے جب میں فرسٹ ایئر میں پڑھتی تھی۔ایف اے کیا۔بی اے کیا پھر گورنمنٹ کالج یونیورسٹی آف ایجوکیشن فیصل آباد سے بی ایڈ کیا اور آخر میں پولیٹیکل سائنس میں ماسٹرز کیا۔پھر اپنا اسکول کھولا۔اس کے بعد شادی ہوگئی۔

زندگی اتنی مصروف ہوگئی جس طرح کولہو کا بیل۔ دس افراد کا گھرانہ جس میں میاں صاحب، ساس، سسر صاحبان تین بچے (ایک بیٹا دو بیٹیاں) اور تین ملازم شامل ہیں۔

ملازمین کی وضاحت کردوں کہ دو مرد ملازم مال مویشی اور کھیتی باڑی کی رکھوالی پر اور ایک خاتون ملازمہ گھر کے لیے۔وہ بھی برتن دھونے اور گھر کی صفائی ستھرائی تک محدود۔باقی سارے کام مابدولت کے ذمہ یعنی دس افراد کا صبح کا ناشتہ تیار کرنا اور کھلانا پھر بچوں کو تیار کرکے اسکول بھیجنا بعد میں خود تیاری کرکے اسکول جانا اور سارا دن مغز ماری کرنا اور پھر ڈھائی تین بجے اسکول سے واپس آنا، پھر دوپہر کے لیے ہلکا پھلکا کھانا بنانا اور بچوں کو ہوم ورک کروانا پھر چائے بنانا اور پلانا۔آخر میں رات کا کھانا تیار کرکے کھلانا اور برتن سمیٹنا۔اتنا کچھ کرنے کے بعد شعاع کے لیے وقت نکالنا کوئی آسان کام نہیں۔

(تالیاں ہی تالیاں)

خیر ناول اچھی لگی۔''پہلی شعاع'' پر نظر ڈالی پھر حمد شریف۔نعت شریف پڑھنے کے بعد ''پیارے نبی کی پیاری باتیں'' پڑھ ایمان کو تازہ کیا۔اس کے بعد جبیں چیمہ کا ناولٹ ''بہ نوک خار می رقصم'' سب سے پہلے پڑھا (کیوں نہ پڑھتے بھئی جبیں چیمہ ہماری برادری بہن بھی تو ہیں) کہتے ہیں ناں برادری کی کشش ہوتی ہے۔ (معذرت کے ساتھ) جبیں صاحبہ سابق پولیس آفیسر ذوالفقار چیمہ صاحب کی بہن تو نہیں ہیں؟ جبیں صاحبہ کے ناولٹ کے بعد سلسلے وار ناول ''نور القلوب ہشام کی حویلی'' اور ''عمر بسرا'' پڑھے۔ماشاءاللہ تینوں ناول زبردست جا رہے ہیں۔باقی ناول ابھی پڑھنے ہیں۔

☆ ایس ایم چیمہ! کیا حرج تھا بھئی اگر آپ اپنا نام لکھ دیتیں اگر اصل نام بتانا نہیں چاہتیں تو کوئی قلمی نام ہی رکھ لیں اور ہمیں قلمی نام سے خط لکھیں۔

آپ نے اتنی مصروفیت کے باوجود ہمیں خط لکھا، بہت خوشی ہوئی، اب رابطہ رکھیے گا۔

آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔جبیں چیمہ ذوالفقار احمد چیمہ کی بہن ہیں۔اس ماہ خواتین ڈائجسٹ میں ان کا انٹرویو شامل ہے ضرور پڑھیے گا۔

یاسمین کنول نے پسرور سے لکھا ہے

سرورق کی نازک اندام ماڈل جانے کس سوچ میں گم ہے، ڈریسنگ پسند آئی، جیولری کمال کی ہے۔سب سے زیادہ خوشی اپنی حمد کی اشاعت کی ہوئی بتا نہیں۔کب بھجوائی تھی میں نے۔بہرحال دیر آید درست آید۔بے حد شکریہ قبول فرمائیں۔

فروری کا شعاع آپ کی ''پہلی شعاع'' سے شروع ہوا ہے۔پہلا پیراگراف ہی عوامی امنگوں کا ترجمان ہے یعنی ہمارے مسائل مہنگائی اور بے روزگاری بیان کررہا ہے۔پٹرول کی قیمت بڑھنے سے مہنگائی کا طوفان امڈ آتا ہے۔اور ساری چیزیں مزید مہنگی ہوجاتی ہیں۔قیمت بڑھ چکی ہے اور مزید بڑھنے کا کہا جارہا ہے۔شاعر نے اسی لیے تو کہا تھا۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

☆ پیاری یاسمین! بالکل درست کہا ہے۔ پہلے جو مہنگائی سال اور مہینوں کے حساب سے بڑھتی تھی، وہ اب دنوں کے حساب سے بڑھ رہی ہے۔ غور کریں تو کہیں نہ کہیں ہم بھی اس کے ذمہ دار ہیں۔ یہ ہمارے اعمالوں کی سزا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائے۔

زاہدہ راجپوت نے کراچی سے لکھا ہے

میرا مدرسہ جس کے محلہ اور بچوں سے بے حد محبت کرتی ہوں اس کا آغاز آج تیس سال پہلے میری بڑی بہن نے کیا۔ وہ ہمارے لیے سپہ سالار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور ہم ان کے قافلے کی ادنیٰ سپاہی ہیں۔ جتنا سکون مجھے قرآن مجید پڑھاتے وقت ہوتا ہے۔ اتنا کسی اور چیز میں میسر نہیں الحمدللہ۔

فروری کے شعاع پر تبصرہ حاضر ہے۔ ''پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں'' دین کے بارے میں کچھ پوچھ رہی ہیں۔ آپ عورت کو طلاق ہونے کی صورتوں پر بھی روشنی ڈالیے گا۔ (قرآن اور حدیث کی روسے)

''سال نو کی پہلی صبح'' ناشر کا کردار بہت مثبت تھا۔ واقعی انسان ناشکری مخلوق ہے ''ماں اور ساس'' یہ افسانے بھی بعض اوقات معاشرے کے عجیب وغریب کرداروں سے ملاقات کرواتے ہیں۔ جو ہوتے تو صد فی صد ٹھیک ہیں۔ قرۃ العین کے افسانے ہمیشہ اچھا سبق دیتے ہیں۔ چھوٹے عمل بھی ان میں سے ایک ہے، خولہ سعید کا ''ایک گلاس کی پیاس'' سب ماؤں کے رونگٹے کھڑے کر گیا ''زنجیر'' انسان جو بوئے گا وہی کاٹے گا۔

حسنہ حسین کا ''عمر یسرا'' میں جنت کی ساس کی باتیں بہت ایمان افروز لگیں اور آخر میں نیا انکشاف...... فارس کا بدلتا رویہ بھی اسرار لیے ہوئے تھا۔

عاصمہ فرحین کا ''چار سو پھیلی محبت'' نے بالکل بھی متاثر نہیں کیا ناولٹ ''یہ نوک خاری رقصم'' تحسین چیمہ نے لکھا ہم ماؤں کو دوسری باتوں کے علاوہ اولاد کو کردار کی مضبوطی کی بھی تاکید کرتے رہنا چاہیے۔ آثار و قرائن یہ بتاتے تھے کہ آصف جیسے ''ٹھرکی'' آدمی نے نور العین سے بھی شادی کرنی ہی نہیں تھی الزام بے چاری گھوڑی پر لگا دیا۔ افسوس نور نے عفت سے گوہر آبدار کو اتنا سستا بنا ڈالا، میمونہ صدف نے رومیو جیولٹ لکھ کر میڈیکل کالج میں پہنچا دیا۔ رباب نے اپنی عزت نفس کو بچایا، محنت کی، اچھی بات ہے۔ ''بگلی پھپھو'' اللہ معاف کرے بگلی تو واقعی نند ثابت ہوئی۔ فضا حسین کی ساس ماشاءاللہ تمہارے اس جملے پہ (ماں صدقے جائے) لڑنے جھگڑنے کے لیے ہر عورت کو ایک شخص کی ضرورت ہوتی ہے جس کا نام شوہر ہے باقی ''نور القلوب'' اور ''شام کی حویلی'' میں بھی نئے انکشافات کے ساتھ رواں دواں تھیں۔

☆ پیاری زاہدہ! آپ سے مل کر ایک خوش گوار احساس نے دل کو چھوا۔ قرآن پڑھنا اور پڑھانا دونوں ہی بہترین کام ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی اس نیکی کو قبول کرے۔

تبصرہ بھی بہت اچھا کیا ہے آپ نے۔ اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔

تحصیل خان پور سے صفیہ مہر نے لکھا ہے

آپ نے سچ کہا مہنگائی کا عفریت جانیں لینے کے درپے ہے۔ حمد، نعت سے دل و ذہن منور کیے۔ ''پیارے نبی کی پیاری باتیں'' امی کو سنائیں تو بولیں، دیکھو کس قدر اچھی باتیں سکھاتی ہیں تمہاری ڈائجسٹ والیاں۔ میں نے کہا ہاں یہ تو ہے پھر امی کو ''جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے'' سنایا تو بولیں دیکھو کیسے قربانیاں دے کر لڑکیاں گھر بساتی ہیں۔ ایک ہمارے ہاں کی لڑکیاں ہیں کیسی آرام طلب ہیں۔ ''خط آپ کے'' میں اپنا خط تلاشتی رہی، لیکن نہیں ملا خطوط سارے دل کو اچھے لگ رہے ہیں مگر ہماری نیو فرینڈ زینب نور کا جھلملاتا خط دل کو منور کر گیا، رخسانہ نگار کا ناول ''شام کی حویلی میں'' کشف نے آپی کو موحد کے لیے چھوڑ کر غلطی کر دی۔ یار پلٹ آؤ، آخر میں یہ کیا؟ کشف سونیا کی بیٹی ہے، حیرت ہے۔ تنزیلہ ریاض کا ناول ''نور القلوب'' خوشحال خان کہیں خان بابا کی سوتیلی اولاد تو نہیں۔ یا رب بگڑی امیر زادی ہمارے سادہ معصوم خوشحال کے لیے قطعی موزوں نہیں، چڑی اڑی۔ کیا واقعی یہ کھیل اتنا مشہور ہے ہم سمجھے یہ کھیل صرف ہم جیسے دیہی لوگوں کا خود تخلیق ایجاد ہے۔ (حیرت ہے اسے تنزیلہ بھی جانتی ہیں) مکمل ناول ''عمر یسرا'' بہت ہی پیاری اسٹوری ہے یہ دل کے تاروں کو چھیڑنے والی، افسانے سارے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں ناولٹ ''بگلی پھپھو'' حنا بشری نے

محفل لوٹ لی۔

☆ پیاری صنیفہ! آپ نے ہمیں خط لکھا بہت خوشی ہوئی معذرت کہ پچھلے ماہ آپ کا خط شامل نہ ہو سکا۔ آپ کی امی کا شکریہ کہ انہوں نے ہماری کوششوں کو سراہا اور آپ کی بھی توجہ دلائی۔

آپ کے افسانے پڑھے نہیں گئے۔ آپ نے سطر بھی نہیں چھوڑی پھر اتنے مخفی لفظوں میں لکھا ہے کہ کاغذ پر کوئی جگہ بھی نہیں چھوڑی۔ آپ صفحے کی ایک جانب اور سطر چھوڑ کر لکھیں اور قدرے جلی الفاظ میں لکھیں۔

مافیہ ارشد نے پسرور سیالکوٹ سے شرکت کی ہے۔ لکھتی ہیں

ٹائٹل پر ماڈل گرل بہت پیاری لگ رہی تھی۔ افسانے، مکمل ناول، پورا رسالہ ہی بہت اچھا تھا۔ مجھے لکھنے کا بہت شوق ہے اور مجبوری بھی، میں نے ایک افسانہ لکھا ہے اگر آپ کہیں تو پوسٹ کروا دوں۔ میں پارلر کا کورس کرنا چاہتی ہی لیکن گھر سے اجازت نہیں ملی۔

☆ پیاری مافیہ! آپ کا خط پڑھا، بہت افسوس ہوا۔ دعا گو ہوں آئندہ زندگی میں آپ کو اچھا جیون ساتھی اور بہت اچھا گھر نصیب ہو جہاں سب آپ سے محبت کریں۔

آپ افسانہ بھجوا دیں۔ قابل اشاعت ہوا تو ضرور شائع ہوگا۔ لیکن لکھنے کو پروفیشن نہیں بنایا جا سکتا۔ بہتر یہی ہے کہ آپ پارلر کا کورس کر لیں۔ امی اور بھائیوں سے کہیں کہ وہ آپ کے والد کو رضامند کرنے کی کوشش کریں۔

رضوانہ وقاص ہری پور کرلاں سے شریک محفل ہیں

میں ایک چھوٹے سے گاؤں کرلاں سے لکھتی ہوں۔ جو ہمیں شہر سے دور پڑتا ہے۔ چاہے وہ ہری پور ہو چاہے ایبٹ آباد دونوں دور پڑتے ہیں۔ میرے شوہر میرا خط پوسٹ کرتے ہیں۔ ویسے بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ لیکن جب سے بیمار ہوئی ہوں۔ اور زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ "پہلی شعاع" پڑھی۔ پاکستان جب سے معرض وجود میں آیا ہے۔ بہت مشکل ادوار سے بھی گزر رہا۔ لیکن اب کرونا کے بعد حالات بہت ہی خراب ہیں۔ مہنگائی ختم ہونے کے بجائے دن بدن بڑھ رہی ہے۔ "پیارے نبی کی پیاری باتیں" بہت ہی اچھا سلسلہ ہے۔ دستک میں جن کے ڈرامے دیکھتی ہوں، ان کا انٹرویو آئے تو تبصرہ کر دیتی ہوں۔ بند من میں شاہین آپا۔ ڈراموں والوں کا یا رائٹر کا انٹرویو دیا کریں۔ کیونکہ ریڈیو مدت ہوئی چھوڑ دیا۔ "شام کی حویلی میں" پلیز رخسانہ نگار آپ کہانی کو مکمل کے بیان کریں۔ یہ کیا کشف سونیا کی بیٹی ہے۔ پلیز قارئین کا دل صاف کر دیں جنت کے لیے۔ ماں اور ساس۔ اچھی کی کہانی۔ "چھوٹے محل" قرۃ العین نے خوب لکھا، کیا بات ہے جی۔ خط آپ کا اچھا سلسلہ ہے۔ تبصرہ تفصیلی

خوش آمدید آپ نے پہلی بار شرکت کی ہے۔ خط ضرور شامل کرنا ہے۔ میں کتنی مشکل سے لکھتی ہوں جب میں نیا دم دلوا کر آؤں مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن درد کی پروا کیے بغیر میں لکھ رہی ہوں۔

☆ پیاری رضوانہ! آپ کو کیا تکلیف ہے اور نیا دم دلوانے کا مطلب کیا ہے۔ ہم سمجھ نہیں سکے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے۔ بہنوں سے درخواست ہے کہ وہ بہن رضوانہ کے لیے دعا کریں۔

آپ نے تکلیف کے باوجود ہمیں خط لکھا، اس محبت کے لیے ممنون ہیں۔

عشاراں نعل رانا نے کبیر والا سے لکھا ہے

شعاع سے تعلق سات سال پرانا ہے لیکن درمیان میں ٹوٹنے جڑنے کا سلسلہ جاری رہا۔ کبھی زندگی میں مصروف ہو کر پڑھنا چھوڑ دیا تو کبھی زندگی کی مصروفیات سے تنگ آ کر پڑھنا شروع کر دیا۔ اس رسالے میں لکھنے والی تمام لکھاری مجھے بے حد پسند ہیں اور تمام سلسلے بھی ہمارے پسندیدہ ہیں۔

آپ سے گزارش ہے کہ "کھلا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ" سلسلے میں جو انتخاب پیش کیا جاتا ہے اس میں انتخاب بھیجنے والے کے نام کے ساتھ شاعر کا نام بھی لکھا کیجیے۔ شاعر کے نام کے ساتھ اشعار پڑھنا زیادہ اچھا لگتا ہے۔

☆ عشاراں! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ زندگی کی تھکا دینے والی روٹین میں شعاع پڑھنا صرف تفریح ہی نہیں یہ زندگی کی بہت سی الجھنوں کو سلجھا کر ذہن کو پرسکون کر دیتا ہے۔

شعر کے ساتھ شاعر کا نام اچھی تجویز ہے ہم اس پر غور کریں گے۔

☆

مارچ 2021 کے شمارے کی ایک جھلک

- "سزاوجزا" نگہت سیما کا مکمل ناول،
- "دردلا دوا پایا" فریدہ بتول کا مکمل ناول،
- فرحت انصاری اور نعیمہ ناز کا ناولٹ،
- سائرہ رضا، ثانیہ مرتضیٰ، وردہ بخاری، نورین ملک، فریحہ اشتیاق اور عمارہ رفیق کے افسانے،
- نمرہ احمد، عفت سحر طاہر اور راحت جبیں کے ناول،
- فلم اور ٹی وی کے فنکار "رانا ماجد علی خان" سے باتیں،
- معروف مصنفہ "جبیں چیمہ" سے ملاقات،
- "کرن کرن روشنی" احادیث نبوی ﷺ کا سلسلہ،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں، خبریں و دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا مارچ 2021 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

حکومت کے لیے

عباسی خلیفہ المتوکل علی اللہ جعفر نے مسند نشین ہوتے ہی سنت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف توجہ کی اور علماء حدیث یعنی محدثین کی مدد کی اور تمام ممالک کے محدثین جمع کیے۔ ابوبکر بن ابی شیبہ کو جامع رصافہ میں مقرر کیا اور ان کے بھائی عثمان کو جامع منصور میں مقرر کیا۔ ان کے وعظ میں روزانہ تقریباً تیس ہزار آدمی جمع ہو جاتے تھے۔ اس کام سے لوگ متوکل سے بہت خوش ہوئے اور اس کے لیے دعائیں کی گئیں۔

یہ عباسی خلیفہ تھا، لیکن دو سال بعد اس نے ایسے کام کیے کہ لوگوں نے اس کو ناصبی (خارجی) کا لقب دے دیا۔ اس نے حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر مبارک اور اس کے اردگرد جو قبریں تھیں، انہیں کھدوا کر برابر کروا دیا اور لوگوں کو اس کی زیارت سے منع کر دیا۔ لوگوں کو اس حرکت سے بہت صدمہ پہنچا اور اہل بغداد نے اس کے خلاف دیواروں اور مسجدوں پر گالیاں لکھ کر چسپاں کیں۔ شاعروں نے اس کی ہجو میں نظمیں لکھیں۔

اس کی حکومت کے چار سال بعد آسمانی آفات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اہل خلاط نے آسمان سے ایک چیخ کی آواز سنی، جس سے ہزاروں آدمی مر گئے۔ عراق میں مرغی کے انڈے کے برابر اولے پڑے۔ مصر کے علاقے میں آسمان سے پتھر برسے، جن کا وزن دس، دس رطل تھا۔ یمن میں پہاڑوں نے اتنی حرکت کی کہ لوگوں کے کھیت ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو گئے۔ حلب میں ایک سفید جانور رمضان شریف میں ظاہر ہوا۔ لوگوں نے سنا، وہ کہتا تھا۔

"لوگو! اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو۔" اس طرح چالیس آوازیں لگائیں اور اڑ گیا۔ دوسرے روز پھر نمودار ہوا اور اسی طرح آوازیں لگائیں۔ اس عجیب وغریب بات کو لوگوں نے تحریر کر کے اس پر پانچ سو افراد کی شہادت دلوائی اور دارالحکومت میں یہ تحریر بھیجی، تاکہ دارالحکومت میں اس کو جھوٹ اور مذاق نہ سمجھ لیا جائے۔

آسمانی آفات کا یہ سلسلہ بھی متوکل کو اس کے ارادوں سے باز نہ رکھ سکا۔ لوگوں نے اس کو لعنت ملامت کی کہ وہ عباسی خلیفہ ہے۔ اس کے باوجود اس طرح کے مظالم ڈھا رہا ہے۔ لیکن لوگوں کی لعنت ملامت کا اس پر اثر نہ ہوا۔ متوکل نے یعقوب بن سکیت امام عربیہ کو جو اس کے بیٹوں کا استاد تھا مروا دیا۔

اس کی خطا یہ تھی کہ ایک روز متوکل نے اپنے بیٹوں معتز اور موید کو دیکھ کر ابن سکیت سے دریافت کیا کہ......

"تمہارے نزدیک یہ اچھے اور پسندیدہ ہیں یا امام حسن رضی اللہ تعالیٰ اور امام حسین رضی اللہ تعالیٰ؟"

یعقوب بن سکیت نے جواب دیا کہ معتز اور موید سے تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ کا غلام قنبر بھی بہتر ہے۔ چہ جائیکہ امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ، امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مقابلہ کیا جائے۔

یہ سن کر اس نے چند ترکوں کو حکم دیا کہ اسے چت لٹا کر اس کے پیٹ پر تب تک کودو جب تک اس میں جان باقی رہے۔ درحقیقت کہتے ہیں کہ اس نے ان کی زبان تالو سے کھنچوائی اور وہ مر گئے۔ ان کی

اولاد کو دیت یعنی خون بہا بھیج دیا۔

متوکل کا وزیر فتح بن خاقان کہتا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ متوکل کو بہت فکرمند اور سرنگوں دیکھا تو میں نے عرض کیا۔

"اے امیر المومنین! آپ کو کیا فکر ہے۔ اللہ کی قسم روئے زمین پر آپ سے زیادہ کسی کو آرام و آسائش میسر نہیں ہے۔"

متوکل نے کہا۔ "فتح مجھ سے زیادہ سکون اور آرام میں وہ شخص ہے جس کا ایک کشادہ گھر ہو، ایک نیک اور صالح بیوی ہو اور اس کے ساتھ اس کو روزی کے تمام اسباب بھی میسر ہوں تو کسی کی کیا مجال کہ ایسے شخص کو کوئی آواز بھی دے سکے۔"

علی بن جہم نے لکھا ہے کہ ایک شخص نے متوکل کو ایک کنیز محبوبہ نامی ہدیہ میں دی تھی۔ جس نے طائف میں پرورش پائی تھی اور وہیں علم و ادب حاصل کیا تھا اور اشعار بھی کہا کرتی تھی۔ متوکل اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ اتفاق سے کسی امر پر اس سے رنجیدہ ہو گیا اور محل کی تمام عورتوں کو حکم دے دیا کہ اس سے بات نہ کریں۔

ایک دن میں متوکل کے پاس گیا تو مجھ سے کہنے لگا۔ "میں نے آج محبوبہ کو خواب میں دیکھا ہے کہ اس سے میری صلح ہو گئی ہے۔ آؤ چلیں دیکھیں محبوبہ کیا کر رہی ہے۔" ہم اس کے پاس پہنچے تو وہ سارنگی بجا کر یہ گا رہی تھی۔

"میں سارے محل میں پھرتی ہوں، لیکن کوئی ایسا نہیں کہ میں اس سے اپنی شکایت کروں اور نہ کوئی مجھ سے کلام کرتا ہے۔"

کیا کوئی شخص ہے جو بادشاہ سے میری سفارش کر سکے، کیونکہ اس نے خواب میں مجھ سے صلح کر لی ہے۔"

یہ سن کر متوکل نے اس کو آواز دی تو اس نے کہا۔

"میں نے رات میں خواب دیکھا تھا کہ آپ نے مجھ سے صلح کر لی ہے۔"

متوکل نے کہا۔ "اللہ کی قسم میں نے بھی اسی طرح کا خواب دیکھا ہے۔"

اس کے بعد اس کو پہلے والے مرتبہ پر بحال کر دیا۔

متوکل بہت سخی تھا۔ اس نے شعرا کو جتنا انعام دیا کسی عباسی خلیفہ نے نہیں دیا۔

متوکل کا قتل

متوکل کی چار ہزار کنیزیں تھیں۔ وہ عیش و عشرت میں منہمک رہتا تھا۔ علی بن جہم کہتے ہیں کہ متوکل کو اپنے بیٹے معتز کی ماں سے جو ایک کنیز تھی بہت محبت تھی اور اس کو اس کے بغیر چین نہیں آتا تھا۔

اس نے اپنے بیٹے منتصر کو اپنا ولی عہد بنایا تھا۔ منتصر کے بعد اس نے معتز اور موید کے لیے ولی عہدی پر بیعت لی تھی، لیکن اسے معتز کی ماں سے بہت محبت تھی۔ اس وجہ سے اس نے ارادہ کیا کہ منتصر کے بجائے اپنے بیٹے معتز کو ولی عہد بنا دے۔ اس نے منتصر سے کہا، لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوا۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ متوکل نے ایک مجلس میں منتصر کو معزول کر کے معتز کو ولی عہد بنا دیا۔ جس سے منتصر کی بے عزتی اور اس کے ساتھ عہد شکنی ہوئی۔ ترک تو پہلے ہی متوکل سے ناراض تھے۔ وہ منتصر کے ساتھ متوکل کے قتل کی سازش میں شریک ہو گئے۔

ایک رات متوکل عیش و عشرت کی محفل سجائے بیٹھا تھا۔ اچانک پانچ آدمی اندر گھس گئے اور متوکل کو اس کے وزیر فتح محمد خاقان کے ساتھ قتل کر دیا۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ متوکل اکثر کہا کرتا تھا کہ مجھے فتح بن خاقان سے بہت محبت ہے۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا اور یہ مجھ سے جدا ہو گیا تو میری زندگی تلخ ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت ایسی ہوئی کہ دونوں کو بیک وقت قتل کر دیا گیا۔

متوکل کے قتل کی رات

عمر بن شیبان کہتے ہیں جس رات متوکل قتل ہوا، میں نے خواب دیکھا کہ کوئی شخص اشعار پڑھ رہا ہے۔ "کیا تو نہیں جانتا ان کم بختوں نے خلیفہ ہاشمی اور فتح بن خاقان کے ساتھ کیا۔"

اور وہ اللہ تعالیٰ سے مظلومی کی حالت میں ملا ہے، اس لیے اہل آسمان نے بھی شور کیا ہے۔

پھر دو ماہ بعد میں نے متوکل کو خواب میں دیکھا، میں نے دریافت کیا۔

"اللہ تعالیٰ نے آپ سے کیا سلوک کیا؟"

اس نے جواب دیا۔ "کچھ دنوں جو میں نے احیاء سنت کیا تھا۔ اس کی وجہ سے مجھے اللہ تعالیٰ نے بخش دیا۔"

میں نے دریافت کیا۔ "آپ کے قاتلوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہوگا؟" اس نے جواب دیا۔ "میں اپنے بیٹے کا انتظار کر رہا ہوں، جب وہ یہاں آجائے گا، تب میں اللہ تعالیٰ کے سامنے فریاد کروں گا۔"

قاتلوں کا انجام

اپنے باپ کو قتل کرانے کے بعد المنتصر باللہ مسند خلافت پر بیٹھا۔ اس کی ماں رومی کنیز تھی۔ منتصر بہت خوب صورت نفس کھو اور نیکیوں کی طرف رغبت رکھنے والا تھا۔ اس نے امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر کی زیارت کی اجازت دے دی اور علویوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔

اس نے اپنے بھائیوں معتز اور موید کو ولی عہدی سے معزول کر دیا۔ ساتھ ہی اس نے ترکوں کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور اپنے باپ کے قتل کا الزام ان پر لگایا۔ حالانکہ ان کے ساتھ شریک تھا۔ اس نے ترکوں کو سخت سزائیں دیں۔ ترک اس سے عاجز آ گئے۔ چونکہ یہ بہت عقل مند تھا۔ اس بنا پر ترکوں نے اس کے طبیب کو تیس ہزار دینار رشوت کے بھیجے۔ طبیب نے زہر آلود نشتر سے اس کی فصد کھول دی۔ پھر طبیب بھی مر گیا۔ بعض کا خیال ہے کہ اسے امرود میں زہر دیا گیا۔

منتصر پر جب نزع کی کیفیت طاری ہوئی تو اپنی ماں سے کہنے لگا۔ "اے میری ماں مجھ سے دین و دنیا دونوں جاتے رہے۔ میں اپنے باپ کی موت کا باعث ہوا اور میں بھی جانے میں جلدی کر رہا ہوں۔"

منتصر چھ ماہ سے بھی کم خلافت کر کے انتقال کر گیا۔ اس وقت اس کی عمر چھبیس سال تھی۔

کہتے ہیں ایک دن اس نے اپنے باپ کے خزانہ میں سے ایک قالین نکلوا کر مجلس میں بچھوایا۔ اس قالین کے درمیان میں ایک دائرہ بنا ہوا تھا۔ جس میں ایک سوار کی صورت بنی ہوئی تھی اور اس کے سر پر تاج رکھا ہوا تھا اور اس دائرے کے گرد فارسی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔

اس نے ایک فارسی جاننے والے کو بلا کر اس کا مطلب دریافت کیا۔ فارسی خواں اسے پڑھ کر چپ ہو گیا۔

منتصر نے پوچھا "یہ کیا لکھا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "یہ لکھا ہے کہ میں شیرویہ بن کسریٰ بن ہرمز ہوں۔ میں نے اپنے باپ کو قتل کیا تھا۔ مگر مجھے چھ مہینے سے زیادہ حکومت کرنا نصیب نہ ہوا۔"

یہ سن کر منتصر کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے اسی وقت اس قالین کو جلا دینے کا حکم دیا۔

کہتے ہیں کس قدر حیرت کی بات ہے کہ خاندان کسریٰ میں جو قابض بادشاہ شیرویہ گزرا ہے، اس نے اپنے باپ کو قتل کیا اور چھ ماہ تک زندہ رہ سکا، اسی طرح بنو عباس میں منتصر خالص خلیفہ ہوا ہے۔ اس نے بھی اپنے باپ کو قتل کر دیا اور چھ مہینے سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔

(ماخذ تاریخ خلفاء حضرت علامہ جلال الدین)

خواہش

اس وقت تقریباً تمام بڑے چینلز نے اپنے مارننگ شوز ختم کردیے ہیں لیکن ندا یاسر کا مارننگ شو تا حال جاری ہے۔ (حالانکہ اسے تو......؟) ندا یاسر یوں تو کئی ڈراموں میں اداکاری کے جوہر دکھا چکی ہیں (جوانی میں)۔ تاہم گزشتہ کچھ عرصے سے ڈراموں میں دکھائی نہیں دے رہیں، صرف مارننگ شو کی میزبانی اور شوہر کی ہدایت کاری میں بننے والی فلموں کو پروڈیوس کررہی ہیں۔ ندا کا اس بارے میں خیال ہے کہ نجی مصروفیات بڑھ جانے کی وجہ سے اب وہ اداکاری نہیں کرسکتیں اور خاندان کو ٹائم دینے کی وجہ سے فی الحال ڈراموں میں نہیں دکھائی دے رہیں، ساتھ ہی ان کی خواہش ہے کہ وہ صرف اور صرف اپنے شوہر یاسر نواز کی ہدایت کاری میں بننے والے ڈراموں میں کام کریں۔ (لیکن ندا یاسر تو اکثر اپنے ڈراموں کے ہیرو ہوتے ہیں۔ آپ کو والدہ کے کردار میں کس طرح لے سکتے ہیں، کیونکہ ہیروئن تو اب آپ لاکھ کوشش کرکے بھی نہیں آسکتی ہیں)۔

ندا نے اپنے شو پر تنقید کرنے والوں سے کہا ہے کہ ہر کسی کو حق ہے کہ وہ ان کے شو کو پسند ناپسند کرے تاہم انہیں ناپسند کرنے والے بددعائیں دیں اور نہ برے الفاظ استعمال کریں۔

افواہ

ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ ہم دوسروں کے متعلق کوئی بھی بات بلا جھجک کہہ دیتے ہیں۔ خاص طور پر شوبز اسٹارز کے متعلق (یہ الگ بات کہ شوبز کے لوگوں کے متعلق کہی باتیں اکثر ٹھیک بھی ہوتی ہیں)۔

گزشتہ دنوں اداکارہ صنم جنگ کے متعلق افواہ اڑائی گئی کہ ان کی طلاق ہوگئی ہے۔ صنم جنگ کا اس بارے میں کہنا ہے کہ ان کا اس افواہ کے متعلق وضاحت دینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اس افواہ کی وجہ سے ان کے شوہر اور دیگر اہل خانہ پریشان ہورہے تھے، اس لیے انہیں وضاحت کرنی پڑی۔

صنم جنگ جلد ہی اپنی شادی کی چھٹی سالگرہ منانے والی ہیں۔ مارننگ شو بند ہونے کے بعد صنم جنگ دوبارہ سے ڈراموں اور اشتہارات میں نظر آرہی ہیں۔ (جب کہ صنم اب ہیروئن کے لیے مناسب نہیں ہیں)۔

دلیل

ہمارے یہاں کسی بھی بات کو لے کر بیان دینا ایک فیشن بن گیا ہے۔ اب یہی دیکھ لیں پچھلے دنوں سوشل میڈیا پر ایک خاتون نے لوگوں کو مشورہ دیا کہ انگریزی زبان دنیا کے دیگر خطوں پر بسنے والے لوگوں سے بات چیت کرنے کے لیے سیکھی جائے اور انگریزی سیکھنا کوئی راکٹ سائنس نہیں ہے، ویسے بھی یہ ہماری تعلیم کا ایک حصہ ہے (ارے بھئی نہ صرف تعلیم کا حصہ بلکہ ہمارے یہاں تو قابلیت کا معیار بھی ہے)۔ ہمیں اسے نظر انداز کرنے کے بجائے اسے سیکھنا ہوگا۔ اردو ہماری اپنی زبان ہے (کتنی نہیں ہے) تاہم انگریزی زبان سیکھنے میں کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔

اب یاسر حسین کو یہ بات شاید سمجھ میں نہیں آئی یا پسند نہیں آئی (شاید انگریزی کمزور ہونے کی وجہ سے)۔ انہوں نے خاتون کو جواباً مشورہ دیا کہ باجی اپنی زبان سے محبت کرنا سیکھیں (اور اپنی روایات سے؟) اور کیا وہ چین، اسپین اور روس کے متعلق کچھ جانتی ہیں۔ (کیا آپ جانتے ہیں، پر کیسے؟) کسی بھی زبان کو سیکھنے میں کوئی حرج نہیں لیکن اسے اپنے معاشرے پر مسلط کرنا برا ہے۔ (یاسر! آپ پاکستانی فلموں، ڈراموں اور شوز کے متعلق کیا کہیں گے؟)

سبب

آمنہ الیاس ماڈل و اداکارہ ہیں جو سماجی مسائل پر کھل کر بولتی ہیں۔ اکثر ہی وہ خواتین کے ساتھ ناروا سلوک، بچوں کا استحصال اور فرسودہ روایات پر بات کرتی نظر آتی ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے اس سلسلے میں سوشل میڈیا پر ایک مختصر ویڈیو شیئر کی ہے جس میں انہیں ٹریفک پولیس کے روکے جانے پر مجرم کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا دیکھا جاسکتا ہے۔ انہوں نے یہ ویڈیو کلچر کو فروغ دینے والے افراد کے نام کی۔ آمنہ الیاس کا اس بارے میں کہنا ہے کہ انہیں لگتا ہے کہ خدمات سر انجام دینے والے اہلکاروں کے سامنے مجرم دکھانے سے کام میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور یہ فیشن قانون کی خلاف ورزی کا سبب بھی بنتا ہے۔

ادھر اُدھر سے

☆ میرے والد مرحوم شورش کاشمیری کی خطابت کے بہت معترف تھے۔ ایک بار شورش سرگودھا آئے، والد صاحب سامعین میں شامل تھے۔ رات گئے واپس آئے تو شورش کی خطابت کا ذکر اور تعریف بار بار کرتے رہے۔ شورش نے اہل سرگودھا کے لیے پچیس کے قریب ایک ہی ردیف قافیے کے الفاظ کا جو استعمال کیا، والد صاحب بالخصوص اسے یاد کرتے رہے۔

(فیض عام..... سہیل وڑائچ)

☆ امریکی صدر بائیڈن نے کہا ہے کہ امریکی جمہوریت ابھی کمزور ہے۔ درست کہا۔ کیوں کہ بائیڈن کے آٹھ کروڑ کے مقابلے میں ٹرمپ کو ساڑھے سات کروڑ ووٹ ملے ہیں۔ اگر 99 فیصد خواندگی اور 62868 ڈالر فی کس آمدنی والے امریکہ میں شہریوں کی اتنی بڑی تعداد کو بے بنیاد نعروں، سازشی افواہوں اور تعصب کے بل پر گمراہ کیا جاسکتا ہے تو 59 فیصد خواندگی اور 1186 فی کس آمدنی والے ملک پاکستان میں کیا نہیں ہوسکتا۔

(نقشۂ نظر..... وجاہت مسعود)

☆ ریاست اور حکومت میں گٹھ جوڑ ہوجائے تو نہتے شہریوں کے لیے آخری امید عدالت ہوتی ہے۔ عدالت کا اعتبار اٹھ جائے تو ریاست کی بنیاد میں تزلزل آجاتا ہے۔

(چراغ طور..... وجاہت مسعود)

☆

بقیہ شعاع کے ساتھ ساتھ

جاگنا بھلا دے۔ تو کہنا یہ ہے کہ محبت تو ہو ہی جاتی ہے مگر اس سے پہلے آپ کے باپ کی محبت کو اہم ہونا چاہیے۔ اور ہر مرد کو شہرام کے جیسا ہونا چاہیے۔

باوقار اور باوفا! شکریہ فرزانہ جی واقعی میں نے آپ کو تھوڑا پڑھا ہے مگر جتنا پڑھا ہے خوب پڑھا ہے۔ آپ نے قلم کا حق ادا کیا ہے۔

س: خوبیاں اور خامیاں اور تعریفی جملہ؟

"انسان تو ہے ہی خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ فرشتہ ہوتا۔ تو ہر انسان کی طرح مجھ میں بھی بہت سی خامیاں ہیں۔ منہ پھٹ ہوں، غصہ بہت آتا ہے۔ خوبیاں بھی کچھ ہیں۔ مجھ میں جو ناراض ہو جائے ان کو منانی ہوں کیوں کہ مجھے نہیں لگتا کہ رشتوں کو خود سے زیادہ دیر دور کرنا چاہیے۔ جھوٹ نہیں بولتی، خوش اخلاق ہوں اور بہترین کک ہوں ہاں جی تعریفی جملے جن کو سن کر خوشی ہوتی ہے وہ کوکنگ سے متعلق ہیں۔ ابو کہتے ہیں۔" اگر یہ ہوٹل کھولے تو کامیاب ہوگی۔ احسن میرا بھائی ناک چڑھا کر کہے گا۔" میں حیران ہوں کہ یہ اتنا اچھا پکا کیسے لیتی ہے۔"

س: پسندیدہ شعر، اقتباس پسندیدہ کتاب؟

وہ بارش کے تسلسل میں
مجھے بوندوں کی مانند یاد ہے

اقتباس: "جو فقیر کر دیتی ہے وہی محبت ہے مل جائے تو بھی ٹھیک نہ ملے تو بھی ٹھیک۔" (پیار کا دوسرا شہر فرزانہ کھرل)

"عورت کسی بھی محبت سے پہلے اپنے آنگن کی دیواروں سے محبت کرتی ہے۔ وہ پر غرور محبت ہوتی ہے اس دیواروں میں صرف سیمنٹ، اینٹ اور بجری نہیں ہوتی پرت در پرت تمام رشتے انہیں اونچائی تک لے جاتے ہیں کوئی ایک بھی رشتہ اپنی جگہ چھوڑ دے تو محبت پر غرور نہیں رہتی۔ اونچائی کا غرور ٹوٹ جاتا ہے۔"

(پیار کا دوسرا شہر.....فرزانہ کھرل)

"انسان جب خالی برتن کی طرح ہو جاتا ہے تو اس میں اللہ سما جاتا ہے اور اللہ ہی کو سمانا چاہیے پھر سب آسان ہو جاتا ہے۔ تادیر کرنا بھی، بھلا دینا بھی، دنیا میں کچھ اپنا نہیں، کچھ پائیدار نہیں، ہر چیز مٹ جانے والی ہے سوائے اس ذات کے۔

(کہاں کا ذکر سفر فرزانہ کھرل)

کتاب! بے شمار کتابیں پسند ہیں حال ہی میں تارڑ صاحب کی منزل کعبہ شریف پڑھی ہے اور میں بیان نہیں کر سکتی کہ وہ آپ کو بھی اپنے ساتھ کس طرح لے کر چلتے ہیں۔ پڑھتے ہوئے آپ بھی ان کے ساتھ حج کر آتے ہیں۔

س: بارش پسند ہے؟

"بارش اللہ پاک کی رحمت ہے۔ اس کے شاہکاروں میں سے ایک شاہکار، اس کے ان گنت معجزوں میں سے ایک معجزہ نیلا آسمان ان کی آن میں سفید سیاہ بادلوں سے ڈھک جاتا ہے اور چھم چھم مینہ برسنے لگتا ہے تو وہ بارش کی بوندوں کی مٹی پر اولین خوشبو تو بارش کسے نا پسند ہوگی۔"

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

سلونی مچھلی مسالا

ضروری اشیاء:

سی مچھلی	ایک کلو
میتھی دانہ	آدھا چائے کا چمچہ
پیاز	دو عدد
پسا لہسن ادرک	چار کھانے کے چمچے
کٹی ہوئی لال مرچ	دو کھانے کے چمچے
پسی ہلدی، دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
دہی	ایک پاؤ
پسا گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
ثابت زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
لونگ، کالی مرچ	چھ چھ عدد
بڑی الائچی	دو عدد
تیل	ایک پاؤ
نمک	حسب ذائقہ
ہرا دھنیا، ہری مرچ	حسب ضرورت

ترکیب:

مچھلی کو اچھی طرح دھو کر دو چمچے پسا لہسن اور نمک لگا کر دس منٹ کے لیے رکھ دیں اور اچھی طرح سے دھو لیں۔ تیل گرم کریں اور باریک کٹی ہوئی پیاز کو گرم گرم تیل میں ڈال کر سنہرا کر لیں۔ ساتھ ہی اس میں میتھی دانہ اور کٹی ہوئی لال مرچ، پسی ہلدی، پسا دھنیا، پسا ادرک لہسن، ثابت زیرہ، لونگ، کالی مرچ، بڑی الائچی اور نمک کو دہی میں اچھی طرح مکس کر کے دیگچی میں ڈال دیں اور اچھی طرح بھون لیں۔ اس میں تھوڑا سا پانی ڈال کر کچھ دیر پکنے کے لیے چھوڑ دیں۔ اس کے بعد مچھلی کے ٹکڑوں کو اس مسالے میں بچھا دیں اور پکنے دیں۔ چمچ کا استعمال بالکل مت کریں بلکہ کسی کپڑے سے دیگچی کو ہلاتے رہیں اور پانی خشک ہونے دیں۔ جب ہلکی سی گریوی رہ جائے تو چولہا بند کر دیں اور اوپر سے کٹا ہرا دھنیا، ہری مرچیں درمیان سے کٹ لگا کر ڈال دیں اور دم دے دیں۔ اوپر سے گرم مسالا چھڑک کر گرم گرم نان یا روٹی کے ساتھ سرو کریں۔ گھر میں تیار کردہ سلونی مچھلی مسالا کھا کر آپ باہر کی مچھلی کھانا بھول جائیں گے۔

گرل فش اور فرائیڈ رائس

ضروری اشیاء:

مچھلی	ایک کلو
پسی پیاز	ایک عدد
آٹا اور سرسوں کا تیل	حسب ضرورت
پسی ہری مرچیں	چھ عدد
پسی کھٹائی	دو کھانے کے چمچے
سرکہ	آدھا کپ
کٹی لال مرچ	دو چائے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
پسا دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
تیل	آدھا کپ

ترکیب:

مچھلی کو دھو کر اس پر تھوڑا آٹا اور دو چمچے سرسوں کا تیل اچھی طرح لگائیں اور پندرہ منٹ کے لیے رکھ دیں (اس طرح اس کی بساند ختم ہو جائے گی۔) اس کے بعد مچھلی کو اچھی طرح دھو کر اس پر پیاز، ہری مرچیں، کھٹائی، سرکہ، کٹی ہوئی لال مرچ، نمک، پسا دھنیا ڈال کر دو گھنٹے کے لیے میرینیٹ ہونے دیں۔

گرل اطلس میں مچھلی کے قتلوں کو پرو دیں اور ہلکا ہلکا تیل لگا کر گرل کرلیں۔ اگر اوون کی سہولت نہ ہو تو توے پر رکھ کر بنالیں۔

فرائیڈ رائس کے لیے:

چاول	ایک کلو
پسا لہسن	ایک چائے کا چمچ
ہری پیاز	آدھا کپ
گاجر	ایک کپ
سویا سوس	پانچ کھانے کے چمچ
سرکہ	تین کھانے کے چمچ
پسی سیاہ مرچ	حسب ذائقہ
انڈے	تین عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	چار کھانے کے چمچ

ترکیب:

چاولوں میں نمک ڈال کر ابال لیں۔ پتیلی میں تیل گرم کریں۔ انڈوں میں چٹکی بھر نمک اور پسی سیاہ مرچ ڈال کر پھینٹ لیں۔ پتیلی میں تیل گرم کر کے انڈے ڈال کر تیز تیز چمچہ چلا کر فرائی کرلیں۔ اب اس میں پسا لہسن، ہری پیاز، گاجر، پسی سیاہ مرچ ڈال کر تین منٹ تک فرائی کریں۔ ابلے ہوئے چاول، سرکہ، سویا سوس ڈال کر اچھی طرح مکس کریں۔ ڈش میں نکال کر اوپر سے گرل کی ہوئی مچھلی رکھ کر پیش کریں۔

حیدرآبادی گوشت ٹماٹر

ضروری اشیاء:

گوشت	آدھا کلو
ادرک	ایک کھانے کا چمچہ
لہسن	چھ جوے
کٹا زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
پسی ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
مونگ پھلی کا تیل	تین کھانے کے چمچ
پیاز	ایک کپ
ٹماٹر	آدھا کلو
ہری مرچیں	تین سے چھ عدد
کڑی پتا	دس سے پندرہ عدد
ہرا دھنیا	دو سے تین کھانے کے چمچ

ترکیب:

ایک پیالے میں گوشت ڈالیں۔ اس میں لہسن، ادرک، زیرہ، پسی ہلدی اور نمک ملا کر اچھی طرح میرینیٹ کرلیں اور آدھے گھنٹے کے لیے ایک طرف رکھ دیں۔

ایک پتیلی میں درمیانی آنچ پر تیل گرم کریں۔ اس میں پیاز ڈال کر سنہری کرلیں۔ اس کے بعد گوشت کو آمیزہ سمیت ڈال دیں۔ ایک منٹ تلنے کے بعد اس کو ڈھک دیں اور آنچ کم کر کے آٹھ سے دس منٹ تک فرائی کریں۔ اس کا ڈھکن ہٹا کر گوشت کو بھون لیں۔ یہاں تک کہ گوشت اچھی طرح بھن جائے۔ اس میں ٹماٹر، ہری مرچیں، کڑی پتا اور ہرا دھنیا ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ گوشت گل جائے تو ڈش میں نکال کر گرم گرم روٹیوں اور سلاد کے ساتھ پیش کریں۔

بہاری مسالا بوٹی

گوشت	ایک کلو
پسا لہسن ادرک	دو کھانے کے چمچ
پیاز	دو عدد
دہی	آدھا کپ
بہاری بوٹی مسالا	چھ چائے کے چمچ
کچری پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
نمک، تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

گوشت کی بوٹیاں بنالیں اور دھو کر اچھی طرح خشک کرلیں۔ پیاز، ہری مرچ پیس کر اور دیگر مسالے گوشت میں ملا کر تین سے چار گھنٹے کے لیے رکھ دیں پھر سیخوں پر چڑھا کر کوئلوں پر سینکیں۔ تھوڑا تھوڑا تیل لگاتی جائیں یا پین میں ہلکا فرائی کر کے کوئلے کا دم دے دیں۔ لچھے دار پیاز اور چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

ماضی میں ہمارے ہاں کی خواتین اپنے چہرے کی دلکشی کے لیے قدرتی اجزا سے بنی ہوئی اشیاء استعمال کرتی تھیں چنانچہ ان کی صحت وتندرستی اور حسن وشادابی بالکل نوجوانوں کی طرح برقرار رہتی تھی۔ اور ان کا چہرہ صاف شفاف اور تروتازہ رہتا تھا۔ عرق گلاب، لیموں کا رس استعمال کیا کرتی تھیں۔ بعد میں جدید طب نے ان دونوں چیزوں کو دلکشی اور جلد کی صحت کا ضامن قرار دے دیا۔ عرق گلاب انسانی جلد کے لیے بے حد مفید ہے۔ جلدی امراض کے ماہرین اسے کئی بیماریوں میں استعمال کرتے ہیں۔

☆ عرق گلاب جلد کی قوت مدافعت بڑھاتا ہے۔ یہ جلد میں پانی کی صحیح مقدار قائم کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے جس کی وجہ سے جلد ملائم، چمک دار اور ہموار رہتی ہے۔

☆ عرق گلاب جلد سے پانی کے غیر ضروری اخراج کو روکتا ہے۔ عموماً گرمیوں کے دنوں میں جنہیں زیادہ پسینہ آتا ہے۔ عرق گلاب کا استعمال انہیں پسینے کی بدبو سے نجات دلاتا ہے۔

☆ جھائیوں سے نجات حاصل کرنے اور جلد کی رنگت میں نکھار پیدا کرنے کے لیے عموماً بازاری کریمیں استعمال کی جاتی ہیں، مگر جلدی امراض کے ماہر ڈاکٹر عرق گلاب کو ترجیح دیتے ہیں۔ چہرے کی خشکی اور جھریوں سے بچنے اور رنگت گوری کرنے کے لیے عرق گلاب، گلیسرین اور لیموں کا رس ملا کر استعمال کرنا مفید ہے۔

☆ گھریلو خواتین جن کے ہاتھوں کی انگلیاں کپڑے اور برتن دھونے سے کھردری ہو کر پھٹ جاتی ہیں اور ان میں زخم بن جاتے ہیں۔ ایسے میں گلیسرین اور عرق گلاب روزانہ تین چار مرتبہ استعمال کرنا ان کے لیے بے حد مفید ہے۔

☆ بعض لوگوں کی ایڑیاں پھٹ جاتی ہیں۔ اگر وہ عرق گلاب اور گلیسرین کا مکسچر لگائیں تو ان کی یہ بیماری ختم ہو جائے گی۔

☆ عرق گلاب، زیتون اور شہد کے ساتھ مل کر جلد اور معدے کے افعال بہتر بناتا ہے۔ خصوصاً صرف عرق گلاب پینے سے قبض دور ہو جاتا ہے اور یہ انتڑیوں کو جراثیم سے پاک وصاف کرتا ہے۔

☆ سیاہ مرچ کو عرق گلاب میں پیس کر دانتوں پر اس کا لیپ کر دیا جائے تو درد سے فوراً نجات مل جاتی ہے۔ جبکہ عرق گلاب میں سیاہ مرچ کو پکا کر اس کا ماتھے پہ لیپ کیا جائے تو سردی کا نزلہ دور ہو جاتا ہے۔

☆ ناخنوں پر دھبے پڑ جائیں تو عرق گلاب میں لیموں کے چند قطرے برابر ڈال کر ناخن دھو لینے سے دھبے اتر جاتے ہیں اور ناخنوں کی قدرتی چمک اور افزائش برقرار رہتی ہے۔

☆